صلی اللہ علیہ وسلم
محاضراتِ سیرت
ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضراتِ سیرت ﷺ

ڈاکٹر محمود احمد غازی

فہرست

(پہلا خطبہ)

(دوسرا خطبہ)

پیش لفظ

زیر نظر کتاب سلسلہ محاضرات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس سے قبل محاضرات قرآنی، محاضرات حدیث اور محاضرات فقہ کے نام سے تین جلدیں پیش کی جا چکی ہیں۔ خالق کائنات کا یہ بے پایاں فضل و کرم ہے کہ اس نے نہ صرف یہ توفیق اور صلاحیت ارزانی فرمائی بلکہ اس سلسلہ محاضرات کو اس کے علمی معیار اور اس کے حقیر مؤلف کی اہلیت اور توقعات سے کہیں بڑھ کر مقبولیت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، قارئین کے لئے مفید اور مؤلف کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔

زیر نظر کتاب سیرت سے نہیں علم سیرت سے بحث کرتی ہے۔ سیرت پر اردو زبان میں سینکڑوں کیا معنی ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ سیرت کے اس کتب خانے میں درجنوں کتابیں تاریخ سیرت میں نمایاں ترین جگہ پانے کی مستحق ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ تاہم ہماری زبان میں تاریخ سیرت، تدوین سیرت اور مناہج سیرت پر مواد نسبتاً کمیاب ہے۔ اردو دان قارئین سیرت کی بنیادی معلومات اور اہم وقائع سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا کافی سامان ہماری زبان میں موجود ہے۔ لیکن سیرت کا یہ علم کن کن مراحل سے گزرا، کن کن مقاصد کے پیش نظر سیرت نگاروں نے یہ سارا لٹریچر مرتب کیا اس پر اردو زبان میں مواد کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

مزید برآں بعض مغربی مصنفین نے سیرت کے ابتدائی مصادر و مآخذ کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا ہے اور ابتدائی سیرت نگاروں کی کاوشوں کی علمی حیثیت کے بارے میں سوالات اٹھائے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ مغرب سے آنے والی ہر مرعوب کن تحریر کو تحقیق کا بے مثل نمونہ سمجھتا ہے۔ اس طبقے کے بارے میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے آج سے اسی نوے سال پیشتر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔ فطرت کی یہ پستی آج اجداد کو چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ اب اس کے اثرات قرآن مجید، حدیث رسول، فقہ اسلامی اور سیرت پاک کے ذخائر پر عدم اعتماد کی صورتوں میں سامنے آنے لگے ہیں۔ ان حالات میں فن سیرت کی ابتدائی تدوین، تاریخ

ارتقاء اور مناہج پر گفتگو کرنے کی ضرورت اور اہمیت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے بارہ محاضرات یا خطبات میں سے تقریباً نصف کا تعلق فن سیرت کی تاریخ اور تدوین سے ہے۔ ان محاضرات میں کوشش کی گئی ہے کہ مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی مسترشدین کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور الجھنوں کو دور کیا جائے۔ دو محاضرات کا موضوع ریاست مدینہ اور معاشرت مدینہ ہے۔ ریاست مدینہ پر گفتگو آج کے سیاق و سباق میں ناگزیر محسوس ہوتی ہے۔ آج دنیائے اسلام ایک شدید کشمکش کی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اور دینی ضمیر اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی نقشہ کشی اپنی تہذیبی روایات کی روشنی میں کریں۔ دنیائے اسلام میں جا بجا اس کوشش کے مختلف النوع مظاہر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کوششوں کی کامیابی کے لئے ایک مجتہدانہ اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ ریاست اسلام سے گہری واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ امام دار الہجرت امام مالک ابن انسؒ کے یہ مشہور الفاظ حرز جان بنانے کے لائق ہیں جن میں آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے بعد کے معاملات و مسائل کے حل کا وہی طریقہ اور اسلوب کارگر ہوگا جو ابتدا میں کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس لئے ریاست مدینہ اور معاشرت مدینہ کے مطالعہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ریاست مدینہ اور معاشرت مدینہ پر گفتگو کے بعد سیرت کے دو اہم پہلوؤں 'کلامیات سیرت اور فقہیات سیرت' پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ آج سیرت پاک کے جن پہلوؤں کو محل نظر ٹھہرایا جا رہا ہے ان کا تعلق انہی دو پہلوؤں سے ہے۔ آج سیرت رسول (علیہ السلام) پر مشرق و مغرب میں عائد کئے جانے والے بیشتر اعتراضات کا تعلق انہی دو میدانوں سے ہے۔ آخر میں دور جدید میں مطالعہ سیرت کے رجحانات کا ایک عمومی جائزہ لے کر مستقبل میں مطالعہ سیرت کی ممکنہ جہتوں کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

یہ محاضرات مختصر یادداشتوں کی بنیاد پر زبانی دیئے گئے تھے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق سربراہ اور میرے انتہائی محترم بزرگ اور کرم فرما جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ازراہ خورد نوازی اور علم دوستی یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ یہ محاضرات ادارہ تحقیقات اسلامی کے شعبہ مطالعہ سیرت کے زیر اہتمام پیش کئے

بنائیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب محترم نے ۲۴ جولائی ۲۰۰۶ء سے لے کر ۵ اگست ۲۰۰۶ء تک روزانہ نماز عصر سے نماز عشا تک ان محاضرات کا اہتمام فرمایا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد سے خواتین و حضرات کی بڑی تعداد نے تشریف لا کر ناچیز مقرر کی عزت افزائی فرمائی۔ ان محاضرات کی ریکارڈنگ کا کام اجمالی اہتمام اور ذاتی دلچسپی سے جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی نے کیا۔ جناب احسان حقانی نے حسب سابق ان گزارشات کو صوتی تسجیل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔ اب یہ گزارشات ضروری ایڈیٹنگ کے بعد پیش خدمت ہیں۔ میں ادارہ الفیصل ناشران کے سربراہ جناب محمد فیصل صاحب اور ان کے مشیر خاص جناب سید قاسم محمود صاحب کا شکر گزار ہوں جن کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ سلسلہ قارئین تک پہنچ رہا ہے۔

میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان، ان کے رفقاء، دعوۃ اکیڈمی کے سربراہ جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر، ان کے رفقاء، جناب محمد فیصل اور جناب سید قاسم محمود کے ساتھ ساتھ ان تمام خواتین و حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ان محفلوں میں شرکت فرمائی۔ جن نامور شخصیتوں نے ان بارہ اجلاسوں کی صدارت فرما کر ناچیز مقرر کو عزت بخشی وہ بھی میری طرف سے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ خاص طور جناب [illegible] کا دلی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے محاضرات کے اس پورے سلسلے میں پابندی سے شرکت فرمائی۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے یہ سلسلہ ممکن ہوا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ناچیز مؤلف کے ساتھ ساتھ اس سلسلے کی محرک اولین میری مرحومہ بہن محترمہ عذرا نسیم فاروقی کو اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں جن کے اصرار اور خواہش پر یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی محاضرات عقیدہ و ایمانیات ابھی باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جلد سے جلد اس کو مکمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

محمود احمد غازی

اسلام آباد

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

پہلا خطبہ

مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت

پہلا خطبہ

مطالعہ سیرت کی ضرورت و اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی الہ و اصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب [illegible]،

قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان

برادران محترم،

خواہران مکرم

میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ سیرت پاک کے انتہائی مقدس اور متبرک علم کے بارے میں کچھ گزارشات ایک ترتیب اور تسلسل کے ساتھ پیش کر سکوں۔ ان گزارشات میں سیرت النبی کے نہیں بلکہ علم سیرت کے بعض اہم اور ضروری پہلوؤں پر گزارشات کا پروگرام ہے۔

علم سیرت کب اور کیوں شروع ہوا، کیسے شروع ہوا، اس کی ضرورت اور اہمیت کیوں محسوس کی گئی۔ پھر ابتدائی طور پر اس کی تدوین کن خطوط پر ہوئی۔ کن کن حضرات نے اس کی تدوین میں حصہ لیا۔ کن کن مناہج اور اسالیب سے کام لے کر سیرت نگاروں نے سیرت کا یہ ساز و سامان تیار کیا۔ ان موضوعات پر ایک ترتیب سے گفتگو کرنے کا پروگرام ہے۔

درمیان میں دو موضوعات ریاست مدینہ منورہ پر بھی گفتگو میں شامل ہوں گے۔ ریاست مدینہ منورہ پر گفتگو کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ ریاست مدینہ کا آغاز ہی

درحقیقت اسلامی تہذیب اور تمدن اور ریاست کا آغاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے سنہ اسلامی کیلنڈر کے لئے جو نقطہ آغاز منتخب کیا وہ کوئی اور واقعہ نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری اور آپ کے دست مبارک سے اسلامی معاشرہ اور اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

اس ریاست کے بنیادی خصائص کیا تھے؟ یہ ریاست کن خطوط پر قائم ہوئی؟ اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس ریاست نے بنیادی طور پر کن ذمہ داریوں کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیا۔ اس موضوع پر ایک الگ نشست میں گزارشات پیش کی جائیں گی۔

آخر میں برصغیر میں علم سیرت، دور جدید میں علم سیرت اور علم سیرت کا آئندہ لائحہ عمل اور مستقبل کی جہتوں کے بارے میں بعض گزارشات پیش کرنے کا ان شاء اللہ موقع ملے گا۔ مضامین کی یہ تقسیم صرف سہولت کی خاطر ہے۔ ان مضامین کو خواہ بالترتیب سے بیان کرنے کے باوجود ایک حد تک تکرار ناگزیر ہے۔ بہت سے عظیم سیرت نگار ایسے ہیں جن کا تذکرہ ابتدائی گفتگو میں بھی آئے گا، دور جدید کے سیرت نگاروں میں بھی ان کا نام اور کام شامل ہوگا۔ ان کے تذکرہ کے بغیر منہج اور اسلوب کی بات بھی مکمل نہیں ہوگی۔ ان کا تذکرہ ریاست مدینہ کی تاسیس اور تشکیل میں بھی بار بار آئے گا۔ اس لئے کسی حد تک تکرار اس سلسلہ گفتگو میں ناگزیر ہے۔

جب ہم مطالعہ سیرت کی ضرورت اور اہمیت پر بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو مختلف ضرورتیں اور مختلف اہمیتیں ہوتی ہیں۔ ضرورت و اہمیت کی ایک سطح مسلمانوں کے لئے اور ایک دوسری سطح غیر مسلموں کے لئے ہے۔ مسلمان جن اسباب اور محرکات کی بنیاد پر سیرت النبی کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی نوعیت اور ہے، جبکہ غیر مسلم جب سیرت النبی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے اسباب اور محرکات دوسرے ہوتے ہیں۔ پھر مسلمانوں میں مختلف لوگوں کی ضروریات اور ذہنی سطح کے لحاظ سے سیرت النبی کے مطالعہ، ضرورت اور اس کی اہمیت کی الگ الگ سطحیں ہیں۔ عام انسان کی سطح اور ہے، تعلیم یافتہ افراد کی سطح اور ہے اور متخصصین کی سطح اور ہے۔

پھر جب ہم اہمیت کی بات کرتے ہیں تو دور جدید میں سیرت کی اہمیت کے کئی نئے

پہلو اور بعض نئی جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سیرت کے مطالعہ کی تہذیبی اہمیت بھی ہے، بین الاقوامی اہمیت بھی ہے، سیرت کے مطالعہ کی علمی اور تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اسی وجہ سے دور جدید کو، چاہے وہ مسلمانوں پر مشتمل ہو یا غیر مسلموں پر، سیرت کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہئے۔

سیرت ایک لامتناہی اور متلاطم سمندر ہے۔ علم سیرت محض ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قوم، ایک ملت اور ایک الٰہی پیغام کے آغاز اور ارتقاء کی ایک انتہائی اہم، انتہائی دلچسپ اور انتہائی مفید داستان ہے۔ سیرت ایک ایسا دریائے متلاطم ہے جس کے دھارے بلاشبہ لامتناہی ہیں۔ ایک مغربی مستشرق نے، کسی دوست نے نہیں بلکہ ایک دشمن نے، یہ اعتراف کیا تھا کہ حضور ﷺ کے سیرت نگاروں کا سلسلہ لامتناہی ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت اور باعث شرف ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ ایک طویل حدیث میں ایک اہم وصف ارشاد فرمایا تھا، وہ ارشاد جس کو سیدنا علی بن ابی طالب نے روایت کیا ہے اور محدث طبرانی نے اس کی تخریج کی ہے۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے قرآن پاک کے دس بارہ اوصاف بیان فرمائے۔ ان میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ 'لا تنقضی عجائبہ' یعنی قرآن مجید کے عجائب و غرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید سے ہمیشہ نئے نئے مطالب اور نئے نئے معانی نکلتے چلے جائیں گے اور ہر آنے والا دن قرآن پاک کے حقائق اور معارف کی ایک نئی دنیا لے کر آئے گا۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم قرآنی ہر دور میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے بطن میں ابھی کتنے عوالم قرآنی پنہاں ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کتنے مناظر اور مشاہد انسانوں کے سامنے آئیں گے۔ اسی طرح صاحب قرآن کی سیرت اور ارشادات میں پنہاں حقائق و معارف بھی۔ کم از کم ہم محدود انسانوں کی بساط کے لحاظ سے۔ لامتناہی ہیں۔

ابھی ہمارے عزیز دوست نے علامہ اقبال کی جو نعت پڑھی اس میں علامہ نے ایک بہت ہی لطیف بات ارشاد فرمائی ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

انگریزی زبان کی لغت اور قاموس میں بھی اب یہ لفظ شامل ہو گیا ہے اور خاص طور پر بالخصوص اسلامی سیرت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں آغاز میں سیرت کا لفظ صرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ عربی زبان میں حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے لئے سیرت کے لفظ کا استعمال بعد میں شروع ہوا ہے جس کی تفصیل آگے کی گفتگو میں سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کے ہاں سیرت کا مفہوم اور ہے، متاخرین کے ہاں سیرت کا مفہوم اور ہے، جبکہ غیر مسلم مصنفین کے ہاں سیرت کا مفہوم کچھ اور سمجھا جاتا ہے۔

اسلامی علوم وفنون کی اصطلاح میں سیرت کا لفظ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اس طرز عمل کے لئے استعمال ہوا جو آپ نے غیر مسلموں سے معاملہ کرنے میں اور جنگوں میں، صلح اور معاہدات کے معاملات میں اپنایا۔ قدیم مفسرین، فقہاء، محدثین اور سیرت نگاروں نے سیرت کے لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور محقق اور قاموس نگار قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنی مشہور کتاب کشاف اصطلاحات الفنون میں سیرت کی لغوی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ثم غلبت في الشرع على طريقة المسلمين في المعاملة مع الكافرين والباغين وغيرهما من المستأمنين والمرتدين واهل الذمة یعنی شریعت کی اصطلاح میں اس لفظ کا زیادہ استعمال مسلمانوں کے اس طریقہ کار پر ہوتا ہے جو وہ کفار، غیر مسلم محاربین، مسلمان باغی، مرتدین، اہل ذمہ اور دوسروں سے معاملہ اور طریقہ کار کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔ یہی بات فتح القدیر میں شیخ کمال ابن ہمام نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں سیر سے مراد وہ طریقہ ہے جو کفار سے جنگ وغیرہ میں اپنایا جائے۔ یہ ایک پہلو سے تاریخ اسلام کا مضمون ہے اور دوسرے پہلو سے اسلامی قانون اور فقہ کا مضمون ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بہت جلد مسلمانوں کو بہت سی دوسری اقوام سے واسطہ پیش آیا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کے دور میں بہت سے علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے۔ بہت سی اقوام اسلام میں داخل ہو گئیں۔ بہت سی دوسری اقوام کے ساتھ جنگ اور صلح کے معاہدات کرنے پڑے۔ ان تمام معاملات میں مسلمانوں کو

قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آئی کہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ، تفصیلی قوانین اور احکام و ہدایات ان کے سامنے ہوں۔ یہ اسوۂ حسنہ رسول اللہ ﷺ کے ان غزوات کی صورت میں حاصل ہوسکتا تھا جو رسول اللہ ﷺ نے وقتاً فوقتاً مختلف دشمنوں کے خلاف فرمائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف اقوام اور قبائل سے معاہدات بھی کیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ بھی معاہدے ہوئے۔ اور پھر غیر مسلموں میں مشرکین، یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی معاہدے ہوئے تو مسلمانوں کو بھی ہدایات دی گئیں۔ ان کے لئے منشور اور دستور جاری کئے گئے۔ ان سب چیزوں کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے ایک نئے قانون اور نظام کی تشکیل کی۔ جس کے لئے سیرت اور سیر کی اصطلاح استعمال کی گئی جو دنیا کی تاریخ میں پہلا بین الاقوامی قانون ہے۔ مغربی دنیا آج ہیوگو گروشس (Hugo Grotius) کو بین الاقوامی قانون کا بانی اور امام قرار دیتی ہے جس نے سترہویں صدی عیسوی میں قانون بین الاقوام پر پہلی باقاعدہ کتاب لکھی تھی۔ لیکن گروشس سے کم و بیش ایک ہزار سال پہلے فقہائے اسلام نے اس قانون کی تدوین اور ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا اور ہیوگو گروشس کی پیدائش سے 860 سال پہلے امام محمد بن حسن شیبانی بین الاقوامی قانون پر کئی کتابیں لکھ چکے تھے۔ یہ تینوں کتب آج موجود ہیں۔ ان میں ایک کا انگریزی اور دوسری کا فرانسیسی اور ترکی ترجمہ بھی موجود ہے۔ یہ کتابیں اور ان جیسی بہت سی دوسری کتابیں جو فقہائے اسلام نے دوسری تیسری صدی اور بعد کی صدیوں میں لکھیں ان میں رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کی بنیاد پر ایک نیا قانون دیا گیا ہے۔ اس قانون کی تدوین اور ترتیب دوسری صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے پہلے کر لی گئی اور اس پر متعدد تصانیف اور مفصل کتابیں لکھی گئیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں۔

جیسے جیسے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے بارے میں یہ معلومات جمع ہوتی گئیں ان کی تدوین کا کام بھی ہوتا گیا۔ تدوین کی تاریخ پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ لیکن یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معلومات کے دو حصے یا دو مجموعے الگ ہوتے گئے۔ ایک حصہ وہ تھا جس کی اہمیت کا براہ راست پہلو دفاع یا جنگ سے تھا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بارے میں مختلف واقعات کو ترتیب سے جمع کیا گیا تھا۔ یہ حصہ مغازی کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرا حصہ وہ تھا جس میں قانون کا پہلو نمایاں تھا۔ جس سے سیر کی

نسبت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ جو حضورؐ نے چاہا وہ قرآن نے کہہ دیا۔ اس کی مثالیں بھی خود قرآن پاک میں موجود ہیں۔ قد نری تقلب وجھک فی السماء۔ حضورؐ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میرے دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کا بنایا ہوا بیت اللہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبلہ قرار پا جائے۔ قرآن پاک نے اس خواہش کو بھی پورا کر دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی تحویل قبلہ کی بات ہو چکی تھی اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ لیکن قرآن پاک میں یہ وضاحت کیا جانا کہ ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرے کا بار بار اٹھنا دیکھتے تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ تحویل قبلہ کے باب میں حضورؐ کی خواہش کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا تھی۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ خاص قانونی ضرورت کی خاطر فقہائے اسلام نے بالخصوص اور محدثین نے بالعموم مغازی کی تفصیلات جمع کیں اور حضورؐ کے ان تمام غزوات اور مہمات میں جو چیزیں قانونی اہمیت کی حامل تھیں، ان کو الگ کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ چنانچہ عروہ بن زبیرؓ اور موسیٰ بن ابی عقبہ کی تحریروں کی طرح ابتدائی دور کی کتابیں مغازی بھی کہلائیں اور سیر بھی۔ کسی نے ان کتابوں کو مغازی اور کسی نے سیر کے نام سے یاد کیا۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ سیرت اور مغازی کی کتابیں الگ الگ ہوتی گئیں۔ مغازی کا انداز تاریخی قرار پایا اور سیر کا انداز قانونی قرار پایا۔ پھر مغازی میں حیات مبارکہ کے دیگر پہلوؤں کی تفصیلات بھی شامل ہوتی گئیں۔ ان کا نام کبھی علم سیرت و مغازی رکھا گیا، کبھی علم مغازی و سیر رکھا گیا۔ بالآخر اس کا نام علم سیرت قرار پایا اور مغازی اس کا ایک شعبہ بن گیا۔

آج علم سیرت ایک ایسا وسیع موضوع بن چکا ہے جس کے بہت سے حصے اور شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ مغازی اور رسول اللہؐ کے غزوات اور مہمات کی تفصیلات بھی ہیں۔ غزوہ کے لفظ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مغازی سے مراد رسول اللہؐ کی صرف وہ مہمات ہیں جن میں کوئی عسکری یا حربی مقصد پیش نظر تھا یا جنگ ہوئی۔ بلکہ اصطلاحاً غزوہ سے مراد وہ مہم ہے جو مدینہ سے باہر رسول اللہ کی قیادت میں اختیار کی گئی ہو۔ چاہے رسول اللہؐ اس میں جنگ کی نیت سے باہر تشریف لے گئے ہوں یا کسی اور نیت سے تشریف لے گئے ہوں۔ ان سب کے لئے عمومی طور پر غزوہ یا مغازی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوہ

شروع میں ہجرت کے ابتدائی مہینوں میں بہت سی مہمات ایسی ہوئی ہیں کہ جن میں رسول اللہ ﷺ کا مقصد جنگ نہیں تھا، بلکہ مختلف قبائل سے دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا، مختلف قبائل سے مختلف نوعیت کے معاہدات کرنا اور ایک طرح سے خیر سگالی کے وفود بھیجنا تھا۔ لیکن محدثین اور سیرت نگاروں نے ان مہمات کو بھی غزوہ کے لفظ سے یاد کیا ہے جن میں سفارتی اور غیر عسکری مہمات بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر غزوہ ابواء کا ذکر ملتا ہے جو بدر سے پہلے کی ایک مہم ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کا مقصد لڑائی جنگ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس غزوہ یا مہم کا مقصد بنی ضمرہ نامی ایک قبیلے کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا اور ان سے خیر سگالی کے تعلقات قائم کرنا اور ماضی کے ان تعلقات کا احیا پیش نظر تھا جو ہجرت سے پہلے سے رسول اللہ ﷺ اور بنی ضمرہ کے درمیان موجود تھے۔ بنی ضمرہ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ہجرت سے پہلے سے تعلقات چلے آرہے تھے۔ ان تعلقات کا احیا اور ان کو مزید پختہ بنانا مقصود تھا۔

انہی دنوں میں ایک غزوہ ذوالعشیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کا بھی کوئی حربی یا عسکری مقصد نہیں تھا بلکہ قبیلہ بنو مدلج، جو عرب میں کھوجیوں کا قبیلہ تھا، اس سے تعلقات قائم کرنا مقصود تھا۔ ہجرت کے واقعہ میں آپ کو یاد ہوگا کہ سراقہ جو اس قبیلے کا سردار تھا، حضور کا پیچھا کرنے کی نیت سے نکلا تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ منورہ کے قریب، مکہ اور مدینہ کے راستے میں آباد تھا۔ سراقہ نے سنا تھا کہ قریش نے سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا ہے۔ وہ چونکہ کھوجی تھا اس لئے اس نے حضور علیہ السلام کے راستہ کا فوراً پتہ چلا لیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مختصر قافلہ تک پہنچ گیا، لیکن مقصود حاصل نہیں کرسکا۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو مدینہ منورہ کے قریب آباد تھا۔ اسی وقت سے رسول اللہ ﷺ کے سراقہ سے اچھے تعلقات قائم ہوگئے۔ سراقہ ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے ان کو ایک پروانہ امن بھی لکھ کر دے دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ تحریر سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے تحریر فرمائی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر صدیق کے غلام جو سفر ہجرت میں ہمراہ تھے) نے لکھی تھی۔ دونوں صورتوں میں حضور اکرمؐ کی طرف سے ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی گئی۔ یوں بنی مدلج کے سردار کے ساتھ حضور کا ایک ذاتی تعلق قائم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بنو مدلج کے خلاف حضور کا کسی عسکری مہم کا کوئی ارادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس قبیلہ کی طرف مہم بھیجنے کا مقصد صرف دوستی اور بھائی چارے کو فروغ

عرب قبیلہ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے غلاموں، اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد رکھتا تھا۔
اس دلچسپی کی وجہ سے علم انساب عربوں کے ہاں ایک علم بن گیا۔ اس علم کی وجہ سے عرب قبائل
کی آپس کی رشتہ داریوں کی تفصیلات محفوظ ہو گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی، ایک تکوینی
حیثیت تھی کہ بہت پہلے سے اس کا بندوبست ہو رہا تھا کہ رسول اللہ نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مختلف
قبائل سے جو تعلقات قائم کیے ان کی تفصیلات جمع ہو کر محفوظ ہو گئی ہیں۔ اب ان قبائل کی
تفصیل، ان تعلقات کی نشاندہی، ان تعلقات کے اثرات، ان کا پس منظر، یہ سب خود علم
سیرت کا ایک ایسا میدان ہے جس پر الگ کام کا آغاز ہوا ہے۔

پھر حضور اکرم کی ازواج مطہرات کا تعلق عرب کے مختلف قبائل سے تھا۔ عرب کے
جتنے بڑے بڑے قبائل تھے، مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں، مکہ مکرمہ اور اس کے قرب
و جوار میں، ان سب قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ذاتی اور شخصی نوعیت کے تعلقات قائم
فرمائے۔ ان تعلقات کا مقصد دعوت اسلام کے کام کو فروغ دینا اور دعوت اسلام کی راہ میں ان
تعلقات کے اثرات کو استعمال کرنا تھا۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے
ام المومنین حضرت ام حبیبہ سے نکاح فرمایا تو اس کے بعد ابوسفیان نے اسلام کے خلاف کسی
مہم کی قیادت نہیں کی۔ عرب کے معاشرے میں کوئی شخص اپنے داماد کے خلاف فوج لے کر نہیں
نکلتا تھا۔ عربوں کی قبائلی روایات اور معاشرتی اقدار اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ کوئی
شخص اپنی بیٹی کے سسرال کے خلاف خود لے کر نکل کھڑا ہو۔ یہ مقاصد تھے جو مختلف قبائل
میں ازدواجی رشتے قائم کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی اولاد مبارکہ، آل کی تفصیلات ہیں۔ یہ بھی سیرت کا ایک اہم
باب ہیں۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس معاشرت اور معیشت کو قیام فرمایا، جو
انتظامات اور ادارے قائم فرمائے، جو وثائق اور دستاویزات حضور نے مرتب کرائیں جن کا
متن حضور علیہ السلام کے زمانے سے آج تک محفوظ چلا آرہا ہے، ان کو جمع کرنے والوں نے الگ
الگ کتابوں میں مرتب کیا ہے۔ پھر حضور کے خصائل، شمائل، خصائص اور فضائل، یہ وہ چیزیں ہیں
جن پر سیرت کی ہر بڑی کتاب مشتمل ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ سیرت بس اسی کا نام ہے۔ مغرب کے ادبا اور محققین، وہ بھی سیرت

نے یہ کوشش کی کہ ہر وہ چیز جس کا حضور ﷺ کی ذات گرامی سے ذرہ برابر کا بھی تعلق ہے۔ بے شک کوئی براہ راست تعلق نہ ہو لیکن تھوڑا سا تعلق بھی ہو۔ تو اس کو بھی سیرت کے مطالعہ کے دائرہ میں لایا جائے۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں جن کا کوئی اثر حضور کے پیغام کو سمجھنے پر نہیں پڑتا ان کو بھی مدون کر لیا گیا۔ اگر وہ معلومات نہ بھی ہوتیں تو بھی شاید علم سیرت کی وسعت اور اہمیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی لیکن سیرت نگاروں کی ذاتی محبت، ذاتی عقیدت اور غیر معمولی احترام اور اہتمام نے وہ چیزیں بھی مرتب کرائیں۔ یہ غیر معمولی محبت اور احترام صحابہ کرام کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ ہر مسلمان اس بات کو جانتا ہے اور گناہ گار سے گناہ گار ترین مسلمان کو بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ ذات رسالت مآب ﷺ کے لئے عقیدت واحترام اور عظمت کے کون سے جذبات واحساسات ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں پنہاں ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہے۔ مغربی مستشرقین اکثر اس چیز سے ناواقف ہوتے ہیں اور انہوں نے کبھی اس غیر معمولی اور بے نظیر و بے مثل محبت وعقیدت کا احساس ہی نہیں کیا جو مسلمانوں کے دلوں میں فروزاں رہتی ہے۔ بڑا اچھا سا مصرعہ ہے جو کسی دوسرے سیاق وسباق میں کہا گیا تھا لیکن مستشرقین پر ضرور صادق آتا ہے:

اے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔

ایک مستشرق نے پوری کتاب اس پر لکھ ڈالی کہ رسول اللہ ﷺ کا جو تصور قدیم سیرت نگاروں کے ذہنوں میں تھا وہ تو محض ایک قابل رحم اور ایک مسکین کا تھا۔ لیکن بعد کی نسلوں نے محمد ﷺ کی ذات کو آئیڈیلائز کیا اور ان کی شخصیت پر عقیدت مندی کی ایک تہہ چڑھا دی۔ اس کی پوری کتاب کا مقصد ہی یہ بتانا ہے کہ Real Muhammad، Idealized Muhammad اور Idolized Muhammad میں بڑا فرق ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ مسلمانوں نے کوئی چیز آئیڈیلائز کی نہ آئیڈلائز کی۔ پھر اس نے اس فرضی عمل کے مختلف مراحل گنوانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ وہ عشق رسول کے اس گہرے جذبے کا ادراک ہی نہیں کر سکتا جو ہر مسلمان کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا کوئی اندازہ کسی غیر مسلم کو ہو ہی نہیں سکتا، جب تک کہ اس کو مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا حقیقی ادراک اور علم نہ ہو۔

شروع شروع میں بھی دوسری صدی ہجری کے وسط تک سیرت کے مختلف پہلوؤں پر
چھوٹی چھوٹی کتابیں آگئیں۔ جوں جوں یہ سارا مواد مرتب ہوکر قلمبند ہوتا گیا اور لوگوں
کے لئے دستیاب ہوتا گیا ویسے ویسے بعد میں آنے والوں کے لئے آسان ہوتا گیا کہ اس
سارے مواد کو یکجا کریں۔ آٹھویں دسویں صدی ہجری تک آتے آتے سیرت کی کتابیں دس
دس بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ جلدوں میں لکھی جانے لگیں۔ یہ جو کتابیں بارہ جلدوں اور پندرہ
جلدوں میں لکھی گئیں، ان میں سے بہت سی مطبوعہ طور پر دستیاب ہیں، وہ اسی ہال کے اوپر
کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو سیرت نگاروں اور
محدثین نے جمع کی ہیں اور جن کا ان کے مصنف کی نظر میں حضور ﷺ کی ذات مبارکہ سے
بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا۔

یہ تمام چیزیں جو ابھی میں نے بیان کیں وہ تو یقیناً سیرت کا لازمی حصہ ہیں۔ ان امور
کے علاوہ مختلف قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعلقات کا مطالعہ بھی سیرت کا ایک ضروری
اور اہم مضمون ہے۔ جن اصحاب کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا وہ بھی
سیرت کا مضمون ہے۔ خدام، عمال اور کارندگان حکومت، قاضی، مفتی، یہ سب تو لازماً سیرت کا
حصہ ہیں ہی، لیکن یہ تفصیلات کہ حضور ﷺ نے کن کن سواریوں کو سواری کا شرف عطا فرمایا۔
آپ کے استعمال میں گھوڑے کتنے تھے، اونٹنیاں کتنی تھیں، ان معلومات کو بھی سیرت نگاروں
نے جمع کیا ہے۔ ان معلومات کی فراہمی میں دینی ذوق اور علمی دیانت کے ساتھ ساتھ حضور کی
ذات گرامی سے گہری محبت، یہ تینوں باتیں بیک وقت کارفرما ہیں۔

حضور کی ذات مبارکہ سے صحابہ کرام کی محبت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کرسکتا۔ حضرت
ابوبکر صدیقؓ پہلی مرتبہ سرکاری انتظام میں امیر حج کے طور پر زیارت بیت اللہ کے لئے تشریف
لے گئے۔ امیر حج بن کر آپ روانہ ہو چکے تھے اور کئی منزلیں طے کر چکے تھے کہ بعد میں سورۃ
براءۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو معاہدے گزشتہ سال فتح مکہ
کے بعد مشرکین کے ساتھ کئے گئے ہیں وہ چار مہینے کا نوٹس دے کر ختم کردیے جائیں۔ اس
کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مناسب سمجھا کہ چونکہ تمام قبائل حج کے لئے مکہ مکرمہ پہنچ
رہے ہیں ہوں گے تو اگر حج کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے تو زیادہ مفید رہے گا۔ سب کو

معاہدات کی منسوخی کا علم ہو جائے گا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو سواری کے لئے اپنی اونٹنی دے دی اور یہ آیات دے کر حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے بھیجا۔ تمام سیرت نگاروں اور مورخین نے یہ بات لکھی ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالبؓ تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے تاکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکہ پہنچنے سے پہلے پہلے ان سے مل لیں۔ صحابہ کرامؓ نے جب دور سے اونٹنی کی آواز سنی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اونٹنی تھی۔ 'جدعاء' اس اونٹنی کا نام تھا، کیونکہ اس کے کان کٹے ہوئے تھے اور جدعاء کے معنی کٹے ہوئے کانوں والی اونٹنی کے ہیں۔ جب جدعاء کی آواز سنی تو صحابہ کرامؓ تڑپ اٹھے، حضورؐ کی یاد آ گئی۔ بہت سوں نے سمجھا کہ حضورؐ خود تشریف لے آئے ہیں۔ جس نے اتنی محبت سے اور ایسی نظر سے معاملات کو دیکھا ہو اور چیزیں جمع کی ہوں اس کے ذوق و شوق کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے والے کہتے رہیں گے اور اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے رہیں گے کہ حضورؐ کی شخصیت پر عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کی layer اور ملمع چڑھا دی گئی وغیرہ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کے جانوروں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اونٹنیوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ حضورؐ نے اگر کوئی بکری اپنے گھر میں رکھی تو اس کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ وہ بکری کس نے دی تھی، کس سے خریدی تھی، کس گھر میں تھی، کتنا دودھ دیا کرتی تھی۔ حضورؐ کے پاس اسلحہ کونسا تھا، آپؐ نے جن گھروں اور حجروں میں رہائش اختیار فرمائی، ان کی پیمائش اور دیگر تفصیل کیا تھی۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی معلوم ہوتا تو سیرت کے علم اور پیغام پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن ایک بے مثال جذبہ اور ایک بے پایاں ذوق و شوق تھا جس کے نتیجے میں یہ معلومات جمع کی گئیں۔

چند سال پہلے پنجاب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب علم نے، جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، کئی سال کی محنت سے تین کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب اسی موضوع پر ہے کہ ازواج مطہرات کے حجرات کہاں کہاں واقع تھے، ان کا رقبہ کتنا تھا؟ کیسے بنے ہوئے تھے؟ پرانی کتابیں لے کر ایک ایک چیز کو ہاتھ سے ناپا۔ مثلاً اگر لکھا ہوا ہے کہ دس ہاتھ کا تھا تو اس ہاتھ سے ناپ کر نشاندہی کی ہے۔ 'مدینۃ النبی' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ چیزیں ان تفصیلات کا حصہ ہیں۔ یہ سب سیرت ہی کا حصہ ہیں۔

یہ ساری معلومات ایک اعتبار سے حدیث کا حصہ ہیں اور ایک اعتبار سے سیرت کا حصہ ہیں۔ محدثین اور سیرت نگار دونوں حضرات نے ان معلومات سے اعتنا کیا ہے۔ لیکن محدثین کا اصل زور اور اہتمام رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپ کے اقوال و افعال اور تقریرات پر اس اعتبار سے ہے کہ کون سی چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ کونسی چیز سنت کا حصہ ہے اور کونسی چیز سنت کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس سیرت نگاروں کا زور اس پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرز عمل، شخصیت مبارکہ اور رویہ کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں علوم کے مضامین ومباحث میں بڑا تداخل پایا جاتا ہے۔ بہت سے موضوعات ہیں جو حدیث کا حصہ بھی ہیں اور سیرت کا بھی۔ کچھ موضوعات ہیں جو صرف حدیث کا حصہ ہیں اور سیرت کا حصہ نہیں ہیں۔ کچھ موضوعات صرف سیرت کا حصہ ہیں اور حدیث کا حصہ نہیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حدیث کی ہر بڑی کتاب سیرت کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں سیرت کے بارے میں بنیادی معلومات موجود نہ ہوں اور وہ سارے بنیادی مسائل اور مباحث جن سے علم سیرت کا بڑا حصہ عبارت ہے وہاں دستیاب نہ ہوں۔ یوں علم سیرت کا اساسی ذخیرہ علم حدیث کی بنیاد پر محدثین نے اچھی چھان پھٹک کے بعد ایک ایک راوی کی تحقیق اور جرح کے بعد مرتب کر دیا۔

چنانچہ حدیث میں اصل بحث اقوال و افعال رسول پر ہے اور ذات و شمائل رسول ضمناً زیر بحث آتے ہیں۔ سیرت میں ذات و شمائل دونوں اصلاً زیر بحث آتے ہیں۔ اور اقوال و افعال پر ضمناً اور تبعاً بحث ہوتی ہے۔ پھر جو چیز ذات رسالت مآب سے جتنی قریب ہے اتنا ہی وہ سیرت کے اصل اور صمیم میں شامل ہے۔ جو چیز جتنی قریب ہے وہ سیرت کے لب (core) میں شامل ہے اور جتنی کوئی چیز ذات رسالت مآب سے دور ہے اتنی ہی سیرت کے لب سے بھی دور اور ہامشی ہے۔

علامہ ابن قیم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سیرت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ اس لئے کہ سعادت دارین رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی رہنمائی اور ہدایت پر ہی ہے۔ لہذا ہر وہ شخص جو اپنے لئے سعادت کا طالب ہے، اپنا خیر خواہ ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت، آپ کی سیرت اور آپ کے معاملات سے آگاہی حاصل

کرنے کا پیمانہ اور مختلف ہے۔ یہ بات انہوں نے زاد المعاد میں لکھی ہے۔

مطالعہ سیرت کی ضرورت مسلمانوں کے لئے کیوں ہے؟ اس پر شاید زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ ایک مسلمان حضور ﷺ کی ذات کو قانون اور شریعت کا ماخذ سمجھتا ہے۔ یہ بات مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت ہی میں نجات ہے۔ وان تطیعوہ تھتدوا۔ یہ ہدایت کا ذریعہ صرف اور صرف اطاعت نبوی ہے۔ اگر کسی مسلمان کے لئے کوئی اسوہ حسنہ ہے تو وہ صرف رسول اللہ کی ذات گرامی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اگر ہو سکتی ہے تو صرف اور صرف رسول اللہ کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کی اطاعت کا کوئی اور ذریعہ یا راستہ نہیں ہے۔

اسوہ حسنہ کا انگریزی ترجمہ Role Model رول ماڈل یا بہترین رول ماڈل یا واحد رول ماڈل ہو سکتا ہے۔ مسلمان کے لئے اگر کوئی رول ماڈل ہے تو وہ رسول ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اس رول ماڈل کی تفصیلات تین ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ ارشاد ہم نے سنا کہ کان خلقہ القرآن "آپ کے اخلاق وہی تھے جو قرآن پاک میں تحریر ہیں۔ دوسرا ماخذ حدیث و سنت کے وہ ذخائر ہیں جن کے جمع کرنے اور مدون کرنے پر ہزاروں انسانوں نے اپنی زندگیوں کے سالہا سال اور شب و روز قربان کئے۔ تیسرا بڑا ماخذ ہے سیرت مبارکہ اور آپ کے محاسن وفضائل جن کا تذکرہ کرنے اور لکھنے کی سعادت "تذکرہ نگاروں" میں ان شاء اللہ ہم سب حاصل کریں گے۔

آج کا دور ایک عالمگیریت کا دور ہے اور دنیا ایک عالمگیر نظام کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ چھوٹے بڑے سبھی اس عالمگیریت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں کی زبان سے جب عالمگیریت کا لفظ سننے میں آتا ہے تو سیدنا علی بن ابی طالب کا یہ جملہ بے اختیار یاد آتا ہے "کلمة حق ارید بها الباطل" بات تو صحیح ہے لیکن نیت اور مقصد غلط ہے۔ بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر سیدنا علی بن ابی طالب یہ جملہ ارشاد نہ فرماتے تو شاید اس طرح کی شرارتوں کی معنویت کا صحیح اندازہ نہ ہوتا۔ بعض اوقات ایک حق بات کہی جاتی ہے اور آپ اس کی تردید نہیں کر سکتے، اس کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ لیکن کہنے والے کی نیت غلط ہوتی ہے اور وہ

اس کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی کیفیت آج عالمگیریت کی ہے جس کے نام پر آج مختلف طاقتیں مختلف مقاصد اور محرکات کے تحت اپنے اپنے اہداف کو پورا کر رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عالمگیریت ایک حقیقت ہے اور ہمیں اس کے تقاضوں کو سمجھنا چاہئے۔

عالمگیریت کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں انسانی مساوات کے اصول کی تکمیل کی جائے۔ اگر انسانی مساوات نہ ہو۔ کچھ انسان برتر اور کچھ کمتر ہوں۔ تو پھر اس طرح کا ایک عالمگیر انسانی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا جس طرح کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ اگر دنیا برتر اور کمتر انسانوں میں منقسم ہو تو ان کے درمیان شدید قسم کی کشمکش جاری رہے گی اور جب کشمکش جاری ہو تو عالمگیریت قائم نہیں ہو سکتی۔ عالمگیریت کا لازمی تقاضا ہے کہ انسانی مساوات کے اصولوں کو تسلیم کیا جائے اور نہ صرف تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر عمل بھی کیا جائے۔

دوسری چیز جو عالمگیریت کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کے اصولوں کو تسلیم کیا جائے اور ہر انسان کو برابری کی سطح پر عدل و انصاف تک رسائی کا حق دیا جائے۔ یہ بھی مساوات کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ ہر انسان کو برابری کی سطح پر امن و سکون حاصل ہو۔ اگر معاشرہ میں امن و سکون سب کے لئے یکساں نہیں ہے۔ کچھ انسان امن میں ہوں اور کچھ مسلسل بد امنی کا شکار ہوں تو پھر بھی عالمگیریت قائم نہیں ہو سکتی۔ کسی ایک طبقے یا کسی ایک گروہ کی فرمانروائی تو قائم ہو سکتی ہے اور ماضی میں بھی قائم ہوتی رہی ہے۔ ماضی میں بھی زبردستوں نے زیردستوں کو اپنی آقائی کے تلے روندا ہے اور آئندہ بھی روندیں گے۔ لیکن اگر ماضی کے کسی منفی رجحان کو ختم کرنا مقصود ہے اور واقعتاً انسانی مساوات کی بنیاد پر عالمگیریت کا قیام مقصود ہے تو پھر امن و سکون تمام انسانوں کو یکساں طور پر حاصل ہونا چاہئے۔

چوتھی چیز جو عالمگیریت کے لئے ضروری ہے وہ علم کے تمام سرچشموں تک تمام انسانوں کی یکساں رسائی ہے۔ ہزارہا سال سے انسانوں نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ وہ مفید علم جس کا مارکیٹ میں چلن ہو اور بازار میں جس کی طلب ہو تو اس علم پر بندشیں عائد کی جائیں۔ اس پر اجارہ داریاں قائم کر دی جائیں۔ اور عام انسانوں یا کمتر انسانوں کو اس علم کے حصول سے منع کر دیا جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ مذہبی علم کی بنیاد پر سیادت اور قیادت ملتی تھی تو مذہبی علم کے لئے

حضرموت سے اٹھے اور تن تنہا طلیف تک تنہا چلی جائے اور حفیف جہاں آج کل امیر کی
ہورہی ہے اور جاتی چلی رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سونا ہو اور کوئی اس کو تنگ کرنے والا نہ
ہو۔ یہ معیار ہے امن وسکون کا۔

عدل وانصاف کا معیار یہ ہے کہ بڑے اور چھوٹے میں مغربی اور مشرقی میں اور عربی
اور عجمی میں کوئی فرق نہ ہو۔ یہاں تک کہ فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کے جرم میں لائی جائیں تو
ان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ مساوات انسانی یہ کہ بادشاہ اور گدا، خلیفہ اور غلام ایک سطح پر
ہوں۔ اگر ایک دن خلیفہ کی سواری کا دن ہو تو خلیفہ سوار ہو اور اگلا دن غلام کی سواری کا دن ہو تو
غلام سوار ہو۔

غرض یہ بہت کو زندگی دینے اور ان کو پختہ خطوط پر استوار کرنے کے لئے اگر کسی شخصیت
کی زندگی صحیح رہنمائی دے سکتی ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہے اور اس کو سمجھنے کے
لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اور ممالک کو جن مشکلات
ومصائب سے واسطہ رہا ہے ان میں ایک اہم مشکل قوموں کی باہمی عصبیت national
prejudices کا مسئلہ ہے۔ دوسری چیز دولت مندوں اور غریبوں، پیٹ بھروں اور بھوکوں
کے درمیان کشمکش۔ ماضی میں انسانیت کو جتنی مشکلات پیش آئیں، جتنی جنگیں ہوئیں اور جتنا
خون بہا ہے وہ شاید تناوے فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ انہی دو وجوہات کی بنا پر بہا ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ نے جب اپنے کام کا آغاز کیا تو قبائل عرب میں یہ دونوں مشکلات
بدرجہ اتم موجود تھیں۔ قومی عصبیت تو قومی سطح پر ہوتی ہے جو بہر حال ایک بڑی سطح ہے، عربوں
میں تو قبائل کی بنیاد پر شدید عصبیتیں موجود تھیں۔ قبیلوں میں پھر مزید ذیلی شعبوں اور شاخوں
کے درمیان عصبیتیں پائی جاتی تھیں۔ آپ نے سنا ہوگا رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے میں،
آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے سے چند مہینے پہلے قبیلہ بنی حنیفہ سے تعلق رکھنے والے
ایک شخص مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جو جزیرہ عرب کے وسط میں
واقع کے علاقے میں آباد تھا۔

عرب قبائل کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک گروپ ربیعہ قبائل اور دوسرا مضری قبائل

کہلاتا تھا۔ رسول اللہ کے قبیلہ قریش کا تعلق مضری قبائل سے تھا۔ ربیعہ قبائل سے اکثر و بیشتر ان قبائل کا تعلق تھا جو جزیرہ عرب کے وسط میں آباد تھے۔ ان دونوں قبائلی گروہوں کے درمیان کشاکش اور عصبیت کی فضا رہتی تھی۔ جب مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ربیعہ قبائل کے لوگ بڑی تعداد میں مسیلمہ کے ساتھ شامل ہوگئے۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کے زمانے میں ان کے خلاف جنگ کی گئی جو کئی دن یا شاید کئی ہفتے جاری رہی۔ جنگ کا انداز یہ ہوتا تھا کہ تمام دن جنگ ہوتی تھی اور جب شام ہو جاتی تو جنگ روک دی جاتی تھی۔ فریقین اپنے اپنے کیمپ میں واپس چلے جاتے تھے۔ ایک دن جنگ کے دوران مسلمان اپنے کیمپ میں تھے۔ مسیلمہ کے ماننے والے اپنے کیمپ میں تھے۔ بعض مسلمان رات کے وقت شاید چہل قدمی کے لئے اپنے کیمپ سے نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسیلمہ کے کیمپ سے بھی کچھ لوگ ٹہلنے کے لئے نکلے ہوئے ہیں۔ وہ قریب پہنچے تو انہوں نے سلام دعا کی۔ ایک صحابی نے مسیلمہ کے حامیوں میں ایک شخص کو غور سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا تمہارا یہ نام ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ صحابی نے پوچھا کہ کیا تم وہ شخص ہو جو بنی حنیفہ کے اس وفد میں مدینہ آئے تھے اور حضورؐ نے تم سب کو فلاں مکان میں ٹھہرایا تھا؟ اس نے کہا ہاں میں وہی ہوں۔ صحابی نے پوچھا تو پھر کیا تم ایمان نہیں لائے تھے؟ اس نے کہا کہ بالکل ایمان لایا تھا۔ صحابی نے پھر پوچھا کہ کیا اب تمہیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر کوئی شک ہوگیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں مجھے اب بھی کوئی شک نہیں۔ صحابی نے پوچھا کہ تم حضور کو نبی مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نبی مانتا ہوں۔ پوچھا گیا کہ تو پھر تم مسیلمہ کی نبوت پر ایمان لائے ہو؟ اس نے کہا نہیں، میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اس پر صحابی رسول نے پوچھا کہ پھر بندۂ خدا! مسلمانوں سے جنگ کیوں کر رہے ہو؟

اس سوال کے جواب میں اس شخص نے جو کچھ کہا وہ بڑی عجیب بات تھی۔ لیکن اس دور کے ماحول کو سمجھنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم ربیعہ کا جھوٹا مجھے مضر کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔ یہ قبائلی عصبیت تھی جس سے رسول اللہ کو واسطہ پڑا تھا۔

جہاں تک جھگڑوں اور پیٹ بھروں کا تعلق ہے تو ان کی کشمکش سے تو پورے عرب کی جاہلی شاعری بھری پڑی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اس کشمکش کے ضمن میں اپنے کارنامے بیان نہ کئے ہوں۔ صعلوک کے معنی کنگال کے ہیں اور وہاں صعالیک کی ایک پوری

بستیاں برباد کر کے لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ بڑے بڑے اکابر اسلام اس ہنگامے میں شہید کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ حافظ ابن کثیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس دور میں لوگوں کی زبان پر اکثر یہ جملہ سننے میں آتا تھا 'اذا قیل لک ان التتار انہزموا فلا تصدق' 'اگر کوئی تم سے کہے کہ تاتاریوں کو شکست ہو گئی تو تسلیم نہ کرو'۔ گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور بات تھی۔

جب تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی اور بربادی کا یہ سارا کام ہو گیا اور دنیائے اسلام کو تاتاریوں کی افراتفری سے فرصت ملی تو اتنی تیزی سے اسلام پھیلا ہے کہ اتنی تیزی سے نہ پہلے پھیلا تھا اور نہ بعد میں کئی سو سال تک اس کی مثال مل سکی۔ جب یہی تاتاری جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا، کتب خانے تباہ و برباد کئے اور ایسی تباہی پھیلائی کہ دجلہ و فرات کا پانی سیاہ ہو گیا، یہی تاتاری اسلام میں داخل ہو گئے۔ خود مغربی مصنفین نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ سیاسی اسلام اور مذہبی اسلام مغرب کی اصطلاحات ہیں ہماری اصطلاحات نہیں ہیں۔ مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ سیاسی اسلام اور مذہبی اسلام دونوں پھیلنے کے اعتبار سے یکساں نہیں رہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جب سیاسی اسلام کو غلبہ حاصل ہو تو مذہبی اسلام کو بھی غلبہ حاصل ہوا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ سیاسی اسلام کو شکست ہوئی ہو تو مذہبی اسلام کو بھی زوال ہو گیا ہو۔ بلکہ بارہا اس کے برعکس ہوا ہے۔ یہ کئی مغربی مصنفین نے تسلیم کیا ہے۔

خود آج امریکہ اور یورپ میں قبول اسلام کی جو رفتار ہے اس سے بھی اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جو لوگ وہاں سے آتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ 9/11 کے واقعات کے بعد اسلامی کتب کی اشاعت اور قبول اسلام کی رفتار پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اسلامی کتب کی اشاعت ہزاروں گنا بڑھ گئی ہے۔ کئی سال تو ایسے گزرے کہ کتابوں کی دکانوں پر قرآن پاک کا ترجمہ دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ ادھر کاپیاں آئیں اور ادھر نکلیں۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں کے دوران قرآن پاک کے تراجم کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔ اس منظر و حقیقت کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کا مطالعہ اس کے اصل ماخذ اور مصادر سے کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا قوت ہے، وہ کیا روح اور اسپرٹ ہے جو اسلام کو اس تیزی سے پھیلا رہی ہے، ان ساری مشکلات کے باوجود اسلام کے پھیلاؤ اور توسیع کا جو منبع

ہے، وہ کمزور نہیں پڑا۔ بلکہ اسلامی چیز مختلفی جا رہا ہے۔ دعوت کے میدان میں بھی اسلام ہمیشہ آگے کی طرف رہا ہے۔ سیاسی اور عسکری میدان سے وہ رُتی بھر بھی متاثر نہیں ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا ایک پہلو اور ہے جس نے بہت سے غیر مسلموں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماضی اور حال میں ایسے لوگ تو بے شمار ہوتے رہے ہیں جو کسی ایک شعبہ زندگی میں قیادت کر رہے ہوں اور کسی ایک شعبہ میں قیادت کے نتیجہ میں انہوں نے کامیابی حاصل کی ہو۔ لیکن ایسی مثال کوئی نہیں کہ ایک شخص نے بالکل شروع اور آغاز سے کسی نئی چیز کا تصور دیا ہو، نئے انقلاب کی نوید دی ہو، نیا وژن دیا ہو، زندگی کے ہر گوشے میں تبدیلی اور اصلاح کی نوید سنائی ہو، ایک بھرپور تبدیلی اور اصلاح کا پیغام دیا ہو، پھر اس بھرپور اصلاح اور تبدیلی کو اپنی زندگی ہی میں آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں مکمل کر کے دکھا دیا ہو۔ (مدینہ منورہ سے باہر توسیع کا عمل سنہ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد شروع ہوا اور سنہ ۹ ہجری میں تبوک کی مہم میں تکمیل کو پہنچا۔ سنہ ۱۰ ھ میں خطبۂ حجۃ الوداع کے ذریعہ اس تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔) اور جو رول ماڈل دنیا کے سامنے پیش کیا ہو وہ زندگی کے ہر گوشے کے لئے اسی طرح سے معنویت رکھتا ہو جس طرح کی معنویت روزِ آغاز سے رکھتا تھا۔ سیرت مبارکہ کی یہ جامعیت ہی ہے جو اس کو ایک انفرادیت عطا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا ایک جامع رول ماڈل ہونا ایک ایسی منفرد چیز ہے جو دنیا میں کسی اور شخصیت کو حاصل نہیں ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام اولوالعزم رسولوں کو یہ چیز حاصل تھی۔ لیکن آج ان کی تعلیمات اور سیرت کے بارے میں معلومات محفوظ نہیں ہیں۔ اس لئے آج ان کی دستیاب سیرت کے حوالے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ آج کوئی رول ماڈل موجود نہیں ہے۔

پھر تاریخ عالم اور خود مغربی مصنفین کے اعتراف کے مطابق انسانی تاریخ کا کامیاب ترین انسان اگر کوئی شخص کہلا سکتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ دنیا میں کوئی اور انسان اپنی کامیابی کی کمیت اور کیفیت، گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے حضور علیہ السلام کی نسبت ہزارویں حصے میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ انسانی تاریخ کے دوسرے ناموراور

کامیاب لوگوں کے اثرات یا تو کسی خاص علاقے تک محدود ہیں، یا کسی خاص دور تک محدود ہیں، یا کسی خاص فن اور کسی ایک میدان تک محدود ہیں۔ ایسے اثرات جو ہر علاقے اور ہر قوم میں موجود ہوں، ہر زبان بولنے والوں میں پائے جاتے ہوں، ہر تہذیب و تمدن اور ہر براعظم میں ہوں، زندگی کے ہر پہلو میں ہوں، ایسی مثال حضور ﷺ کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اسی لئے انصاف پسند مشرقی اور مغربی مصنفین رسول اللہ ﷺ کو تاریخ انسانی کی منفرد ترین شخصیت کہتے ہیں جو انسانی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔

یہاں میں مائیکل ہارٹ کا حوالہ نہیں دوں گا جس نے حضور ﷺ کو عظیم انسانوں میں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ لیکن میں اس کا حوالہ اس کے بعد والے نام کے لئے دینا چاہوں گا۔ اس نے نمبر دو پر آئزک نیوٹن یا اسحاق نیوٹن کو رکھا ہے۔ نیوٹن بلاشبہ بہت بڑا آدمی تھا اور سائنس کے میدان میں اس کا کارنامہ بہت بڑا ہے۔ لیکن جو آدمی میری طرح سائنس کا طالب علم نہ ہو، اور دنیا کے چھ ارب انسانوں میں کتنے انسان سائنس کے طالب علم ہیں؟ کتنے ہیں جنہوں نے نیوٹن کا نام بھی سنا ہو، ان کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے۔ پھر سائنس کہاں سے کہاں چلی گئی۔ اگر اسحاق نیوٹن تاریخ کا دوسرا بڑا آدمی ہے تو پہیہ ایجاد کرنے والا اس سے بھی بڑا آدمی ہونا چاہئے۔ آخر پہیے کی ایجاد انسانی تہذیب و تمدن کی توسیع و تشکیل میں اس کام سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو نیوٹن نے کیا تھا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ چونکہ نیوٹن کا تعلق دنیائے مغرب سے تھا اور مغرب سے جو چیز وابستہ ہو، دنیا اس کو بہت اونچی اور بے مثال چیز سمجھتی ہے اس لئے اسحاق نیوٹن کا نام انہوں نے نمبر دو پر لکھ دیا۔ ورنہ بظاہر اپنی اہمیت اور اپنی تاثیر کی وسعت کے اعتبار سے وہ اس درجہ کا انسان نہیں ہے کہ اس کا نام رسول اللہ ﷺ کے بعد دوسرے نمبر پر لکھا جا سکے۔

ان سب سے قطع نظر کرکے کم سے کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کا اگر کوئی معیار ہو اور کسی بھی غیر مسلم سے کہا جائے کہ پوری تاریخ انسانی کا جائزہ لے کر وہ انصاف سے یہ بتائے کہ کم سے کم وسائل میں زیادہ سے زیادہ کامیابی کس انسان نے حاصل کی۔ اگر دیانت داری سے کوئی شخص مطالعہ کرنا چاہے تو رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے علاوہ کوئی اور نام ذہن و دل اور حاشیہ خیال میں آ ہی نہیں سکتا۔

دنیا میں یقیناً بڑے بڑے فاتحین گزرے ہیں۔ بڑے بڑے قانون دہندگان بھی گزرے ہیں، جسٹینین گزرا ہے جس کا کوڈ بڑا مشہور ہے۔ سلطنتوں اور ریاستوں کے بانی گزرے ہیں۔ معلمین اخلاق اور تزکیہ نفس کرنے والے بھی گزرے ہیں۔ اجتماعی مصلحین بھی گزرے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے پاس یا تو پہلے سے ایک روایت اور ذخیرہ موجود تھا۔ جسٹینین کے اپنے پاس قانون کا ذخیرہ یا اس کا ذاتی حصہ کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے خود تو اپنا کوڈ نہیں لکھا۔ اس نے پہلے سے موجود قوانین کو مدون کرا دیا جو اس سے پہلے سے تحریری اور غیر تحریری دونوں صورتوں میں موجود تھے اور ہزار سال سے ان پر عمل ہو رہا تھا۔ جسٹینین کے کہنے سے وہ قوانین یکجا مرتب کر کے لکھوا دیئے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی کارنامہ جسٹینین کا نہیں ہے، کیونکہ روما میں ایک ہزار سال پہلے سے جو قوانین چلے آ رہے تھے جن میں سے بہت سے پہلے سے لکھے ہوئے موجود تھے ان سب کو یکجا کر کے کوڈیفائی کروا دیا گیا۔ یوں جسٹینین بہت بڑا آدمی ہو گیا۔

اب ذرا جسٹینین کے قانون کا رسول اللہ ﷺ کی عطا فرمودہ شریعت سے موازنہ کریں۔ عرب میں قانون کا کوئی تصور نہیں تھا۔ قانون کے نام پر ایک صفحہ بلکہ ایک جملہ بھی کہیں لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ عرب میں قانون سازی یا قانون پر عمل درآمد کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے ایسا قانون عطا فرمایا کہ دنیا سے حضورؐ کے تشریف لے جانے کے بعد پندرہ سال کے اندر اندر دنیا کے تین براعظموں میں وہ قانون پھیل گیا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں مسلمان ہمارے برصغیر میں پہنچے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں اسپین میں مسلمانوں کی آبادی وجود میں آ گئی تھی۔ تین براعظموں میں اسلام کا پیغام حضرت عثمان کے زمانے میں پہنچ گیا تھا۔ اور یہ تمام آبادیاں اسلامی قانون پر عمل کر رہی تھیں۔ اس حکومت میں جو سیدنا عثمان غنیؓ کی تھی، آج اس میں ایک درجن سے زیادہ مسلمان حکومتیں ہیں۔ ان سب کا نظام اور قانون شریعت کے مطابق چل رہا تھا۔ جسٹینین کے قانون کو اتنی وسعت اور قبولیت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

عظیم فاتحین کی مثالیں دیکھ لیں، بانیان مذاہب کی مثالیں دیکھ لیں۔ معلمین اخلاق کی مثالیں دیکھ لیں۔ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر تصورات و نظریات کا ایک ذخیرہ موجود

تھا۔ ایک ایسا متحرک موجود تھا جس کی بنیاد پر تعمیر کرنا آسان تھا۔ بالکل آغاز سے تعمیر ہو رہی تھی۔
حضور کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔ یہاں تدریج قدم بہ قدم ہر چیز کا آغاز ہوا۔ یہ وسائل تھے
اور کامیابی آپ کے سامنے ہے جس کا اندازہ آئندہ گیارہ دنوں کی گفتگو میں ہو جائے گا۔

رسول اللہ کے سیرت نگار کے لئے ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ کی حیات مبارکہ،
اقوال وارشادات، پیغامات اور کارناموں کے بارے میں معلومات اتنی وسیع اور پھیلی ہوئی ہیں
کہ ان کو ایک جگہ سمیٹنا اور ان کی بنیاد پر ایک مرتب اور جامع تصویر پیش کرنا بجائے خود ایک چیلنج
رہا ہے۔ ہر سیرت نگار کے سامنے ایک بہت بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ اس ذخیرہ معلومات کو
کیسے سمیٹا جائے اور کیسے مرتب کیا جائے۔ اس موضوع پر آئندہ گفتگو کے دوران بات ہوگی تو
اس مشکل کا اندازہ بھی ہوگا کہ جب معلومات سیرت کو مرتب انداز میں جمع کیا جائے اس سے
کیا مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اگر الگ الگ موضوعات کے مطابق معلومات جمع کی جائیں تو
اس سے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔

گویا یہاں معلومات کی وسعت اور فراوانی کی وجہ سے مشکل پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے
بانیان مذاہب اور انبیاء کے سیرت نگاروں کے سامنے مسئلہ قلت معلومات کا ہوتا ہے۔
معلومات ہی موجود نہیں ہوتیں۔ کوئی چھوٹا سا سوال کرنا چاہے۔ جس طرح کے سوالات حضور
کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔ وہ مغربی مستشرقین آئے دن یہ سوالات دہراتے رہتے ہیں۔
اس طرح کے سوالات دوسری مشہور شخصیات کے بارے میں کئے جائیں تو ان کے تمام پہلوؤں کو
پہلے ہی قدم پر ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان شخصیات کے بارے میں عام سے
سوالات کا جواب ملنا بھی ممکن نہیں۔ مثلاً سیدنا عیسیٰ ابن مریم کس طرح کا لباس پہنتے تھے۔ آج
اگر کوئی ان کی پیروی میں ان جیسا لباس پہننا چاہے، ان جیسا کھانا کھانا چاہے تو ان سوالات
کا کوئی جواب دستیاب نہیں۔ چاروں انجیلوں میں جو کچھ ہے اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔
بہت ابتدائی، جزوی، مختصر قسم کی معلومات ملتی ہیں۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو سب
سے زیادہ recent پیغمبر ہیں ان کی کیفیت ہے جو ایک ایسی قوم میں آئے جو بڑی متمدن
تھی۔ جس کے بڑے شہروں میں بڑے بڑے تمدن قائم کرنے والے لوگ موجود تھے۔ جو ایک
قوم میں بھیجے گئے جہاں یونانیوں کے علوم وفنون کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ جہاں عقلیات

کا پتہ لگ جاتا تھا۔ وہاں پر بھی سیرت نگار معلومات کی قلت سے پریشان ہو جاتے ہیں۔

معلومات کی اس قلت کی وجہ سے خود عیسائیوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کوئی شخصیت تھے بھی یا محض ذہنی اور دیومالائی وجود رکھتے ہیں۔ جیسا کہ برٹرینڈ رسل اور کئی دوسرے مغربی اہل علم کا خیال ہے۔ یہی بات متعدد مغربی مؤلفین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی کہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی تاریخی شخصیت نہیں تھے بلکہ ان کا وجود محض دیومالائی کہانی ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اور مضامین لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس شک کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان شخصیات کے بارے میں معلومات کی قلت ہی ہے۔ لیکن اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کہہ سکا کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت تاریخی اعتبار سے ثابت شخصیت نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کی اس اہم ترین شخصیت سے واقفیت کے لئے اور اس شخصیت کا فہم حاصل کرنے کے لئے مطالعہ سیرت ناگزیر ہے۔

پوری تاریخ مذاہب میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہی واحد تاریخی شخصیت ہے۔ اس وقت دنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں ان میں سے کسی کے مؤسس کی شخصیت کا وجود بھی تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔ خالص تاریخی شواہد کے مطابق کسی ایک کی شخصیت بھی تاریخی لحاظ سے ثابت شدہ نہیں ہے۔ خود ان کے ماننے والوں کو بھی یہ یقین نہیں ہے کہ واقعی اس نام کی کوئی شخصیت موجود بھی تھی کہ نہیں تھی۔ اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکا۔ حضور ﷺ ہر پہلو سے تاریخ کی مرتب اور ثابت شدہ ہیں جس کا ہر ہر گوشہ نصف النہار کے آفتاب کی طرح روشن ہے۔ لہٰذا اسوۂ حسنہ کو جس کو آج کل کے محاورہ میں قرآن ان ایکشن یا قرآن ان پرسن کہہ سکتے ہیں، دیکھنے کے لئے اور قرآن صامت کو سمجھنے کے لئے قرآن ناطق کی عظیم شخصیت کو دیکھنا پڑے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان تمام کامیابیوں اور عظمتوں کے باوجود کسی بڑائی کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ خود حضور ﷺ کے سچے ہونے اور نبی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ تھوڑی سی کامیابی سے انسان کا ذہن بھٹک جاتا ہے اور دماغ بہک جاتا ہے۔ معمولی کامیابی بھی مل جائے تو انسان ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ لیکن اتنی بڑی کامیابی، ہر پیغام اور ہر چیز کے بارے میں بار بار یہ

اعلان کرنا کہ یہ اسی سلسلہ کا ایک تسلسل ہے جو خالق کائنات نے روز اول سے شروع کر دیا تھا، یہ انہی انبیا کی تعلیم کا تسلسل ہے جو ماضی میں آتے رہے ہیں۔ میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا۔ نہ میں بطور نبی کے کوئی نیا ہوں، نہ میرا پیغام کوئی نیا پیغام ہے، اور نہ ہی میں کوئی نئی چیز لے کر آیا ہوں۔ میں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے چلے آنے والے پیغام الٰہی، الٰہی شریعت اور دین کو لے کر آیا ہوں۔ میرا کام صرف ان دو چیزوں کی تکمیل ہے۔ ایک مکارم اخلاق کا تصور، دوسرے تصور دین کی تکمیل۔ مکارم اخلاق سے مراد محض اخلاقیات نہیں ہے۔ بلکہ مکارم اخلاق سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کو کسی مادی اساس کی بنیاد پر، کسی عقلی اساس کی بنیاد پر، یا کسی مفاداتی اساس کی بنیاد پر قائم ہونے کی بجائے خالصتاً اخلاقی اور روحانی اصولوں پر قائم ہونا چاہئے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔

انسانوں میں معلمین اخلاق نے ہزاروں بار اخلاق کی تعلیم دی۔ سیکڑوں معلمین اخلاق کے خیالات قلم بند کئے گئے۔ درجنوں معلمین اخلاق کے خیالات کی بنیاد پر اخلاقیات کے نظریے اور فلسفے مرتب ہوئے۔ لیکن تکمیل اخلاق اگر کسی شخصیت کے ہاتھوں ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ اس طرح کہ ایک ایسا نظام معاشرت و معیشت اور نظام سیاست و اجتماع قائم ہو کہ جس میں بنیادی اساس اخلاق اور روحانیات ہوں۔ جس میں مادی اور دنیاوی عامل اور محرک کوئی مادی مفاد نہ ہو بلکہ روحانی اور اخلاقی بہتری ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن پاک کے الفاظ میں نعمت کے لفظ سے یاد کیا گیا (واتممت علیکم نعمتی) اور جس کو حضور ﷺ نے اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرار دیا۔

علم حدیث و سیرت کے باہمی تعلق کے بارے میں میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ ابتدا میں حدیث اور سیرت دونوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک رہیں اور آج بھی بہت سے موضوعات مشترک ہیں۔ لیکن ایک چیز ان دونوں کا پوری انسانی تہذیب اور سارے انسانی تمدن کے لئے contribution ہے۔ علم سیرت اور حدیث نے علم تاریخ کو جنم دیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی کے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے اس کو بیان کیا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا میں تاریخ کا تصور کیا تھا اور مسلمانوں کے بعد دنیا میں تاریخ کا کیا تصور رائج ہو گیا ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے تاریخ نویسی کے کون سے معیارات مقرر کئے ہیں جن

تک آج انسان نہیں پہنچ سکا۔

یہ عجیب بات ہے کہ مشرقی اور مغربی ناقدین اسلام سیرت نگاروں پر تنقید کرتے ہیں۔ مورخین اسلام کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کسی نے آج تک ہیروڈوٹس سے نہیں پوچھا کہ آپ نے جو تاریخ لکھی ہے اس کے ذرائع و مصادر کیا ہیں۔ ہیروڈوٹس نام کا کوئی آدمی تھا بھی کہ نہیں تھا۔ اگر تھا تو کہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کو جو معلومات ملیں وہ کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اس کے بیانات کہاں تک سچ اور کہاں تک جھوٹ ہیں۔ کسی نے یہ سوالات نہیں پوچھے۔ دنیا کے مشرقی اور مغربی اہل علم آنکھیں بند کر کے اس کے دعاوی اور بے دلیل بیانات کو مانتے ہیں۔ آج کے مغرب زدہ مسلمان شاید قرآن کو اتنا نہیں مانتے جتنا کہ اہل مغرب ہیروڈوٹس کو مانتے ہیں۔

کسی نے نہیں پوچھا کہ مہابھارت میں جو قصے لکھے گئے ہیں وہ سچ ہیں کہ جھوٹ ہیں۔ دنیا میں بسنے والا ہر ہندو ہر چیز، قدیم اور اچھی چیز کو بھارت سے منسوب کرتا ہے۔ آپ پچھلے پچیس تیس سالوں کے دوران سامنے آنے والی ہندو مصنفین کی کتابیں پڑھیں تو روئے زمین پر کوئی چیز نہیں جس کا آپ تصور کر سکتے ہوں اور اس کو انہوں نے قدیم بھارت کے ساتھ منسوب نہ کر دیا ہو۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ مہابھارت کس نے لکھی تھی۔ کب لکھی گئی تھی۔ اس کے ماخذ کیا تھے، مصادر کیا تھے۔ اس کے پاس یہ معلومات کہاں سے آئیں۔ کوئی اس چیز کو چیلنج نہیں کرتا۔ میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر سوال کرتا ہوں کہ کیا اقوام عالم کے مکاشفات اور صحف کی تحریروں کو حدیث و سیرت تو درکنار موضوع احادیث کے معیار پر بھی پرکھا جا سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ تنقیدی سوالات صرف قرآن اور سیرت کے بارہ میں ہی کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیشتر مغربی مصنفین کے دل و دماغ پر اسلام کے خلاف تعصب کا زبردست داغ لگا ہوا ہے اس کے علاوہ کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم سیرت اور علم حدیث نے ہی دنیا کو پہلی بار علم تاریخ کے اصولوں سے روشناس کرایا۔ علم سیرت ہی نے حقائق اور افسانوں کے درمیان فرق کرنا سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑے بڑے محدثین نے ہی سب سے پہلے تاریخ پر قلم اٹھایا۔

قرآن میں نبوت کے بارے میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ کیا ہے۔ جب نبوت پر بات کریں گے تو وحی پر بات ناگزیر ہوگی۔ وحی پر بات ہوگی تو ذرائع علم پر بھی بات ہوگی اور وہ شعبہ علم و حکمت زیر بحث آئے گا جس کو آج کل Epistymology کہتے ہیں۔ یہ سوال کہ وحی کیا ہے، ذرائع علم کیا ہیں، ثبوت کیا ہے، علم ضروری اور علم حصولی کیا ہے۔ یہ مسائل سب سے پہلے محدثین اور سیرت نگاروں نے اٹھائے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں اور جس کے بارے میں ایک الگ گفتگو میں بات ہوگی۔

اب مختصر طور پر ایک دو اہم امور کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ مطالعہ سیرت کی اہمیت ہر مسلمان کے لئے کیا ہے۔ مطالعہ سیرت کی ضرورت پر تو بات ہوگئی، لیکن اس کے علاوہ اہمیت بھی ہے۔ بعض اوقات کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ضرورت ہوتی ہے۔ پیاس لگی ہو تو اس وقت پانی کی اہمیت نہیں، لیکن ضرورت بہت ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت اور چیز ہے اہمیت اور چیز ہے۔

پہلے مطالعہ سیرت کی تہذیبی اہمیت پر بات کرتے ہیں۔ اگر تہذیبوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ایک چیز بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے جو تہذیب قائم کی وہ ایک جامع الصفات تہذیب ہے۔ وہ تمام تہذیبوں کی جامع ہے۔ گویا تمام تہذیبوں کی روح اور خلاصہ اسلامی تہذیب میں آگیا ہے۔ لیکن وقوع کے اعتبار سے بھی اسلامی تہذیب مجمع الصفات ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں تہذیبوں کی جغرافیائی اہمیت پر بہت تفصیل سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کا مرکز جغرافیائی اعتبار سے زمین کا مرکز ہے۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو ناف زمین کہا جاتا ہے۔ روئے زمین کے مرکز میں اسلامی تہذیب ہے اور جہاں جہاں اسلامی تہذیب کی پہنچ ہے وہاں سے تمام دنیا تک روئے زمین کے ہر علاقے کا فاصلہ تقریباً یکساں ہے۔ یہ اسلام کے جامع الصفات ہونے کا ایک اہم ثبوت ہے۔

تہذیبوں کی تاریخ میں یہ بات بہت اہم اور قابل توجہ ہے کہ ماضی میں جتنی تہذیبیں پیدا ہوئیں یا اسلام کے قیام کے وقت جو تہذیبیں تھیں وہ علاقائی تہذیبیں تھیں۔ ان کی اساس مذہبی پیغام پر تھی۔ رومیوں کی تہذیب ہو، یونانیوں کی ہو، مصریوں کی ہو، چینیوں کی ہو اور ایرانیوں کی پارسی تہذیب ہو۔ ان ساری تہذیبوں کی اساس کسی نہ کسی مذہبی پیغام پر

تھی۔ مذہبی پیغاموں میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ جن کی اساس اور آغاز کوئی آسمانی مذہب یا آسمانی پیغام ہے۔ کسی نہ کسی نبی تک جا کر وہ منتہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایرانیوں کی آتش پرست تہذیب پر بھی تھوڑا سا غور کیا جائے تو وہ بعض ایسی شخصیات تک جا کر ختم ہوتی ہے جن کے بارے بہت سے محققین کا خیال ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز تھے۔ مثلاً زرتشت جن سے بہت سے مذہبی عقائد منسوب ہیں۔ ان کے نبی ہونے کا امکان متعدد اہل علم نے ظاہر کیا ہے۔ خود مجوس جو ایران کی ایک بڑی قوم تھی، وہ بھی ایک مذہبی روایت کے پیرو تھے اور ایک آسمانی مذہب سے ان کا تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو وہی حیثیت دی جو اہل کتاب کو دی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کے حیات مبارکہ کے آخری ایام میں بعض ایسے علاقے فتح ہوئے جہاں مجوسی بھی رہتے تھے تو صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے ان کی مذہبی اور قانونی حیثیت کے بارے میں پوچھا۔ جنوبی عرب میں باذان حضورؐ کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ یہاں مجوس کے نام سے ایک قوم بستی ہے، میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ آپؐ نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا جس کا متن حدیث و سیرت کی کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔ اس میں آپؐ نے فرمایا کہ سنوا بهم سنة اهل الكتاب، یعنی ان کے ساتھ وہی معاملہ رکھو جو اہل کتاب کے ساتھ رکھتے ہو۔ غير ناكحي نسائهم ولا آكلي ذبائحهم۔ ان کا ذبیحہ کھاؤ اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، بقیہ معاملات میں ان کے ساتھ وہی سلوک جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ ساری تہذیبیں مختلف آسمانی مذاہب کے زیر اثر قائم ہوئیں۔ آسمانی مذاہب کو قرآن پاک نے تسلیم کیا۔ قرآن پاک نے خود کو نہ صرف ان کا مصدق قرار دیا بلکہ مہیمن بھی قرار دیا و مهيمنا عليه' کہ قرآن ان پر مہیمن ہے یعنی ان کا محافظ اور ان پر حاوی ہے۔ کس طرح حاوی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کریں تو مختلف انبیاء کا تذکرہ ملتا ہے۔ کسی ایک پیغمبر کا تذکرہ کرتے وقت ان کی کسی ایک صفت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے، دوسرے کی دوسری صفت نمایاں طور پر پیش کی گئی ہے، تیسرے کی تیسری صفت نمایاں ہے۔ کسی میں صبر کی کیفیت نمایاں ہے، کسی میں کلمۂ حق اور جہاد کی، کسی میں زہد و تقویٰ نمایاں ہے۔ کسی میں بادشاہت کا قیام اور اس کی شان و شوکت نمایاں ہے۔ کسی میں بین الاقوامیت نمایاں ہے۔ اسلام کے پیغام اور

پیغمبر اسلام میں یہ ساری صفات یکجا موجود ہیں۔ جن میں اولوالعزمی بھی ہے، استغنا اور زہد بھی ہے، عالمگیریت بھی ہے، صبر، جہاد اور شکر بھی ہے اور وہ ساری صفات جو قرآن کے بیان کردہ 26 انبیا میں انفرادی طور پر پائی جاتی ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں یکجا طور پر موجود ہیں۔ پھر بقیہ آسمانی کتابوں کی جو خصوصیات ہیں، مثلاً کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا قانون بڑا سخت ہے اور قانون کے احکام شدید ہیں۔ اس لئے کہ اس قوم کو اسی طرح کے قانون کی ضرورت تھی۔ کسی کتاب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں قانون کی روح پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور قانون کی بجائے اخلاقی اساس کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلق مع اللہ کو زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ کسی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناجاتیں کر کے اللہ کے حضور کے بندگی کے احساس کو نمایاں کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں یہ ساری چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ قرآن پاک میں سخت احکام بھی ہیں۔ نالائقوں کے لئے احکام سخت ہی ہونے چاہئیں۔ قرآن پاک میں مناجاتیں بھی ہیں۔ قرآن پاک اور اس کے پیغمبر نے جو مناجات اور دعائیں سکھائی ہیں اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم اور کوئی روایت نہیں کر سکتی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے، دعوۃ اکیڈمی نے شائع کی تھی، سیرت النبی دعاؤں کے آئینے میں، اس میں مولانا نے یہ سمجھایا ہے کہ دعاؤں کی کیا حیثیت ہے اور دعاؤں سے سیرت النبی پر کس طرح روشنی پڑتی ہے۔ دعاؤں کے ذریعے حضور کی شخصیت کو کیسے دیکھا جائے۔ دلچسپ اور چھوٹی سی کتاب ہے۔ یہ ساری چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر ان پیغاموں کی روح قرآن پاک میں موجود ہے۔ جن پیغاموں پر یہ تہذیبیں قائم تھیں ان کی روح قرآن پاک میں موجود ہے تو قرآن پاک سے جو تہذیب ابھرے گی وہ ساری تہذیبوں کی جامع قرار پائے گی۔

قرآن پاک اپنے بارے ایک اور خصوصیت کا بار بار تذکرہ کرتا ہے، جو مغربی مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آئی۔ قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ میں آسمانی وحی کا تسلسل ہوں۔ یہ سب تورات، زبور اور انجیل آسمانی کتابیں تھیں۔ میں بھی ایک آسمانی لیکن آخری اور حتمی کتاب ہوں۔ ہر مستشرق شکایت کرتا ہے کہ جب مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرنا

انسانی سطح پر اسلام کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی۔ یہ تبدیلی اپنے غیر معمولی نتائج و ثمرات کے اعتبار سے انسان کی علمی اور فکری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ شاید انسان کی فکری تاریخ میں یہ ایک نقطۂ تحول ہے۔ ایک Turning point ہے کہ قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ عقل اور نقل کے درمیان ایک توازن قائم کیا۔ ماضی میں یا تو عقل پر زور تھا اور نقل کو لوگوں نے سرے سے بھلا دیا تھا۔ یونانیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کچھ اور لوگوں نے نقل پر ہی سارا زور دیا اور عقل کو بالکل بھلا دیا۔ ہندوؤں کی مثال ہمارے اپنے پڑوس میں ہے۔ اس لئے نہ کوئی دیرپا، متوازن، مستقل اور قابل عمل نظام مجرد عقل کی بنیاد پر کھڑا ہو سکتا ہے نہ مجرد نقل کی بنیاد پر۔ اسلام نے پہلی مرتبہ نقل اور عقل کے درمیان ایک توازن پیدا کر دیا۔

حضور ﷺ نے ایک خالص بدوی معاشرہ کو ایک ایسا عاقلانہ، عالمانہ اور مہذب معاشرہ بنا دیا جو عقل اور نقل دونوں کے تقاضوں کو لے کر کامیابی سے چلا اور دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا۔ افتراق رنگ و نسل اور تمیز رنگ و خون کو ختم کر کے ایک ایسی مساوات بشری قائم کر دی جس سے بڑھ کر نمونہ آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ اس مساوات بشری کا ایک مظہر وہ ہدایات بھی ہیں کہ ایک ناک کٹا حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو تو اس کی اسی طرح پیروی کرو جس طرح ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کرتے ہو۔ یہ بات دنیا آج تک حاصل نہیں کر سکی۔ آج بھی دنیا میں سارے دعوؤں کے باوجود کچھ لوگوں کو ساری دنیا کے مقابلہ میں ویٹو حاصل ہے، کچھ لوگ بہ نسبت اوروں کے زیادہ مساوات رکھتے ہیں۔

ایک بڑی بنیادی اور امتیازی عطا جو علمی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید کا حقیقی مفہوم لوگوں کی رگ و پے میں اس طرح سے جاگزیں کر دیا کہ بڑی سے بڑی گمراہی، بڑی سے بڑی مصیبت اہل ایمان کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ یہ نہ اسلام سے پہلے ہوا اور نہ بعد میں ہوا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ توحید محض ایک doctrinal issue ہے۔ بقول علامہ اقبال یہ محض علم کلام کا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ قوت کا نام ہے۔ توحید جب تک ایک زندہ قوت تھی اس نے مسلمانوں کو متحرک رکھا۔ اس زندہ قوت کے مظاہر، ثمرات اور برکات اتنے بے شمار ہیں کہ ان پر گفتگو کرنے کے لئے

تیسے الگ شخصیت کی ضرورت ہوتی۔ میں ایک چھوٹی سی مثال میں عرض کرتا ہوں۔ اسلام سے پہلے بہت ساری اقوام میں ایک بہت بڑی گمراہی پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں میں یہ گمراہی آج بھی پائی جاتی ہے۔ یہ چونکہ ہمارے پڑوس کا قصہ ہے اس لئے آپ شاید زیادہ واقف ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک گمراہی یہ پائی جاتی ہے جو ماضی میں اور قوموں میں بھی پائی جاتی تھی کہ جو جو قوت جو قدرت میں نفع اور ضرر رکھتی ہے وہ الوہیت کے عناصر رکھتی ہے۔ گویا نفع اور ضرر دونوں الوہی عناصر ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی جانور کسی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ یقیناً الوہی صفات رکھتا ہے۔ کسی دریا کے پانی سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں تو وہ دریا الوہی صفات رکھتا ہے۔ کسی درخت کی چھاؤں اور پھل سے لوگ غذا اور دوا حاصل کرتے ہیں تو وہ درخت الوہی صفات رکھتا ہے۔ اسی طرح بہت سے دیویاں اور دیوتا وجود میں آ گئے۔

یونانیوں کو علم و فن کی بہت اونچی معراج پر فائز بتایا جاتا ہے۔ اہل مغرب کی نظر میں علم و حکمت کا ہر موتی یونان کی کان سے نکلتا ہے۔ وہاں بھی ہر چیز کا الگ دیوتا ہے۔ آج کل دنیا میں بہت ساری اصطلاحات مروج ہیں جو سب یونانی دیوتاؤں کے نام ہیں۔ ہمارے ہاں دکانوں کے نام بھی یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے جاتے ہیں۔ سکولوں کے نام یونانی دیوتاؤں کے نام پر رکھے جاتے ہیں، یہ سب جانے بوجھے بغیر ہوتا ہے۔ دیکھا دیکھی بہت سے مغربی الفاظ اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ ان میں بہت سارے الفاظ یونانی ہیں، اور یہ سب دیوتاؤں کے نام ہیں۔ آگ کا دیوتا الگ ہے، محبت کا دیوتا الگ ہے، فلاں کا دیوتا الگ ہے، فلاں کا دیوتا الگ ہے۔ یہ سارے دیوی دیوتا ہمارے ہاں بھی آج تک کم از کم ناموں کی حد تک معروف ہیں۔

یہ تصور کیوں پیدا ہوا؟ اگر یہ تصور ہو کہ ہر وہ چیز جو نافع اور ضار ہے وہ دیوتا ہے، تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ دیوتا کو کوئی کاٹ پھانٹ کر تحقیق نہیں کرتا۔ دیوتا تحقیق کا موضوع نہیں ہوتے۔ وہ احترام کا مرکز ہوتے ہیں۔ احترام اور تحقیق انسان کے مزاج کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر آپ میڈیکل سائنس کے طالب علم ہوں اور اگر آپ کو کسی لاش کی چیر پھاڑ کرنی ہو تو آپ کر لیں گے۔ لیکن اگر آپ کی والدہ کا انتقال ہوا ہو تو آپ کبھی بھی ان کی میت کی چیر پھاڑ پر آمادہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ان کی ذات سے احترام و

عقیدت وابستہ ہے۔ کسی دوسرے انسان کی اچھی چیز چھوڑنے کے لئے آپ تیار ہو جائیں گے،
کیونکہ وہاں احترام اور عقیدت وابستہ نہیں ہے۔ جہاں احترام اور عقیدت ہو وہاں تحقیق نہیں
ہوتی۔ اگر گنگا اور جمنا دریا ہیں تو ان پر تحقیق نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ دیوتا ہیں تو ان پر بھی
تحقیق نہیں ہو سکتی۔ چاند اور سورج اگر دیوتا ہیں تو ان پر تحقیق نہیں ہو سکتی۔ تحقیق تو تب ہو سکتی
ہے جب آپ ان چیزوں کو اپنے استعمال کر سکتے ہوں۔

قرآن پاک نے جب توحید تعالیٰ کا پیغام دیا کہ خلق لکم ما فی الارض جمیعا جو کچھ
بھی زمین پر ہے تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ سخر لکم ما فی الارض جمیعا۔ یہ جو کچھ ہے وہ
تمہارے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ اس کو دیکھو تو ڈرو۔ چیر پھاڑ دو اور اپنے مقصد کے لئے استعمال
کرو۔ یہی وجہ ہے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علوم و فنون کی تحقیق اور اس میدان میں ایک
نئے دور کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی تعلیم اور توحید کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اگر توحید کی یہ
دعوت نہ ہوتی اور اس میں اتنی شدت، جامعیت اور گہرائی نہ ہوتی تو تحقیق کے دروازے کبھی
کھل نہیں سکتے تھے جو بعد میں کھل گئے۔

یہ تو مطالعہ سیرت کی علمی اہمیت تھی۔ اب دورِ جدید کے لئے مطالعہ سیرت کی
اہمیت پر چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔ دورِ جدید سے مراد ان گزارشات کے سیاق و سباق
میں بیسویں صدی کے آغاز بلکہ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر آج تک کا دور ہے۔ اس
دور میں مختلف مغربی قوتوں کو دنیائے اسلام میں فکری، تہذیبی اور ثقافتی بالادستی حاصل ہوئی
ان گزارشات میں آج کل کی بالادست قوتوں سے مراد مغربی طاقتوں کی یہی قوتیں ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ دنیائے مشرق و مغرب آج مسلمانوں کے درپے ہے۔ مسلمانوں کو
نہ مشرق میں چین ہے نہ مغرب میں۔ دنیا کی ہر طاقت اس وقت مسلمانوں کی دشمن معلوم ہوتی
ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے دنیا کے حال و مستقبل کے بارے
میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ مشرق والے مسلمانوں سے کلی طور پر صرف نظر کر سکتے ہیں
اور نہ ہی مغرب والے مسلمانوں کے علی الرغم کچھ کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے لئے دنیائے
اسلام سے صرف نظر کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ نہ ایک ارب تیس کروڑ کی قوم کو
مٹایا جا سکتا ہے۔ نہ اس کے بغیر زندہ رہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر معاملات چلائے

کریں۔ احساس اور جذبہ وہ چیزیں ہیں جو قرآن مجید، سنت اور سیرت سے ملتی ہیں۔ اس احساس اور جذبہ کے مطالعے کے بغیر مسلمانوں سے متعلق کوئی بھی معاملہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اب مغرب میں سیرت کا مطالعہ سنجیدگی سے ہونے لگا ہے۔ پرانے تعصبات ایک ایک کرکے ختم ہو رہے ہیں یا کم از کم کمزور پڑ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ پرانے تعصبات کا علمی اعتبار سے دفاع نہیں کیا جا سکتا اور صدیوں پرانے مستشرقانہ تصورات کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے اب مغرب کے انصاف پسند محققین زیادہ حقیقی اور زیادہ معتبر مطالعہ کی طرف آ رہے ہیں۔

آخری بات یہ کہ مطالعہ سیرت دنیا کی ایک روحانی ضرورت بھی ہے۔ روحانیات کے معاملے میں ہر مذہب میں بنیادی سوال یہ رہا ہے کہ 'جز' چاہتا ہے کہ وہ 'کل' کی طرف لوٹ جائے۔ فرد اپنے خالق اور مالک کی طرف رجوع کرنے یا تائب ہونے کا رجحان رکھتا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کو آپ وصال کے نام سے یاد کریں یا لقا کے نام سے، ہر مذہب میں یہ سوال موجود ہے اور اس کا جواب دینے کی بھی ہر مذہب نے کوشش کی ہے۔ اسلام میں رب العالمین کی طرف رجوع اور اس سے ملاقات کی تعلیم موجود ہے۔ توبہ، انابت اور رجوع الی اللہ اسی کے مظاہر ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں لقاء کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ۔ لیکن جز کے کل کی طرف لوٹنے کی شکل کیا ہوگی؟ اس کی بنیادی اور سب سے پہلی منزل ذات باری سے تعلق اور محبت ہے۔ یہی روحانی شخصیت کا ہدف رہا ہے کہ انسانوں کے دلوں میں ذات باری تعالیٰ کی محبت اور تعلق کی بنیاد کو مضبوط بنایا جائے۔ جو جتنا زیادہ مضبوط بنے گا اتنا ہی زیادہ روحانی معاشرہ وجود میں لا سکے۔ بہت سے فلسفے اور نظریے اسی بنیاد پر سامنے آئے کہ ذات باری سے تعلق اور محبت کی اساس کو کیسے مستحکم کیا جائے۔ دنیا کے مختلف مذاہب راستوں اور مظاہر کی تلاش میں رہے۔ کوئی بتوں کے ذریعے، کوئی صفات کے ذریعے اور کوئی کسی اور ذریعے سے ذات باری تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات کہ ذات رسالت مآب کا اتباع کامل اور آپ کی ذات گرامی سے محبت ذات باری تعالیٰ سے محبت کا ایک مظہر ہے (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی)، اسلام کی ساری روحانی تعلیم کا اصل الاصول ہے۔ حضور ﷺ کا اتباع، ذات باری تعالیٰ سے محبت کا واحد طریقہ

سوال و جواب

مستشرقین اور سیرت نبوی کے حوالے سے آپ نے کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ کیا تفصیلی مطالعہ کے لئے آپ کوئی کتاب تجویز کر سکیں گے؟

کوئی متعین کتاب تو اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے جو خاص سیرت نبوی اور مستشرقین کے حوالے سے لکھی گئی ہو۔ لیکن اسلام اور مستشرقین کے حوالے سے کئی لوگوں نے بڑی تحریریں لکھی ہیں۔ خاص طور پر آٹھ دس سال پہلے مشہور امریکی یہودی دانشور ہنٹنگٹن کی کتاب چھپنے کے بعد سے کئی تحریریں اس موضوع پر سامنے آئی ہیں۔ وہ شاید آپ کے لئے مفید ہوں۔

☆

آپ نے فرمایا کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے چاہا وہ قرآن میں بیان ہوا اور جو قرآن نے بیان کیا وہ آپ نے کیا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو حضرت ابو طالب کی مغفرت یا ان کے قبول اسلام کی بہت خواہش تھی۔ کیا قرآن پاک میں اس کا کوئی بیان ہے کہ حضرت ابو طالب نے اسلام قبول کیا یا نہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے شاید منطق نہیں پڑھی۔ منطق کا اصول یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ کلیہ نہیں ہوتی بلکہ سالبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ یعنی جب اس طرح کا کوئی بیان آ جاتا ہے جو عمومی بیان ہو اور اس میں کوئی مثبت بات کہی گئی ہو تو اس کی نقیض میں عمومی نفی پائی جا

ضروری نہیں ہے۔ وہ جزوی طور پر بھی اگر شفی ہو تو اس کی تحقیق ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی خواہش تو یہ تھی کہ پوری انسانیت مسلمان ہو جائے۔ آپؐ کے بارے میں تو خود قرآن کے اندر یہ گواہی موجود ہے کہ 'لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین' یعنی آپ اس غم میں اپنے آپ کو فنا کئے دے رہے ہیں کہ لوگ مسلمان نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی جو تکوینی حکمت اور مشیت ہے اس کے حساب سے کوئی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ انک لا تهدی من احببت 'کہ تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے، کیونکہ ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

جناب ابوطالب کے قبول اسلام کے بارے میں مسلمانوں میں دو نقطہ نظر ہیں۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اپنی وفات سے چند لمحے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسرے نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہ تاریخ کا مسئلہ ہے عقیدہ یا دین کا مسئلہ نہیں ہے۔

☆

کیا جملہ موضوعات پر آپ کا بیان تحریری صورت میں پایا جا سکتا ہے؟

میں نے کوئی تحریری بیان تیار نہیں کیا ہے۔ یہ مختصر نوٹس ہیں جن کی بنیاد پر زبانی گفتگو کی گئی ہے۔ اس وقت تک تو ان موضوعات پر کوئی تحریر لکھی ہوئی نہیں ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ یہ ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈر سے نقل ہوگی اور پھر اس پر ضروری نظر ثانی ہوگی تو اس وقت یہ تحریری طور پر دستیاب ہو سکے گی۔ ان شاء اللہ۔

☆

مطالعہ سیرت کی اہمیت قابل عمل اور آسان ہونے کے حوالے سے کوئی مثال بیان فرمائیں۔

سیرت کا یقیناً یہ ایک اہم پہلو ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت قابل عمل بھی ہے اور آسان

بھی ہے۔ آپ نے اپنی شریعت کے بارے میں ایک بار فرمایا تھا کہ میں ایک آسان اور سیدھی شریعت لے کر آیا ہوں۔ اس پر عمل درآمد کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ابھی ایک دوست ڈاکٹر سجاد صاحب نے ایک مثال یاد دلائی کہ حضور ﷺ سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان میں نماز کی عبادت کے لئے یہ ضروری ہوتا تھا کہ کسی مخصوص عبادت گاہ میں جا کر ہی عبادت کی جائے۔ اب بھی مختلف اقوام میں عبادت کے لئے عبادت گاہ کا ہونا لازمی ہے اور جب تک خاص rituals ادا نہ ہوں اس وقت تک عبادت نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے اس طرح کی کوئی قید یا شرط نہیں رکھی۔ پوری روئے زمین کو مسجد قرار دے دیا گیا ہے۔ آپ جہاں بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی ایک مثال ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے اور حضور ﷺ کی سیرت پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔

☆

> سیرت النبی پر بات کرنے والے ہجرت مدینہ سے شروع کرتے ہیں۔ آپ نے بھی انہی کے قدموں پر چلتے ہوئے ابتدا کی۔ سوال یہ ہے کہ حیات نبی کا جو حصہ مکہ میں گزرا ہے اس کو کس وجہ سے موخر کیا جا سکتا ہے اور اسی سے ابتدا ہونی چاہئے۔

یہ واضح کر دوں کہ خطبات کے اس سلسلہ میں علم سیرت پر گفتگو ہوگی۔ اس لئے میں تاریخی ترتیب سے سیرت کے واقعات کو اس طرح بیان نہیں کروں گا جس طرح سیرت کی کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ گفتگو سیرت پر نہیں بلکہ علم سیرت پر ہے۔ سیرت کے اس علم پر گفتگو مقصود ہے جس کو مسلمانوں نے مدون کیا اور ہم تک پہنچایا۔ میں یہ فرض کر کے یہ گفتگو کر رہا ہوں کہ سیرت کے عمومی واقعات سے سب حاضرین و سامعین واقف ہیں اس لئے ان پر گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ سیرت کا ایک اہم حصہ حضور کی مکی زندگی ہے۔ مکی زندگی دراصل مدنی زندگی کے لئے تیاری تھی۔ مدنی زندگی میں شریعت، معاشرت، حکومت،

تہذیب اور چیزوں کی اساس ہے۔ یعنی زندگی کی حیثیت بنیادی ہے جبکہ عملی زندگی کی حیثیت عمارت کی ہے۔ عمارت بنیاد کے بغیر نہیں ٹک سکتی۔ لیکن جب بن جاتی ہے تو بنیاد نظروں سے سامنے نہیں ہوتی۔ عمارت سامنے ہوتی ہے۔

☆

آپ نے خواتین کی دینی تعلیم کو پہلے نقطۂ نظر کے طور پر پیش کیا۔
پھر اخلاقی تعلیم پھر تہذیب اور پھر ان سب کی حفاظت کے
لئے ریاست۔ ہم بہ حیثیت خواتین اپنے گھروں میں اس
ترتیب کو کس طرح نافذ کر سکتی ہیں؟

آپ اس ترتیب کو اس طرح نافذ کریں کہ آپ اپنے بچوں کو، اپنے قریب وجوار اور جہاں جہاں آپ کے اثرات ہیں وہاں دینی تعلیم دیں۔ جب آپ اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کو دینی تعلیم دیں گی تو اس کے نتائج اور اثرات ان کے اخلاق پر ہوں گے۔ پھر اخلاق کے نتیجے میں معاشرت وجود میں آنے لگے گی۔ جب معاشرت وجود میں آئے گی تو تہذیب وجود میں آئے گی اور جب تہذیب وجود میں آئے گی تو ریاست اور حکومت پر اس کے اثرات پیدا ہوں گے۔ یوں مسلمانوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر خود بخود وجود میں آ جائے گی۔

☆

آپ نے فرمایا کہ مغربی حلقوں میں اسلام کے خلاف موجود
پرانی متعصب تحریریں پڑھی تھیں۔ اس کی کچھ مزید وضاحت
فرمائیں گے؟

اس موضوع پر تفصیل ان شاء اللہ سے ایک نشست ہو سکتی۔ اگر آپ اس کا جائزہ لیں کہ مغربی مصنفین نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیا کیا لکھا ہے اور اس سارے لٹریچر کا تنقیدی اعتبار سے جائزہ لیں تو وہ بات واضح ہو جائے گی جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ مغربی مصنفین آج سے چھ سات سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک میں انتہائی گستاخانہ کلمات

بولا کرتے تھے۔ ایسے کلمات جن کو میں آپ کے سامنے دہرا نہیں سکتا۔ سب و شتم کا یہ نامبارک
مشغلہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں ایک ایسا زمانہ آیا
کہ یورپ میں سیرت کے ماخذ چھپنے شروع ہوئے۔ ان میں ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں
نے اسلام کے اساسی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے غیر اخلاقی انداز تو چھوڑ دیا
لیکن رسول اللہ ﷺ کو ایک سیاسی (نعوذ باللہ) موقع پرست کے طور پر پیش کرنا شروع کیا اور یہ
بتایا کہ آپ کا مقصد اپنی قوم کو سیاسی اقتدار دلانا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا بھی جواب دیا اور خود
سیرت کے لٹریچر سے بھی اس کی تردید ہوگئی۔ پھر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضور نبی تو تھے
لیکن صرف عرب کے لئے تھے پوری دنیا کے لئے نہیں تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ اسلام کے حق میں اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کی تائید میں
کتابیں آنے لگیں۔ مثلاً آج سے سو پچاس سال پہلے مغرب میں اسلامی نقطہ نظر کی تائید میں
کوئی کتاب نہیں لکھی جاتی تھی۔ پہلی کتاب سید امیر علی نے لکھی۔ اس پر بھی میں بات کروں گا۔
اس کے علاوہ کوئی کتاب تائید میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن آج خود مغربی اور عیسائی مصنفین اور
دوسرے لوگ سیرت پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اتنی قابل
اعتراض نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کتابوں میں سو فیصد مسلمانوں کا نقطہ نظر بیان کیا گیا
ہے۔ لیکن اب اتنا ہو گیا ہے کہ ہمارے نقطہ نظر سے ایسی قابل قبول چیزیں آنی شروع ہو گئی ہیں
جن کی تعداد درجنوں میں نہیں بلکہ سینکڑوں میں ہے۔ ایک خاتون جو امریکی یا برطانوی ہیں،
مجھے ان کا نام یاد نہیں، لیکن وہ کافی عرصہ پاکستان میں رہی ہیں۔ انہوں نے مغرب میں رسول اللہ ﷺ
کے بارے میں Perceptions کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں
بتایا گیا ہے کہ مغربی تحریروں میں حضور ﷺ کا تصور کیا رہا ہے۔ اس نے یہ ساری تفصیل بتائی
ہے اور آخر میں کہا کہ اب مغربی مصنفین میں ایک ہمدردانہ رویہ پیدا ہوا ہے جو اتنا زہر آلود نہیں
ہے جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔

☆

بعض احادیث کے بارے میں علامہ کا خیال ہے کہ یہ حدیثیں
خود بنائی گئی ہیں اور حقیقی نہیں ہیں۔ [illegible]

آپ جس کو بھی درست مانیں اس کو اختیار کر لیں۔ اس سے فی نفسہ اس اصل حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ وہ شق صدر ہو یا شرح صدر ہو، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ حق کے لئے کھول دیا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نبوت کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے حضور کی تربیت بچپن سے ہو رہی تھی۔ اس پر دونوں تعبیریں متفق ہیں۔

☆

سیاسی اور عسکری اعتبار سے جب مشکل وقت ہوتا ہے تو اسلام زیادہ تیزی سے پھیلتا ہے، اس کی محرکات اور وجوہات کیا ہیں؟

اس کے محرکات اور وجوہات بظاہر یہ معلوم ہوتے ہیں کہ جب ملت مسلمہ کو سیاسی طور پر مشکل پیش آتی ہے اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مسلمان خود بخود اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مسلمانوں میں مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ایک مزاج ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اس لئے وہ سیرت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کو جب کامیابی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو ان کی زندگی کے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو پہلے ان کے علم میں نہیں ہوتے۔ دور سے جب آدمی معائنہ کرتا ہے تو اور بات ہوتی ہے اور جب قریب آتا ہے تو بہت سے دوسرے پہلو سامنے آتے ہیں۔ جب اسلام کے نئے اور مثبت پہلو سامنے آتے ہیں تو مخالفین بھی مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جب مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یوں بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ بیان کیا تھا (اور یہ بیان حضور ﷺ کے پیغام پر بھی صادق آتا ہے۔) کہ جب کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کو پہلی مرتبہ دیکھتا تھا یا دور سے دیکھتا تھا تو اس پر ایک رعب اور خوف کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ جب کسی کو حضور علیہ السلام کے ساتھ قریب رہنے اور مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو پھر حضور کی محبت میں اضافہ

ہوتا تھا۔ جو جتنا قریب ہوتا تھا اتنا ہی حضورؐ کی محبت میں غرق ہوتا تھا۔ یہی حال حضورؐ کے پیغام کا ہے کہ جو لوگ دور سے دیکھتے ہیں اور کئی منافی باتوں پر بھروسہ کرتے ہیں وہ کسی پرانی عصبیت کی وجہ سے قریب نہیں آتے۔ لیکن جب قریب آتے ہیں اور براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو بہت سے ایسے پہلو سامنے آجاتے ہیں جن سے وہ پہلے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

☆

آپ نے بہترین اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جو اصول بیان کئے، یعنی پہلے تعلیم، پھر تربیت، پھر تہذیب۔ ہم اتنے پست ہو گئے ہیں کہ اب کیا بہترین راستہ ہو سکتا ہے؟

ہم بالکل پست نہیں ہوئے۔ آپ اسلامی تعلیم سے شروع کریں، تہذیب اور معاشرت خود بخود آجائے گی۔ مسلمانوں میں کوئی بھی چیز مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے۔ اسلامی تہذیب بھی مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے، نہ ہی اسلامی تعلیم مکمل طور پر معدوم ہے اور نہ ہی اسلامی ثقافت سرے سے ناپید ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن کہیں دھندلا گئی ہیں، کہیں کمزور پڑ گئی ہیں۔ جب آپ تربیت اور تعلیم کا کام شروع کریں گے تو جو چیزیں دھندلا گئی ہیں ان پر پڑا ہوا غبار ہٹ جائے گا اور وہ صاف ہو کر سامنے آجائیں گی۔

☆

علمی حلقے مطالعہ سیرت کے ذرائع سے واقف ہوتے ہیں۔ عوامی حلقوں کے لئے آپ سیرت کی کونسی کتاب تجویز کرتے ہیں؟

آپ اردو اکیڈمی کی مطبوعات کی فہرست دیکھیں۔ اس میں سیرت پر بچوں، بڑوں اور خواتین کے لئے سیرت پر کتابیں موجود ہیں جن کتابوں سے آپ کو خوشی ہو وہ لے سکتے ہیں۔

☆

> سیرت طیبہ پر کتابیں مختلف ادوار میں لکھی گئیں۔ تاریخ اسلام میں بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سیرت کی کتابیں لکھوائیں تاکہ عوام پر حکمرانی میں آسانی ہو۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی تاریخ بادشاہوں سے بھری پڑی ہے جس میں یہ سب کچھ ہوا آج کے دور میں بھی سرکاری مولوی موجود ہیں جو بادشاہوں کی مرضی کے مطابق سیرت النبی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ایک شخص سیرت النبی کو کس طرح سمجھ سکتا ہے؟

کم از کم میں نے سیرت کی جن کتب کا مطالعہ کیا ہے ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں مصنف نے بادشاہوں کے مفادات کے مطابق کچھ لکھا ہو۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ سیرت پر پہلا کام انہوں نے کیا اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کسی بادشاہ کے مفاد کی خاطر سیرت کی تفصیلات مرتب نہیں کیں۔ سیرت پر قدیم ترین کتاب ابن ہشام کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن ہشام بنی عباس کے دور میں یہ کتاب لکھ رہے تھے۔ بنی عباس کی کمزوریاں انہوں نے بیان کر دی ہیں۔ ان کو چھپایا نہیں۔ طبری نے بھی بنو عباس کے دور میں کتاب لکھی اور یہ بھی لکھا کہ بنو عباس کے جد امجد غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے۔ گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کو باندھا گیا تھا اور باندھنے والوں نے اتنا کس کر باندھا کہ وہ کراہ رہے تھے اور حضورؐ کو ان کے کراہنے سے تکلیف ہو رہی تھی اور آپ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ یہ باتیں بنو عباس کے دور میں لکھی گئیں۔

میرے خیال میں یہ محض مغربی پروپیگنڈا ہے جو وہ حدیث، سنت اور فقہ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ بادشاہوں نے مرتب کروائی۔ آج تک کوئی بھی یہ وضاحت نہ کر سکا کہ فقہ کا کون سا حکم کون سے بادشاہ کے مفاد کی خاطر لکھا گیا۔ جن فقہا نے فقہ کو مرتب کیا ان کا تو کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے تو سرکاری عہدے ٹھکرائے۔ امام ابو حنیفہ نے کوئی

سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام جعفر صادق بڑے بڑے فقہا تھے اور آج ان سب کی فقہوں کی پیروی ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی سرکاری عہدہ نہیں رکھتا تھا۔ ان میں سے کس فقیہ نے سرکاری عہدے کے لئے فقہ کے مسائل گھڑے؟

سیرت کے باب میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ مفروضہ اور تکلفات سے بالکل آزاد ماحول میں لکھی گئی۔ یہ جو خیال ہے کہ سیرت اکثر کتابیں حکمرانوں نے اپنے مفاد کی خاطر لکھوائیں، بالکل غلط ہے۔ دراصل یہ مغربی مصنفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ سیرت کے روشن پہلوؤں سے اتنے مرعوب ہیں کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ موجود ہے۔ پہلے پہل انہوں نے قرآن کا انکار کیا۔ جب پچاسوں سال کی کوششوں کے باوجود قرآن کو غلط ثابت نہ کر سکے تو حدیث کی کمزوریاں تلاش کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ حدیث کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں اور لکھا کہ یہ تو حضورؐ کے انتقال کے تین چار سو سال بعد کے لوگوں نے کہانیاں سی گھڑ لی ہیں۔ جب دلائل سے یہ بات غلط ثابت ہو گئی تو فقہ کے پیچھے پڑ گئے کہ فقہ یا تو رومن لاء سے ماخوذ ہے، یا محض جعلی ہے۔ لیکن جب یہ بات بھی غلط ثابت ہو گئی تو دوسری چیزوں کے پیچھے پڑ گئے۔ سیرت کے بارے میں بھی ہزار برس سے کہہ رہے ہیں اور ہر دو سو سال بعد ان کے بیان میں تبدیلی آ جاتی ہے۔

مثال کے طور پر این میری شمل نے کتاب لکھی ہے Muhammad: The Messanger of Allah، یہ کتاب کوئی بیس پچیس سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ ہاشم سید کی کتاب سے اس کا تقابلی مطالعہ کریں جو آج سے 120 سال پہلے لکھی گئی تھی تو آپ کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آنزا میری شمل بھی مسلمان نہیں تھیں، عیسائی تھیں۔ لیکن اسلامی مصادر و ماخذ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کے نتیجہ میں بڑی بڑی تبدیلی اور بہتری آئی۔ شمل کی کتاب میں کوئی بات بھی بظاہر قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلوب کے بارہ میں آپ بات کریں کہ ایسا ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ان کی اس کتاب کے مندرجات میں ایسی کوئی غلط بات نہیں ہے۔

☆

غزوہ سے مراد raiding کے ہیں۔ غیر ملکی کے وفود یا قبائل
کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لئے مہمات کو غزوات
میں شامل کرنا کس زمرے کے مترادف تصور نہیں آتا؟

ممکن ہے لغوی اعتبار سے ایسا ہی ہو، لیکن تمام محدثین اور سیرت نگاروں نے غزوات کے باب میں مہمات کو بھی شامل کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری میں کتاب المغازی والجہاد میں ان مہمات کا بھی ذکر ہے جو انتہائی پرامن تھیں۔ اسی میں صلح حدیبیہ کا بھی ذکر ہے، تبلیغی مہمات کا ذکر بھی ہے، بئر معونہ کے جو 70 شہدا تھے اور تبلیغی مشن پر جارہے تھے ان کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے۔ عربی زبان میں تغلیب کا اصول ہے کہ اگر ایک سے زائد چیزوں کا ذکر کرنا ہو اور ان میں سے ایک چیز کسی ایک وقت میں نمایاں ہو تو دونوں کے لئے اس لفظ کو بیان کردیتے ہیں۔ مثلاً ظہرین عصر اور ظہر کی نماز کے لئے اور مغربین مغرب اور عشا کی نماز کے لئے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عمرین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو کہتے ہیں۔ تو تغلیباً اگر تمام مہمات کے لئے غزوات کا لفظ استعمال ہو تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ پھر ویسے بھی اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا۔ لا مشاحة في الاصطلاح۔ ہر شخص کو اپنی اصطلاح وضع کرنے کا اختیار ہے۔ اگر محدثین اور سیرت نگاروں نے یہ اصطلاح وضع کی اور اس کے مطابق کتابیں مرتب کیں تو میرے خیال میں ہمیں اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

۔☆۔

دوسرا خطبہ

سیرت اور علوم سیرت

ایک تعارف، ایک جائزہ

دوسرا خطبہ

سیرت اور علوم سیرت

ایک تعارف، ایک جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قابل احترام جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب،
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،
ڈائریکٹر جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی
قابل احترام امیر البحر جناب افتخار احمد سروہی،
برادران محترم!
خواہران مکرم!

کل کی گفتگو کا موضوع تھا: مطالعہ سیرت کی ضرورت و اہمیت۔ اس ضمن میں ضمنی طور پر لفظ سیرت کے لغوی معنی، اور فنی تعریف بھی سامنے آئی۔ سیرت کے بعض اہم موضوعات کی طرف بھی مختصر سا اشارہ کیا گیا۔ آج اسی چیز کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا مقصود ہے۔ سیرت کے موضوعات، ان کی جامعیت اور وسعت، اہم علوم سیرت اور نمایاں موضوعات سیرت آج کی گفتگو کے موضوعات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مصادر علم سیرت کی طرف بھی اختصار کے ساتھ اشارہ کیا جائے گا۔

علوم سیرت اور موضوعات سیرت پر گفتگو کرنے سے پہلے اگر ہم مختصراً اپنے ذہن میں وہ بات تازہ کرلیں جس کی طرف کل اشارہ کیا گیا تھا کہ تمام بانیان مذاہب اور مؤسسین ادیان میں رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری کی پوری سرچ لائٹ میں دنیائے انسانیت کے سامنے ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ کی تاریخیت اور حقیقی شخصیت کے بارے میں ذرہ برابر شک کا اظہار نہیں کرسکتا۔ حضور علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آنے والے بہت سے بانیان مذاہب کے وجود کے بارے میں خود ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں کے حلقوں میں بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کے نام سے آج جو مجموعے ہمارے سامنے موجود ہیں وہ ان مقدس شخصیات کی حیات طیبہ، سوانح اور خدمات کے بارے میں یا تو تقریباً خاموش ہیں یا بہت ہی سرسری اور متضاد معلومات پر مشتمل ہیں۔ وہ معلومات جو ان کتابوں سے ان عظیم الشان انبیاء اور معلمین انسانیت کے بارے میں ملتی ہیں وہ انتہائی اجمالی اور ظنی ہیں۔ اس کے مقابلے میں حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ پر آپ کی اپنی حیات مبارکہ کے دور سے لے کر آج تک مسلسل نہ صرف غور وخوض کیا جارہا ہے، بلکہ لکھا جارہا ہے۔ نہ صرف اپنے بلکہ اپنے اور پرائے دوست دشمن داد تحقیق دے رہے ہیں۔ معلومات اور مصادر کی فراوانی اور توسع کی کیفیت یہ ہے کہ سیرت کے نام پر پورے پورے کتب خانے قائم ہیں۔ سیرت کے نام پر ادارے اور مسندیں قائم ہیں۔ سیرت کے مختلف موضوعات پر تحقیق اور مطالعہ کا فریضہ انجام دیا جارہا ہے۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ جس کو آج ہم علم سیرت کہتے ہیں، اس کو آغاز میں مغازی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مغازی کے بارے میں تفصیلات جمع کرنے کا مقصد تاریخی بھی تھا اور قانونی بھی۔ دونوں ضروریات کے تحت مغازی کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔ جیسے جیسے یہ معلومات وسعت پذیر ہوتی گئیں ان کو کتابوں اور تحریری مجموعوں کی صورت میں مرتب کیا جاتا رہا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے باقی گوشوں کے بارے میں بھی صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد میں آنے والے علمائے کرام اور محققین امت معلومات فراہم کرتے رہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات مقدسہ کے علاوہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات، آپ کی سنت، آپ کے تحریر فرمائے ہوئے مکاتیب، وثائق اور دستاویزات۔ پھر آپ کے آباؤ اجداد اور خاندان، خاندان سے آگے بڑھ کر آپ کے قبیلے اور دوسرے رشتہ دار اور متعلقہ قبائل کے انساب، رشتہ داریاں، پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شمائل یعنی عادات مبارکہ، فضائل، پھر آپ سے بڑھ کر صحابہ کرام اور صحابہ کرام کے طبقات کے بارے میں معلومات اور تفصیلات کی ایک کہکشاں تھی جو صحابہ اور تابعین نے فراہم کر دی۔

اس وجہ سے طبقات کا ایک نیا فن وجود میں آیا جس کا آغاز صحابہ کرام کے حالات جمع کرنے سے ہوا۔ صحابہ کرام کے حالات جمع کیے گئے۔ صحابہ کرام کے مختلف طبقات تجویز کیے گئے۔ طبقے کے لفظ کو یہاں اردو زبان کے لفظ طبقے کے معنوں میں نہ سمجھئے گا۔ طبقہ عربی زبان میں جنریشن کو کہتے ہیں، یعنی زمانے کے اعتبار سے مختلف طبقے۔ طبقات صحابہ کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل اور اخلاق کے بارے میں علم حدیث سے معلومات حاصل کی گئیں۔

ان امور کے ساتھ ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کی بحث سیرت کا ایک اہم باب قرار پائی۔ اور معجزات سے دلائل نبوت، پھر دلائل نبوت سے وہ مسائل جن کا تعلق کلامیات سے ہے، علوم سیرت کا حصہ بنے۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ موضوع پھیلتا چلا گیا۔ اب سیرت کی جتنی بنیادی کتابیں اور امہات کتب ہیں ان میں ایک انتہائی وسیع سلسلہ موضوعات ہے جن سے سیرت نگار بحث کرتا ہے۔

نمونے کے طور پر میں نے صرف ایک متوسط حجم کی کتاب کے عنوانات نوٹ کیے ہیں۔ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ عام متوسط کتابوں کے عنوانات کی وسعت اور پھیلاؤ کس حد تک ہے۔ ساتویں آٹھویں صدی ہجری کے ایک عربی سیرت نگار کی کتاب کے عنوانات یہ ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا خاندان،

آپ کا قبیلہ،

آپ کے فضائل،

معجزات،

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ میں مسلمانوں پر جن آداب اور حقوق کا فریضہ

عائد ہوتا ہے،

آپ کی اولاد مبارک،

آپ کی جدات (یعنی دادیاں)،

آپ کے ننھیالی رشتہ دار،

آپ کی نانیاں،

آپ کے خادم،

آپ کی خادمائیں،

جن معزز اور محترم خواتین نے آپ کی پرورش کی اور دودھ پلایا،

آپ کی عادات،

آپ کے خصائل،

آپ کے اخلاق،

ازواج مطہرات،

آپ کے لباس،

آپ کا اسلحہ،

آپ کے جانور۔

ان موضوعات کی حیثیت ظاہر ہے کہ ضمنی مباحث کی ہے۔ اصل مباحث میں سے اہم ترین یہ ہیں:

وقائع سیرت،

مغازی اور مہمات،

سفیر روانہ،

تبلیغ دین،

قبائل سے روابط،

معاہدات،

معیشت و تجارت،

قانون و شریعت،

اقتضاءات و واردات،

وثائق و دستاویزات،

آپؐ کے سفراء اور عمال،

آپؐ کے صحابہ،

آپؐ کے عسکری انتظامات،

شہر مدینہ کا بندوبست،

ازواج مطہرات کے گھروں کا نظم و نسق،

وغیرہ وغیرہ۔

سیرت نگاروں کا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے اور قدیم سے قدیم سیرت نگاروں نے بھی اس بات کا اہتمام کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی سیرت مرتب کی جائے تو آغاز آپ کے خاندان اور آباؤ اجداد سے کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عروہ بن زبیرؓ سے لے کر آج کے سیرت نگاروں تک تقریباً تمام مصنفین اور مؤلفین نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرت مبارکہ کا بیان آپؐ کے جد امجد معد بن عدنان سے شروع کیا ہے اور معد بن عدنان کے خاندان کا پس منظر اور ان کے اجداد کے بارے میں بیان کرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر سے بات شروع کی ہے۔

یہ بات کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا تعلق نسل ابراہیمی سے ہے، یہ کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور یہ کہ آپ کا سلسلہ نسب معد بن عدنان تک قطعی اور یقینی ہے، یہ بات قریب قریب تمام سیرت نگار بلا استثنا بیان کرتے آئے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعض مغربی مستشرقین، جن میں سب سے نمایاں نام سر ولیم میور کا ہے، اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ شاید یہ بات ان کو گوارا نہیں ہوئی کہ جس طرح بنی اسحاق میں انبیاء کا سلسلہ چلتا آرہا تھا، اسی طرح کا ایک سلسلہ، بلکہ خاتم السلاسل بنی اسمٰعیل میں سامنے آئے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے بنی اسمٰعیل کو بھی وہ

شرف اور اعزاز حاصل ہے جو بنی اسحاق کو حاصل ہوا تھا۔ عیسائی ہو یا کوئی اور، بیشتر کی مغربی مصنفین نے اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ مغربی مصنفین کے اس انکار کی وجہ سے یہ بات اور بھی اہم ہوگئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان اور آپ کے سلسلۂ نسب پر از سر نو تحقیق کی جائے اور یہ بات پورے تاریخی دلائل سے ایک بار پھر واضح کی جائے کہ رسول اللہ ﷺ کا نسل ابراہیمی میں ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ جو بات محققین روز اول سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں، اور جو عرب میں روز روشن کی طرح واضح تھی، جس میں مسلمانوں کو کبھی بھی کوئی تامل یا تردد نہیں ہوا اس کو مزید تاکید اور تحقیق کے ساتھ بیان کرنے کی آج پھر ضرورت ہے اور تمام ممکنہ اور دستیاب دلائل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

اجداد نبی یعنی رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد میں سے متعدد نامور شخصیات گزری ہیں جن کے اثرات عربوں کی تاریخ پر بہت گہرے ہیں۔ قیدار بن اسماعیل کی اولاد میں ۳۷ پشت کے بعد عدنان ایک بہت ہی نمایاں اور صاحب عزم شخصیت تھے۔ ان کے نمایاں ترین ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان تک ہمارے اسماعیلی عربوں کا نسب نامہ پورے اہتمام سے محفوظ کیا گیا۔ عدنان کے بعد مکہ اور بیت اللہ کی تولیت پر بنی جرہم قابض ہو گئے جو حضرت اسماعیل کے سسرالی تھے اور یوں یہ عدنان کے ماموؤں کا خاندان تھا۔

بنو جرہم نے ۲۰۷ء کے لگ بھگ بنی عدنان کو مکہ سے نکال دیا اس لئے کہ انہوں نے بت پرستی میں بنو جرہم کا ساتھ نہ دیا تھا۔ یہ سلسلہ دو سو سال سے زائد جاری رہا۔ ۴۴۰ء کے لگ بھگ قصی نے پھر مکہ پر قبضہ حاصل کر لیا اور بنی جرہم کو نکالا۔ یہ واقعات عربوں کے بچے بچے کی زبان پر تھے اور ہر قبیلے میں فخر و مباہات سے بیان کیے جاتے تھے۔

سر ولیم میور نے ان سب حقائق کو نظر انداز کر کے نہ صرف بنی اسماعیل کی تحقیق کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض مزید متعصب اور بے انصاف لوگوں نے کچھ ایسی چیزوں کا بھی انکار کیا جس سے ہر مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی ساٹھ ستر سال پہلے تک واقف تھے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان عرب کے انتہائی معتبر، محترم اور قابل ذکر خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی نسل میں سے بنی اسماعیل کو چنا۔ بنی اسماعیل میں سے قریش کو چنا۔ قریش میں

خاندان بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھے منتخب کیا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام یہ بات ایک ایسے
معاشرے میں ایک ایسے طبقے کے سامنے ارشاد فرما رہے تھے جہاں انساب کی تفصیلات معلوم
کرنا اور یاد رکھنا لوگوں کا خاندانی مشاغل اور پیشے میں شامل تھا۔ جہاں اس موضوع پر کوئی کمزور یا
متنازعہ بات کرنا ممکن نہیں تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جناب عبدالمطلب مکہ مکرمہ کی شہری ریاست کے سربراہ تھے۔ ان
سے پہلے ان کے والد جناب ہاشم اور جد امجد جناب قصی کو یہ سرداری حاصل رہی۔ یہ تو پچھلے تھے
کہ عرب نے جن پر ان کا تذکرہ تھا۔ اگر مکہ مکرمہ کی شہری ریاست کے سربراہ کا خاندان اعلیٰ
خاندان نہیں ہوگا تو پھر کس کا خاندان اعلیٰ ہوگا۔ قبائلی معاشروں میں آج بھی قبیلے کی سربراہی
کسی کمزور یا کمتر خاندان کے فرد کو نہیں دی جاتی۔ اس زمانے میں تو خاندانی وجاہت ہی قیادت کی
سربراہی کے لئے سب سے پہلی اور سب سے بنیادی شرط سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ان سب چیزوں
کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈی ایس مارگولیتھ نے ان تمام حقائق کا بلا دلیل انکار کر دیا۔ میرے
لئے اس کے الفاظ دہرانا بہت تکلیف دہ ہے۔ تاہم میں بہت مشکل سے وہ انگریزی الفاظ
دہرا رہا ہوں جس سے اس کا نقطہ نظر سامنے آ جائے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ کا تعلق low
birth سے تھا۔ یعنی آپ کا خاندان نسلی اعتبار سے کمتر درجے کا خاندان تھا۔ اب یہ بات ایک
مسلمان کے لئے جو سیرت کے پورے ذخیرے سے واقف ہو اور سارا لٹریچر جس کی نظر
سے گزرا ہو بڑے تعجب کی بات ہے اور حقائق کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے خاندان کے بارے میں عربوں کی علم الانساب میں
دلچسپی کی وجہ سے بہت سی روایات محفوظ ہیں جن کو علمائے انساب اور سیرت نگاروں نے تفصیل
سے بیان کیا ہے۔ عرب میں چونکہ نسب کی تفصیلات محفوظ رکھنے کا رواج تھا اس لئے ترتیب
کے ساتھ قبائل کے نسب نامے محفوظ تھے۔ وہاں افراد اور خاندانوں کے ہی نہیں بلکہ اونٹوں
اور گھوڑوں تک کے نسب نامے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ وہاں یہ بات بڑی غیر مانوس اور
ناقابل تصور تھی کہ کسی شخص کا نسب معلوم اور متعین نہ ہو۔ اس لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے
پیچھے کئی پشتوں تک ایک ایک نام پوری طرح معلوم اور ان میں ہر ایک کا سلسلہ نسب پوری طرح
محفوظ تھا۔ ان افراد اور شخصیات کے بارے میں سیرت نگاروں اور ماہرین انساب نے بہت سی

ضروری معلومات جمع کی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے معد بن عدنان تک اپنے نسب نامہ کی تصدیق فرمائی۔ کئی بار رسول اللہ ﷺ نے اپنے نسب نامہ کی تصدیق فرمائی۔ آپؐ نے جب اپنے نسب کے بارے میں ارشاد فرمایا تو اپنے اور اپنے والد جناب عبداللہ اور دادا جناب عبدالمطلب سے لے کر معد بن عدنان تک بیان فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "کذب النسابون" یعنی اس کے بعد کی جو پشتیں ہیں ان کے بارے میں ماہرین انساب کی معلومات درست نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آگے کے نسب ناموں میں بہت سے نام ماہرین انساب نے چھوڑ دیئے۔ بہت سے ناموں کے بارے میں اشتباہ اور اختلاف ہے۔ تاہم یہ حقیقت عرب میں کبھی بھی باعث اختلاف نہیں رہی کہ سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے خاندان کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا اور معد بن عدنان بنی اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اجداد میں سے ایک مشہور شخصیت کعب بن لوئی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے ہم عصر تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں سے ان کی ملاقات کی طرف بھی کچھ اشارے ملتے ہیں۔ چونکہ یہ سب حضرات تجارت پیشہ تھے اور اس سلسلہ میں مختلف علاقوں میں جاتے رہتے تھے اس لئے یہ بات نہ صرف بعید از امکان نہیں، بلکہ ہر طرح قرین قیاس ہے کہ جناب کعب بن لوئی بعض ایسے علاقوں میں تشریف لے گئے ہوں جہاں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین موجود تھے اور ان سے ان کی ملاقات ہوئی ہو۔

قریش کے قبائل اور خاندانوں کے بارے میں سیرت نگاروں اور ماہرین انساب نے جو تفصیلات محفوظ رکھی ہیں وہ محض حضور کے دادا کے زمانے کی نہیں ہیں، بلکہ کئی کئی پشتوں سے وہ تفصیلات موجود ہیں۔ قبائل قریش کے آپس کے روابط کے بارے میں بھی ضروری تفصیلات محفوظ ہیں۔ ان قبائل اور برادریوں میں آپس میں اگر کوئی اختلاف ہوا تو اس کی تفصیلات اور اسباب بھی موجود ہیں اور اگر کہیں اتفاق رائے ہوا تو اس کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔

قبائل قریش میں وہ کون لوگ تھے جو بطحین کہلاتے تھے۔ کون لوگ تھے جو احلاف کہلاتے تھے۔ قبائل قریش میں کون لوگ تھے جو قریش الظواہر کہلاتے تھے اور کون سے قبائل

تھے جو قریش البطاح کہلاتے تھے۔ یہ سارے قبائل وہ تھے جن میں آپس کے معاہدے اور دوستیاں بھی تھیں اور آپس میں تعلقات بھی تھے۔ ان معاہدوں اور دوستیوں کا تعلق نہ صرف باہمی تعاون اور قبائلی تقسیم کار سے تھا، بلکہ ان میں بہت سے معاہدوں کا تعلق عام آدمی کی فلاح و بہبود، مظلوموں کی حمایت، بے گھر اور بے سہارا لوگوں کی امداد سے بھی تھا۔ عرب میں اس نوعیت کے معاہدے بھی عام تھے جن کا مقصد کمزوروں کی مدد اور مظلوموں کی حمایت تھا۔ اس طرح کے بعض معاہدات کا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "ما کان من حلف فی الجاھلیۃ فان الاسلام لم یزدہ الا شدۃ" جاہلیت کے زمانے میں جتنے بھی حلف اور معاہدے رہے ہیں اسلام میں ان کو نظر انداز یا ختم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو مزید بہتر اور پختہ بنایا جائے گا۔ یعنی اسلام کے آنے کے بعد دوستی اور تعاون کے ان معاہدوں کی شدت اور intensity میں اضافہ تو ہو سکتا ہے کمی نہیں ہو سکتی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جد امجد جناب ہاشم بن عبد مناف کے بارے میں تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں قریش کے سردار تھے، بلکہ آج کل کی اصطلاح کے مطابق شہری ریاست مکہ کے چانسلر تھے۔ وہ ایک طرف مکہ کی شہری ریاست کے سربراہ تھے تو دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم میں بیت اللہ کی نگہداشت کا جو منصب چلا آرہا تھا، اس پر بھی فائز تھے۔ یوں ان کی ذاتی اور خصوصی ذمہ داری حجاج کی دیکھ بھال بھی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکومت مکہ میں وزیراعظم بلکہ صدر ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے وزیر حج بھی تھے۔ شہری ریاست مکہ میں وزیر حج کا منصب خاندانی طور پر جناب ہاشم بن عبد مناف کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے زمانے سے حضرت عباس بن عبدالمطلب کے زمانے تک یہ کیفیت رہی کہ یہ حضرات اپنی جیب سے اور اپنے ذاتی وسائل سے حجاج کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جناب ہاشم کا لقب ہاشم اسی لئے پڑا تھا کہ وہ حجاج کرام کی مہمانداری اپنی جیب سے کیا کرتے تھے۔ لفظ ہاشم کا مطلب ہے روٹی توڑ کر ثرید بنانے والا۔ وہ تمام حجاج کرام کو اپنی جیب سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ان کے حکم سے روٹیاں توڑ کر ثرید بنایا جاتا تھا اور تمام حجاج کو کھلایا جاتا تھا۔ ثرید عرب میں اعلیٰ قسم کا لذیذ اور عمدہ کھانا سمجھا جاتا تھا۔ گویا جتنے حجاج کرام آتے تھے وہ مکہ میں قیام کے دوران جناب ہاشم بن

عبد مناف کے ذاتی مہمان ہوتے تھے۔ اس روایت کو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے بھی نبھایا۔ وہ بھی بڑے پیمانے پر حجاج کرام کی دعوت و خدمت کیا کرتے تھے۔

جناب ہاشم کے بعد ان کے صاحبزادے جناب عبدالمطلب اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک مکہ کی شہری ریاست کے سربراہ رہے۔ ابرہہ نے جب مکہ پر حملہ کا ارادہ کیا اس وقت جناب عبدالمطلب ہی مکہ کے سردار تھے۔ ہاشم کو چند سال ہی مکہ کی سربراہی کا موقع ملا اور نسبتاً کم سنی میں فوت ہو گئے۔ ہاشم کے برعکس جناب عبدالمطلب کی عمر نہایت طویل ہوئی۔ وہ بہ اختلاف روایات 90 سے لے کر 108 سال کی عمر تک حیات رہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاید ستر سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک مکہ کی شہری ریاست کے سربراہ رہے ہوں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کی ان تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا خاندان عرب کے نامور ترین اور محترم ترین خاندانوں میں سے ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علم انساب نے اس خاندان کے بارے میں بہت سی تفصیلات محفوظ رکھی ہیں۔ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کے براہ راست آباؤ اجداد بلکہ آباؤ اجداد کے قریبی رشتہ دار و اقارب، پھر جہاں جہاں ان آباؤ اجداد کی شادیاں ہوئیں، ان کے سسرالی رشتہ داروں اور ان کی نانیوں اور دادیوں سب کے بارے میں محققین نے الگ الگ تفصیلات جمع کی ہیں۔ لوگوں نے ان کے بارے میں کتابیں بھی لکھیں۔

سیرت نگاروں نے جب سیرت نگاری کا سلسلہ شروع کیا تو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کی لفظی تصویر کشی پر بھی توجہ کی۔ اس زمانے میں عرب میں مصور نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی تصویر سازی اسلام کے مزاج کے خلاف تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بیت اللہ میں عبادت کی خاطر جن مقدس شخصیات کی تصویریں لگائی گئی تھیں آپؐ نے ان کو مٹا دیا۔ اس لیے حضور کی تصویر تو کوئی نہیں بنا سکتا تھا اور اگر کوئی مصور ہوتا بھی تو شاید حضور ﷺ کے جمال جہاں آرا کی شبیہ نہ بنا سکتا۔

لیکن کم و بیش ایک درجن سے زائد صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کو بعد والوں کے لیے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک تو سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں

جو پیدائش سے لے کر تیس پینتیس سال کی عمر تک حضورؐ کی خدمت میں شب و روز رہے۔ دوسرے آپؐ کے سوتیلے بیٹے ہند بن ابی ہالہ ہیں جن کے بارے حضرت حسنؓ نے ارشاد فرمایا کہ کان وصافا لحلیۃ رسول اللہ ﷺ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ وہ حضرات جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حلیہ مبارکہ کو بیان کیا ان کی تعداد پندرہ کے قریب ہے۔ ان کی روایات مختلف کتب سیرت میں موجود ہیں۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ صحابہ کرام تو بہت بڑی تعداد میں تھے۔ ان ہزاروں میں سے صرف پندرہ صحابہ نے کیوں حلیہ مبارکہ بیان فرمایا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ اکابر صحابہ کرام کے مخاطبین میں سے بیشتر تو وہ تھے جن کی آنکھیں خود دیدار جمال سے مشرف ہو چکی تھیں۔ ان کے سامنے حضور اکرمؐ کا حلیہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حلیہ مبارکہ بیان کرنے کے مواقع زیادہ تر ان صحابہ کرام کو ملے جن کو تابعین کے زمانے تک زندہ رہنے کا موقع ملا۔ وہ تابعین کے مجمع میں حلیہ مبارکہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور چھوٹی سی وجہ جو ایک اور صحابی کی زبان سے سامنے آتی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ تابعین میں سے کسی نے ایک صحابی، غالباً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے پوچھا کہ کیا آپ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارکہ بیان کر سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تابعی نے حیرت سے پوچھا کہ آپ کبھی حضورؐ کی محفل میں نہیں بیٹھے تھے کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں، لیکن جب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا تو مخالفت کی وجہ سے کبھی رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک کو پوری توجہ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ اور جب اسلام قبول کر لیا تو آپ کا رعب اور جلال اتنا غیر معمولی تھا کہ کبھی نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ حلیہ مبارکہ کو بیان کرنے والے صحابہ کی تعداد کا کم ہونا اس وجہ سے بھی ہو۔

جن صحابہ کرام سے حضور ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بارہ میں کتب حدیث میں روایات موجود ہیں ان میں درج ذیل حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب

۲۔ حضرت انس بن مالک

۳۔ حضرت ابوہریرہ

۴۔ حضرت براء بن عازب

۵۔ حضرت عائشہ صدیقہ

۶۔ حضرت ابو جحیفہ

۷۔ حضرت جابر بن سمرہ

۸۔ حضرت عبداللہ بن عباس

۹۔ حضرت معرض بن معیقیب

۱۰۔ حضرت ابو الطفیل

۱۱۔ حضرت حذام بن خالد

۱۲۔ حضرت خریم بن فاتک

۱۳۔ حضرت حکیم بن حزام

۱۴۔ حضرت ام معبد

۱۵۔ حضرت ہند بن ابی ہالہ

وغیرہ وغیرہ

اگر آپ اجازت دیں تو میں ہند بن ابی ہالہ کی طویل روایت سے چند جملے نقل کروں۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس کے مختلف ٹکڑوں کو امام ترمذی نے شمائل ترمذی میں مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ شمائل ترمذی حضورؐ کے شمائل پر پہلی کتاب ہے جو ایک بڑے محدث نے مرتب کی ہے۔ اس میں حضور علیہ السلام کے حلیہ مبارک کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ علم سیرت کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ اس لئے اس کے چند ٹکڑے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ عربی الفاظ کے بجائے ان کا اردو ترجمہ پڑھتا ہوں۔

حضرت حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے جو رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بہت زیادہ بیان کرنے والے تھے، یہ عرض کیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مجھ سے بیان فرمائیں۔ ہند بن ابی ہالہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی ذات والا صفات کے اعتبار سے بھی شاندار تھے اور دوسروں کی نظروں میں بھی بڑے رتبے والے تھے۔ آپ کا چہرہ مبارک ماہ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ کا قد کسی متوسط قد والے سے کسی

قد طویل اور بہت لمبے انسان سے نسبتاً کم تھا۔ سر اعتدال کے ساتھ بڑا تھا۔ سر کے بال کسی قدر
بل کھائے ہوئے تھے۔ اگر اتفاقاً مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ تکلف سے مانگ نکالنے کا
اہتمام نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا رنگ نہایت چمکدار، پیشانی کشادہ، ابرو خمدار، باریک
اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جدا جدا تھے۔ دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو کسی ناگواری کے
وقت ابھر جاتی تھی۔ ناک بلندی کی طرف مائل تھی۔ اس پر ایک چمک اور نور محسوس ہوتا تھا۔
پہلی بار دیکھنے والا آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا کہ یہ حسن اور چمک
کی وجہ سے زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے ورنہ فی نفسہ اتنی بلند نہیں تھی جتنی معلوم ہوتی تھی۔
آپ کی داڑھی بھرپور اور گنجان تھی۔ آنکھوں کی پتلی نہایت سیاہ تھی۔ رخسار ہموار اور ہلکے تھے۔ آپ
کا دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا، یعنی تنگ نہ تھا۔ دندان مبارک باریک اور آبدار
تھے۔ سامنے کے دانتوں میں ہلکا ہلکا سا فاصلہ بھی تھا۔ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک باریک
لکیر تھی۔ گردن ایسی خوبصورت اور قدرے لمبی تھی جیسے مورتی کی گردن صاف اور تراشی ہوئی
ہوتی ہے۔ رنگ میں چاندی کی طرح صاف اور خوبصورت تھی۔ آپ کے اعضا نہایت معتدل
اور پرگوشت تھے۔ بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ پیٹ اور سینہ ہموار تھا۔ سینہ فراخ اور کشادہ تھا۔
دونوں مونڈھوں کے درمیان فاصلہ قدرے زیادہ تھا۔ جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور مضبوط تھیں۔
بدن کے وہ حصے جو عموماً کپڑوں سے باہر رہتے تھے وہ بھی نہایت روشن اور چمکدار تھے۔ بدن
پر چھاتیوں کے بالائی حصے کے علاوہ بال نہیں تھے۔ البتہ دونوں بازوؤں، کندھوں اور سینے کے
بالائی حصے پر بال تھے۔ کلائیاں دراز تھیں۔ ہتھیلیاں فراخ اور پرگوشت تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی
انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں۔ آپ کے تلوے قدرے گہرے اور قدم ہموار تھے۔ جب
آپ چلتے تو قوت کے ساتھ قدم اٹھاتے اور ذرا آگے کو جھک کر چلتے۔ قدم مبارک زمین پر
آہستہ لیکن جم کر پڑتا۔ آپ تیز رفتار تھے اور کشادہ قدم رکھتے۔ جب آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا
کہ گویا بلندی سے پستی کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے
بدن سے توجہ فرماتے۔ نظریں عموماً نیچی رہتیں۔ آپ کی نگاہیں آسمان کی نسبت عموماً زمین کی
طرف زیادہ مائل رہتیں۔ آپ کی عادت شریفہ عموماً گوشہ چشم سے دیکھنے کی تھی۔ صحابہ کرام کو
چلتے وقت اپنے سے آگے رکھتے تھے اور خود پیچھے رہتے تھے۔ جس سے ملتے اس کو سلام کرنے

میں پہل کرتے۔ آپ نوجوان کے بچے اور طبیعت کے نرم خو تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا۔ جو آپ کے ساتھ جتنا زیادہ رہتا وہ آپ کی محبت میں اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا۔ آپ اکثر و بیشتر گہری سوچ میں رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غم آپ کو مسلسل کھائے جا رہا ہے۔۔۔۔

یہ ایک طویل روایت ہے جس کے چند فقرے میں نے نقل کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے حلیہ مبارک کے بارے میں کس طرح کی معلومات جمع کی ہیں۔ یہ شمائل کا ایک نمونہ ہے۔ شمائل کے بارے میں یوں تو تمام سیرت نگاروں نے تفصیل بیان کی ہے لیکن اس میں تقدم اور اولیت کا شرف امام ترمذی کو حاصل ہے جنہوں نے شمائل ترمذی کے نام سے کتاب لکھی اور آج اس کا اردو، انگریزی، فارسی اور غالباً ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں شمائل ترمذی کے ایک سے زائد ترجمے ہوئے ہیں۔ شمائل پر عربی زبان میں ایک سو سے زائد کتابیں موجود ہیں، لیکن شمائل رسول پر پہلی کتاب لکھنے کا اعزاز و اولیت شرف امام ترمذی کو حاصل ہے۔

شمائل کے بعد سیرت کا جو دوسرا میدان سامنے آیا وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات اور وہ تقریریں ہیں جو آپ نے مختلف مواقع پر ارشاد فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ آپ افصح العرب تھے۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا جو معیار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور خطبات میں ہے، آج تک عربی زبان کا کوئی بھی خطیب اور ادیب اس بلند معیار تک نہیں پہنچ سکا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو افصح العرب قرار دیا اور اس کے اسباب بھی بیان فرمائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کتب تاریخ و سیرت کے علاوہ کتب حدیث میں بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ سیرت نگاروں نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کو جمع کیا ہے۔ اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات کے ایک درجن سے زائد مجموعے موجود ہیں جن کو دیکھ کر خطبات نبوی کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہیں۔ ان خطبات میں دو اہم خطبات ہیں ان میں سب سے پہلے خطبہ صفا ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خاندان کو دعوت دی اور قریش کے اہم ترین افراد کو جمع کر کے کوہ صفا سے ان کو خطاب فرمایا۔ دوسرے اہم خطبات

میں فتح مکہ کے موقع پر آپ کا ارشاد کردہ خطبہ ہے۔ خطبہ تبوک ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ادارہ تحقیقات اسلامی نے شائع کیا ہے۔ پھر خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ جو انسانی تاریخ میں انسانی حقوق کا سب سے پہلا اور سب سے جامع منشور یا منشور اعظم ہے۔ اس سے پہلے انسانی حقوق کے بارے میں اتنی تفصیل کے ساتھ کسی بھی منشور یا دستاویز میں وہ تفاصیل اور ہدایات کہیں ملتیں جو خطبہ حجۃ الوداع میں ملتی ہیں۔ پھر حضور نے اپنی وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے خطبات میں ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان تمام خطبات میں سب سے زیادہ اہمیت یقیناً خطبہ حجۃ الوداع کو حاصل ہے۔ اس پر دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں مواد اور تحریریں موجود ہیں۔ خود اردو زبان میں اس خطبہ پر ایک سے زائد کتب لکھی گئی ہیں۔ ان کتب میں اس خطبہ کے مکمل متن کے علاوہ اس کے مندرجات، اس میں دیئے گئے اصول اور قواعد کی تحقیق اور تنقید اور انسانی حقوق کے جدید بین الاقوامی چارٹر سے اس پر مختلف انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ کئی غیر مسلم مصنفین اور اہل علم نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو نہایت توجہ اور خاموشی سے سماعت فرماتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو [illegible] وضاحت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات ارشاد فرماتے۔ جو اہم نکات ہوتے ان کی تکرار بھی فرماتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ خطبہ ارشاد فرماتے وقت دست مبارک اور انگلیوں سے بھی اشارہ فرماتے تھے۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی نکتہ پر زور دینا چاہتے تھے تو بائیں دست مبارک کو سیدھا کرکے دائیں دست مبارک کے انگوٹھے سے اشارہ فرماتے تھے کہ یہ بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ اس وقت ڈائس اور روسٹرم کا رواج تو نہیں تھا جس طرح آج جب کوئی مقرر کسی نکتہ پر زور دینا چاہتا ہے تو روسٹرم پر مکا مار کر زور دیتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کسی نکتہ پر جب زور دینا چاہتے تھے تو بائیں دست مبارک کی ہتھیلی پر دائیں دست مبارک کے انگوٹھے سے زور ڈالتے تھے۔ بہت سے سیرت نگاروں اور محدثین نے حضورؐ کے خطبے اور تقریر کے انداز کو نقل کیا ہے تو یہ تفصیل بیان کی ہے۔ ایک ایسی بھی حدیث مسلسل ہے جس میں راویان حدیث نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے اشارہ کرنے کا یہ نقشہ بنایا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشبیک سے (یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر) ایک بات کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے ایک بار تین چار قسم کے گناہوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ جب انسان یہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکل جاتا ہے اور جب توبہ کرتا ہے تو دوبارہ اس کے دل میں ایمان اس طرح داخل ہوتا ہے۔ روایت کرنے والے صحابی نے فرمایا کہ فشبک بین اصابعہ یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پرو کر آپ نے اس طرح بتایا۔ اب یہ عمل بھی صحابہ کے زمانے سے آج تک ہوتی چلی آ رہی ہے اور اس حدیث کو بیان کرنے والا ہر شخص تشبیک کے اس عمل کو کر کے بتاتا ہے۔ یہ عمل بھی حدیث کا حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر کوئی نقش بنا کر بھی دکھایا۔ ایک موقع پر آپ نے چھڑی سے ریت پر نقش بنا کر ارشاد فرمایا کہ راہ راست ایسی ہوتی ہے اور صراط مستقیم اس طرح ہے اور گمراہی کے راستے دونوں طرف اس طرح نکلتے ہیں۔ اس بات کو آپ نے ایک نقشے کی مدد سے ارشاد فرمایا۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ مثالیں دے کر بھی بات بیان فرمایا کرتے تھے۔ امثال النبی پر لوگوں نے الگ سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔

حضور کا طریقہ تھا۔ اور قرآن پاک کا بھی یہی طریقہ ہے۔ کہ پہلے ایک بات کو اجمالاً بیان فرماتے تھے۔ اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل بیان فرماتے تھے۔ پھر آپ کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ استفہام کے طریقے سے بات ارشاد فرماتے تھے۔ پہلے ایک بات سوالیہ انداز میں سامعین کے سامنے رکھتے تھے اور جب سامعین متوجہ ہو جاتے تھے اور ان کے ذہن اس پر غور شروع کر دیتے تھے تو پھر حضور اس کا جواب خود عنایت فرما دیتے تھے۔ یوں وہ مسئلہ لوگوں کے ذہن کے قریب ہو جاتا تھا اور فوراً ان کی سمجھ میں بات آ جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ مخاطبین کے مختلف درجات کے لحاظ سے ان کو الگ الگ خطاب فرماتے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب کوئی نئی وحی آتی تھی یا آپ کوئی نئی بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے تو پہلے مردوں کے مجمع میں بیان فرماتے تھے۔ پھر اس کو عورتوں کے مجمع میں بیان فرماتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کوئی بات بچوں کے مجمع میں بھی ارشاد فرمائی۔ یہ سارے پہلو وہ ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خطبات اور ارشادات پر غور کرنے والوں

نے دریافت کئے ہیں۔ حضور کے خطبات پر غور کرنے سے یہ خصائص اور نمایاں پہلو خود بخود سامنے آتے ہیں۔

اردو زبان میں خطبات نبوی کا ایک ایسا ضخیم مجموعہ موجود ہے جس سے بڑا اور جس سے زیادہ جامع مجموعہ عربی کے علاوہ شاید کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہے۔ مولانا محمد جوناگڑھی، جن کا اردو ترجمہ قرآن پاک سعودی حکومت نے حال ہی میں شائع کیا ہے اور بڑے پیمانے پر تقسیم کیا ہے، انہوں نے خطبات محمدی کے عنوان سے آپ حضور علیہ السلام کے خطبات ایک بہت ہی مفصل اور ضخیم کتاب میں جمع کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے خطبات نبوی کو ایک نئی ترتیب سے بیان کیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس ترتیب پر شرح صدر نہیں ہے۔ تاہم یہ خطبات نبوی کا ایک بہت جامع مجموعہ بن گیا ہے جو اردو زبان میں دستیاب ہے۔

خطبات کے بعد ایک نیا فن سیرت میں سامنے آیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے املا کردہ وثائق اور دستاویزات ہیں۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مختلف دستاویزات تیار کرائیں۔ اپنے معاصر فرمانرواؤں کو خطوط تحریر فرمائے۔ ان دعوتی خطوط میں سے 104 کے لگ بھگ خطوط کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان تبلیغی اور دعوتی خطوط کے علاوہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے انتظامی معاملات کے بارے میں بھی بہت لوگوں اور کارندوں کو خطوط تحریر فرمائے۔ کچھ اور معاہدات کے لئے آپ نے دستاویزات تیار کرائیں۔ ان دستاویزات ومکاتیب کے کئی مجموعے عربی زبان میں موجود ہیں۔ ان میں جو جامع ترین مجموعے ہیں ان میں سے ایک ہمارے برصغیر کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے تیار کیا ہے جن کے نام پر ہماری لائبریری موسوم ہے، 'الوثائق السیاسیة فی العهد النبوی و الخلافة الراشدة'۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے کے کئی سو ایسے وثائق کو جمع کیا گیا ہے جن کی کوئی سفارتی، سیاسی اہمیت ہے۔ اس گرانقدر مجموعے میں مختلف انداز کے وثائق اور دستاویزات شامل ہیں۔ بہت سے قبائل کے ساتھ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے معاہدے فرمائے۔ بہت سے قبائل کے ساتھ پہلے سے موجود تعلقات اور معاہدات کی تجدید فرمائی۔ دعوت وتبلیغ کے لئے معاصر فرمانرواؤں اور بہت سے بااثر سرداروں کو خطوط بھی لکھے۔ عمال کے تقرر کے موقع پر آپ نے جو تقرر نامے جاری کئے وہ بھی سب موجود ہیں۔ بعض

بجز اس کے بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہے کہ بعض لوگوں نے نقلی دستاویزات بھی تیار کیں۔ ان جعلی دستاویزات کا محدثین نے پتہ چلایا۔ بعد کے زمانے میں اس طرح کی کئی جعلی دستاویزات سامنے آئیں۔ ایک دستاویز بعض یہودیوں نے غالباً خلیفہ ہارون الرشید کو پیش کی۔ اس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ دستاویز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے فلاں صحابی نے تیار کی تھی جس کے ذریعے یہودیوں کو بعض حقوق اور مراعات دی گئی تھیں۔ خلیفہ ہارون الرشید نے مشہور فقیہ اور محدث امام اوزاعی کو وہ دستاویز دکھا کر ان کی رائے مانگی۔ امام اوزاعی نے اس پر صرف ایک نظر ڈال کر کہا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ خلیفہ نے حیرت سے پوچھا کہ آپ ایک نظر میں کیسے اس کو جعلی قرار دے سکتے ہیں۔ امام اوزاعی نے بتایا کہ اس دستاویز پر جن لوگوں کے نام بطور گواہ درج ہیں ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد بن معاذؓ دونوں کا ذکر ہے۔ حضرت معاویہؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی حضرت سعد بن معاذؓ شہید ہو چکے تھے۔ چونکہ یہ دونوں ایک دستاویز کے گواہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ دستاویز جعلی ہے۔

اس طرح کی اور بھی کئی ایک مثالیں ہیں۔ مثلاً ایک اور دستاویز پانچویں صدی ہجری میں سامنے آئی۔ خلیفہ وقت نے مشہور مورخ اور محدث علامہ ابن الجوزی کو مامور کیا کہ اس کا جائزہ لیں۔ انہوں نے بھی مطالعہ کرنے کے فوراً بعد کہہ دیا کہ یہ جعلی ہے اور ثبوت میں ایسے ہی دلائل پیش کئے تھے۔

برصغیر کو ایک شرف اور فخر یہ بھی حاصل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دستاویزات اور مکاتیب پر پہلی کتاب ہمارے پاکستان کے ایک محقق اور سیرت نگار نے لکھی تھی۔ یہ بزرگ شیخ ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی تھے۔ دیبل بعض لوگوں کے خیال میں کراچی کا پرانا نام تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ٹھٹھہ کے قریب کسی بستی کا نام تھا۔ بہرحال یہ سندھ ہی کی کوئی بستی تھی اور علامہ ابو جعفر دیبلی سندھ کے کسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے مکاتیب نبوی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ مکاتیب نبوی پر قدیم ترین کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ بھی ہمارے ایک فاضل دوست ڈاکٹر عبدالشہید صاحب نعمانی نے شائع کیا ہے اور آج کل دستیاب ہے۔ ابو جعفر الدیبلی کے علاوہ جس سیرت نگار نے مکاتیب

نبوی پر خصوصی کام کیا اور بہت سے مکاتیب جمع کئے۔ دسویں صدی ہجری کے شامی مؤرخ اور محقق محمد بن علی ابن طولون ہیں۔ انہوں نے "اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔

یہ بات کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب اور دستاویزات انتہائی محترم، مقدس اور متبرک یادگار بھی ہوتی تھیں۔ تاریخ نے بھی اس کو محفوظ رکھا ہے اور یہ روایت کئی جگہوں پر بیان ہوئی ہیں کہ فلاں قبیلہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی فلاں دستاویز موجود تھی اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ ابن حزم جن کو حضور ﷺ نے یمن کے ایک علاقہ کا گورنر بنا کر بھیجا تھا اور ان کو ایک دستاویز بھی لکھ کر دی تھی۔ وہ دستاویز ان کے خاندان میں محفوظ چلی آتی تھی۔ ان کے خاندان کے لوگ نسلاً بعد نسلٍ نہ صرف اس کی حفاظت کرتے تھے بلکہ اس کو زبانی یاد رکھتے تھے اور لوگوں کو زیارت کے لئے بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ ابن حزم نے ان کے مکاتیب پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر رکھی تھی جو ان کو بہت عزیز تھی۔ یہ کتاب انہوں نے زبانی یاد کر لی تھی۔

مکتوبات نبوی اور وثائق نبوی کی روایت کرنے والے اور جمع کرنے والے کئی حضرات اور بھی ہیں۔ مشہور مؤرخ ابو الحسن علی بن محمد المدائنی نے بھی رسائل النبی کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اردو زبان میں بھی مکتوبات نبوی کے کئی مجموعے موجود ہیں۔ خود ابو جعفر دیبلی کی کتاب کا ترجمہ ہمارے دوست اور میرے ہم سبق ڈاکٹر عبد الشہید نعمانی نے کیا ہے جو کراچی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے پروفیسر ہیں۔ یہ ترجمہ چھپا ہوا موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرتب کردہ وثائق السیاسیہ کا اردو ترجمہ سیاسی وثیقہ جات کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ ایک اور کتاب ہندوستان کے ایک عالم مولانا سید محبوب رضوی نے "مکتوبات نبوی" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ بھی لاہور، کراچی اور دہلی سے کئی بار چھپی ہے۔ اس میں 94 مکتوبات اور وثائق شامل ہیں۔ ان میں سے بہت مکتوبات اور وثائق کا عکس متن بھی دیا گیا ہے۔ گو کہ بیشتر وثائق ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

جب وثائق اور دستاویزات کی بات آئی ہے تو ان کے لکھنے اور لکھوانے والوں کی بات بھی آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے کاتبین کی اور وثائق نویسوں اور دستاویزات تحریر کرنے والوں

کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ مکہ مکرمہ میں بھی موجود تھی۔ مکہ مکرمہ میں یہ حضرات صرف وحی کی کتابت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور کاتبین وحی کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد کاتبین دو قسم کے ہو گئے۔ ایک کاتبین وحی تھے۔ یہ نسبتاً سینئر حضرات تھے۔ دوسرے حضرات نسبتاً کم عمر اور نوجوان تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جو عام دستاویزات کے کاتبین تھے۔ کچھ وہ حضرات تھے جو دونوں کی کتابت میں پائے جاتے تھے۔ ان سب کی تعداد مجموعی طور پر چالیس پچاس سے لے کر ستر اسی کے درمیان تھی۔ بعض حضرات نے ان لوگوں کے سب لوگوں پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے حالات الگ سے جمع کئے ہیں۔ یہ بھی سیرت کا حصہ ہے۔

کاتبین وحی کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سیدنا عثمان بن عفان اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان میں بہت نمایاں رہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ جب کوئی نئی وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے ان دونوں کو بلاتے تھے۔ اگر یہ دونوں دستیاب نہ ہوں تو پھر حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا جاتا تھا۔ زید بن ثابتؓ مدینہ منورہ کے کاتب وحی بھی تھے اور دستاویزات لکھنے والوں میں بھی سب سے نمایاں تھے اور رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین لوگوں میں تھے۔

جن حضرات نے کاتبین اور دربار رسالت کے بارے میں معلومات جمع کرکے کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک بزرگ علامہ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن علی ابن حدیدہ الانصاری تھے۔ ان کی کتاب 'المصباح المضیء فی کتاب النبی الامی و رسلہ الی ملوک الارض من عربی و عجمی' ہے۔ یہ کتاب غالباً صرف کاتبین اور دربار رسالت کے بارے میں معلومات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں کاتبین وحی اور وثیقہ نویس منشیوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں دربار رسالت کے سفیروں کا ذکر ہے۔ ایک اور مورخ عمر بن شبہ تھے جن کی تاریخی روایات سے بہت سے قدیم مورخین، بالخصوص امام ابن جریر طبری نے بہت استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی کاتبین وحی پر ایک الگ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے حوالے قدیم مورخین اور سیرت نگاروں کے یہاں تفصیل سے ملتے ہیں۔ ایک اور بزرگ احمد بن علی علامہ القسطلانی تھے۔ انہوں نے بھی کاتبین وحی پر اور کاتبین دربار رسالت پر کتاب

تھی۔

ان موضوعات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے متعلق اور آپ کے اپنے شخصی معاملات کے بارے میں جتنی معلومات جمع ہو سکتی تھیں وہ جتنی صحابہ کرام سے حاصل کر کے جمع کی گئیں۔ بعض ایسی چیزوں کے بارے میں بھی معلومات جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا جن کی شاید سیرت یا سیرت کے پیغام کو سمجھنے میں اتنی اہمیت نہ ہو۔ ان میں سے دو مثالیں میں عرض کرتا ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نعلین مبارک کے بارے میں معلومات بھی سیرت نگاروں کی دلچسپی کا موضوع رہی ہیں۔ حضور ﷺ جوتا پہنتے تھے۔ ہر شخص جوتا پہنتا ہے۔ آج بھی پہنتا ہے۔ لیکن حضور ﷺ کا نعل مبارک کس طرح کا ہوتا تھا۔ اس کی شکل کیسی ہوتی تھی۔ یہ بھی سیرت نگاروں کی دلچسپی کا مضمون رہا۔ ایک مؤرخ سیرت نگار نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے نعلین مبارک پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ ان میں سے چند ایک کے نام میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ایک بزرگ محمد بن عیسیٰ المقری کی کتاب 'قرۃ العینین فی تحقیق امر النعلین' ہے۔ ایک اور بزرگ تھے وہ بھی مغربی تھے۔ ابو العباس المقری التلمسانی۔ یہ مراکش کے شہر تلمسان کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب ہے 'النفحات العنبریہ فی وصف نعل خیر البریہ'۔ یہ کتاب بڑی مفصل اور طویل ہوگی۔ عربی زبان میں اس کی تین تلخیصیں تیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک تلخیص ہمارے برصغیر کے ایک بزرگ علامہ رضی الدین ابو الخیر عبد المجید الہندی نے تیار کی۔ اس کے بارے میں ایک صاحب نے بیان کیا ہے کہ یہ تلخیص ہندوستان میں تیار کی گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ پڑھا ہے۔ ایک اور تلخیص 'فتح المتعال فی مدح خیر النعال' کے نام سے تیار کی ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ تلخیص انہوں نے روضہ اقدس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کی جانب بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس لئے کہ نعلین مبارک کے بارے میں لکھنا تھا۔ تو قدم کی سمت میں بیٹھ کر انہوں نے یہ تلخیص تیار کرنا مناسب سمجھا۔ اردو زبان میں بھی ایک چھوٹا سا رسالہ مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ہے جس میں نعلین مبارک کا وصف اور شبیہ بھی دی گئی تھی اور کچھ اور تفصیل بھی بیان کی گئی تھی۔

طب نبوی

رسول اللہ ﷺ اللہ کے نبی اور ترجمان تھے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا حضورؐ کی اصل ذمہ داری تھی۔ ہدایت ربانی اور وحی الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً ایسے بہت سے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا جو براہ راست رسالت اور نبوت کے فریضے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن آپ نے ایک بزرگ اور روحانی باپ کی حیثیت سے لوگوں پر شفقت اور مہربانی فرمائی اور ان امور کے بارہ میں رہنمائی عطا فرمانا پسند فرمایا۔ جو براہ راست آپ کے پیغمبرانہ فرائض میں شامل نہ تھے۔ ان میں سے ایک چیز طب نبوی بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ ظاہر ہے کہ طبیب یا حکیم تو نہیں تھے۔ وہ ارواح اور قلوب کا علاج کرنے آئے تھے ابدان کا علاج کرنے نہیں آئے تھے۔ آپ علیہ السلام طبیب ابدان و اجسام نہیں، طبیب ارواح و قلوب اور طبیب نفوس تھے۔ لیکن طب ابدان کے بارے میں بھی آپ نے وقتاً فوقتاً اظہار خیال فرمایا۔ آپؐ کے زمانہ میں عرب میں جو طبی تجربات تھے آپ ان سے خوب واقف تھے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کی رہنمائی میں آپؐ نے حفظان صحت کے اصول بیان فرمائے۔ طاعون اور وباؤں کے بارہ میں ہدایات عطا فرمائیں۔

طب نبوی کے موضوع پر فقہیات سیرت کے باب میں ذرا تفصیل سے بات ہوگی کہ طب کے بارے میں حضورؐ کے ارشادات کی فقہی حیثیت کیا ہے اور ایک مسلمان کا رویہ ان کے بارے میں کیا ہونا چاہئے۔ جن سیرت نگاروں نے طب نبوی کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ انہوں نے خصوصیت کے جذبے سے یہ کام کیا اور صرف عربی زبان میں اس پر کم از کم پچیس کتابیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے سیرت کی ایک کتابیات تیار کی ہے۔ اس میں طب نبوی پر عربی زبان کی پچیس کتب کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو زبان کا دامن بھی اس موضوع سے خالی نہیں۔ ہمارے وطن پاکستان کے ایک ماہر طب ڈاکٹر خالد غزنوی نے 'طب نبوی اور جدید سائنس' کے نام سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ بھی سیرت کا ایک جزوی حصہ کہلائی جا سکتی ہے۔ سیرت کے عمومی دائرے سے اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لوک سیرت

جہاں سیرت پر تحقیقی اور عالمانہ کام ہوئے، وہاں سیرت پر عوامی انداز میں بھی کام ہوئے۔ اگر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم اس کو 'لوک سیرت' بھی کہہ سکتے ہیں۔ لوک سیرت پر مسلمان اہل قلم قدیم زمانے سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس کو سیرت کے بنیادی حقائق سے واقف کرایا جائے اور سیرت پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے تیار کرائے جائیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت، آپ کی شخصیت اور بزرگی لوگوں کے سامنے آجائے۔ لوک سیرت کا ایک بڑا اہم نمونہ میلاد نامے اور مولود نامے بھی ہیں۔ میلاد نامہ اگرچہ نام کے اعتبار سے صرف میلاد نامہ ہے لیکن اس میں صرف ولادت رسول کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ ولادت مبارک کے ساتھ حضور کے معجزات اور حضور کی ولادت سے پہلے ہونے والی بشارتیں، جن کو صوفیا کی زبان میں ارہاصات کہتے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ ارہاص سے مراد کسی عظیم روحانی شخصیت کی ولادت سے پہلے بعض ایسے شواہد جو اہل روحانیت اور اہل کشف کے سامنے آئے تھیں، ان چیزوں کو ارہاص کہتے ہیں۔ پھر حضور کے بچپن، رضاعت اور ابتدائی تربیت کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔ یہ کتب مولود کب سے لکھی جانی شروع ہوئیں؟ اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ لیکن پانچویں یا چھٹی صدی ہجری سے مولود پر کتابیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس وقت سے آج تک تقریباً تمام اسلامی زبانوں میں میلاد نامے لکھے جا رہے ہیں۔

تعلیمات سیرت

سیرت کا ایک اہم شعبہ تعلیمات سیرت بھی ہے۔ تعلیمات سیرت سے مراد سیرت سے متعلق وہ معلومات یا وہ شعبے ہیں جن کا تعلق علم کی نشرواشاعت اور تعلیم وتعلم سے ہے۔ تعلیم اور تعلیمات سے متعلق سیرت میں جو مواد ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو براہ راست شریعت کا حصہ ہے۔ یوں تو سیرت مبارکہ ساری کی ساری شریعت ہے لیکن سیرت پاک کا ایک تو وہ حصہ ہے جو قرآن پاک اور احادیث میں آیا ہے۔ اس کو ہم

اسلام کا تصور علم اور تصور تعلیم یا تعلیم کے بارے میں اسلام کے احکام کہہ سکتے ہیں۔ یہ براہ راست اور بلاواسطہ تو صرف شریعت کا حصہ ہے سیرت کا نہیں، لیکن بالواسطہ طور پر یہ سیرت کا بھی حصہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ براہ راست سیرت کا حصہ نہیں، بلکہ براہ راست علم حدیث کا حصہ ہے۔

دوسری چیز جو سیرت اور احادیث دونوں کا حصہ ہے، وہ معلم کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کا اپنا کردار ہے۔ آپ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ 'انما بعثت معلماً' میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ نے معلم کائنات اور معلم انسانیت کی حیثیت سے اس فریضے کو کس طرح انجام دیا۔ اس کے بارے میں اہل علم نے بہت کام کیا ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے ایک محقق استاذ اور ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر فضل الٰہی نے بھی ایک جامع کتاب 'النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام معلماً' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور سعودی عرب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے وہ تمام احادیث اور سیرت کی معلومات جمع کر دی ہیں جن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کیفیت تعلیم، اسلوب تعلیم اور طرز تعلیم کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

تعلیمات سیرت کا تیسرا حصہ وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ان انتظامی فیصلوں سے بحث کرتا ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم کے بارے میں کیے۔ تعلیم کی نشر و اشاعت کے بارے میں آپ نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے قبل مکہ مکرمہ میں کیا کیا؟ پھر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں کیا کیا؟ کیسے تعلیم کو عام کیا؟ کیسے کیسے انتظامات فرمائے؟ کیا اقدامات کیے؟ کس قسم کے ادارے قائم فرمائے؟ یہ سب تفصیلات براہ راست علم سیرت کا حصہ ہیں۔ ان موضوعات پر ریاست مدینہ کی معیشت و معاشرت کے موضوع پر بحث کے دوران گفتگو ہوگی۔

روحانیات سیرت

سیرت کا ایک اہم میدان روحانیات سیرت ہے۔ اس سے مراد بنیادی طور پر تو تزکیہ نفوس کے سلسلہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دی ہوئی ہدایات ہیں۔ یہ ہدایات شریعت،

حدیث اور سنت کا حصہ ہیں لیکن سیرت کے باب میں بھی ان کا تذکرہ آتا ہے۔ سیرت کے موضوع سے براہ راست تعلق تزکیۂ نفس کے ان اقدامات کا ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمائے۔ لوگوں کی روحانی پاکیزگی و تربیت کے لئے کیا کیا۔ لوگوں کے اخلاق کی تربیت کس طرح فرمائی۔ لوگوں کی غلط عادات ،غلط رجحانات اور غلط رویوں کو کیسے دور فرمایا۔ اس کا مطالعہ روحانیات سیرت کے ضمن میں آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہل علم روحانیات سیرت پر غور کرتے گئے اور ان تفصیلات کو سیرت کی کتابوں میں مدون کرتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ تمام روحانی پاکیزگیوں کا سرچشمہ ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے مسلمانوں میں روحانیات کی ہر شمع روشن ہوئی ہے۔ اس لئے اہل روحانیت نے اس پر خاص توجہ دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعائیں اور مناجاتیں جو روحانیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ان کو لوگوں نے جمع کیا ہے۔ اس پر سینکڑوں کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ آپ کتابیات سیرت و حدیث پر نظر ڈالیں تو وہ مجموعے جو دعاؤں کے بارے میں مختلف صدیوں کے اہل علم اور مسلمانوں نے مرتب کئے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں سے نکلے گی۔ بہر حال یہ موضوع روحانیات سیرت کا ایک بہت اہم باب ہے۔ اس پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں مجموعے تیار کئے گئے ہیں اور ہر دور میں مختلف رجحانات کے لوگ اپنی اپنی پسند کے مجموعے تیار کرتے چلے آرہے ہیں۔

روحانیات سیرت کی اس صنف کا ،یعنی ادعیہ نبوی یا مناجات نبوی اور دعوات نبوی پر کام کا آغاز محدثین کرام کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ صحابہ کرام نے بہت ساری دعائیں یاد کیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کو دعائیں یاد کروائیں۔ ایک صحابی کو حضور علیہ السلام نے ایک دعا یاد کروائی تھی۔ اس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'ونبیک الذی ارسلت'۔ جب اگلے دن ان صحابی سے یہ دعا کو سنا تو انہوں نے کہا کہ 'ورسولک الذی ارسلت'، تو آپؐ نے از راہ مذاق ان صحابی کا کان مروڑا اور کہا کہ میں نے یہی کہا تھا۔ اب صحابی کو اصل الفاظ یاد آئے کہ آپؐ نے 'ونبیک الذی ارسلت' فرمایا تھا۔ بعد میں وہ صحابی جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ حضور ﷺ نے میرا کان مروڑ کر فرمایا تھا کہ میں نے یہی کہا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ آپؐ جو الفاظ سکھاتے تھے، اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ صحابہ کرام وہ الفاظ بالکل اسی طرح یاد کریں اور صحابہ ان کو اسی طرح یاد رکھیں۔

دعاؤں کی نقل و روایت بھی دوسری احادیث کی طرح بالمعنی نہیں بلکہ باللفظ ہوئی ہے۔

روحانیات سیرت کا ایک اہم عنوان تصوف کے وہ سلسلے ہیں جو چند صحابہ کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتے ہیں۔ اس پر لوگوں نے الگ سے کتب لکھیں۔ سلسلہ ہائے تصوف کی انتہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی تک ہوتی بیان کی جاتی ہے۔ ہمارے برصغیر میں تصوف کا ایک بڑا سلسلہ سلسلۂ نقشبندیہ حضرت ابوبکر صدیق کے واسطے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتا ہے۔ بقیہ سلسلوں میں کئی بڑے بڑے سلسلے سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے واسطے سے حضور تک پہنچائے جاتے ہیں۔ ایک آدھ سلسلہ اور بھی ہے جو دوسرے صحابہ مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ یا حضرت ابوذر غفاریؓ کے واسطے سے حضور تک پہنچتا ہے۔ روحانی سلسلوں کی یہ تاریخ اور حضور تک ان کی سند کا معاملہ خود روحانیات سیرت کا ایک بہت اہم میدان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک بڑی ہی لطیف بات فرمائی۔ آپؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانشینی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خلافت ظاہرہ کہلاتی ہے اور دوسری خلافت باطنہ کہلاتی ہے۔ خلافت ظاہرہ تو وہ ہے جہاں ظاہری معاملات اور دنیاوی انتظامات چلانے کے لئے حضور کی جانشینی کا بندوبست کیا گیا۔ یہ جانشینی تو جناب صدیق اکبر کو حاصل ہوئی۔ حضورؐ کے جانشین کے طور پر انہوں نے جنگیں بھی کروائیں۔ فوجیں بھی بھیجیں۔ ریاست سے متعلق بقیہ انتظامات بھی کئے۔ لیکن جو خلافت باطنہ اور حضور کی حقیقی جانشینی اور حقیقی خلافت ہے وہ روحانی تربیت، تزکیۂ نفس، دین کی تعلیم اور روحانی پاکیزگی کے کام میں حضور کی جانشینی اور نیابت سے عبارت ہے۔ اس جانشینی میں تمام کبار صحابہ حضورؐ کے بلاواسطہ خلیفہ ہوئے۔ سیدنا صدیق اکبر سمیت تمام اکابر صحابہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بلاواسطہ خلفا ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خلافت باطنہ کی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں تمام صحابہ حضورؐ کے خلیفہ بلافصل ہیں۔ کچھ صحابہ کو خلافت کے زیادہ تقاضے انجام دینے کا موقع ملا۔ کچھ صحابہ کو نسبتاً کم موقع ملا۔

پھر جب اہل علم نے، بالخصوص ارباب تصوف اور اساطین روحانیات نے اس پر غور شروع کیا تو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کو تصوف کی اصطلاحات میں بیان

کرنا شروع کیا۔ نور محمدی، حقیقت محمدیہ، یہ سب چیزیں، یہ تصوف کے بڑے بڑے موضوعات اور میدان ہیں۔ ان پر اکابر صوفیاء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ محی الدین ابن عربی، ان سب حضرات نے روحانیات سیرت کو ایک الگ فن بنا دیا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس فن کو عام طور پر اس لئے بیان نہیں کیا جاتا کہ اکثر سیرت نگار اس فن کے مرد میدان نہیں تھے۔ اس لئے سیرت کی کتابوں میں عموماً اس کا تذکرہ نہیں ہوتا، لیکن سیرت کی بعض کتابوں میں یہ تذکرہ اجمال کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابوں میں اس بات کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح سے کئی اور سیرت نگاروں نے ان مضامین کو اپنی کتابوں میں اٹھایا ہے۔

روحانیات سیرت کا ایک اہم موضوع یہ بھی تھا کہ روحانیت انبیاء کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ بعض سیرت نگاروں نے مختلف انبیاء علیہم السلام کی روحانیت اور رسول اللہ ﷺ کی روحانیت کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں ذوقی تجربے کی بنیاد پر بات کی جا سکتی ہے۔ اس نازک موضوع پر محض عقل اور روایت کی بنیاد پر بات نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے میں مزید تفصیل میں نہیں جا سکتا کہ روحانیت انبیاء سے ان کی کیا مراد ہے۔ حقیقت موسوی، حقیقت عیسوی اور حقیقت محمدی وغیرہ سے کیا مراد ہے۔ یہ ایک الگ میدان ہے جس پر لوگوں نے ہزاروں صفحات لکھے ہیں۔ خاص طور پر شیخ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اس پورے میدان میں شاید سب سے اعلیٰ ترین کتاب ہے۔

ان تمام مضامین کا خلاصہ اور شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو کچھ لکھا اس کو علامہ اقبال نے ایک چھوٹے سے انگریزی کے جملے میں سمو دیا ہے۔ وہ جملہ بیان کر کے میں روحانیات سیرت کا مضمون ختم کرتا ہوں۔ علامہ اقبال نے غالباً یہ ساری کتابیں پڑھی ہوں گی۔ فتوحات مکیہ تو یقیناً پڑھی تھی۔ شیخ عبدالحق کی کتابیں بھی دیکھی ہوں گی۔ علامہ نے لکھا تھا کہ

All the previous prophets were Muhammad in the making.

ادبیات سیرت

روحانیات سیرت کے بعد ایک اہم مضمون ادبیات سیرت کا ہے۔ اس سے مراد حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے خطبات اور مکاتیب کا ادبی اعتبار سے جائزہ ہے۔ ادبیات سیرت میں اسی زمانے کے ادباء اور ماہرین ادب نے یہ جائزہ لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا عربی زبان پر، عربی زبان کے اسالیب، ساخت، طریق ادا اور طرز بیان پر کیا اثر پڑا ہے۔ خود اس کی خوبیاں کیا ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے کون کون سے نئے دبستان نکلتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے عربی زبان کو کون کون سے نئے اسالیب عطا فرمائے۔ حضور نے عربی زبان کو کیا کیا رونق بخشی۔ یہ ساری چیزیں ادبیات سیرت کا حصہ کہلا سکتی ہیں۔ اس میں قدیم ترین مواد جو ملتا ہے وہ علامہ جاحظ کے ہاں ملتا ہے جس نے 'البیان والتبیین' میں ایک طویل اور مفصل باب رسول اللہ ﷺ کی ادبیت، زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کے بارے میں وقف کیا ہے۔

ادبیات سیرت میں ہم منظوم سیرت کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ منظوم سیرت کا طریقہ کار بہت شروع سے چلا آ رہا ہے۔ ابن ہشام کی منظوم سیرت کا میں آگے چل کر تذکرہ کروں گا۔ اس کو کئی لوگوں نے نظم کیا۔ ابن ہشام کے مضامین کو عربی نظم میں بیان کیا۔ پھر عربی نظم میں جب واقعات کو بیان کرنے کی روایت چل پڑی تو فارسی نظم میں بھی کئی واقعات بیان کئے گئے۔ بعض لوگوں نے اردو زبان میں بھی سیرت کے واقعات کو منظوم بیان کیا۔ ہماری اردو زبان کا دامن بھی اس سے الحمد للہ خالی نہیں ہے۔ حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا 'شاہنامہ اسلام' منظوم سیرت ہی کا ایک نمونہ ہے۔

مدائح نبوی

یہ بھی ادبیات سیرت یا منظوم سیرت کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام کے زمانے سے ہی مدائح نبوی کا رواج چلا آ رہا ہے۔ بلکہ صحابہ کرام کے زمانے سے پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ بعض اشعار جناب عبد المطلب سے بھی منسوب ہیں۔ جب عبد المطلب کا انتقال

ہو۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ لیکن اس وقت بھی جناب عبدالمطلب نے آپ کی تعریف میں بعض شعر کہے تھے جو سیرت ابن ہشام وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں۔ جناب ابو طالب نے بھی حضور کے بارے میں کچھ شعر کہے تھے جن میں سے ایک شعر بہت مشہور ہے:

وأبيض يستسقى الغمام بوجهه

ثمال اليتامى عصمة للأرامل

وہ گورا چٹا مکھڑا جس کا نام لے کر بادل سے بارش برسنے کی دعا کی جاتی ہے۔ جو یتیموں کا ٹھکانا اور بیواؤں کا سہارا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق بیمار تھے۔ آپ کا بالکل آخری وقت تھا، غشی کی کیفیت تھی اور اس کے بعد انتقال ہو گیا، حضرت عائشہ صدیقہ پاس بیٹھی ہوئی تھیں اور والد کے بستر مرگ پر ہونے کے موقع پر غم کی جو کیفیت ہوتی ہے تو اس کیفیت میں انہوں نے یہ شعر پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فوراً آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ یہ شعر حضور کے لئے ہے کسی اور کے لئے نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد پھر غشی کا دورہ طاری ہو گیا۔

جناب ابوطالب کا کہا ہوا یہ شعر اس وقت سے صحابہ کرام میں بہت مشہور تھا۔ اس وقت سے آج تک ہر شاعر اور ہر ادیب اپنی استعداد اور بساط کے مطابق منظوم خراج عقیدت حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات مبارک کو پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبان کا دامن اس بارے میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اس میں اگر کوئی لسانی عصبیت کا الزام نہ بھی لگائے تو میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اردو اور فارسی کا دامن نعتیہ کلام اور منظوم سیرت کے معاملہ میں عربی سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

اجتماعیات سیرت

اس سے مراد یہ ہے کہ سیرت نبوی کا مطالعہ اجتماعیات کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ اس کو ہم سیرت نبوی کا عمرانی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ اس کو sociology of Sirah بھی کہا جا سکتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ سیرت پاک کے اس پہلو کا مطالعہ اس نئے انداز سے کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ کے بہت سے اقدامات اور فیصلوں کا اجتماعی پہلو سامنے آیا تھا۔ اس زمانے کی دنیا کا عالمی منظر کیا تھا، کس ماحول اور کس پس منظر میں حضور یہ کام کر رہے تھے۔ یہ پس منظر بہت سی چیزوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مدینہ منورہ میں اجتماعیت کس رنگ کی تھی۔ مسلمان اور قبائل کون کون سے آباد تھے۔ ان کے آپس میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ مدینہ کی زندگی اور معاشرت کیا تھی۔ مکہ کی شہری ریاست کیا تھی۔ مختلف قبائل میں آپس کا تعلق اور لین دین کس انداز کا تھا۔ یہ سیرت کا ایک پہلو ہے اور اتنا اہم پہلو ہے کہ اس کو سمجھے بغیر سیرت کے بہت سے مواقع کو سمجھنا بہت دشوار ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی نجاشی کے دربار میں کوئی خط بھیجا تو حضرت عمرو بن امیہ الضمری کے ہاتھ بھیجا۔ ان کے بارے میں یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جب حضورؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو پہلی بار نجاشی کے دربار میں بھیجا تو اس وقت تک وہ اسلام نہیں لائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا تعلق اور دوستی قبول اسلام سے پہلے سے تھی۔ بعد میں کئی مواقع پر وہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا نامہ مبارک لے کر نجاشی کے دربار میں گئے۔

عام طور پر محدثین اور سیرت نگاروں نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ عمرو بن امیہ کو خاص طور پر اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا جاتا تھا۔ کسی نے نہیں سوچا کہ اس انتخاب کی بھی کوئی خاص وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بعد میں اہل علم نے اس پر غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ نجاشی جو رسول اللہ ﷺ کا ہم عصر تھا۔ جب وہ اپنے باپ کا جانشین بنا اور اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ خاصا کم سن تھا۔ اس کے کسی اور عزیز نے، جو رشتہ میں اس کا چچا ہوتا تھا، سازش کر کے اس کو اقتدار سے محروم کر دیا اور اس کے قتل کے درپے ہو گیا۔ نجاشی جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور کئی سال عرب میں اپنے کسی دوست کے یہاں آکر پناہ لے لی۔ اس کا بچپن وہیں گزرا۔ عمرو بن امیہ الضمری بھی اسی سردار کے بیٹے تھے جس کے ہاں کم سن نجاشی نے پناہ لی تھی اور وہ اسی نجاشی کے ہم عمر تھے اور بچپن میں نجاشی کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دونوں دوست مل کر شکار کے لئے جایا کرتے تھے اور کوئی عرصہ یعنی اندازاً دس بارہ سال تک ایک ساتھ رہے۔ پھر حبشہ کے حالات بدلے۔ غاصب حاکم کو حبشہ کے لوگوں نے نکال دیا اور اصل وارث کو بلا کر دوبارہ تخت نشین کرایا۔ اب

رسول اللہ ﷺ کا کردار دیہاتی کی نسبت دربار میں غیر معروف مجمع میں آتے ہی پیش نظر کیا تھا۔ اس میں کیا حکمت تھی۔ اس طرح کی بہت سی حقیقتیں اقتصادیات سیرت کے مطالعہ سے سامنے آجاتی ہیں۔

اجتماعیات سیرت کے ضمن میں ضروری ہے کہ عرب کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ عرب کے بازاروں اور تجارتی میلوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ عرب کے میلوں اور بازاروں کے رنگ ڈھنگ سمجھے بغیر آپ کی بہت سی اصطلاحات کی معنویت کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔ اسی طرح قبائلی سیاست اور قبائلی تعصب کی تفصیلات سے واقفیت بھی لازمی ہے۔

نفسیات سیرت

قدیم مفسرین، سیرت نگار اور محدثین اس فن میں زیادہ براہ راست تو دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن انہوں نے بعض ایسے اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بات ارشاد فرمائی اس کے پیچھے حکمت کیا تھی۔ مخاطبین کے ذہن میں کیا خیالات اور تصورات تھے جن کی وجہ سے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ پھر تبلیغ اور دعوت میں مخاطب کی ذہنی اور مزاجی کیفیت کو پیش نظر رکھنے کی کتنی ضرورت ہے؟ یہ چیز پیش نظر رکھیں تو ان باتوں کا تصور نئے پیرائے میں کیا گیا۔

اس ضمن میں تدریج بہت بنیادی خصوصیت ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو احکام دیئے وہ تدریج کے ساتھ دیئے۔ اگر پہلے دن یہ کہا جاتا کہ فلاں کام نہ کرو اور فلاں فلاں کام بھی نہ کرو تو شاید لوگ اس کو آسانی سے قبول نہ کرتے۔ پرانی عادتوں اور روایات کو اچانک تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اور تدریج کے ساتھ آنے والی تبدیلی زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور زیادہ گہری بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی نفسیات کا ایک نکتہ ہے کہ قوموں کے مزاج، لوگوں کی عادات اور خصائل کو اچانک تبدیل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ماضی سے مکمل اور قطعیت کے ساتھ تعلق ختم کر لیتے ہیں۔ بیشتر لوگ ماضی سے اچانک لاتعلق نہیں ہو پاتے۔

جنازہ کو اس موقع پر کمان سے سبکدوش کرنا حکمت عملی کے خلاف تھا۔ کیونکہ عین میدان جنگ میں کمان کو تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔ پھر سعد بن عبادہ جیسے بڑے آدمی کو، جو مزاجاً بھی کچھ حساس تھے اور طبیعت کے بھی ذرا تیز تھے، ان کو ہٹانا مناسب نہیں تھا۔ لیکن ان کو ہٹائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس صورت حال میں آپؐ نے فرمایا کہ سعد بن عبادہ سے علم لے کر ان کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دو۔ ظاہر ہے کوئی باپ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانے پر کیسے ناراض ہو سکتا ہے۔ کوئی قبیلہ اس پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے سردار کے بیٹے ہی کے ہاتھ میں کمان دی گئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی لطیف اقدام تھا۔ جس سے مقصد بھی حاصل ہو گیا اور کسی منفی ردعمل کے امکانات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کو یہ خدشہ ہوتا تھا کہ کسی صحابی یا کسی اور کے دل میں کسی طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو۔ ایک چھوٹے سے واقعہ کی مثال دیتا ہوں۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں اعتکاف فرما تھے۔ اعتکاف کے دوران ازواج سے تعلق یا میل جول اعتکاف کے قواعد کے خلاف ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہ کسی غرض سے۔ کھانا دینے یا کوئی کپڑا دینے کے لئے۔ حضورؐ کے پاس مسجد نبوی میں آ گئیں۔ عشاء کے بعد رات کا وقت تھا۔ جب وہ واپس ہونے لگیں تو حضور مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو گئے تاکہ وہ بے خوف چلی جائیں اور تنہائی کی وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ ابھی وہ مسجد سے نکلی نہیں تھیں کہ دو انصاری صحابہ کرام مسجد کی گلی کے کونے سے گزر رہے تھے۔ وہ حضورؐ کو رات کے اندھیرے میں اس طرح دیکھ کر ٹھٹکے۔ آپؐ نے دونوں کو آواز دی کہ ادھر آؤ۔ وہ دونوں آ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انھا ھی صفیة بنت حیی، یہ صفیہ بنت حیی ہیں، یعنی کوئی غیر خاتون نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہمارے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپؐ نے فرمایا لا، ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم ' شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے دل میں یہ بدگمانی ڈال دیتا کہ رات کے وقت یہ کون خاتون ہے جو اعتکاف کے موقع پر تنہا میرے پاس آئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ وضاحت ضروری سمجھی۔ اس سے پتہ چلا کہ انسانی نفس میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور خیالات پیدا ہو سکتے

ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی پاکستان میں اسلامی قوانین شریعت کے نفاذ کے لئے قائم ہونے والے سب سے پہلے ریاستی ادارہ کے سب سے پہلے سربراہ تھے۔ یہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب اور موجودہ سربراہ جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب موجود ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی صاحب ان دونوں حضرات کے پیش رو تھے۔ کیونکہ وہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے پہلے سربراہ تھے اور تعلیمات اسلامی بورڈ بھی اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا جس کے لئے آج کل اسلامی نظریاتی کونسل کام کر رہی ہے۔

جغرافیہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابن حائک ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب کے نام سے لکھی۔ یہ 1819ء میں لائیڈن میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں عرب کا علاقہ، جغرافیہ، اقوام، قبائل، راستے، پہاڑ، تالاب، ان سب چیزوں کا بیان ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر ان علاقوں کا بیان بڑا اہم ہے جہاں کوئی غزوہ ہوا یا کوئی تاریخی واقعہ پیش آیا، یا رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص قبیلے کے ساتھ کوئی معاہدہ فرمایا یا اس قبیلے کو کسی کوئی خاص مراعات عطا فرمائیں یا جاگیریں دی گئیں۔ ایسے قبائل کا جغرافیہ خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو یہ مراعات کیوں دی گئیں اور جاگیریں کیوں بخش دی گئیں۔ جغرافیہ سیرت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض قبائل کو عطا کی جانے والی مراعات کا علاقائی اور مقامی پس منظر کیا تھا۔

ایک اور اہم کتاب معجم ما استعجم ہے جو پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔ یہ ادب کی کتاب بھی ہے اور لغت کی کتاب بھی ہے، لیکن بنیادی طور پر جغرافیہ سیرت اور جغرافیہ قرآن پر ہے۔ عرب کا جغرافیہ جس حد تک مصنف کے علم میں آیا انہوں نے بیان کیا۔ بقیہ کتابوں کی تفصیل میں چھوڑ رہا ہوں۔ کوئی آٹھ دس کتابیں ہیں جو عام طور پر دستیاب ہیں اور ان میں عرب کا جغرافیہ، صوبوں، پہاڑوں اور معدنیات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ ان کتابوں میں قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

۱۔ ابن فقیہ الہمدانی (ف ۲۹۰ھ)

کتاب البلدان، مکہ، طائف، مدینہ، یمامہ اور یمن کا ذکر ہے۔

۲۔ الاصطخری (ف ۳۴۰ھ)

المسالک والممالک۔ دنیا کے جغرافیہ کے بارے میں ہے۔ عرب کے بارہ میں بھی ضروری اور اہم معلومات دی ہیں۔

۳۔ ابن حوقل (۳۶۷ھ)

کتاب المسالک والممالک۔ باب اول عرب کا جغرافیہ تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

۴۔ بشاری (۳۷۵ھ)

احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ عرب کے صوبوں، دیہاتوں، معدنیات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

۵۔ ابوالفداء:

تقویم البلدان۔ عرب کی ۱۴۳ آبادیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ایک بہت عمدہ کتاب، جو قدیم ترین تو نہیں ہے لیکن جامع ترین کتاب ضرور ہے وہ یاقوت حموی کی لکھی ہوئی 'معجم البلدان' ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ بھی لکھی ہے۔ جتنے بھی بعد کے لکھنے والے ہیں انہوں نے یاقوت کی کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔ یاقوت کے سامنے ساری قدیم کتابیں موجود تھیں۔ اس لئے ان کی اس کتاب میں ساری معلومات یکجا ہو گئی ہیں۔ یاقوت سے قبل کی کتابوں میں ازرقی کی اخبار مکہ بھی ہے جس میں مکہ کے جغرافیہ کا تذکرہ ہے۔ سمہودی کی وفاء الوفاء ہے جس میں مدینہ منورہ کا جغرافیہ ہے۔ ہمارے پاکستان کے ایک محقق مولانا عبدالغنی الیاس نے تاریخ النبی، مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کے جغرافیہ اور محل وقوع پر دو تین کتابیں لکھی ہیں، یہ اس موضوع پر تازہ ترین تحریر ہے۔ جغرافیہ سیرت کے ضمن میں گزشتہ صدی کے ایک اہم محقق کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ برادر ملک سعودی عرب کے شیخ حمد الجاسر تھے جن کا رسالہ العرب اس قسم کی تحقیقات کے لئے وقف تھا۔

یہ تو جغرافیہ سیرت کے بارے میں وہ معلومات تھیں جو واقعاتی نوعیت کی ہیں کہ فلاں واقعہ سیرت کا جغرافیہ کیا تھا۔ لیکن جغرافیہ کی بنیاد پر واقعات سیرت کا مطالعہ، جس کو آج کل Geo-politics کہتے ہیں۔ یہ بھی ارباب سیرت کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا اور انہوں نے سیرت کے مختلف واقعات کے جغرافیائی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر

مشہور مصنف اور فقیہ امام سرخسی نے ایک جگہ بڑا لطیف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ صلح حدیبیہ اور فتح خیبر میں باہم کیا تعلق ہے۔ انہوں نے دونوں کے جغرافیہ کو سامنے رکھ کر بیان کیا ہے کہ اس وقت مدینہ منورہ دو دشمنوں کے درمیان واقع تھا۔ دونوں سے کھلی کھلی جنگ تھی، اور دونوں کے ساتھ ایک شدید فوجی معرکہ درپیش تھا۔ جنوب کی سمت میں قریش مکہ تھے اور شمال کی سمت میں یہود تھے۔ دونوں کا آپس میں مسلمانوں کے خلاف گہرا تعلق اور معاہدہ تھا۔ اور دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے۔ جب احزاب کی جنگ ہوئی تو یہودیوں نے مشرکین مکہ کا ساتھ دیا۔ ان کو نقد رقم بھی دی اور وسائل بھی دیے۔ بعد میں بھی دونوں کے درمیان رابطہ رہا جس سے سیرت نگار اور طلبا سیرت واقف ہیں۔ ان دونوں طاقتور اور با اثر دشمنوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا مدینہ منورہ کے لئے آسان نہ تھا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ان میں سے ایک دشمن کو غیر جانبدار کر دیا جائے۔

صلح حدیبیہ کی بظاہر نامناسب شرائط کا مقصد یہ تھا کہ قریش غیر جانبدار ہو جائیں اور کسی بیرونی دشمن سے جنگ کی صورت میں اس دشمن کا ساتھ نہ دیں۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو باقی جو بھی شرائط وہ رکھنا چاہیں وہ رکھ دیں۔ اسی لئے معاہدہ میں درج بہت سی شرائط صحابہ کرام کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ یہاں تک حضرت عمر فاروقؓ نے کہا 'لماذا نعطی الدنیۃ فی دیننا' ہم دین کے بارے میں نرمی اور بزدلی کیوں دکھائیں۔ اب یہ بات تھا کہ حضور اکرمؐ ہر کسی کے ساتھ تو تفصیل نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بس یہی فرمایا کہ اسی میں کامیابی ہے۔ جب سورۃ فتح نازل ہوئی تو حضور اکرمؐ نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو بلایا اور کہا کہ یہ سورۃ فتح نازل ہوئی ہے سنو۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا یہ فتح مبین ہے؟ آپؐ نے فرمایا ای واللہ 'خدا کی قسم یہ فتح مبین ہے۔ بعد میں حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جب اس معاہدہ کی حکمتیں سامنے آنے لگیں تو مجھے تب اندازہ ہوا کہ یہ بڑی فتح مبین ہے۔

خود قریش اور حضورؐ کے تعلقات کے حوالے سے قرآن مجید نے 'رحلۃ الشتاء والصیف' کا ذکر کیا ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بھی عرب کا جغرافیہ سمجھنا ضروری ہے۔ یہ وہ بنیادی مضامین ہیں جو سیرت نگاروں نے گزشتہ چودہ سو سالوں میں وقتاً فوقتاً سے بیان کیے ہیں۔ میں نے صرف اہم چیزیں بیان کی ہیں اور جزوی تفاصیل چھوڑ دی ہیں۔ وہ

سیرت کا بنیادی ڈھانچہ ان دونوں ماخذوں سے مکمل طور پر مرتب ہو جاتا ہے۔

بعض اہل علم نے صحیحین کی بنیاد پر سیرت کے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ بعض نے صحیحین کے ساتھ بقیہ کتابوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ اور قرآن اور حدیث کی بنیاد پر سیرت کے مجموعے مرتب کئے۔ ایسے مجموعوں میں انہوں نے صرف قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کا حوالہ دیا ہے۔ کسی سیرت نگار کا حوالہ نہیں دیا۔ اس طرح کے کام کا ایک بہت اہم فائدہ یہ ہوا کہ اس سے سیرت نگاروں کی سیرت کی تحقیقات کی تائید ہو گئی۔ احادیث کی بنیاد پر مرتب کی جانے والی ان کتابوں میں اور بقیہ سیرت نگاروں کی تصنیفات میں بنیادی طور پر کوئی فرق سامنے نہیں آیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ سیرت کے جو اصل وقائع اور سارے مسائل و معلومات ہیں وہ ساری کی ساری کتب حدیث اور احادیث صحیحہ سے لی جاتی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے کسی محقق نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری سے سیرت سے متعلق مواد الگ کر کے مرتب کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ فتح الباری صحیح بخاری کی مشہور ترین شرح ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری جس پایہ کی کتاب ہے اس کی اس پایہ کی شرح نہیں لکھی گئی اور اس معیار کی شرح لکھنا امت مسلمہ پر قرض ہے۔ ابن خلدون کا انتقال 707 ہجری میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد حافظ ابن حجر کو یہ شرح لکھنے کی توفیق ہوئی۔ جب انہوں نے یہ شرح لکھ دی تو بعض لوگوں نے یہ بات کہی کہ جس فریضہ یا قرض کی طرف ابن خلدون نے اشارہ کیا تھا وہ فریضہ حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے ادا کر دیا ہے۔ فتح الباری کی عظمت اور مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہر دور میں بخاری کی مقبول ترین شرح رہی ہے۔ اس کے حوالے سے وہ مشہور حدیث بھی بیان کی جاتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ لاھجرۃ بعد الفتح۔ حضور ﷺ نے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کو لازمی قرار دیا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ ہر مسلمان کا مدینہ کی طرف ہجرت کرنا لازمی ہے تاکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اب ہجرت ختم ہو گئی۔ اب فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ بعض محدثین نے یہ حدیث فتح الباری کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے کہا کہ "لاھجرۃ بعد الفتح"۔ فتح الباری کے بعد حدیث کے لئے ہجرت کی ضرورت نہیں۔ یہ کتاب اتنی جامع ہے

کی ہے۔

اس فاضلانہ اور مایہ ناز کتاب بلکہ موسوعہ میں انہوں نے صحیح بخاری کی متعلقہ احادیث کی شرح کرتے ہوئے بقیہ صحیح احادیث کے جو جو حوالے دیئے ہیں اور جو جو مسائل اٹھائے ہیں۔ ان سب کو مرتب نے فتح الباری سے نکال کر نئی ترتیب سے جمع کر دیا ہے اور تین جلدوں پر مشتمل سیرت کی ایک کتاب مرتب کر دی ہے جو تمام تر کتب حدیث کی بنیاد پر ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ ماہر حدیث کی مرتب کردہ ہے۔ اس کے بارے میں ابن خلدون اور باقی لوگوں کا بیان آپ نے ابھی سن لیا۔

یوں تو حدیث کی ساری ہی کتابیں۔ اپنے اپنے درجہ استناد کے مطابق۔ معلومات سیرت کے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں وسیع مواد پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک قابل اعتماد بھی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱: مسند امام احمد، جو مستند احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ ہے اور تقریباً تیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ مسلمان اہل علم کے بارہ میں تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن کئی مغربی اہل علم نے اس کا حرف حرف پڑھا اور اس سے سیرت کا مواد چھان کر الگ کیا۔

۲۔ السنن الکبریٰ، امام بیہقی کی یہ ضخیم کتاب جو دس بارہ جلدوں میں چھپ کر ہر جگہ متداول ہے۔ امام بیہقی خود بھی بہت بڑے محدث اور بڑے بڑے محدثین کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

۳۔ مصنف عبد الرزاق۔ یہ امام عبد الرزاق بھی بہت بڑے محدث تھے۔ ان کی یہ کتاب بہت مفصل اور جامع ہے۔ احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال و آثار کا بہت اہم ماخذ ہے۔ ان کی کتاب کئی بار چھپی ہے۔ حال ہی میں غالباً ۲۶ جلدوں میں نئی تحقیق کے ساتھ آئی ہے۔

۴: مصنف ابن ابی شیبہ: یہ بھی عبد الرزاق کی مصنف کی طرح بہت جامع اور مبسوط کتاب ہے اور معلومات کا خزانہ۔ یہ ابوبکر بن ابی شیبہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۵: المعجم الکبیر، امام طبرانی کی یہ معجم دس بارہ جلدوں میں چھپی ہے اور عام دستیاب ہے۔

۲۔ صحیح البخاری کا صاحب مشکوٰۃ کی یہ ترتیب ہوتا ہوگی خاص ہے اور فقہ کے مصادر کی بنیاد پر ہے لیکن عام طور پر اس کو مستند مانا جاتا ہے۔

کتب حدیث کے ساتھ ساتھ سیرت کا ایک بہت اہم اور بنیادی ماخذ کتب فقہ کی ہیں۔ بالخصوص دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران لکھی جانے والی فقہ کی وہ کتابیں جن میں بڑی تعداد میں روایات واحادیث پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حدیث اور فقہ جدا جدا ہو کر الگ الگ تخصصات کے طور پر سامنے آ رہے تھے۔ فقہ اور حدیث کی بالکل الگ الگ کتابیں تو بعد میں (غالباً چوتھی صدی ہجری سے) لکھی شروع ہوئیں۔ لیکن ابتدائی دو صدیاں (دوسری اور تیسری صدی) ان دونوں علوم کے اشتراک اور پھر تدریجی امتیاز کی صدیاں تھیں۔

اس دوران فقہ کی جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں خاصا بڑا حصہ احادیث و روایات کا ہوتا ہے۔ ان احادیث و روایات میں سیرت کی بہت سی اہم معلومات موجود ہیں۔ فقہ کی ان کتابوں میں وہ کتابیں سب سے زیادہ اہم ہیں جو مالیات اور دوسرے انتظامی امور پر لکھی گئیں۔ مثلاً درج ذیل کتب:

کتاب الخراج، امام ابو یوسف

کتاب الاموال، یحییٰ بن آدم

کتاب الاموال، ابو عبید

کتاب الاموال، ابن زنجویہ

کتاب الاموال، ابو نصر داؤدی

۳۔ سیرت کا تیسرا اور سب سے اہم ماخذ مصادر کتب سیرت اور مغازی ہیں، جن کے بارے میں تفصیلی بحث کل ہوگی۔ کتب سیرت اور مغازی میں بعض بنیادی کتابیں ہیں۔ بعض بہت بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بعض کتابیں کمزور ہیں۔ بعض کے بارے میں مورخین اور محدثین کی رائے ہے کہ ان میں بہت کچھ رطب و یابس بھی موجود ہے۔ اس لئے ان میں سے کچھ کتابوں کا درجہ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

۴۔ چوتھا درجہ حدیث کے ان مجموعوں کا ہے جو محدثین کی نظروں میں بہت اچھے

مجموعے نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حدیث کی کتب کے تین اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے ان کے چار مجموعے قرار دیئے ہیں۔ سب سے پہلے مجموعہ الف یا کیٹیگری اے کی کتب ہیں جن کے بارے میں شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ کتابیں حدیث کے صحیح ترین مجموعے ہیں۔ اس کیٹیگری میں انہوں نے تین کتابوں کے نام لئے ہیں یعنی موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ پھر درجہ دوم میں انہوں نے پانچ کتابیں رکھی ہیں۔ صحاح ستہ کی بقیہ چار کتابیں اور پانچویں مسند امام احمد۔ درجہ سوم میں انہوں نے حدیث کی بقیہ مشہور کتابیں رکھی ہیں۔ چوتھے درجہ میں انہوں نے حدیث کی وہ کتابیں رکھی ہیں جن میں رطب ویابس کی بھرمار ہے اور جو کسی بھی اعتبار سے استناد کے لائق نہیں ہیں۔ اس لئے جو بقیہ کتابیں ہیں ان کا درجہ چوتھا ہونا چاہئے۔

پانچواں مصدر و ماخذ کتب تاریخ کا ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

چھٹا مصدر و ماخذ کتب ادب ہیں۔ صدر اسلام میں اور اس سے پہلے بھی یہ رواج تھا کہ عربی زبان میں ادبیات کے اعلیٰ ترین نمونوں کو محفوظ رکھا جائے۔ اسلام سے پہلے قبائلی تفاخر کے جذبے سے یہ چیزیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے بڑے بڑے اور نامور شعراء کے قصائد اور خطباء کی تقریریں وغیرہ محفوظ رکھا کرتا تھا۔ قبیلہ کے بچے بچے کی زبان پر یہ قصائد ہوتے تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد ظاہر ہے کہ ان نمونوں کی حفاظت کا اصل اور بنیادی مقصد قرآن پاک کی زبان کی حفاظت، قرآن پاک کی اسالیب کو سمجھنے میں مدد اور قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کا اندازہ کرنا قرار پایا۔ اس لئے اسلام کے بعد بہت سے حضرات نے اپنی زندگی کا ایک بڑا اور بنیادی ہدف یہ قرار دیا کہ اسلام سے پہلے کے اور فوراً بعد کے عربی ادب کے ذخائر، تقریریں، خطابت، کہانت، نظم اور شاعری کو محفوظ کیا جائے۔ خود صحابہ کرام کو اس کام میں بڑی دلچسپی تھی۔ سیدنا عمر فاروقؓ کو اس چیز کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ خود عربی زبان وادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے زمانے میں لوگوں کو تلقین اور ہدایت کی کہ اپنے بچوں کو شعر وادب ضرور سکھاؤ، فان الشعر دیوان العرب "اس لئے کہ شعر عرب کی تاریخ کا مجموعہ ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی شعر وادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ تمام صحابہ کرام

میں شعر و ادب سے سب سے زیادہ دلچسپی رکھنے والے حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ وہ قرآن
مجید میں عربی ادب سے بہت مدد لیا کرتے تھے۔ عربی ادب سے یہ شغف باقی صحابہ کرام میں اتنی
گہرائی کے ساتھ نہیں ملتا۔ ایک مرتبہ ایک مشہور خارجی سردار نافع بن ازرق کے ساتھ حضرت
عبداللہ بن عباسؓ کا مکالمہ ہوا۔ اس نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پاک کے بارے میں
دو سو سوالات کئے۔ اس موقع پر شاگردوں کا حلقہ کتاب قلم ہاتھوں میں لئے موجود تھا۔ نافع بن
ازرق سوالات کرتے گئے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جوابات دیتے گئے۔ یہ سارے
جوابات لکھے گئے اور ان پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر لی گئی جس کا امام بخاری نے بھی
جابجا حوالہ دیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے اور علامہ جلال الدین سیوطی
نے پوری کی پوری کتاب تھوڑے سے فرق کے ساتھ اپنی کتاب الاتقان میں محفوظ کر لی ہے۔

کتب ادب کی ترتیب و تدوین کا یہ اہتمام گویا صحابہ کرام کے زمانے سے شروع
ہو گیا تھا۔ لیکن کتب ادب میں جو مواد ہے وہ سیرت کے اصل اور بنیادی حقائق کے بارہ میں
نہیں ہے۔ بلکہ اس مواد میں بہت سی ایسی جزوی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں جن سے سیرت کے
متعدد اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یوں تو ادب کی کتابیں جو سیرت کے مطالعہ میں کام آ سکتی
ہیں بے شمار ہیں تاہم ان میں سے میں صرف دو کتابوں کا حوالہ دوں گا۔ یہ دونوں کتب نہ تو براہ
راست سیرت پر ہیں اور نہ ان کے مرتبین نے ان کو سیرت کے واقعات کے نقطہ نظر سے لکھا
تھا۔ ان کتابوں میں سیرت کے بارہ میں براہ راست معلومات والی تو ہیں نہیں، اور اگر ہیں بھی
تو ظاہر ہے ان سے سیرت کے بارے میں براہ راست معلومات لینا بھی مناسب یا درست
نہیں سمجھا گیا۔ ان دو کتابوں میں بھی زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا کتاب تیس
جلدوں میں ابوالفرج اصفہانی کی کتاب 'کتاب الاغانی' ہے۔ اس میں عرب کے گوئیوں اور
بجانے والوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کی ایسی کوئی بھی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن جب مصنف
عرب کے گویوں اور گانے والوں کا تذکرہ کرتا ہے تو جگہ جگہ ان کے قبائل کا تذکرہ بھی کرتا ہے
کہ فلاں قبیلے کے گویے نے فلاں قبیلہ کے خلاف یہ ہجو کہی۔ لکھنے کی جو بھی تحریک کی ہے۔ اس
طرح کی جزوی معلومات جو قبائلیات، انساب اور عام سماجی معاملات کے بارے میں
ہیں کتاب میں جابجا بکھری ہوئی ہیں، اس کتاب میں موجود ہیں۔ بہت سی قیمتی معلومات ادب

کے طور پر کسی راوی کے بارے میں تذکرہ آیا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور ان کے والد فلاں غزوہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ شریک تھے۔ فلاں صاحب کے والد فلاں موقع پر فلاں واقعہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ اس طرح رجال کے تذکرے تابعین اور تبع تابعین کے حالات سے بھی سیرت کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

یہ کتابیں ہمارے نزدیک تو مستند ہیں۔ ہر مسلمان ان کو مستند مانتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں استناد کا ایک معیار ہے۔ جس کی بنیاد پر معلومات کو پرکھا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ رجال اور تذکرہ کی یہ کتابیں استناد کے ایک معیار پر نہیں ہیں۔ جو درجہ قرآن پاک کا ہے وہ کسی اور کتاب کا نہیں ہو سکتا۔ جو درجہ مستند کتب حدیث کا ہے وہ بقیہ کتب کا نہیں ہو سکتا۔ جو کتابیں ارباب سیر کے متفق نقطہ نظر کے مطابق ہیں وہ سیرت کی دوسری کتابوں سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔ اس لئے کہ جو درجہ متفق علیہ مسائل کا ہے وہ درجہ یقیناً مختلف فیہ مسائل کا نہیں ہو سکتا۔ حدیث کے جو غیر مستند مجموعے ہیں ان میں چھان پھٹک کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی ہے۔ ان میں ہر دور میں صحیح اور سقیم میں فرق کیا گیا۔ ہر دور میں یہ بحث سامنے آئی کہ یہ روایت قابل قبول ہے یا ناقابل قبول ہے۔ اس لئے یہ بات ہر دور کے مسلمانوں میں قریب قریب طے شدہ رہی ہے کہ ہر روایت یکساں طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ مسلمان اہل علم نے روایات کے اخذ و قبول کے اصول مقرر کئے ہیں۔ اب یہ بات کہ ان سب اصولوں کو نظر انداز کر کے ان تمام مجموعوں کو نظر انداز کر دیا جائے جن کی ترتیب و تدوین میں اہل علم نے زندگیاں کھپائی ہیں اور ان کو بیک جنبش قلم غیر تاریخی اور غیر مستند ثابت کیا جائے، یہ سراسر ایک غیر علمی اور بے بنیاد بات معلوم ہوتی ہے۔

آج مغربی ناقدین سیرت کے بہت سے بلکہ تقریباً تمام مجموعوں کو غیر مستند قرار دیتے ہیں۔ ایک بڑی دلیل جو وہ کئی دہائیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ ساری روایات زبانی ہیں اور سیرت نگاروں نے سنی سنائی باتیں نقل کر دی ہیں۔ حالانکہ یہ بات اب تحقیق کے ساتھ ثابت کی جا چکی ہے کہ سیرت کی روایات زبانی روایات پر مبنی نہیں ہیں۔ اس کی تحقیق بھی ہو چکی ہے اور ثبوت بھی دیئے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر فواد سیزگن نے اس پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس پر لکھا ہے۔ اور بھی بہت سے محققین نے اس پر لکھا ہے کہ یہ

ساری روایات زبانی نہیں تھیں بلکہ زبانی اور تحریری دونوں طرح کی روایات بہت تحقیق، احتیاط اور اہتمام سے محفوظ کی گئی تھیں۔

یہ بات مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی تلامذہ اور عقیدت مند پیروکار بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں میں بعض چیزوں کو حفظ کرنے کی روایت آج تک چلی آرہی ہے۔ ہماری آج کی اس محفل میں بھی کم سے کم ایک درجن حفاظ قرآن موجود ہوں گے۔ ایسے بے شمار لوگ مسلمانوں میں آج بھی موجود ہیں جن کو حدیث کی کتابیں زبانی یاد ہیں۔ میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو حدیث کی کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی یاد ہیں۔ متون یاد کرنے والے آج جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ کسی کو فقہ کا متن یاد ہے، کسی کو منطق کا متن یاد ہے، کسی کو کوئی متن یاد ہے، کسی کو کوئی اور متن یاد ہے۔ درحقیقت مسلمانوں میں زبانی یادداشت کا رواج اتنا زیادہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود یہ روایت چلی آرہی ہے۔ اس روایت کو نظرانداز کر دینا اور ان تحریری ذخائر کو بھی جو حضور کے زمانے سے چلے آرہے ہیں ان کو نظرانداز کرنا اور یک طرفہ طور پر یہ کہے جانا کہ یہ سارا ذخیرہ غیر مستند ہے، یہ محض تحکم اور ضد بلکہ محض عناد اور بغض پر مبنی ہے۔ اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہو سکتا۔

یہاں میرا خیال تھا کہ قرآن پاک میں سیرت کے جو اہم واقعات بیان ہوئے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کروں، لیکن وقت تنگ ہے اس لئے ان مثالوں سے صرف نظر کرتا ہوں۔ سیرت کے جو واقعات قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں ان کو جمع کرنے اور مرتب کرنے کا کام کئی لوگوں نے کیا ہے۔ اس میں ایک بہت ہی قیمتی کام تو شاید شام یا لبنان کے عالم ڈاکٹر محمد عزت دروزہ نے عربی میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'عصر النبی' میں بڑے فاضلانہ انداز سے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اور قرآن پاک کی تمام آیات کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ سیرت کے واقعات اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی ساری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ایک اور کام ہمارے برصغیر کے ایک صاحب ڈاکٹر نعمان اعظمی نے کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے جو پاکستان میں بھی کئی بار چھپا ہے۔ انہوں نے اسی موضوع پر قاہرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے کہ قرآن پاک میں سیرت کے واقعات کیسے بیان ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ کے معاشرہ اور مدینہ منورہ کے ماحول کے بارے میں قرآن کریم

کیا گیا ہے۔

کل میں نے تذکرہ کیا تھا کہ کتب حدیث اور کتب سیرت میں بعض چیزیں مشترک ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ وہ صرف حدیث کا موضوع ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جو صرف سیرت کا موضوع ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو علم حدیث اور علم سیرت دونوں کا موضوع ہیں۔ محدثین کا معیار تحقیق اور ان کا احتیاط بہت اونچا اور غیر معمولی ہے، جبکہ ارباب سیر اور تاریخ نگاروں کا معیار تحقیق اتنا اونچا نہیں ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیرت کا اگر کوئی واقعہ ایسا ہو کہ محدثین اور سیرت نگاروں میں اس کے بارہ میں کوئی اختلاف ہو تو کس کی بات کو ترجیح دینی چاہئے۔ جہاں تک شریعت کے احکام، عقائد اور دین کی تعلیم کا تعلق ہے تو ان معاملات میں تو بالاتفاق تمام اہل علم کا فیصلہ ہے کہ ان امور میں ارباب حدیث کی تحقیق کو ترجیح دینی چاہئے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر کوئی چیز خالص سیرت کے واقعہ سے متعلق ہے جس سے کوئی حکم شرعی یا حکم فقہی یا عقیدہ کا کوئی پہلو ثابت نہیں ہوتا اور اس میں ارباب حدیث اور سیرت نگاروں میں اختلاف ہو تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے امور میں ارباب سیرت کی رائے کو ترجیح دینی چاہئے، جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے امور میں بھی ارباب حدیث کی تحقیق کو ترجیح دینی چاہئے۔ یہ اختلاف اکثر رہتا ہے اور کتب حدیث میں اس کا تذکرہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

مثلاً اس نوعیت کا اختلاف کہ غزوات میں کون سا غزوہ پہلے ہوا اور کون سا بعد میں ہوا۔ یا مثلاً یہ سوال کہ کوئی خاص واقعہ کسی خاص غزوہ میں پیش آیا یا کسی اور غزوہ میں پیش آیا۔ اس طرح کے اختلافات محدثین اور ارباب سیر کے مابین موجود ہیں کہ فلاں غزوہ جو ہوا تھا تو وہ فلاں واقعہ سے شروع ہوا تھا یا فلاں واقعہ سے۔ یا یہ کہ کوئی واقعہ ایک مرتبہ پیش آیا تھا یا دو مرتبہ۔ مثال کے طور پر لیلۃ التعریس کا واقعہ مشہور ہے۔ تعریس عربی زبان میں صبح کی نماز سے پہلے نصف شب کے بعد کے وقت سو جانے کو کہتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا کہ قافلے رات کے پہلے حصہ میں سفر کرتے تھے اور نصف شب کے بعد آرام کے لئے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ اس پڑاؤ اور آرام کو تعریس کہا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ لمبا سفر تھا۔ سب

ہوئے تھکے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے نماز فجر سے کچھ پہلے پڑاؤ کرنے اور وہاں آرام کرنے کا فیصلہ
کیا۔ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم جاگتے رہنا اور فجر کے وقت ہمیں
جگا دینا۔ یہ ہدایت دے کر سب سو گئے۔ سیدنا بلالؓ بھی تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی بھی
آنکھ لگ گئی اور وہ بھی سو گئے۔ اور یوں سب سوتے رہ گئے اور فجر کی نماز کا وقت نکل گیا۔ حضورؐ کی
آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی کرنیں نکل آئیں اور لوگوں کے چہروں پر پڑیں۔ حدیث میں
آیا ہے کہ فزع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی آپ پریشانی کے عالم
میں اٹھے اور پوچھا کہ بلال یہ کیا ہوا؟ حضرت بلال نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! جس نے
آپ کو سلا دیا اس نے مجھے بھی سلا دیا۔

اس واقعہ کی تفصیلات صحاح کے ذخیرے میں لیلۃ التعریس کے عنوان سے ملتی
ہیں۔ اس سے فقہا نے بہت سے احکام نکالے ہیں اور محدثین نے اس کی تفصیلات سے بحث
کی ہے۔ اب یہ لیلۃ التعریس ایک مرتبہ ہوئی یا دو مرتبہ ہوئی۔ اگر ایک مرتبہ ہوئی تو کس غزوہ
سے واپسی پر ہوئی اور اگر دو مرتبہ ہوئی تو کس کس غزوہ سے واپسی پر ہوئی۔ اس پر بعض
اوقات علم حدیث اور علم سیرت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ کسی کو ترجیح دیتے
ہیں کچھ اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ سیرت کا ایک ماخذ تاریخ بھی ہے۔ بعض مغربی اہل علم
کا کہنا ہے کہ عربوں میں تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا۔ یہ بات درست ہے۔ اس کے برعکس
بہت سے محققین کا اصرار ہے کہ عربوں میں تاریخ کا رواج تھا۔ یہ بات بھی درست
ہے۔ دونوں باتیں درست ہیں۔ تاریخ نویسی کا رواج اس اعتبار سے نہیں تھا کہ کوئی مرتب اور
مدون تاریخ نویسی عربوں میں رائج نہیں تھی۔ لیکن بڑے بوڑھوں کے ماضی کے واقعات سے
واقف ہونا، ان کی تفصیلات کو محفوظ رکھنا اور ان سے استشہاد کرنے کا رواج عربوں میں
یقیناً تھا۔ خاص طور پر وہ ادارے ایسے تھے جن میں یہ معلومات ناگزیر تھیں۔ ایک ادارہ منافرہ
کے نام سے تھا۔ منافرہ سے مراد یہ تھی کہ جب دو عرب قبائل میں اختلاف ہو جاتا تھا کہ کون سا
قبیلہ افضل ہے۔ یا قبائل کی سرداری میں دو افراد کے درمیان مقابلہ ہو جاتا تھا تو یہ سوال کہ ان
دونوں دعویداروں میں سے کس کو ترجیح دی جائے، اہم سوال سمجھا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر ترجیح

کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوتا تھا کہ کس کے آباء واجداد کی خدمات زیادہ تھیں۔ کس کا خاندان خدمت میں زیادہ پیش پیش تھا۔ کس کے آباء واجداد کی صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ جب یہ مرحلہ پیش آتا تھا تو پھر آباء واجداد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان معلومات کی بنیاد پر سربراہ منافرہ تنازعہ کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔

اس ادارہ کو منافرہ کہا جاتا تھا۔ منافرہ کا یہ ادارہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آرہا تھا اور جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پردادا جناب عبد مناف کا انتقال ہوا تو ان کی جانشینی پر ان کے دو بیٹوں میں اختلاف ہوا۔ جناب ہاشم کا دعویٰ تھا کہ میں زیادہ حقدار ہوں اور ان کے بڑے بھائی عبد شمس کا دعویٰ تھا کہ میں زیادہ حقدار ہوں۔ اب ان دو بھائیوں میں جو ایک بہت بڑے باپ کے بیٹے تھے ان کی سرداری کے بارے میں اختلاف ہوا۔ اس معاملہ پر حسب روایت حضرت عمر فاروقؓ کے دادا کو حکم بنایا گیا، کیونکہ منافرہ کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ انہوں نے تفصیل سے دونوں کا موقف سنا اور جناب ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ان کی سرداری کے حقدار جناب ہاشم ہیں۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ یوں منافرہ کے لئے ضروری تھا کہ قبائل کے حالات اور اکابر کی خدمات کے بارے میں معلومات جمع کی جائیں۔ اس لئے یہ معلومات جمع ہوتی تھیں اور عرب قبائل اس سے مانوس تھے۔

اسی طرح کا دوسرا بڑا ادارہ ایام کے نام سے تھا۔ ایام العرب کے نام سے ایک الگ فن موجود تھا۔ عربوں میں قدیم قبائل کے کارنامے اور خاص طور پر جنگوں میں فتوحات کے تذکرے باقاعدگی سے یاد کرتے تھے۔ ایام العرب پر اس وقت بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ ایک بڑی ضخیم کتاب آج سے کوئی پچاس سال پہلے ایک مصری عالم نے مرتب کی تھی۔ اس میں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب ایام کا تذکرہ موجود ہے۔ یوم بعاث، یوم فجار، یوم ذی قار، یہ بڑی بڑی جنگیں تھیں۔ یہ صرف جنگیں نہیں تھیں جو ایام العرب کا موضوع تھیں بلکہ اور بھی بہت سے معرکے تھے جن کی وجہ سے کوئی قبیلہ باعزت یا زیادہ کامیاب قرار پاتا تھا۔ یہ معلومات عربوں میں جمع ہوتی تھیں اور نسلاً بعد نسل چلتی رہتی تھیں۔ اس لئے ان حقائق کی بنیاد پر ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ سے شغف کسی حد تک عربوں میں موجود تھا۔

پھر ان دونوں اداروں سے بڑھ کر علم انساب کے بارے میں عربوں میں جو اہتمام تھا

وہ بڑا غیر معمولی تھا۔ عرب خصوصی اہتمام کے ساتھ انساب کے بارے میں معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایام العرب، مخالف قبائل کی شکست اور مظالم کی روداد یں، اپنے قبیلہ کی فتوحات کا فخریہ بیان اور ان سب کو نسل در نسل بیان کرنے کی روایت، یہ تینوں چیزیں عرب میں چلی آرہی تھیں۔ جب یہ چیزیں جمع ہورہی تھیں تو حضور کے خاندان کے بارے میں بھی ان سب عنوانات کے تحت ضروری اور اہم معلومات خود بخود جمع ہورہی تھیں۔ جناب ہاشم اور جناب عبد مناف کے بارے میں بھی یہ ساری معلومات جمع ہورہی تھیں۔ قصی اور دوسری تمام شخصیات کے بارے میں بھی جمع ہورہی تھیں۔ جن مورخین کی کتابوں میں یہ معلومات ملتی ہیں ان میں ابن حبیب بہت نمایاں ہیں۔ ان کی دو کتابیں کتاب المحبر اور کتاب المنمق آج سے ساٹھ ستر سال قبل حیدرآباد دکن میں چھپی تھیں۔ ان دونوں کتابوں سے بہت سی قیمتی معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔

جن حضرات نے علم انساب پر لکھا ہے ان میں حضرت مصعب بن زبیرؓ حضرت عائشہ کے نواسے تھے اور ان کو صحابہ تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ حضور کے خاندان ہی کے فرد تھے۔ انہوں نے انساب کے بارے میں معلومات جمع کیں۔

جن لوگوں نے تاریخ مرتب کی ان میں قدیم ترین حضرات میں سے ایک مورخ خلیفہ بن خیاط بھی ہیں جن کی تاریخ چھپی ہوئی موجود ہے۔ یہ خلیفہ بن خیاط مستند ترین مورخین میں سے شمار ہوتے ہیں۔ امام بخاری کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ ان کے مستند ہونے پر حضرات محدثین بھی متفق ہیں۔

دیگر قابل ذکر مورخین میں ابو حنیفہ دینوری، امام ابن جریر طبری کے علاوہ یعقوبی اور مسعودی بھی نمایاں ہیں۔ اگرچہ یعقوبی اور مسعودی کا رجحان استناد اور ان دونوں کے بیانات کی ثقاہت ہمیشہ محل نظر رہی ہے۔ طبری کے ہاں سیرت پر بہت قیمتی مواد موجود ہے۔ طبری نے مکمل سند اور حوالوں کے ساتھ ہر بات لکھی ہے اور حوالوں کی تحقیق کا کام قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔

مورخین میں سب سے مستند، جیسا کہ عرض کیا گیا، خلیفہ بن خیاط ہیں۔ ان کی کتاب کا ابتدائی حصہ سیرت پر مشتمل ہے۔ ان کے مآخذ میں امام سبیعی، امام یحییٰ بن مخلد اور امام لیث بن سعد جیسے صف اول کے محدثین کے علاوہ بیشتر نامور سیرت نگار شامل ہیں۔ مثلاً:

۱۔ محمد بن اسحاق

۲۔ وہب بن جریر بن حازم

۳۔ ابو معشر السندی

۴۔ علی بن محمد المدائنی

۵۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ

۶۔ عبدالملک الاصمعی

۷۔ ابو داؤد الطیالسی

۸۔ عبدالرحمٰن بن مہدی

۹۔ ابو نعیم الفضل بن دکین

۱۰۔ محمد بن عمر الواقدی

ازرقی کی اخبار مکہ اور سمہودی کی وفاء الوفاء کا میں نے پہلے ہی تذکرہ کیا ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ پر دو مشہور کتابیں ہیں اور سیرت کے بارے میں بہت اہم مواد پر مشتمل ہیں۔ ازرقی تو تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں جبکہ سمہودی بعد کے ہیں۔ عمر بن شبہ مشہور مورخ ہیں۔ طبری کے سب تاریخی حوالے عمر بن شبہ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی کتاب اخبار المدینۃ المنورۃ حال ہی میں چھپی ہے۔ تمام قدیم مورخین کی کتب میں ان کے حوالے موجود ہیں۔ انہوں نے کتاب کے انہوں تین حصے قرار دیے ہیں۔ پہلا حصہ ہے مدینہ منورہ حضور کے عہد میں، دوسرا حصہ ہے مدینہ منورہ حضرت عمر کے عہد میں اور تیسرا حصہ ہے مدینہ منورہ حضرت عثمان کے عہد میں۔

انساب کے بارے میں زیادہ مفصل گفتگو کا وقت نہیں رہا ہے۔ اس پر بہت سی مستقل کتابیں موجود ہیں۔ ہمارے مغربی محققین علم نسب کے بارے میں بھی شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ان کا پروپیگنڈا نہیں ماننا چاہیے۔ جو لوگ قرآن کے بارے میں شک کرتے ہیں اگر وہ انساب کے بارے میں بھی شک کریں تو کونسی حرج کی بات ہے۔ عربوں میں نسب سے دلچسپی اسلام سے بہت پہلے سے رہی ہے۔ ہر قبیلہ میں انساب کے ماہرین ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا محض ضد اور عناد ہے۔ عربوں میں

آج بھی نسب ناموں کو ریکارڈ کرنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ بلکہ دنیائے عرب سے باہر بھی عربی الاصل خانوادوں میں شجروں کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ برصغیر، ایران، ترکی حتیٰ کہ مشرق بعید تک پائے جانے والے عربی الاصل خاندانوں میں انساب سے دلچسپی آج بھی نظر آتی ہے۔ صحابہ کرام میں بہت سے حضرات انساب کے ماہر تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں آتا ہے کہ کان انسب العرب کہ وہ عرب میں علم انساب کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

اس موضوع پر جو قدیم ترین مصنفین ہیں ان میں بلاذری، زبیر بن بکار، سمعانی اور ابن حزم شامل ہیں۔ ان حضرات کی کتابوں میں ایک بلاذری کی انساب الاشراف ہے۔ اس کی پہلی جلد پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا پورا حصہ مدنی دور سے بحث کرتا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے سب سپاہیوں، فوجیوں اور دیگر مجاہدین کی تنخواہوں کے لئے دیوان مرتب فرمایا تھا تو اس کو قرابت کی بنیاد پر مرتب فرمایا تھا۔ انہوں نے جو تنخواہیں متعین فرمائی تھیں تو وہ حضور سے قربت کی بنیاد پر متعین فرمائی تھیں۔ آں جناب نے طے کیا تھا کہ جو جو حضور کے جتنے زیادہ قریب ہوگا اس کو اتنی زیادہ تنخواہیں ملیں گی۔ اس موقع پر آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ پہلے اپنا نام لکھیں۔ آپ نے جواب دیا کہ تیری ماں تجھے روئے! میں رسول اللہ ﷺ کے خاندان کو سب سے پہلے لکھوں گا۔ اس طرح انہوں نے سب سے پہلے حضور کے خاندان کو لکھا۔ پھر جو خاندان حضور کے خاندان کے جتنا قریب تھا اس کے لوگوں کے نام اسی ترتیب سے درج کئے گئے۔ جب ان کے اپنے قبیلے کا نمبر آیا تو کسی نے کہا کہ اب تو اپنا نام پہلے لکھیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے قبیلے میں جو شخص سب سے پہلے اسلام لایا تھا پہلے اس کا نام لکھا جائے گا۔ پھر جس ترتیب سے میں اسلام لایا تھا اسی کے مطابق میرا نام بھی لکھ دیا جائے گا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں انساب کا علم اتنا عام اور واضح تھا کہ انہوں نے انساب کی بنیاد پر دیوان تیار کیا اور تمام صحابہ کے سامنے تیار کیا اور ان سب کی مشترکہ معلومات انہوں نے اس میں استعمال فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انساب کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا سیرت نگاروں نے اتنا ہی اہتمام کیا جتنا سیرت کے دیگر مصادر کے بارے میں نظر آتا ہے۔ بلاذری اور سمعانی جیسے مورخین

کے علاوہ ابن حزم جیسے فقیہ نے بھی انساب کی تحقیق کو اپنا میدان بنایا اور انساب معلومات کو مدون کیا۔ ان کے علاوہ مشہور مؤرخ اور سیرت نگار ہشام بن محمد کلبی نے بھی محمد بن حبیب کی کتاب جمہرۃ النسب کی روایت کی۔ ہشام کا شمار خود تو زیادہ مستند اور قابل اعتماد راویوں میں نہیں ہوتا، لیکن ان کے استاد محمد بن حبیب کو کبھی غیر مستند نہیں سمجھا گیا۔ جمہرۃ النسب ایک اعتبار سے ان دونوں فضلاء کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ یہ کتاب دو بار چھپ چکی ہے۔ ایک ایڈیشن تین جلدوں میں محمود فردوس العظم کی تحقیق سے چھپا ہے۔

انساب کے اس ذخیرہ میں بلاذری کی انساب الاشراف کو سب سے معتبر اور مستند مانا جاتا ہے۔ بلاذری کے انساب کی ہر جلد چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سیرت اور متعلقات سیرت پر بھی مواد موجود ہے۔ بلاذری کے مصادر اور اساتذہ میں امام شعبی اور امام زہری جیسے جید محدثین کے ساتھ ساتھ واقدی اور ابن اسحاق جیسے نامور سیرت نگار بھی شامل ہیں۔ زہری کی روایات بلاذری کے ہاں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اس سے بھی بلاذری کی ثقاہت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سیرت کے اس سارے ذخیرے پر کتابیات بھی شروع سے مرتب ہوتی چلی آرہی ہیں۔ کتابیات سیرت پر سب سے پہلا کام ابن ندیم نے کیا تھا۔ ابن ندیم نے الفہرست میں بہت سی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ واقدی کی انہوں نے چھبیس کتابیں بیان کی ہیں۔ حال ہی میں کتابیات سیرت پر دو اہم کتابیں آئی ہیں۔ ایک ڈاکٹر صلاح الدین منجد کی ہے جو بڑی ضخیم ہے اور اس کے بارہ ابواب یا اقسام ہیں۔ انہوں نے ہر قسم سے متعلق الگ الگ ابواب کی تفصیل بیان کی ہے اور موضوع وار کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔ جو کتب مخطوط ہیں اور جو مطبوعہ ہیں وہ سب بیان کی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تفصیلی کتاب غالباً ایک ایرانی عالم عبدالجبار الرفاعی نے فراہم کی ہے۔ ان کی ایک بہت مفصل اور ضخیم کتاب تہران میں چھپی ہے۔ گیارہ جلدوں میں ہے اور گیارہویں جلد کا جو آخری اندراج ہے وہ 29 ہزار 7 سو 94 ہے۔ اس سے زیادہ شاید ان کتب کے بارے میں کچھ کہنا چاہئے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

۔☆۔

سوال و جواب

آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا کہ حضور خواتین سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اس کا طریقہ کار کیا ہوتا تھا؟ کیا حضور عورتوں کے سامنے آکر خطاب فرمایا کرتے تھے یا کوئی اور انداز تھا۔

حضور ﷺ خود خواتین کے سامنے آکر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ خواتین مسجد نبوی میں بھی تشریف لایا کرتی تھیں اور خواتین کا الگ اجتماع بھی حضور منعقد فرمایا کرتے تھے اور وہاں جا کر خواتین کے سامنے ضروری امور پر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان میں سے تقریباً سب حجاب کے اسلامی آداب کی پابندی کے ساتھ آتی تھیں۔ صحابہ کرام کے زمانے سے اب تک یہ بات محل اختلاف ہے کہ خواتین کے لئے چہرے کا پردہ لازمی ہے کہ نہیں۔ بعض صحابہ کرام کا خیال تھا کہ چہرہ کا پردہ لازمی ہے اور بعض کا خیال تھا کہ چہرہ کا پردہ لازمی نہیں ہے۔ ان دونوں کا مستند اور مستدل وہی واقعات ہیں جو حضور کے زمانے میں پیش آئے۔

☆

شمائل اور انساب پر اردو میں چند مشہور اور مفصل کتب کے نام بتا دیں۔

رسول اللہ ﷺ کے شمائل پر اردو میں جو کتاب مشہور ہے وہ امام ترمذی کی کتاب الشمائل المحمدیہ کا اردو ترجمہ ہے جو کئی لوگوں نے کیا ہے۔ ترجمے کے علاوہ اردو میں اس کتاب کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک مشہور شرح جو کئی بار اردو ترجمے کے ساتھ چھپی ہے، وہ مولانا

محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث کے قلم سے ہے۔ انساب نبی پر اردو میں کوئی کتاب میں نے
نہیں دیکھی۔ البتہ عربی میں کئی کتابیں ہیں۔ میری انتہائی محدود معلومات کی حد تک انساب کی
کسی کتاب کا اردو ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔

☆

> جب بھی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں بنیادی ترقی کی
> بات ہوتی ہے تو فخر کے لئے ہمارے پاس ماضی کے سوا شاید
> کچھ نہیں بچتا۔ مسلمانوں کی مادی اور ذہنی مغلوبیت کو دور
> کرنے کے لئے موجودہ دنیا کے علوم و فنون کو قرآن و سنت
> کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ خیال ہی تھا کوئی اجتماعی
> یا انفرادی اور منظم اور جامع کوشش کی جا رہی ہے؟ مزید یہ کہ
> ایک فرد کے لئے یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اسلامی
> قوانین کی جامعیت اور ابدیت کو جدید دور کے تقاضوں کے
> مطابق ثابت کرے؟

میرے خیال میں یہ کام ایک ملی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ اس لئے یہ اہم کام اداروں کو
بھی کرنا چاہیے اور افراد کو بھی کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال نے آج سے اسی سال پہلے اس
ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے 1925 میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط میں
لکھا تھا کہ اس وقت مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ جو شخص زمانہ حال کے
jurisprudence پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی نوع
انسان کا سب سے بڑا خادم اور شاید اسلام کا مجدد ہوگا۔ اس لئے خواہ ایک فرد یہ کام
کرے یا بہت سے افراد مل کر یہ کام کریں تو یہ بہت اہم ہے اور اس کی بہت زیادہ ضرورت
ہے۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے بہت سے لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ اس
میں پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ اب دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔

☆

آپ نے مسائل تصوف کی بنیاد نبی کریم ﷺ تک پہنچا دی
ہے جس کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ کرام میں روحانی اعتبار سے ہر صحابی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا خلیفہ بلافصل ہے اس میں تو کسی سند کی ضرورت نہیں۔ ایک صحابی کی صحابیت اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ تعلیم دین اور تزکیہ نفوس میں حضور کا جانشین ہو۔ ساری کتب حدیث اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کی رہنمائی کو آنے والے دوسروں تک پہنچایا اور حضور کی تربیت کے نتائج کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔

جہاں تک صوفیہ کے سلسلوں کے تاریخی طور پر مستند ہونے کا تعلق ہے تو یہ واقعی ایک مشکل بات ہے اور اس پر بحث میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ بعض حضرات بڑے شد و مد سے اس کے منکر ہیں۔ اور وہ اس انکار کے لئے وزنی تاریخی دلائل رکھتے ہیں۔ ان حضرات میں بیشتر وہ لوگ ہیں جو سرے سے تصوف کے بھی منکر ہیں اس لئے ان کے انکار کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ بعض دیگر حضرات بڑے شد و مد کے ساتھ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب سلسلے براہ راست رسول ﷺ سے متصل ہیں۔ ان قائلین میں بیشتر وہ ہیں جو تصوف کی تمام روایات کو بلا رد و قدح قبول کرتے ہیں۔ یوں ان کی تائید بھی ہلکی قرار پاتی ہے۔ متوازن رائے دونوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے۔ میں کوئی حتمی رائے نہیں دینا چاہتا۔ لیکن یہ بات میں ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات تصوف کے سلسلوں سے وابستہ رہے ہیں وہ امت کے انتہائی قابل احترام اور معتمد ترین حضرات تھے۔ وہ ایسے بلند پایہ لوگ تھے جن کا نام لیتے سر کو احتراماً خم کرنا پڑتا ہے۔ کون سا مسلمان ہے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے پائے کے دوسرے بزرگوں کے احترام میں کسی سے پیچھے رہنا گوارا کرے گا۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

علامہ اقبال نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

He was the the greatest religious genius of

Muslim India.

برصغیر کے امیر المومنین فی الحدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی تصوف کے سلسلوں سے وابستہ تھے۔ یہ بڑے بڑے حضرات جو ان سلسلوں کی سند کو مستند مانتے ہیں تو یقیناً اس کی کوئی بنیاد ہوگی۔ میں نے خود کوئی تحقیق نہیں کی اس لئے میں خود ان سلسلوں کی سند بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆

جن دستاویزات کا آپ نے ذکر کیا ہے کیا وہ محفوظ ہیں؟

جی ہاں، وہ دستاویزات محفوظ ہیں۔ ان کا کچھ حصہ تو امام ابوعبید کی کتاب 'کتاب الاموال' میں درج ہے۔ کچھ حصہ طبقات ابن سعد میں اور کچھ حصہ حدیث کی متفرق کتابوں میں ہے۔ کچھ حصہ بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے۔ ان تمام کتابوں سے جمع کر کے اہل علم و تحقیق نے وثائق نبوی کے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے لکھے ہوئے چند وثائق اپنی اصلی شکل میں بھی موجود ہیں۔ ان پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرانسیسی زبان میں ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے جس میں ان سب کے بارے میں مستند اور تاریخی معلومات پر مشتمل قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔

☆

کل آپ نے فرمایا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا۔ آج کے لیکچر میں آپ نے منافرہ کا ذکر کیا ہے جو ایک قسم کا قانون ہے۔

منافرہ کوئی مدون قانون نہیں تھا۔ آپ اس کو ایک رواج کہہ سکتے ہیں۔ کل جب میں نے کہا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا تو میری مراد یہ تھی کہ جزیرۂ عرب کے علاقوں میں مدون اور مرتب قانون کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ایسے قانون کی جو پورے عرب کے علاقوں کے لئے مشترک طور پر قابل قبول ہو۔ جیسے جسٹینین کا کوڈ تھا جو پوری رومن سلطنت کے لئے ایک مشترک قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ یا دنیا کے کچھ دوسرے حصے میں اور طرح کے مدون

قوانین تھے۔ ایسا کوئی قانون عرب میں نہیں تھا۔ عرب میں مختلف قبائل کے اپنے اپنے رواجات تھے۔ مثلاً یہ کہ رواج قبیلہ قریش اور اس کے حوالی میں تھا۔ اس کو اول تو قانون نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ محض ایک رواج تھا۔ اگر اس کو قانون کہا بھی جائے تو یہ مرتب و مدون نہیں تھا۔ پھر بھی اگر اس کو قانون قرار دینے پر اصرار کیا جائے تو پورے عرب کے لئے نہیں تھا۔ عرب کے بیشتر علاقوں میں اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے پورے ملک کی بات کی آپ کی گنجائش تردید نہیں ہوتی۔

☆

آپ نے خلافت کی جو اقسام بتلائیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
بیان کی ہیں، میرے علم کے مطابق وہ تین ہیں۔ آپ نے
صرف دو کا ذکر کیا ہے۔ تیسری اگر کوئی ہے تو بھی بتا دیں۔

میرے علم میں تیسری قسم کوئی نہیں ہے۔ میں نے خلافت کی دو ہی قسموں کا ذکر سنا ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء میں خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کتاب میں تیسری قسم کا ذکر کیا ہو تو وہ میرے علم میں نہیں۔ آپ مجھے بتا دیجئے۔ میری واقفیت اور علم کی کمی پوری ہو جائے گی۔

☆

رسول کریم ﷺ کی داڑھی مبارک کے بارے میں وضاحت
فرمائیں۔ کیا آپ مہندی لگایا کرتے تھے؟

جی ہاں، حضور ﷺ بھی کبھی کبھی، خاص طور پر گرمی کے شدید موسم میں سر اور داڑھی کے بالوں پر مہندی لگایا کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ آپ کی داڑھی کی مقدار کتنی تھی، اس کا کسی روایت میں کوئی تعین نہیں ہے۔ صحابہ کرام صرف اتنی بات روایت کرتے ہیں کہ کان کث اللحیۃ، یعنی آپ کی گھنی داڑھی تھی۔

☆

آپ نے ازرقی کی اخبار مکہ کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خانہ کعبہ میں بتوں کو گرا رہے تھے اور وہاں سے تصویروں کو مٹا رہے تھے تو حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی جو تصویریں وہاں پر کندہ یا آویزاں تھیں، آپ نے صحابہ کو ان کے مٹانے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ میں نے استنبول میں ازرقی کا اصل نسخہ دیکھا ہے اس میں روایت موجود ہے۔ اس روایت کے بارے میں بتائیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ علم الانساب کی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا جائے کیونکہ اہل مغرب کے ہاں اس طرح کا مستند ذخیرہ نسل کے بارے میں بھی نہیں ہے۔

انساب کی کتابوں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی میری ناچیز رائے میں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ مغرب کے جو اہل علم سیرت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ عربی جانتے ہیں۔ خود انہوں نے عربی کی بہت سی کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ اس لئے ایسی چیزیں جن کو پہلے ہی سے دستیاب ہیں وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ انساب کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ عام لوگوں کے لئے شاید مفید نہ ہو۔ اس لئے کہ علم انساب کی کتابوں کا اسلوب عام قارئین کی دلچسپی کی چیز نہیں ہے۔ وہ متخصصین کی دلچسپی کی چیز ہے۔

ازرقی کی اس روایت کے بارے میں میں نے کوئی تحقیق نہیں کی، اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض لوگ سختی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ازرقی نے صحیح لکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے واقعی ایسا کیا یا نہیں کیا۔ لیکن ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور مسلمانوں کے دور عروج میں کبھی بھی اس فن کی عام حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

خصائص نبوی کو آپ کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں؟

خصائص نبوی پر کسی وقت سیرت میں بات ہوگی۔ اس سے مراد بعض وہ چیزیں ہیں جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ خاص ہیں۔ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے 'خالصة لک من دون المومنین' یہ بات آپ کے لئے خاص ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ اس طرح کی چیزوں پر لوگوں نے فقہی انداز میں بھی بات کی ہے اور کلامی اور فلسفیانہ انداز میں بھی بات کی ہے۔ اس پر ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر بات ہوگی۔

☆

سیرت نگاروں کا ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ حضور کا دوسرے انبیاء کے ساتھ تقابل کرکے حضور کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ اس بارے میں بعض مفکرین کی رائے یہ ہے کہ یہ عمل ناپسندیدہ ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

واقعی عمل تو یہ ناپسندیدہ ہی ہے۔ حضور نے اس سے منع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے حضرت یونس بن متی پر حضور کو فضیلت دی تھی تو آپ نے منع فرمایا تھا اور ایسا کرنے کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ اس لئے صحابہ کرام اس طرح کے موازنے نہیں کیا کرتے تھے، ہمیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی وہ صفات جو قرآن پاک یا مستند احادیث میں آئی ہیں ان کو بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس سے اگر بالواسطہ طور پر دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں آپ کی فضیلت ثابت ہو جاتی ہے تو شاید اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

☆

آپ نے سعد بن ابی ہند کی جو روایت بیان کی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ راہ چلتے وقت اپنے اصحاب کو آگے رکھتے تھے اور خود پیچھے رہتے تھے۔ جب کہ قرآن میں سورۃ الحجرات میں آیا ہے کہ لاتقدموا بین یدی اللہ

منافقین کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کے علم میں فتن کی بعض احادیث تھیں جو عام لوگوں کے علم میں نہیں تھیں۔ اس کی خصوصی تربیت اور تعلیم سے زندگی کی ظاہرات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

☆

سیرت کا وہ کون سا پہلو یا کون سا مطالعہ ہے جو سیرت نگاری کی تکمیل و ترتیب کو واضح کرتا ہے؟ معاشرہ کا وہ پہلو جس میں تفریح اور آرٹ کی اہمیت ہے، سیرت میں اس کا تذکرہ کس عنوان کے تحت کرنا چاہیے؟

سیرت میں ان معاملات کی جو عام باتیں ہوں گی ان میں تفریح کا تذکرہ بھی آئے گا۔ محدثین نے تذکرہ کیا ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تفریح میں حصہ لیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے گھوڑ دوڑ کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ کشتی کے مقابلے بھی دیکھے ہیں۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق صحابہ شعر و شاعری کا ذکر کر رہے ہوتے تھے تو حضورؐ اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ صحابہ پرانے واقعات بیان کر رہے ہوتے تھے تو حضورؐ اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اس لیے یہ چیز اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اگر کوئی مفید بات یا کوئی چیز کسی علاقے میں رائج ہے اور شریعت سے متصادم نہیں ہے تو اس میں حصہ لینا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے مقامی ثقافتوں کی وہ تمام چیزیں جن میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو ان کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو شریعت سے متصادم سمجھا گیا ہو یا ان کا تعلق یا رشتہ کسی غیر اسلامی روایت سے ملتا ہو جیسے ہمارے ہاں بدعات و روایات کی چیزیں مروج ہو گئی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہیے۔

☆

آپ نے اپنے خطاب میں بعض معجزات کا حضورؐ سے غلط منسوب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح بعض نوادرات بھی حضورؐ سے منسوب ہیں۔ مثلاً لاہور کی بادشاہی مسجد میں

حضور کے نعلین مبارک یا موئے مبارک ان کی نسبت کہاں تک درست ہے!

لاہور کے نعلین مبارک کی تاریخی حیثیت بارے میں تو مجھے علم نہیں۔ غالباً وہ چوری بھی ہو گئے تھے جو ابھی تک بازیاب نہیں ہوئے۔ لیکن موئے مبارک کے اکثر نمونے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اور تمام محدثین نے لکھا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے حلق فرمایا تو دور دراز سے آنے والے صحابہ کرام نے آپ کے موئے مبارک تبرکاً بانٹ لئے تھے۔ جب حضور نے صحابہ کی دلچسپی دیکھی تو خود بھی موئے مبارک صحابہ کرام کو عطا فرمائے۔ جب نائی نے حضور کے سر مبارک کے ایک طرف استرا پھیرا تو حضور نے دست مبارک میں پکڑ کر اس طرف کے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرمائے اور جب نائی نے دوسری طرف سے کاٹا تو دوسری طرف کے لوگوں کو عطا فرما دیے۔ جب اتنے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرمائے گئے ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ موئے مبارک بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر بات ہے جس کے پاس حضور علیہ السلام کا موئے مبارک ہوگا تو اس نے ضائع نہیں کیا ہوگا۔ مسلمانوں میں آثار رسول کی اتنی بے توقیری کبھی بھی نہیں ہوئی کہ کسی خاندان میں موئے مبارک ہو اور اس نے ضائع کر دیا ہو۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں موئے مبارک پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔

دوسرے تبرکات اور آثار نبوی کو تاریخی طور پر ثابت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان کا وہ استناد تو نہیں ہے جو قرآن پاک یا احادیث کا ہے۔ لیکن حضور سے جو چیز منسوب ہے اس سے محبت اور احترام کا تعلق رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی چیز واقعی حضور ﷺ کی ہے تو پھر تو وہ واجب الاحترام ہے ہی، لیکن اگر نہیں ہے تو بھی حضور سے منسوب ہونے کی وجہ سے اس کا احترام ہونا چاہیے۔ توہین اور بے احترامی کا رویہ میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔

۔☆۔

تیسرا باب

علم سیرت

آغاز، ارتقا، تدوین اور ترویج

تیسرا خطبہ

علم سیرت

آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب میر اشفاق احمد سروری،

محترم جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان،

مدیر ادارہ تحقیقات اسلامی،

برادران عظام

خواہران محترم!

آج کی گزارشات کا عنوان ہے 'علم سیرت: آغاز، ارتقا، تدوین اور توسیع'۔ گزشتہ دو دنوں کی نشستوں میں علم سیرت کی ضرورت واہمیت، علم سیرت کے مضامین اور مندرجات کی وسعت کے بارے میں گزارشات پیش کی گئیں۔ آج کی گفتگو میں دو موضوعات زیر بحث آئیں گے۔ ان میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ علم سیرت کی ابتدا کس طرح ہوئی، علم سیرت کے آغاز میں کس کس نے حصہ لیا، کن کن محدثین کن کن سیرت نگاروں نے اس میں علم کے حصہ لیا اور کس طرح اس عظیم الشان علمی روایت کا تسلسل دور حاضر تک کا ایک مختصر سا خاکہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اگر علم سیرت کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ علم سیرت ابھی تک سات مختلف مدارج ومراحل سے گزرا ہے اور اب آٹھویں مرحلے یا آٹھویں درجے میں

جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا وہ نقشہ مکمل طور پر دنیا کے سامنے آ جائے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ تدوین و ترتیب کا یہ مرحلہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مکمل ہوا۔ اندازاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرحلہ 210 ہجری کے لگ بھگ ختم ہو گیا۔ محدثین نے تابعین کا آخری زمانہ 170 اور 175 کے قریب قرار دیا ہے اور تبع تابعین کا آخری دور 210 اور 215 ہجری کے قریب قرار دیا ہے۔ گویا 210 اور 215 ہجری کے درمیان یہ مرحلہ بھی ختم ہو گیا۔ جو جو مجموعے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ہاتھوں مرتب ہونے تھے وہ اس دور میں مرتب ہو گئے۔ وہ سارا ذخیرہ معلومات محفوظ ہو گیا۔ اب ترتیب و تبویب اور تجزیہ ذخیرہ معلومات کے شائع ہونے کا مرحلہ شروع ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

تیسرا دور جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تصنیف و تالیف کا دور ہے۔ یہ دور 200 ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا اور کم و بیش اگلے 200 سال تک جاری رہا۔ 400 ہجری تک یہ مرحلہ بھی تقریباً مکمل ہو گیا۔ اس دور میں پہلے دونوں ادوار، بالخصوص دوسرے دور سے آنے والے تمام چھوٹے بڑے مجموعوں کو جمع کر کے مفصل اور مکمل کتابیں تیار کی گئیں۔ سیرت کو ایک باقاعدہ علم کے طور پر منظم اور مرتب کیا گیا۔ اور یہ ذخیرہ ہم تک پہنچ گیا۔

اس دور کی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب جو تنہا ہی قابل ذکر ہے وہ علامہ عبدالملک بن ہشام کی کتاب کا وہ نسخہ ہے جو انہوں نے ابن اسحاق کے کام کی بنیاد پر تیار کیا۔ یہ تیسری صدی ہجری کے آغاز کا کام ہے۔ ترتیب و تدوین کا یہ مرحلہ اگلے دو سو سال تک جاری رہا۔

چوتھا مرحلہ جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سن 400 سے شروع ہوا اور آئندہ مزید دو سو سال تک جاری رہا، اس کو ہم استیعاب و استقصاء کہہ سکتے ہیں۔ یعنی سیرت سے متعلق تمام بالواسطہ معلومات کا مکمل سراغ اور استیعاب و استقصاء۔ واضح رہے کہ سیرت کے دور میں علم حدیث اور سیرت کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی بہت سی قیمتی معلومات موجود تھیں۔ مختلف علوم وفنون میں منتشر طور پر یہ معلومات موجود تھیں۔ کچھ معلومات علم تفسیر میں تھیں، کچھ علم حدیث میں تھیں، کچھ مورخین مرتب کر رہے تھے۔ کچھ معلومات قصہ گو لوگ مرتب کر رہے تھے۔ کچھ معلومات جغرافیہ دانوں کے پاس تھیں۔ ان سب کو جمع کر کے پچھلے دو ادوار میں مرتب کردہ

سیرت کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں میں دستیاب تھا، ان کو از سر نو منظم کر کے بڑے بڑے مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ یہ دور سیرت مبارکہ پر بڑی بڑی کتابوں کا دور ہے۔ اس دور میں چھ چھ، آٹھ آٹھ، دس دس جلدوں پر مشتمل ضخیم اور جامع کتابیں لکھی گئیں جن میں بہت سی کتابیں آج ہمارے پاس مطبوعہ اور بعض مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔

پانچواں دور جس کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ تقریباً 600 ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا اور آج سے کم و بیش ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک جاری رہا۔ یہ تجزیہ، مطالعہ اور تخصص یعنی diversification کا زمانہ ہے۔ اس دور میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مقالے سامنے آئے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا تھا کہ کتاب الشمائل، دلائل النبوۃ، رسول اللہ ﷺ کے دور کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے بارے میں، صحابہ کرام کے الگ الگ طبقات اور مجموعوں پر سارا کام تقریباً اسی دور میں ہوا۔ سیرت کے بارے میں دستیاب تمام معلومات اور تجربات کو اہل علم، محدثین اور سیرت نگاروں نے اس طرح منقح کر دیا کہ ایک ایک پہلو الگ الگ ہمارے سامنے آ گیا۔

چھٹا دور انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوا۔ تقریباً 1280ھ کے لگ بھگ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم سیرت میں تجدید کا زمانہ آیا۔ سیرت پر ایک نئے انداز سے غور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سیرت کے بارے میں مغربی دانشوروں نے وسیع پیمانے پر غور و فکر اور اظہار خیال کیا۔ بہت سے سوالات ایسے اٹھائے جو پہلے گزرے ہوئے مسلمان سیرت نگاروں کے سامنے نہیں تھے۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے انداز سے سیرت پر کام کر رہے تھے۔ جو شخص اپنا سمجھ کر سیرت پر کام کرے گا اس کا انداز اور ہوگا۔ جو پرائی نظر سے دیکھے گا اس کا انداز اور ہوگا۔ جو مسلمانوں کے اندر بیٹھ کر لکھے گا اس کا انداز مختلف ہوگا اور جو باہر سے دیکھ کر لکھے گا اس کا انداز دوسرا ہوگا۔ پھر موافقانہ اور مخالفانہ نظروں سے دیکھنے سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو محبت سے دیکھے گا وہ اور طرح کے سوالات اٹھائے گا۔ جب کہ تنقید سے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں اور طرح کے سوالات پیدا ہوں گے۔ جو محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھے گا اس کی کیفیت اور ہوگی، اور جو تنقید کی نظر سے دیکھے گا اور کمزوریوں کی تلاش میں مطالعہ کرے گا وہ اور طرح کے سوالات اٹھائے گا۔ ان اسباب کی بنا پر مغربی مستشرقین نے بہت سے سوالات

اٹھائے۔ بعض سوالات حقیقی تھے اور بظاہر علمی انداز کے تھے۔ ایسے سوالات کا جواب سیرت نگاروں، محدثین اور اہل علم نے دیا اور سیرت کے فن کو ایک نئی جہت یعنی dimension سے روشناس کیا۔ ان نئی نئی جہتوں کے ساتھ ساتھ مغربی اہل علم کی طرف سے بہت سے اعتراضات بھی کیے گئے اور شبہات کا بھی اظہار کیا گیا جن پر مسلمان محققین اور سیرت نگاروں کی طرف سے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔

انسان کا مزاج یہ ہے کہ جب تک اس کے سامنے کوئی شبہ یا سوال پیش نہ کیا جائے، بہت سی سادہ حقیقتوں پر بھی وہ غور نہیں کرتا۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ یا تاریخ کا کوئی حادثہ سامنے ہوتا ہے۔ مورخین اس کو بیان کرتے رہتے ہیں۔ بہت بعد میں کہیں جا کر لوگ اس پر کوئی خاص سوال اٹھاتے ہیں تو پھر اس کے جواب پر غور شروع ہوتا ہے اور دستیاب مواد کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے تجدید سیرت کے اس دور میں مغربی مستشرقین نے بہت سے سوالات اٹھائے۔ ان سوالات کی روشنی میں سیرت کے علم کو ایک نئی جہت دینے میں بڑی مدد ملی۔

دور حاضر کا آغاز کب سے ہوا، یہ تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ دراصل دور حاضر کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ جس کو زمانہ موجود کہتے ہیں وہ ایک غیر مستقل چیز ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ زمانہ یا ماضی ہوتا ہے یا مستقبل ہوتا ہے۔ حال سے مراد وہ باریک فرضی خط ہے جو ماضی کو مستقبل سے جدا کرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے کی چیز ماضی ہے اور ایک لمحہ بعد آنے والا وقت مستقبل ہے۔ ان کے درمیان جو باریک فرضی خط ہے وہ حال ہے۔ اس لئے زمانہ حال جس کو کہتے ہیں وہ محض ایک مجازی بات ہے۔ اس میں ماضی قریب اور مستقبل قریب کو ملا کر ایک فرضی اور عارضی چیز بنالی جاتی ہے جس کو زمانہ حال کہا جاتا ہے۔ لہٰذا در حقیقت زمانہ حال کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لئے زمانہ حال پر جب سیرت النبی کے حوالے سے بات کی جائے تو ماضی قریب میں جو کچھ ہوا اور مستقبل قریب میں جو کچھ ہونے کی امید ہے اس کو زمانہ حال سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

آئندہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں یعنی foreseable future میں علم سیرت کو کون کون سے مسائل اور چیلنجز درپیش ہیں۔ آئندہ کن موضوعات پر کام ہونے کا اور کس

طرح کے سوالات اٹھائے جانے کا امکان ہے۔ مسلمان اہل علم اور سیرت سے دلچسپی اور شغف رکھنے والوں کو ان مسائل کی جواب دہی اور تحقیق کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس پر ان شاء اللہ آخری گفتگو میں بات ہوگی۔

یہ ادوار بہت ہی تخمینی اور حتمی طور پر طے شدہ نہیں ہیں۔ ان میں خاصا تداخل پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں دور 200 میں ختم ہو گیا اور فلاں دور 600 میں ختم ہو گیا، یہ شاید قطعیت کے ساتھ درست نہ ہوگا۔ 200 ھ سے کچھ معاملات آگے جاچکے ہوں گے۔ بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ دور سنہ ڈیڑھ سو ہجری سے شروع ہوا ہوگا، بعض موضوعات کے اعتبار سے یہ 210 میں شروع ہوا ہوگا۔ لیکن ایک عمومی اندازہ کرنے کے لئے یہ حد بندیاں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

کل میں نے اشارۃً عرض کیا تھا کہ اپنے آباء و اجداد اور اپنے اسلاف کے کارناموں میں دلچسپی لینا اور ان کو محفوظ رکھنا، خاص طور پر آئندہ نسلوں میں اعتماد پیدا کرنا عرب میں ایک طویل عرصے سے مروج تھا۔ یہ وہ چیز تھی جس کو ایام العرب کہتے تھے۔ ہر عرب قبیلہ اسی طرح کے ایام سے متعلق اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں اور ان کی یادداشتوں کو محفوظ رکھتا تھا۔ بڑے بڑے قبیلے کے ایام مشہور ہیں۔ ربیعہ کے ایام مشہور ہیں۔ مضریوں کے بہت سے ایام مشہور ہیں۔ شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے قبائل کے مشہور واقعات اور ایام کی تفصیلات عربی ادب میں اور تاریخ کی قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔ جہاں ہر قبیلہ اپنی کامیابیوں کی تفصیلات محفوظ رکھتا تھا اور بیان کرتا تھا۔ وہاں ان کارناموں کے دوران یا ان پر تبصرہ کرنے کے لئے جو شعر اور قصائد کہے گئے، وہ بھی ان کا حصہ تھے اور وہ بھی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے قبائل کی شکست اور ناکامیوں کی تفصیلات بھی محفوظ رکھی جاتی تھیں تاکہ آئندہ اس قبیلے کے خلاف اقدام کرنے میں ان سے مدد ملے۔ جو کردار آج صحافت ادا کرتی ہے کہ جس کو اٹھانا ہو اس کو اٹھاتی ہے اور جس کو گرانا ہو اس کو گرا سکتی ہے۔ ذرائع ابلاغ جس کو شہرت دینا چاہتے ہوں ان کو شہرت ملتی ہے اور جن کے بارے میں منفی رائے قائم کروانی ہو تو ان کے بارے میں ذرائع ابلاغ منفی رائے بھی قائم کرا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بڑی حد تک یہ کردار شاعر ادا کرتے تھے۔ ہر بڑے قبیلے کا ایک شاعر ہوتا تھا۔ اس قبیلے کے

ایام یا اس کے شاعر کی زبان سے قصائد کی صورت میں ادا ہوتے تھے۔ قبیلے کا بچہ بچہ ان قصائد کو یاد رکھتا تھا۔ اور یہ قصائد ہر تقریب و موقع پر بیان کئے جاتے تھے۔

اسی طرح سے صحابہ کرام نے اس رواج اور طریقہ کار کو سامنے رکھتے ہوئے، جس کو ہم ایام النبی کہہ سکتے ہیں، یا ایام الرسول، اس کے بارے میں تفصیلات جمع کیں۔ ان کو محفوظ رکھا۔ ان ایام کے بارے میں شعراء صحابہ نے جو قصائد لکھے تھے وہ سب کے سب سیرت نگاروں نے محفوظ رکھے ہیں۔ سیدنا حسان بن ثابت شاعر دربار رسالت کہلاتے ہیں، ان کے قصائد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کے قصائد ہیں۔ حضرت کعب بن مالک بھی نامور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے قصائد ہیں۔ اسی طرح جو صحابہ شاعر نہیں تھے، وہ بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، ان سب کے شعر محفوظ ہیں اور قدیم کتب سیرت میں بیان ہوئے ہیں۔

ویسے شعراء بھی تھے جو پہلے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور بعد میں قبول اسلام کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور حمایت میں سامنے آئے۔ ان کے دونوں ادوار کے نمونے محفوظ ہیں۔ حضرت کعب بن زہیر جو اپنے مشہور قصیدہ 'قصیدہ بانت سعاد' کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے دور کا کلام معروف اور مشہور ہے۔ دوسرے دور کا کلام بھی محفوظ اور مشہور ہے۔ مشہور شاعر اور قبائلی سردار ابو سفیانؓ بن الحارث جن کا تذکرہ کتب حدیث میں بہت آتا ہے، ان کا کلام بھی محفوظ ہے۔ بہت سے طلبہ ان کو ابو سفیان بن حرب، حضرت معاویہؓ کے والد سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ بچپن میں حضور کے انتہائی قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے بہت محبت تھی۔ لیکن اعلان نبوت کے بعد کسی وجہ سے پیغام کو قبول نہیں کر پائے۔ مخالفت میں بہت دور چلے گئے اور زبانی، جسمانی، مالی ہر طرح سے حضور کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ مخالفت میں جتنا کلام ابو سفیان کی زبان سے ادا ہوا اتنا کلام شاید ہی کسی نے کہا ہو۔ بعد میں ایک موقع پر فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا اور پھر حضور کی محبت اور عقیدت میں کسی اور صحابی سے پیچھے نہیں رہے۔

آپ نے سنا ہوگا، جب غزوہ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور حضورؐ

کے ساتھ چند ہی لوگ رہ گئے، ان میں سے ایک نام ابوسفیانؓ کا بھی آتا ہے۔ وہ یہی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ اس موقع پر انہوں نے جس جان نثاری سے حضورؐ کا دفاع کیا، اس کے بارہ میں کسی نے کہا، مجھے یاد نہیں کہ یہ حدیث ہے یا کسی صحابی کا قول ہے، لیکن اس موقع پر کہا گیا کہ ابوسفیان نے پچھلی ساری کسر پوری کر دی۔ یہ واقعات تھے جو صحابہ کرام نے سب سے پہلے محفوظ رکھے۔ جن صحابہ کرام کی زبان سے محفوظ ہوئے، وہ شاعر بھی تھے اور ماضی میں ایام العرب میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے۔

کل کی گزارشات میں عرض کیا گیا تھا کہ سیرت پاک کے مصادر اور بنیادی ماخذ میں قرآن پاک بھی شامل ہے۔ قرآن پاک کی تدوین اور جمع بھی ایک طرح سے سیرت کی جمع اور تدوین کے مترادف ہے۔ جب قرآن پاک جمع ہو رہا تھا اور اس کو مدون کیا جا رہا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ سیرت بھی مدون ہو رہی تھی۔ قرآن پاک میں سیرت کے تمام اہم واقعات، خاص طور پر ہجرت سے لے کر حضورﷺ کے آخری غزوہ یعنی غزوہ تبوک تک ہر اہم واقعہ پر قرآن پاک میں تفصیلی تبصرہ موجود ہے۔ مکی دور میں کفار مکہ نے جو اعتراضات کئے، جو سوالات کئے، جو شبہات کئے، ان سوالات کا جواب بھی ہے، شبہات کی وضاحت بھی ہے، غلط فہمیوں اور الجھنوں کی تردید بھی ہے۔ اس طرح سے مکی دور گویا دعوت اسلامی کے نظری پہلوؤں کو اور مدنی دور دعوت اسلامی کے عملی پہلوؤں کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔ قرآن پاک سے مثالیں دی جائیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ لیکن مثال کے طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ بدر کے واقعات قرآن پاک کی سورۃ انفال میں موجود ہیں، کما اخرجک ربک من بیتک بالحق وان فریقاً من المومنین لکارھون۔ اسی طرح سے غزوہ بدر پر پورا تبصرہ سورۃ انفال میں موجود ہے۔ ہجرت کے واقعات سورۃ توبہ کے ایک حصہ میں بیان ہوئے ہیں۔ غزوہ تبوک پر تبصرہ سورۃ توبہ کے ایک حصہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں منافقین کے وجود، ان کی سازشیں اور کرتوت تمام چیزوں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ منافقین نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے کے لئے جو مسجد بنائی، مسجد ضرار، جس کو حضورؐ کے حکم سے گرا دیا گیا، یہ واقعہ قرآن پاک میں مسجد ضرار کے نام کی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ظاہر ہے قرآن پاک کی تدوین کے ساتھ ساتھ یہ سارے معاملات بھی مدون ہو گئے۔

یہ تدوینِ سیرت کا پہلا مرحلہ تھا۔ قرآن پاک کی تدوین کی مزید تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اختصار کے ساتھ دو تین اشارے کئے جاسکتے ہیں۔ قرآن پاک شاید پہلی اور یقیناً آخری مذہبی کتاب ہے جس کو اس کے نزول کے ساتھ ساتھ نہ صرف ضبطِ تحریر میں لایا گیا بلکہ اس کے سینکڑوں اور ہزاروں نسخے بیک وقت تیار ہوئے اور اس کو سینکڑوں اور ہزاروں صحابہ کرام نے اسی وقت زبانی یاد کرنا شروع کیا۔ زبانی یاد کرنے کی روایت تو یقیناً آج بھی کسی قوم میں موجود نہیں ہے۔ آج بھی کسی قوم میں مذہبی کتابوں کے حفاظ نہیں پائے جاتے۔ صرف قرآن پاک کے حفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن پاک جس طرح سے لکھا گیا اس طرح سے کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہوئی تختیاں دے دیں۔ فاخذ الالواح انہوں نے وہ تختیاں لے لیں اور اپنی قوم کو دے دیں۔ یہ تختیاں طویل عرصہ تک ایک تابوت میں محفوظ رہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ وہ تابوت جب ایک جنگ میں گم ہو گیا تو تورات بھی گم ہو گئی۔ اس کے بعد سے آج تک اصلی تختیوں پر لکھی ہوئی تورات نہیں ملی۔ اس واقعہ کے کئی سو سال بعد ایک بزرگ نے جو ہمارے عقیدہ کے مطابق پیغمبر تھے لیکن یہودی ان کو پیغمبر نہیں مانتے، ربی کہتے ہیں۔ ان بزرگ نے بقول یہودیوں کے اپنی یادداشت سے تورات لکھ دی۔ ہم مان لیتے ہیں کہ صحیح لکھ دی ہوگی۔ یہ ایک معجزہ ہی ہوگا کہ انہوں نے اپنی یادداشت سے صحیح لکھ دی ہو۔ لیکن وہ جو لکھی گئی تھی وہ بھی بعد میں آگے جا کر ایک دوسری جنگ میں ضائع ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی ربی یا نبی ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے پوری تورات اپنی یادداشت سے لکھی ہو۔ اس کے بعد تورات کے نام سے جو کچھ بھی ہے وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس کے پورے مندرجات کو جوں کا توں کلام الٰہی ماننا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام پر اخلاقی نوعیت کے الزامات ہیں۔ ان الزامات میں نعوذ باللہ قتل، بدکاری اور اغوا کے الزامات بھی شامل ہیں۔ اس تورات میں کہا یہ گیا ہے کہ جب موسیٰ مر گیا تو سڑک کے کنارے ایک چٹان کے نیچے اس کو دفن کر دیا گیا، چنانچہ فلاں جگہ دائیں طرف موسیٰ کی قبر ہے۔ یہ کتاب یقیناً وہ کتاب نہیں ہو سکتی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی کیونکہ اس میں ان کی قبر کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے انتقال کا قصہ بھی بیان ہوا۔ یہی کیفیت دوسری کتابوں کی

بھی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کو لکھوایا ہی نہیں۔ ان کا پیغام زبانی ہی چلتا رہا۔ انہوں نے پیغام کو زبانی طور پر پہنچانے پر اکتفا کیا۔ یہی حال بقیہ کتابوں کا ہے۔ اس لئے قرآن مجید پہلی اور آخری کتاب ہے جو اپنے نزول کے ساتھ ساتھ لکھی گئی اور لکھوائی گئی۔ مکہ کے دور آغاز سے ہی اس کو لکھوایا جانا شروع کر دیا گیا۔ ایک واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ جب قبول اسلام کے دن غصہ کے عالم میں اپنی بہن کے گھر گئے۔ وہاں ان کو اندر سے ایک آواز سنائی دی جس کو سننے کے بعد وہ مزید غصہ کے عالم میں اندر پہنچے۔ وہاں ایک صحابی حضرت خباب بن ارتؓ کاغذ کا ایک پرزہ لئے ہوئے سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو پڑھا رہے تھے۔ بہن نے وہ کاغذ یا جس چیز پر بھی وہ آیات لکھی ہوئی تھیں، اس کو اپنے گھٹنے کے نیچے رکھ لیا۔ حضرت خباب ایک دوسرے کمرے میں چھپ گئے اور حضرت عمرؓ کو اندر بلا لیا گیا۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور سے ہی مکہ مکرمہ کے انتہائی مشکل دور میں اور انتہائی پریشانی کے زمانے میں بھی اس بات کا اہتمام تھا کہ جیسے جیسے قرآن پاک کی آیات نازل ہوتی جائیں ان کو لکھا جائے۔ ان کو گھر گھر پہنچا دیا جائے اور ایک معلم ہر گھر میں جا کر اس چیز کی تعلیم دے اور تحریری ذخیرہ بھی فراہم کر دے۔ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مکی اوپن یونیورسٹی تھی جس میں یونٹ بھی لکھے جا رہے تھے۔ طلبہ کو درسی یونٹ بھی فراہم کئے جا رہے تھے اور ایک موبائل معلم لوگوں کے گھروں میں جا کر مختلف اوقات میں ان کو قرآن پاک پڑھاتا بھی تھا۔ مکی دور تک تو یہ طریقہ رہا۔ مدنی دور میں پھر سرکاری سطح پر انتظام ہوا۔ رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے اجزا نازل ہو چکے ہوتے تھے، ان کو سنایا کرتے تھے اور ان دوبارہ مرتب کراتے تھے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ 'وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیهم بکرة واصیلا'۔ مفہوم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کہتے ہیں کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ان کو صبح شام پڑھ کر سنایا جاتا ہے اور اکتتبها یعنی یہ لوگوں سے لکھواتے ہیں۔ یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی تھی رسول اللہ ﷺ اس کو

پاس صندوق میں یہ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ کسی کے بارے میں ملتا ہے کہ میں نے ان سب اجزا کو ایک تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔ کسی کے بارے میں ملتا ہے کہ میں نے یہ سب چیزیں ایک الماری میں محفوظ کی تھیں۔ کاغذ کے پرزے، لکڑی اور پتھر کی تختیاں یہ سب محفوظ تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن پاک کی یہ صورت حال تھی کہ لاکھوں صحابہ کرام کو جزوی طور پر قرآن پاک یاد تھا۔ ہزاروں کو مکمل طور پر یاد تھا۔ ہزاروں کے پاس تحریری صورت میں غیر مرتب صورت میں موجود تھا۔ بہت سے صحابہ کرام ایسے تھے جن کے پاس تحریری صورت میں مکمل طور پر مرتب موجود تھا۔ انہوں نے جس کو ترتیب دے دیا تھا۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی۔ ان میں 700 صحابہ کرام ایسے تھے جو قرآن پاک کے حافظ تھے۔ حفاظ صحابہ کی اس شہادت سے حضرت عمر فاروقؓ کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر حفاظ صحابہ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کی ترتیب کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ ہر ایک کے پاس قرآن پاک کے اجزاء سارے کے سارے تحریری طور پر تو محفوظ ہیں۔ ہزاروں صحابہ کرام قرآن کے حفاظ بھی موجود ہیں۔ لیکن اگر حفاظ ایک ایک کر کے دنیا سے چلے گئے تو آئندہ آنے والوں کو یہ التباس پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن کی ترتیب کیا ہے۔ ایک تھیلے میں سب سورتیں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں سورۃ الفاتحہ پہلے ہے، بقرہ پہلے ہے یا آل عمران پہلے ہے؟۔ یہ بعد میں آنے والے غیر حفاظ کو کون بتائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں آنے والا کوئی آل عمران کو پہلے لکھ دے اور بقرہ کو بعد میں لکھے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ سورۃ العلق پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے اس کو پہلے لکھنا چاہئے اور بقیہ سورتوں کو بعد میں لکھنا چاہئے۔ تو ترتیب بدلنے کا پورا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت عمر فاروقؓ نے مشورہ دیا۔ صدیق اکبرؓ نے اس کو تسلیم کیا اور قرآن پاک کا ایک سرکاری نسخہ موجودہ ترتیب کے ساتھ یعنی ترتیب تلاوت کے ساتھ، جس ترتیب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے، جس ترتیب سے آپؐ نے ہر سال دور کیا، جس ترتیب سے صحابہ کرام نے یاد کیا، اس ترتیب سے اس کو مرتب کروا دیا گیا اور مسجد نبوی میں رکھ دیا گیا۔ صحابہ کرام اپنے طور پر بھی نسخے تیار کرتے رہے۔ بہت سے صحابہ کرام کے اپنے نسخے تھے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بعض صحابہ نے اپنی یادداشت سے نسخے لکھے ہیں۔ بعض نے اپنی یادداشت میں کسی لفظ کے معنی بھی لکھے تھے۔ بعض نے بین السطور میں مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے تھے۔ بعض صحابہ نے اپنی یادداشت والے نسخوں میں کچھ اور معلومات بھی لکھی تھیں۔ چونکہ صحابہ کرام نے وہ چیزیں جو ان کو بہت یاد تھیں ان کو لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً اپنی یادداشت کے لئے لکھے جانے والے نسخہ میں بعض صحابہ نے سورۃ فاتحہ نہیں لکھی۔ بعض صحابہ کو آخری دو سورتیں یاد تھیں، انہوں نے ان کو لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نسخہ میں یہ سورتیں نہیں تھیں۔ ان کا ایک ذاتی نسخہ تھا جس میں انہوں نے سورۃ الفاتحہ اور آخری دو سورتوں کو لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ انہوں نے اپنی یادداشت کے لئے دعائے قنوت لکھی تھی۔ اب اس کا امکان موجود تھا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کا نسخہ ان کے ورثاء کے پاس جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی غلط فہمی کا فوری طور پر تو کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لئے کہ وہ تابعین کی نسل تھی۔ تبع تابعین کی نسل میں بھی کسی غلط فہمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں اگر وہ نسخہ کسی مستشرق کی نظر میں آجاتا تو وہ زمین و آسمان ایک کر دیتا کہ دیکھو! قرآن کے بارے میں محفوظ ہونے کا بڑا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دیکھئے اس نسخہ میں تین سورتیں کم ہیں اور ایک الگ سورۃ موجود ہے جو مسلمانوں نے قرآن کے سرکاری نسخوں سے نکال دی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے یہ طے کیا کہ جس جس کے پاس قرآن مجید کا جو نسخہ لکھا ہوا ہے وہ سب ضبط کر کے ضائع کر دیا جائے۔ بظاہر یہ فیصلہ بڑا سخت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے ایسا ہی کیا، اور تمام نسخے ضبط کر کے ضائع کرا دیئے اور حکم دیا کہ آئندہ قرآن مجید کے جو بھی نسخے لکھے جائیں وہ اس نسخہ اور اس کے ہجا کے مطابق لکھے جائیں جو اب سرکاری طور پر تیار کرائے گئے ہیں۔ صحابہ کرام کے اتفاق رائے سے حضرت عثمان غنیؓ نے یہ بھی طے کیا کہ قرآن پاک کی ہجا میں اس نسخہ کی پیروی کی جائے جو حضرت زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں لکھا تھا۔ آج تک مشرق و مغرب میں قرآن پاک کے تمام نسخے اسی ہجا کے مطابق لکھے جاتے ہیں جس ہجا کے مطابق حضورؐ کے کاتب خاص حضرت زید بن ثابت نے حضورؐ کی زندگی میں بھی قرآن کی کتابت کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں

قرآن کا مکمل نسخہ تیار کیا۔ اس میں اور عربی زبان کے ہجوں میں کہیں کہیں فرق ہے۔ لیکن قرآن پاک لکھا جاتا ہے تو اسی ہجا کے مطابق، اور عربی کی عام عبارت کوئی لکھتا ہے تو دوسری ہجے کے مطابق لکھتا ہے۔ کتاب کا لفظ قرآن پاک میں بہت سی جگہوں پر ک ت ب اور ت پر کھڑا زبر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ عربی زبان یا اردو اور فارسی میں کتاب کا لفظ لکھیں تو ک ت ب کے ساتھ بیچ میں بلکہ ت الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ رحمان کا لفظ قرآن پاک میں میم پر کھڑے زبر کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی ایک حرف رہ گیا، اس کے رہ جانے کی وجہ معلوم نہیں۔ وکذالک ننجی المومنین سترہویں پارے میں ہے۔ اس میں آپ دیکھیں ایک ہی نون ہے۔ ہمارے جیسے عجمی لوگوں کے لئے کاتبوں نے ایک چھوٹا سا نون الگ سے لکھا ہوتا ہے جو بین السطور لکھا جاتا ہے، مصحف میں نہیں لکھا ہوتا۔ لکھا ہوا ایک نون ہے لیکن پڑھے جاتے ہیں دو نون، وکذالک ننجی المومنین۔ مثلاً انیسویں پارے کے شروع میں ایک جگہ ہے کہ لااذبحنہ، اس میں دو الف ہیں۔ لیکن پڑھی جاتی ہے ایک۔ یہ اس لئے کہ حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھا تھا۔ کیوں لکھا تھا، اس کے بارے میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے جو یہاں غیر ضروری ہے۔ لیکن ان دو مثالوں سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن پاک کے ہجا کے بارے میں بھی اسی طرز املا کی پیروی کی گئی۔ اسی طرز املاء سے ایک نقطے یا حرف کے انحراف کو بھی جائز نہیں سمجھا گیا اور اس کی سو فیصد پیروی کی گئی۔ گویا سیرت کا جو پہلا، اولین اور بنیادی ماخذ ہے وہ مکمل طور پر ہمارے سامنے آگیا اور اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ مذہبیات، ادبیات، قانون اور فکر و فلسفہ کی پوری تاریخ میں کوئی چیز بھی اتنی ثقاہت کے ساتھ محفوظ نہیں کی گئی۔ جس چیز کو لاکھوں کروڑوں لوگ زبانی یاد کر لیں اس سے زیادہ محفوظ کسی چیز کا تصور نہیں ہو سکتا۔

سیرت کا دوسرا مصدر، جیسے کہ احادیث کا بیان کیا تھا، حدیث کی تدوین کی تاریخ بھی ایک اعتبار سے سیرت کی تدوین کی تاریخ ہے۔ حدیث کی ہر کتاب میں سیرت پاک سے متعلق مستند اور ضروری مواد موجود ہے۔

علم حدیث مسلمانوں میں روز اول سے ایک انتہائی محترم، مقدس اور مقبول علم رہا ہے۔ ہر دور کے بہترین ذہنوں اور بہترین دماغوں نے علم حدیث کی خدمت کی ہے۔ ابھی گزشتہ

چند سالوں سے یہاں اردن کے ایک سرکاری ادارے نے اسلامی مخطوطات کی ایک بہت بڑی اور بہت جامع اور مکمل فہرست شائع کی ہے۔ اس میں علم حدیث کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ان فہرستوں میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان کے مطابق اس وقت تقریباً مخطوطات پر ایک مکمل جلد ہے۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں صحیح بخاری کے چھ سات اور آٹھ آٹھ سو سال اور ایک ہزار سال پرانے کئی ہزار نسخے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ جس سے یہ بات بالکل واضح اور ثابت ہوتی ہے کہ حدیث کی مشہور کتابیں دنیا کے ہر علاقے میں موجود تھیں اور دنیائے اسلام کے ہر حصہ میں لکھی گئیں۔ وہ متداول اور مشہور ہیں۔ ان میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کو میں بطور مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ اس میں امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو اسلام کی دعوت کیسے دی۔ اس باب میں امام بخاری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکمرانوں کے نام جو خطوط لکھے ان میں قیصر روم کے نام لکھا جانے والا خط یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد عبدالله ورسوله الى هرقل عظيم الروم

اما بعد

سلام على من اتبع الهدى

اما بعد فاني ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم يؤتك الله اجرك مرتين، فان توليت فعليك اثم الاريسيين .....

والسلام على من تبع الهدى

محمد رسول الله

یہ متن امام بخاری نے بیان کیا ہے۔ آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پہلے اس نامہ مبارک کا اصل متن دریافت ہوا جس پر بہت سے مغربی اور مشرقی ماہرین نے غور کیا۔ اس پر ہزاروں صفحات کی گفتگو ہوئی، مختلف نگاہوں سے تحقیق ہوئی ہیں۔ کتابوں میں اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً خیال کیا گیا... دریافت شدہ نامہ مبارک میں اور صحیح بخاری کے اس متن میں ذرہ

چکی ہے۔

اس سے پہلے کتاب رسول حضرت ابوہریرہؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ ان کے شاگرد ہمام بن منبہ نے مرتب کیا تھا وہ نسخہ دریافت ہوا۔ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے اس کو ایڈٹ کیا۔ انگریزی، اردو، فرانسیسی، جرمن اور دوسری کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ وہ نسخہ بھی آج مطبوعہ موجود ہے۔ ترکی کے ایک انتہائی بالغ نظر اور دور جدید کے صف اول کے محققین میں سے ایک محقق ڈاکٹر فواد سیزگین ہیں، جو جرمنی میں رہتے ہیں اور جرمن زبان میں انہوں نے اسلامی موضوعات پر انتہائی عالمانہ کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کے مصادر و مآخذ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ صحیح بخاری کے مآخذ کے بارے میں انہوں نے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا اور جس کا کوئی جواب کسی مغربی مستشرق کے پاس نہیں تھا کہ صحیح بخاری میں جو مواد شامل ہے وہ نہ صرف سارے کا سارا معتبر ترین زبانی روایت کے ساتھ امام بخاری تک پہنچا بلکہ اس میں ہر روایت کے پیچھے مسلسل تحریری ذخائر بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ عبدالرزاق صنعانی امام بخاری کے رواۃ میں شامل تھے۔ وہ امام بخاری کے اساتذہ کے استاذ تھے۔ امام بخاری نے بہت سی روایات عبدالرزاق سے لیں۔ عبدالرزاق کی اپنی کتاب موجود تھی جو اس وقت تک نہیں چھپی تھی وہ اب چھپ گئی ہے۔ وہ ساری احادیث جو امام بخاری نے عبدالرزاق کے توسط سے لی ہیں وہ جوں کی توں مصنف عبدالرزاق میں موجود ہیں۔ عبدالرزاق کے استاد تھے معمر بن راشد ازدی۔ ان کی کتاب جامع اس وقت نہیں چھپی تھی اب چھپ گئی ہے۔ اس میں وہ تمام احادیث جو عبدالرزاق نے معمر بن راشد سے لی ہیں وہ سب جوں کی توں موجود ہیں۔ معمر کے سامنے جو ذخائر موجود تھے ان میں سے بعض چھپ گئے ہیں جن میں وہ احادیث موجود ہیں۔ گویا ایک ایک مرحلے پر زبانی روایتیں بھی اور اساتذہ، تابعین اور تبع تابعین کی موجود تھیں۔ اور ان میں سے ہر روایت کے پیچھے ہر محدث کے پاس تحریری ذخائر اور تحریری سند بھی موجود تھی۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں کئی صحابہ کرام تھے جو حضور کی اجازت سے احادیث لکھنے کا کام کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں۔ ان کا مزار مبارک مصر میں ہے۔ وہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے

ہیں۔ یہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور والد محترم سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضور کی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ لکھا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، حضور کبھی حزن کی کیفیت میں ہوں گے، کبھی غصے میں ہوں گے۔ اس لئے ہر چیز لکھنا شاید درست نہ ہو۔ انہوں نے حضور سے عرض کیا کہ بعض لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم ضرور لکھ لو، کیونکہ میری اس زبان سے حق کے علاوہ کوئی چیز نہیں نکلتی۔ چنانچہ وہ حضور علیہ السلام کے ارشادات کو آپ ہی کی مجلس میں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ محفوظ ہے اور فن حدیث کے طلبہ اس سے خوب واقف ہیں۔ طلبہ حدیث نے بعض احادیث کی سند پڑھی ہو گی: عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ۔ یہ وہی مجموعہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی احادیث عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور اپنے پردادا سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے پردادا سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں۔ یہ پورے کا پورا مجموعہ امام احمد کی مسند میں موجود ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مجموعہ یعنی الصحیفۃ الصادقۃ یوں تو احادیث کے بہت سے موضوعات پر مشتمل ہے لیکن اس میں خالص سیرت نبوی سے متعلق بھی اہم مواد ہے۔ چنانچہ حضور کے بعض غزوات نبوی، فتح مکہ اور حجۃ الوداع جیسے اہم وقائع سیرت کے بارہ میں اس مجموعہ میں معلومات ملتی ہیں۔

اسی طرح سے خود حضرت ابو ہریرہ اپنے دست مبارک سے احادیث لکھا کرتے تھے۔ وہ حضور سے جتنی احادیث سنتے تھے گھر جا کر لکھ لیا کرتے تھے۔ نہ صرف لکھا کرتے تھے بلکہ جب تک زندہ رہے اس مجموعے کی تلاوت کرتے رہتے تھے، اس کو یاد کرتے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنی یادداشت کو اس تحریری ذخیرہ کی روشنی میں چیک کرتے رہتے تھے۔ ایک زمانے میں مروان بن حکم مدینہ کے گورنر بن کر آئے۔ انہوں نے کئی بار حضرت ابو ہریرہ کے درس میں شرکت کی۔ کافی عرصہ بعد جب وہ خلیفہ ہو گئے اور اپنے زمانہ خلافت میں حج کرنے آئے تو پھر حضرت ابو ہریرہ کے درس میں گئے۔ ان کو خیال آیا کہ اب حضرت ابو ہریرہ عمر رسیدہ ہو گئے ہیں اور اپنی یادداشت سے احادیث سناتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کو صحیح یاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔ انہوں نے خفیہ طور پر ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ پردے کے پیچھے بیٹھو اور جو کچھ

ابو ہریرہ کہیں، وہ لکھتے جاؤ۔ مروان بن حکم دمشق واپس چلے گئے۔ دو ڈھائی سال کے بعد پھر آنا ہوا تو اپنے کاتب کو ساتھ لائے اور حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ میں آپ سے فلاں فلاں احادیث سننا چاہتا ہوں۔ کاتب سے کہا کہ دیکھتے رہنا۔ حضرت ابو ہریرہ نے زبانی سنانا شروع کر دیا اور کاتب پیچھے بیٹھ کر اپنی تحریر دیکھتا رہا۔ جب حضرت ابو ہریرہ پورا سنا چکے تو کاتب نے تصدیق کی کہ جو کچھ سنایا ہے وہ وہی ہے جو کئی سال قبل ان سے سن کر لکھا گیا تھا۔ مروان نے فرطِ جذبات سے ان کی پیشانی چوم لی اور کہا کہ میں نے آج سے تین چار سال پہلے آپ سے جو احادیث سنی تھیں ان میں اور آج سنی ہوئی احادیث میں ایک لفظ اور ایک حرف کا بھی فرق نہیں پایا۔ نہ اس میں کوئی کمی ہے اور نہ بیشی۔ میں یہی چیک کرنا چاہتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ کیا آپ کو یہ شک ہے کہ ابو ہریرہ حضور کے بارے میں غلط باتیں بیان کرے گا۔ مروان سے کہا کہ چلو میرے ساتھ۔ چنانچہ اسی وقت اٹھے اور خلیفہ کو اپنے گھر لے جا کر ایک کمرے میں موجود بڑے بڑے تحریری ذخائر دکھائے اور کہا کہ یہ میرے تحریری ذخائر ہیں۔ یہ حضور کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ میں روزانہ ان میں سے ایک جز کو یاد کرتا ہوں اور دہراتا ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جس دن مجھے پتہ چلا کہ میری یادداشت جواب دے رہی ہے میں اسی دن حدیث سنانا بند کر دوں گا۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ کی سنت کو جس اہتمام اور محبت سے جمع کیا ہے۔ پھر جس بالغ نظری سے تابعین اور تبع تابعین نے اس فن کو ترقی دی اس کی وجہ سے علم حدیث اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ اس طرح کے معمولی شبہات اور معمولی شکوک ان بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکتے۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کوئی ڈھائی سو کے قریب دستاویزات کا املا کرایا۔ وہ ڈھائی سو دستاویزات تو وہ ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔ ممکن ہے اس سے زیادہ ہوں۔ آج ہمارے پاس ڈھائی سو دستاویزات کا متن موجود ہے۔ گویا یہ بھی علم حدیث کا ایک اہم حصہ ہے۔ حدیث وہ ارشاد یا کلام ہے جو حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے، جو کام کیا ہو، یا صحابہ کرام نے ان کے سامنے کوئی کام کیا ہو اور حضور نے ان کو منع نہ کیا ہو۔ لہٰذا ان دستاویزات میں سے ہر دستاویز ایک حدیث ہے۔ یہ ہیں وہ نامہ ہائے مبارک جن کی اصل موجود

ہے۔ یہ بھی دستاویزات ہیں جو کتابی صورت میں موجود ہیں۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جتنے لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں ان سب کے نام لکھ کر مجھے دو۔ "اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام"۔ یہ اسلام میں مردم شماری کی پہلی مثال تھی۔ صحابہ کرام کہتے ہیں کہ ہم نے ڈیڑھ ہزار مردوں کی فہرست بنا کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دی۔ غالباً مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے تین چار سال بعد کا واقعہ ہوگا کہ حضور کے حکم سے تمام صحابہ کرام کی فہرست تیار کی گئی۔ یہ بھی حضور کے زمانے میں حدیث کو مرتب کرنے کا اور سیرت کے واقعات کو لکھنے کی ایک مثال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کا ذکر ہے۔ بعض نے کہا کہ دونوں مواقع پر ایسا ہوا۔ خطبہ ختم ہوتے ہی ایک صحابی ابوشاہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ خطبہ میرے لیے لکھوا دیں، اس میں بہت قیمتی باتیں ہیں۔ بخاری میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "اکتبوا لابی شاہ" ابوشاہ کو لکھ کر دے دو۔ صحابہ کرام نے حضور کے حکم سے ابوشاہ کے لیے ایک یا دونوں خطبے لکھ دیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بعض منشور بھی جاری فرمائے۔ کل میں نے عمرو بن حزم کے نام لکھے ہوئے ایک منشور کا ذکر کیا تھا جس کا متن آج موجود ہے۔ حضرت علی کو جب یمن بھیجا تو ان کو ایک دستاویز لکھ کر دی۔ وہ بھی موجود ہے۔ ایسے بھی ہوا کہ بعض وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ خاص طور پر سنہ ۹ ھ میں جس کو عام الوفود کہتے ہیں۔ عرب قبائل نے بڑی تعداد میں آکر اسلام قبول کیا۔ ان میں سے کئی عرب قبائل نے واپس جا کر اپنی ملاقاتوں کی روداد لکھیں۔ وہ رودادیں طبقات ابن سعد میں موجود ہیں۔ کئی دوسرے مورخین نے بھی ان رودادوں کو محفوظ کیا ہے۔

تدوین حدیث کے بارے میں مزید تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہ چند مثالیں اس بات کی ہیں کہ حدیث جو سیرت کا دوسرا ماخذ ہے اس کی تفصیلات رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے ضبط تحریر میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ تابعین کے زمانے میں بہت سارے صحابی اور تابعین نے تحریری مجموعے تیار کیے جن کا تذکرہ ملتا ہے۔ تبع تابعین کے دور کے مجموعے تو بڑی تعداد میں پہلے ہی سے ہمارے پاس موجود تھے، اب تابعین کے مجموعے بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔

تیسرا مرحلہ یا تیسرے مرحلے کا پہلا اسٹیج تدوین سیرت کا ہے۔ سیرت کے واقعات کی تفصیلات صحابہ کرام اور تابعین نے جمع کرنا شروع کر دیں اور ان کو محفوظ کرنا شروع کیا۔ یہ تفصیلات قرآن پاک اور حدیث میں آئی ہوئی چیزوں کے علاوہ ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے مستشرقین اور منکرین حدیث بڑی یہ بات دہراتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کے علاوہ دوسری چیزوں کے لکھنے کی ممانعت کی تھی۔ اس مضمون کی بعض احادیث بھی موجود ہیں۔ وہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا لکھا جانا یا رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کا ضبط تحریر میں لایا جانا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جن حضرات نے ایسا کیا انہوں نے فرمان نبوی کو نظر انداز کر کے یہ کام حضور کی منشا کے خلاف کیا اور ایک چیز اسلام میں داخل کر دی جس سے حضور نے منع کیا تھا۔ یہ ایسی بات ہے منکرین حدیث پاکستان میں بھی اور بیرون ملک بھی بہت کثرت سے کہتے رہتے ہیں۔

ابھی میں نے تدوین حدیث کی مثالیں آپ کے سامنے بیان کیں۔ حضور کی موجودگی میں صحابہ کرام کے تحریری ذخائر موجود تھے۔ حضور کی اجازت سے صحابہ کرام آپ کے ارشادات گرامی کو لکھ رہے تھے۔ اس لئے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ حضور ﷺ نے جس چیز کی ممانعت کی تھی وہ حدیث کی تدوین تھی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جس چیز کی ممانعت فرمائی تھی وہ دو طرح کی تھی۔ ایک تو ممانعت کی یہ بات ان صحابہ کرام سے کہی گئی جو وحی کے کاتبین تھے۔ حضور علیہ السلام نے انہیں منع کیا کہ تم قرآن کے علاوہ کچھ مت لکھو۔ لاتکتبوا عنی غیر القرآن۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں کہ مجھ سے سن کر قرآن کے علاوہ کچھ مت لکھو۔ یہ بات آپ نے اس لئے ارشاد فرمائی کہ یہ خطرہ موجود تھا کہ کاتبان وحی مثلاً حضرت زید بن ثابت کے اپنے ذخائر میں اگر ان کے دست مبارک سے لکھی ہوئی کوئی چیز قرآن کے علاوہ ہوتی تو ان کے بعد آنے والوں میں کسی کو یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ نوشتہ بھی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی قرآن ہو سکتا ہے۔ تو پہلی ممانعت تو حضور نے کاتب وحی کے لئے فرمائی۔ یعنی کاتبین وحی اپنے ہاتھ سے وحی کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کوئی اور چیز نہیں لکھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور

کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے ہدایات اور رہنمائی لیا کرتے تھے۔ اس طرح سے علم حدیث کے سارے ذخائر تابعین تک منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ جو صحابہ کرام علم حدیث کے ذخائر تابعین تک پہنچا رہے تھے وہ خود بھی درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی صحابہ کرام ایسے تھے جنہوں نے عام مضامین حدیث کی بجائے خاص اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ سیرت کے موضوعات پر توجہ دی اور سیرت کے موضوعات کے درس و تدریس کو مشغلہ بنایا۔

حضرت براء بن عازب مشہور انصاری صحابی ہیں۔ ان کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ صرف مغازی اور سیرت کے بارے میں املا کرایا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد ابو اسحاق السبیعی ہیں۔ انہوں نے ان سے روایات لیں اور ان کے سارے مجموعے کو مرتب کیا۔ حضرت براء بن عازب اپنا ذخیرہ معلومات املا کرایا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے طلبا ان کے مجموعہ احادیث و سیرت کے واقعات کو لکھتے تھے۔ ان شاگردوں میں ابو اسحاق بھی شامل تھے۔ اس طرح سے حضرت براء بن عازب کے پاس علم سیرت کے جو کچھ ذخائر تھے وہ ان کے شاگرد ابو اسحاق کے پاس آ گئے۔ امام بخاری کی صحیح بخاری میں مغازی اور سیرت کے بارے میں درجنوں روایات ایسی ہیں جو براء بن عازب اور ابو اسحاق کی روایت سے منقول ہیں۔ گویا براء بن عازب نے جو روایات بیان کی تھیں اور جو ابو اسحاق تک پہنچی تھیں وہ درجہ بدرجہ امام بخاری تک پہنچ گئیں۔ اور امام بخاری نے ان کو اپنی کتاب میں محفوظ کر لیا۔

یہ جو مستشرقین اور ان کے مشرقی مقلدین کہتے ہیں کہ علم حدیث کا سارا ذخیرہ چوتھی صدی ہجری میں لکھا گیا ان کی غلط فہمیوں کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ احادیث کے جو بڑے بڑے مجموعے امت میں مقبول ہوئے وہ زیادہ تر تیسری اور کچھ چوتھی صدی ہجری کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں، یا شاید بھلا دیتے ہیں، کہ زیادہ مکمل اور زیادہ بہتر کام جلدی مقبول ہو جاتا ہے اور کم درجے کے یا ابتدائی مرحلے کے کام سے لوگوں کو مستغنی کر دیتا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی کتابیں اس لئے مقبول ہوئیں کہ چوتھی صدی ہجری تک وہ سارا مواد ایک ایک کر کے سامنے آ گیا تھا جو پہلی اور دوسری صدی میں مدون ہوا تھا۔ حضرت براء بن عازب کا مجموعہ تو ظاہر ہے کہ دو چار سو روایات پر مشتمل ہوگا۔ ان

واقعات پیش ہوئے تھے جو انہوں نے خود دیکھے۔ لیکن بعد میں آنے والے تابعین نے حضرت براء کی معلومات بھی لیں۔ حضرت قاسم بن ولید سے آنے والی معلومات بھی لیں۔ بقیہ صحابہ سے بھی معلومات ملیں اور ان کو یکجا کر دیا۔ تو ایک تابعی کے پاس ایک صحابی کی بجائے دس صحابہ کے مجموعے آگئے۔ تبع تابعی کے پاس تین صحابہ کے مجموعے آگئے۔ تبع تابعین کے بعد جو لوگ آئے ان کے پاس اور زیادہ معلومات جمع ہو گئیں۔ یوں جب امام بخاری اور ان کے معاصرین کا زمانہ آیا تو صحیح اور مستند، ناقابل تردید، قابل اعتماد اور مستند ذرائع جن سے حدیث تھی تو وہ مختصر یا زیادہ جامع اور زیادہ مکمل مجموعے سامنے آگئے۔ ان مجموعوں نے لوگوں کو ابتدائی مجموعوں سے مستغنی کر دیا۔ یوں ابتدائی مجموعوں کی ضرورت نہیں رہی۔ یعنی اگر کسی کے پاس صحیح بخاری موجود ہو تو اس کو تین تین چار چار احادیث کے چھوٹے چھوٹے مجموعے رکھنے کی ضرورت تھی۔ چھوٹے مجموعوں کی تاریخی حیثیت تو اپنی جگہ برقرار تھی۔ لیکن عام دینی اور تعلیمی ضروریات کے لئے بڑے مجموعوں نے لوگوں کو چھوٹے مجموعوں سے مستغنی کر دیا۔ جس طرح آج ہر جگہ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن دو چار سو سال بعد شاید ان کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ کمپیوٹر پر ساری کی ساری کتابیں دستیاب ہوں گی۔ اب آنے والا بٹن کو دبا کر دیکھ لے گا۔ جناب کی ڈسک پر احادیث کی کتابیں تو تیسری صدی میں مرتب ہوئی ہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ یہ بات غلط ہوگی کیونکہ تیسری صدی کی یہ ڈسک پر جو مجموعہ وہ فراہم ہوگا وہ پچھلی صدیوں میں مرتب ہونے والے کام کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ امام بخاری، امام ترمذی اور امام مسلم، یہ حضرات جو مجموعے مرتب کر رہے تھے وہ پچھلی تحریری اور زبانی ذخائر کی بنیاد پر مرتب کر رہے تھے جو ان تک پہنچے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں واضح طور پر یہ روایت آئی ہے کہ وہ مختلف علوم کے حلقے پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس پہلے صحابی تھے جن کا لقب ترجمان القرآن تھا۔ ان کے وقت کا ایک حصہ عربی زبان و ادب کے لئے مقرر تھا۔ وہ عربی زبان و ادب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کے وقت کا ایک حصہ تفسیر کے لئے مقرر تھا جس میں وہ تفسیر پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مقررہ وقت میں وہ حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ ایک خاص وقت میں وہ مغازی پڑھایا کرتے تھے۔ غزوات اور سیرت کے بارے میں جو معلومات ان کو تھیں

وہ معلومات تابعین تک پہنچایا کرتے تھے۔ غزوات اور سیرت کے بارے میں ان کی جو اپنی یادداشتیں اور نوٹس تھے وہ مقدار میں اتنا زیادہ تھے کہ لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ "کان عندہ حمل بعیر" ان کے پاس ایک اونٹ کے وزن کے برابر یادداشتیں تھیں۔ مجھے حتمی طور پر یہ معلوم نہیں کہ ایک اونٹ کتنا وزن اٹھاتا ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ چھ سو من کے قریب وزن ایک اونٹ اٹھاتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے نوٹس کئی من وزن کے کاغذات اور یادداشتوں پر مشتمل ضرور ہوتے ہوں گے۔ آپ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ تشریف لے جایا کرتے تھے تو آپ کی یادداشتیں ایک اونٹ پر لاد کر لے جائی جاتی تھیں۔ اس ذخیرے میں کیا کیا تھا، یہ ہم نہیں جانتے۔ تاہم جو بھی حضرت عبداللہ بن عباس کا علم تھا وہ عربی زبان وادب، یعنی قرآن کے لغوی پہلو کے بارے میں ہو، مغازی اور سیرت کے بارے میں ہو، یا احادیث کے بارے میں ہو، وہ اتنا تھا کہ ایک اونٹ سے کم پر اس کو اٹھایا نہیں جاسکتا تھا۔

علم حدیث اور علم مغازی شروع میں ایک ہی علم یا فن کا حصہ تھے اور محدثین اور اصحاب سیر دونوں کی یکساں دلچسپی کے موضوعات تھے۔ صحابہ کرام جو احادیث بیان کیا کرتے تھے وہ مغازی کے باب میں بھی بیان کرتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دونوں علم ترقی کرکے الگ الگ ہوتے گئے۔ علم حدیث الگ اور علم مغازی الگ ہوگئے۔ ان دونوں میں تخصص بھی الگ الگ نمایاں طور پر سامنے آگیا۔ کچھ لوگ مغازی کے متخصص قرار پائے اور کچھ لوگ علم حدیث کے متخصص بن گئے۔ پھر مغازی کا مطالعہ دو پہلوؤں سے ہونے لگا۔ کچھ لوگوں نے مغازی کا مطالعہ واقعات اور تاریخ کے نقطۂ نظر سے کیا۔ کچھ حضرات نے مغازی کا مطالعہ اسلام کے قانون جنگ وصلح کے ماخذ کے طور پر کیا۔ اسلام کا بین الاقوامی قانون اول اول مغازی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا ارشادات فرمائے۔ لوگوں سے معاملہ کیسے کیا۔ کس طرح سے اپنی جنگوں کو منظم کیا۔ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ معاہدے کئے تو کیسے کئے اور ان کی پاسداری کی تو کیسے کی۔ کچھ لوگ ان موضوعات میں دلچسپی لینے لگے۔ اس لئے پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے شروع سے یہ دو الگ الگ فن بن گئے۔ ایک علم سیر کہلایا جس کو آپ اسلام کا بین الاقوامی قانون کہہ سکتے

ہیں، اور دوسرا علم، مغازی کہلایا جو گویا سیرت کا ایک شعبہ بنا۔ بعد میں پھر مغازی میں اور موضوعات بھی شامل ہو گئے اور اس کو سیرت کے نام سے یاد کیا گیا۔

صحابہ کرام تک کے بیان کے ضمن میں یہ ایک روایت بیان کیا گیا تھا کہ بعض ایسے حضرات تھے جن کی خاص دلچسپی اور ذوق یہ تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے حضور علیہ السلام کی جنگوں اور مہمات کے بارے میں معلومات بیان کیا کرتے تھے۔ کل میں کوئی بارہ یا پندرہ صحابہ کرام کے نام بیان کر چکا ہوں جو رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک بیان کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے کچھ صحابہ کرام میں سیرت، حضور کی ذات اور شمائل مبارکہ کے بارے میں تخصص کا رجحان پیدا ہوا۔ تابعین میں سے جن حضرات نے اس معاملہ میں بہت دلچسپی لی اور ان معلومات کو صحابہ کرام سے حاصل کیا ان میں تو یوں تو کئی بزرگوں کے نام آتے ہیں، لیکن ان میں دو بزرگ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کا تعلق دو بڑے صحابہ کرام سے ہے۔ ایک حضرت ابان بن عثمان ہیں جو حضرت عثمان غنی ذوالنورین کے صاحبزادے ہیں۔ یہ مغازی کے خصوصی متخصص تھے اور انہوں نے مغازی کے بارے میں مختلف صحابہ کرام سے معلومات جمع کیں اور مغازی کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو مغازی ابان بن عثمان کہلاتا تھا۔ یہ اپنے طلبہ کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے اور ان کو اپنے اس مجموعے کا املا بھی کرایا کرتے تھے۔ ان کے طلبہ اس کتاب کے نسخے تیار کیا کرتے تھے۔

تابعین میں دوسرا مشہور اور نمایاں نام بلکہ غالباً سب سے زیادہ نمایاں نام حضرت عروہ بن زبیر کا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ انہوں نے علم سیرت اور مغازی کے بارے میں ایک مجموعہ مرتب کیا۔ وہ مجموعہ تحریری بھی تھا اور اپنے طلبہ کو وہ پڑھایا بھی کرتے تھے۔ اس تحریری مجموعہ کی تیاری میں بعض خلفا نے بھی دلچسپی لی اور بعض دوسرے حضرات نے بھی ان سے درخواست کی کہ وہ مجموعہ ان کے لئے بھی مرتب کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا یہ مجموعہ ایک سے زائد مرتبہ مرتب کیا۔ انہوں نے خود اپنے دست مبارک سے جو نسخہ لکھا تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں کو جو چیزیں املا کرائی تھیں وہ محفوظ ہیں۔ ان کے شاگردوں کا لکھا ہوا مجموعہ مشہور مؤرخین اسلام طبری، ابن سعد اور واقدی تک پہنچا۔ ان سب مؤرخین نے اس سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس کے مندرجات کو اپنی اپنی کتابوں میں

سکا ہے۔ آج سے کوئی چودہ پندرہ سال پہلے ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ان ساری کتابوں سے عروہ بن زبیر کی اس کتاب کے سارے حوالوں کو جمع کرکے مغازی عروہ بن زبیر کے نام سے ایک کتاب مرتب کردی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس طرح حضرت عروہ بن زبیر کی معلومات کا سارا ذخیرہ یکجا جمع ہوگیا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح ان کے ذخیرہ معلومات کا خاصا حصہ دریافت ہوکر یکجا ہوگیا ہے اور آج مطبوعہ موجود ہے۔ میں اس کی طرف ابھی دوبارہ بھی آرہا ہوں۔

تابعین میں مزید تین ایسے نام ہمارے پاس موجود ہیں جنہوں نے سیرت اور مغازی کے بارے میں صحابہ کرام سے آنے والی معلومات کے ذخائر کو مرتب اور منظم کرنے میں بہت نمایاں، وقیع اور قابل ذکر کام کیا۔ ان میں سے ایک وہب بن منبہ (متوفی ۱۲۸ھ) ہیں۔ یہ بھی ہمام بن منبہ کے چھوٹے بھائی ہیں جو حضرت ابوہریرہ کے شاگرد تھے جن کا تدوین حدیث کے ضمن میں ذکر آچکا ہے۔ یہ دونوں بھائی حضرت ابوہریرہ کے شاگرد تھے۔ ہمام بن منبہ نے احادیث مرتب کیں۔ وہب بن منبہ نے سیرت اور مغازی کی روایات جمع کیں۔ ان کی اس کتاب کا ایک نسخہ جو ان کی وفات کے سو سال بعد ۲۲۸ھ میں لکھا گیا تھا جرمنی کے ایک کتب خانہ میں موجود بتایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہجرت کے واقعات اہتمام سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے مشہور تابعی جنہوں نے تدوین سیرت میں نمایاں کام کیا شرحبیل بن سعد تھے۔ آخری تابعی محمد ابن شہاب زہری تھے جو امام مالک سمیت بہت سے بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ سیرت کی ان ابتدائی تالیفات میں جو تابعین کے قلم سے ہیں ایک تابعی سلیمان بن طرخان (المتوفی ۱۴۳ھ) کی کتاب السیر الصحیحہ کا ذکر بھی کیا جانا چاہئے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ مشہور مستشرق فان کریمر نے اس کا متن مغازی واقدی کے آخر میں لگا دیکھا، اس نے ان دونوں کو ایڈٹ کرکے شائع کیا۔

تابعین میں ان پانچ حضرات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا اہم اور ایک انتہائی قابل احترام نام ایک اور تابعی حضرت امام علی بن حسین زین العابدین کا ہے۔ انہوں نے اپنی یادداشت کے لئے سیر و مغازی کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بارے میں واقدی نے بھی صراحت کی ہے اور علامہ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں بھی صراحت کی ہے کہ

امام زہری جو محدثین میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں اور حضرت عروہ بن زبیر کے شاگردوں میں سے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ کان عروۃ بحراً لاتکدرہ الدلاء، یعنی عروہ ایک ایسا سمندر ہیں جس سے جتنا چاہو پانی نکالو، گدلا نہیں ہوتا۔ یعنی ان کی معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ ہر بار نئی ہوتی ہیں اور نہ ان میں تکرار ہوتی ہے۔ جب بھی کسی چیز کے بارے میں پوچھا گیا تو ان سے کوئی نئی معلومات ملیں۔ مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی کی ایک کتاب ہے تہذیب التہذیب، جو صحابہ کرام اور دیگر راویان حدیث کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عروہ بن زبیر کے بارے میں لکھا ہے کہ روایت، مغازی اور سیرت کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات بڑے بڑے صحابہ کرام بھی ان سے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں معاملہ کیا تھا اور کس طرح پیش آیا تھا، یا سیرت کا فلاں واقعہ کیسے ہوا تھا۔

حضرت عروہ بن زبیر صرف حدیث، سیرت اور مغازی کے عالم نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے۔ فقہائے سبعہ کا نام ہم سب نے سنا ہے۔ ایک زمانے میں مدینہ منورہ کے سات بڑے فقہا مشہور تھے جو فقہائے سبعہ کہلاتے تھے۔ جس زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ منورہ کے گورنر تھے تو انہوں نے ان فقہائے سبعہ کو اپنا مشیر خاص اور شوریٰ قرار دیا تھا اور ان کے مشورے سے ہر اہم کام کیا کرتے تھے۔ ان فقہائے سبعہ میں حضرت عروہ بن زبیر بھی شامل تھے۔

ایک طرف تو حضرت عروہ بن زبیر خود بھی یہ کام کر رہے تھے اور جو کچھ وہ ان کو اپنے والدین سے، اپنے خاندان اور دوسرے صحابہ سے ملا تھا وہ اس کو اپنے شاگردوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ دوسری طرف حضرت عروہ کے شاگردوں میں سے متعدد حضرات نے اس کام پر خصوصی توجہ دی۔ امام زہری ان کے شاگردوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے حضرات نے بھی ان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ زیادہ مفصل انداز میں ان معلومات کو آگے کی نسلوں کو دے سکیں۔ جس زمانے میں مروان بن حکم مدینہ منورہ کے گورنر تھے تو ان کی ایک خاص دلچسپی یہ بھی تھی کہ وہ مختلف صحابہ کرام اور تابعین سے معلومات کو جمع کرنے اور فراہم کرنے کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار حضرت عروہ بن زبیر سے بھی یہ کام

کرنے کے لئے کہا۔ ایک مشہور صحابی حضرت حکیم بن حزام، جو رسول اللہ ﷺ کے قبل از اسلام کے دوست تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ جب شعب بنی ہاشم میں حضور کے پورے خاندان کو صحابہ کے ساتھ محصور کر دیا گیا تھا۔ تو قریش کے وہ لوگ جو اسلام نہیں لائے تھے لیکن درپردہ مسلمانوں کی مدد کیا کرتے تھے اور جن کی کوشش سے بعد میں وہ ظالمانہ معاہدہ ختم کیا گیا تو ان میں حضرت حکیم بن حزام بھی شامل تھے۔ حکیم بن حزام کے پاس بھی غزوات کے بارے میں بہت کچھ معلومات تھیں۔ جن غزوات کے بارے میں انہوں نے دوسروں سے سنا اور بعد کی جن غزوات میں وہ خود شریک ہوئے۔ ان کے بارے میں تفصیلات جو محفوظ رکھنے کا وہ خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ مروان بن حکم نے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنی ان معلومات کو ایک جگہ مرتب کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ معلومات مرتب کر لیں۔

مروان بن حکم کے علاوہ ان علوم کو جمع کرنے میں جس اموی خلیفہ کا بہت زیادہ حصہ ہے وہ مروان کے صاحبزادے عبدالملک بن مروان ہیں۔ عبدالملک بن مروان خود ایک بہت ہی صاحب علم انسان تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے انتقال کے وقت ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد فتاویٰ کے لئے کس سے رجوع کیا جائے؟ انہوں نے فرمایا کہ عبدالملک بن مروان سے رجوع کیا جائے۔

عبدالملک بن مروان علمی اور دینی اعتبار سے اس درجہ اور مقام و مرتبہ کے انسان تھے کہ امام مالک نے موطا میں کئی جگہ کسی چیز کا سنت ہونا عبدالملک کے طرز عمل کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے کہ فلاں چیز سنت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل علم نے عبدالملک بن مروان کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ گویا امام مالک نے عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو سنت کی ایک دلیل قرار دیا۔ عبدالملک بن مروان نے عروہ بن زبیر کو سیرت سے متعلق متعدد تفصیلات اور کئی ایک معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کا مشورہ دیا۔ نہ صرف تحریر کرنے کا مشورہ دیا بلکہ وہ وقتاً فوقتاً کچھ معاملات کے بارے میں سوالات حضرت عروہ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔ عبدالملک کے خطوط اور عروہ کے جوابات آج بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالات و جوابات امام طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔ کئی ایک واقدی اور ابن سعد نے بھی نقل کئے ہیں اور کئی

محدثین نے لکھا ہے کہ کان راویۃ للعلم 'وہ علم کی بہت زیادہ روایت کرنے والے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے: وله علم بالمغازي والسير 'ان کے پاس مغازی اور سیرت کا بہت زیادہ علم تھا۔ ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ روزانہ دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھ کر مغازی اور سیرت کا درس دیا کریں، لوگوں کو اس کی تعلیم دیا کریں، چنانچہ انہوں نے یہ کام کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پہلی سیرت چیئر قائم کی اور عاصم ابن عمر بن قتادہ بن نعمان الانصاری کو اس چیئر پر مقرر کیا جو خلیفہ وقت کے کہنے پر وہاں سیرت اور مغازی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

عام طور پر محدثین، سیرت نگار اور مورخین یہ لکھتے چلے آرہے ہیں کہ سیرت نگاری میں سب سے پہلا کام حضرت امام زہری نے کیا تھا۔ چنانچہ ایک زمانے تک اہل علم کے حلقوں میں یہی خیال تھا کہ امام زہری پہلے آدمی ہیں جنہوں نے سیرت اور مغازی پر کتاب لکھی۔ چنانچہ ان کی ایک کتاب مشاہد النبی کا کئی لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ امام سخاوی نے بھی الاعلان بالتوبیخ میں یہ بات کہی ہے۔ لیکن اب حضرت عروہ بن زبیر کی کتاب دستیاب ہونے کے بعد، حضرت ابان بن عثمان کی مرویات کے تحریری طور پر مرتب ہونے کی اطلاع کے بعد اور عاصم بن عمر بن قتادہ کی کتاب کے مرتب ہونے کے علم کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ امام زہری پہلے مصنف ہیں۔ امام زہری بہت بڑے محدث تھے، بڑے عالم تھے، ارباب سیر وحدیث میں سے تھے۔ لیکن سیرت نگاری میں ان کو اولیت کا مقام حاصل نہیں تھا۔ ان کا شمار نسبتاً جونیئر تابعین میں تھا۔ سینیئر تابعین ان سے پہلے سیرت کے موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ لہذا قدیم مصنفین نے جو لکھا ہے کہ اسلام میں سیرت کی پہلی کتاب امام زہری نے لکھی ہے تو یہ بیان اس وقت تک کی معلومات کی روشنی میں تو درست تھا۔ لیکن اب نئی اور تازہ ترین معلومات کے لحاظ سے درست نہیں۔ اس وقت کی تازہ ترین تحقیقات کی رو سے قدیم ترین سیرت نگار حضرت عروہ بن زبیر ہیں جن کے بارے میں کئی لوگوں نے کہا کہ وہ ایسا سمندر ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ ان کے ایک اور شاگرد نے لکھا ہے کہ میں جب بھی ان کے پاس گیا تو میں نے ان کے پاس ایک نیا علم اور نئی معلومات پائیں۔

حضرت عروہ ہی کے ہم عصر ایک اور تابعی عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ تھے۔ یہ بھی صحابی

ان سے کہتے تھے کہ آپ نے اپنے والد سے فلاں غزوہ کے بارے میں کیا سنا ہے، فلاں غزوہ کے بارے میں کیا سنا ہے۔ حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین سے پردہ کے پیچھے سے غزوات کی تفصیلات پوچھتے تھے۔ یوں خواتین، مردوں اور عورتوں سے الگ الگ جا کر معلومات جمع کرتے جاتے تھے۔

امام زہری کی معلومات میں وسعت اور گہرائی بلا کی تھی۔ امام لیث بن سعد کا کہنا ہے کہ میں نے زہری سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ وہ جس فن پر بھی بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسی کے متخصص ہیں۔

امام زہری کی معلومات کی وسعت اور روانی کو دیکھ کر ایک بار خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو یہ خیال ہوا کہ امام زہری حافظہ سے احادیث بیان کرتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا حافظہ قابل اعتماد ہے کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے احادیث سننا چاہتا ہوں۔ خلیفہ وقت احادیث سننے کے لئے امام زہری کے حلقہ درس میں بیٹھ گئے اور چار سو احادیث کا املا لے کر چلے گئے۔ کافی عرصہ کے بعد واپس مدینہ منورہ آنا ہوا تو پھر کہا کہ میں آپ سے فلاں فلاں موضوع پر احادیث سننا چاہتا ہوں۔ امام زہری نے دوبارہ وہ سب احادیث سنا دیں۔ انھوں نے احادیث سن کر ان کا موازنہ اپنی لکھی ہوئی احادیث سے کیا تو "فــــمـا وجـــد فـلـم یغادر حرفا" تو ان میں سے ایک حرف کا بھی فرق نہیں پایا۔ جو پہلے سنایا تھا وہی کچھ دوبارہ سنایا اور اس میں کوئی ردوبدل نہیں تھا۔

امام زہری کے تلامذہ میں یوں تو بے شمار لوگ ہیں۔ بڑے بڑے محدثین اور اکابر فقہا ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ امام لیث بن سعد جو امام شافعی اور امام مالک کے استاد ہیں وہ امام زہری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ سیرت کی حد تک ان کے تلامذہ میں تین نام بڑے نمایاں ہیں۔

ایک موسیٰ بن عقبہ،

دوسرے معمر بن راشد اور

تیسرے محمد بن اسحاق ہیں۔

محمد بن اسحاق کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان میں موسیٰ بن عقبہ اپنے وقت کے ایک

بہت بڑے محدث بھی تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کا اونچا مقام تھا۔ مغازی اور سیر میں بھی ان کا بہت بڑا درجہ حاصل تھا۔ موسیٰ بن عقبہ نے امام زہری کی روایات کو مرتب کیا، اپنے انداز سے ترتیب دی اور مدینہ منورہ میں ان کو ایک سند کی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ جب کوئی امام مالک سے پوچھتا تھا کہ مغازی کے بارے میں کس سے معلومات حاصل کریں تو امام مالک کہا کرتے تھے کہ علیکم بمغازی موسی بن عقبة فانه ثقة "موسیٰ بن عقبہ سے مغازی کا علم حاصل کرو کیونکہ وہ مستند اور ثقہ آدمی ہیں۔" حنبلی فقہ کے بانی اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے امام اور صف اول کے محدث امام احمد بن حنبل بھی موسیٰ بن عقبہ کی اس کتاب کو سیرت کی سب سے مستند کتاب قرار دیا کرتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کے دو بھائی ابراہیم بن عقبہ اور محمد بن عقبہ تھے۔ یہ تینوں بھائی فقیہ اور محدث تھے اور ایک زمانے میں تینوں کا الگ الگ حلقہ درس مسجد نبوی میں لگا کرتا تھا۔

موسیٰ بن عقبہ کی مکمل کتاب تو ہم تک نہیں پہنچی لیکن اس کا ایک مخطوطہ پروشیا میں، جو جنگ عظیم سے پہلے یورپ کا ایک ملک تھا اور بعد میں فاتح طاقتوں نے اس کے حصے بخرے کر کے اس کے کچھ حصے جرمنی میں اور کچھ پولینڈ میں ضم کر دیئے۔ وہاں کے ایک کتب خانے میں اس کا ایک حصہ موجود تھا۔ مشہور مستشرق ایڈورڈ سخاؤ نے 1904ء میں اس کو ایڈٹ کر کے شائع کروا دیا تھا اور یہ اب عام طور پر کتب خانوں میں موجود ہے۔ ایک نامکمل نسخہ برلن میں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پروشیا کے نسخے کی بنیاد پر چھپنے والے نسخے اور برلن والے نسخے میں کیا قدر مشترک ہے۔ موسیٰ بن عقبہ کی ان مغازی کے علاوہ جو چھپ گئے ہیں، ان کی روایات کا ایک بڑا حصہ طبقات ابن سعد میں پایا جاتا ہے۔ ابن سعد دو واسطوں سے موسیٰ بن عقبہ کے شاگرد ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ نے اپنے شاگردوں کو جو املا کرایا ہوگا وہ روایت ان کے شاگردوں کے ذریعے ابن سعد تک پہنچی ہوگی۔

موسیٰ بن عقبہ کا ایک بڑا کارنامہ اور ہے جو آج تک چلا آرہا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ان کو یہ خیال آیا کہ اصحاب بدر کی مکمل فہرست بنائیں۔ قرآن پاک میں اصحاب بدر کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے اور صحابہ کرام میں ان کی فضیلت مشہور و معروف تھی۔ بعد کے صحابہ میں بدریین کا بڑا اونچا مقام تھا۔ یہاں تک کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اصحاب بدر کا ایک

اجتماعی ادارہ یا کونسل کی حیثیت حاصل تھی۔ خلفائے راشدین کا انتخاب اصحاب بدر کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سیدنا حضرت علی بن ابی طالب سے لوگوں نے کہا کہ آپ خلیفہ بن جائیں تو آپ نے ان سے کہا کہ "لیس ذالک الیکم، یہ فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں نہیں ہے۔ انما ذالک الی اھل بدر، یہ فیصلہ کرنے کا حق تو اہل بدر کو ہے۔ فمن رضی به اھل بدر فھو الخلیفه، جس سے اہل بدر راضی ہوں گے وہی خلیفہ ہوگا۔" اہل بدر کی اس اہمیت کی وجہ سے ضرورت تھی کہ ان کی مکمل اور مستند فہرست مرتب ہو۔ ایسی پہلی مکمل فہرست موسیٰ بن عقبہ نے بنائی جس کی امام مالک نے بھی تصدیق کی اور اس کو مستند قرار دیا۔

زہری کے شاگردوں میں دوسرا نمایاں نام معمر بن راشد (متوفی ۱۵۳ھ) کا ہے۔ وہ یمن کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی مغازی پر ایک کتاب 'کتاب المغازی' کے نام سے لکھی تھی جس کا تذکرہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے۔ معمر بن راشد کی اس کتاب کے اقتباسات طبری، واقدی، ابن سعد، بلاذری اور دوسرے اہل علم کے ہاں ملتے ہیں۔ معمر بن راشد نے یوں تو بہت سے اہل علم سے کسب فیض کیا لیکن زیادہ استفادہ انہوں نے امام زہری کی روایات سے کیا ہے۔ امام زہری کے پاس مغازی اور سیر کے بارے میں جو کچھ معلومات تھیں وہ سب معمر بن راشد کے پاس آگئیں جو انہوں نے مزید اضافوں کے ساتھ ایک کتاب المغازی کی شکل میں مرتب کر دیں۔

یحییٰ بن معین جو ایک مشہور محدث ہیں۔ محدثین میں ان کا بہت اونچا مقام ہے اور اس اعتبار سے وہ بڑے اہم ہیں کہ جرح و تعدیل یعنی کسی راوی کو مستند یا غیر مستند قرار دینے کا جو فن ہے اس کے سب سے بڑے ماہر تھے اور اس سلسلہ میں ان کا شمار متشددین میں ہوتا تھا۔ متشددین وہ لوگ تھے جو راویوں کو بہت سختی سے پرکھتے تھے اور ان کی رائے کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔ اسی لئے یحییٰ بن معین کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جس راوی کو یحییٰ بن معین مستند قرار دے دیں تو پھر آنکھیں بند کر کے اس کو قبول کر لینا چاہئے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ "عضوا علیه بالنواجذ"، جس راوی کو یحییٰ بن معین قابل قبول قرار دے دیں اس کو دانتوں سے پکڑ لو۔ اس لئے کہ اس کے بعد کسی اور کی تعدیل کی ضرورت نہیں۔ یحییٰ بن معین

مطالعہ اور ان کے اساتذہ اور مآخذ کے بارے میں تفصیل بیان کی ہے۔ کتاب اچھی ہے، معلومات بھی مستند ہیں۔ کہیں کہیں مغربی تعصب کی جھلک نظر آتی ہے لیکن کچھ زیادہ نہیں اور اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ابن اسحاق کے بارے میں اگر ہم کہیں کہ ان کو علوم سیرت میں اتنا ہی بڑا مقام حاصل ہے جو حکیم ارسطاطالیس کو منطق میں حاصل ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ ابن اسحاق نے تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک جامع کتاب سیرت پر لکھی تھی۔ ان تمام صحابہ سے جن کا بھی تذکرہ ہوا، انہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسب فیض کیا۔ ان سب کے تحریری ذخائر حاصل کیے۔ ان تمام مقامات اور علاقوں کو جا کر دیکھا۔ جن جن حضرات کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق شرکائے بدر کے خاندان سے ہے یا شرکائے احد یا فلاں واقعہ سے ان کا کوئی تعلق ہے تو یہ ان کے پسماندگان کے پاس جا کر ان سے معلومات جمع کرتے تھے اور پھر ان معلومات کو آپس میں مقابلہ کرتے تھے اور چیک کرتے تھے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں ہے۔ ان سب معلومات کی روشنی میں انہوں نے ایک کتاب مرتب کی جو جامع ترین اور مکمل کتاب ہے جو ایک اہم واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ابن اسحاق نے عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر لکھی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو۔ کیونکہ منصور نے امام مالک سے بھی درخواست کی تھی کہ آپ سنت کا ایک مجموعہ مرتب کریں۔ چنانچہ امام مالک نے موطا منصور کے کہنے پر لکھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ منصور کو یہ خیال ہوا ہو کہ مغازی اور سیرت پر بھی کوئی کتاب ہونی چاہئے۔ اس لئے یہ بات بعید از امکان نہیں کہ ابن اسحاق نے یہ کتاب منصور ہی کے کہنے پر مرتب کی ہو۔

اس کتاب کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ کا نام کتاب المبتدأ تھا۔ اس میں انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے جد امجد معد بن عدنان تک تمام اہم اور مشہور شخصیتوں کے بارہ میں جو معلومات ان کو ملی وہ انہوں نے مرتب کیں۔ ان معلومات کے بارے میں بعض محدثین اور محققین اہل علم کا خیال تھا کہ کتاب کا یہ حصہ بہت غیر مستند ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اکثر و بیشتر ان معلومات پر مشتمل تھا جو یہودی اور عیسائی ذرائع سے لی گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دلچسپی یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو تھی۔ اس

سے پہلے تاریخ انبیا کا حصہ یہودیوں اور مسلمانوں میں مشترک تھا۔ اس لئے ابن اسحاق نے یہودی اور عیسائی مصادر سے یہ معلومات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور اس طرح ابن اسحاق کے اس کام پر بھی ایک حرف آیا اور اس کو محدثین کی نظر میں استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو بقیہ دو کو حاصل تھا۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ المبعث کے نام سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے لے کر بلکہ آپ کے خاندان اور برادری کے تذکرے سے لے کر آپ کی وفات تک اس دوسرے حصہ میں بحث کی گئی تھی۔ تیسرا حصہ مغازی تھا جس میں جنگوں کا الگ سے تفصیل سے بیان ہوا تھا۔ ابن اسحاق کی یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک مقبول رہی۔ اس کے نسخے ساتویں آٹھویں صدی ہجری تک بہت عام تھے۔ علامہ ابن اثیر الجزری (متوفی ۱۳۰ھ) کے پاس بھی یہ کتاب موجود تھی۔ ان کی کتاب اسد الغابہ میں کثرت سے اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک ابن اثیر ہی کیا، تقریباً تمام سیرت نگاروں نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ اس کے مضامین کو اپنے مجموعوں میں شامل کیا۔ اس کے خلاصے لکھے۔ اس کی شرحیں لکھی گئیں۔ یہ کتاب بڑی دیانت داری سے لکھی گئی تھی۔ خود مغربی مصنفین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ الفرڈ گیام جس نے کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑی دیانت داری، صداقت اور غیر جانبداری سے یہ کتاب لکھی گئی ہے

اس کتاب کے تقریباً پندرہ مختلف نسخوں (versions) کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ہر صاحب علم فقہ یا حدیث کی جو بھی کتاب مرتب کرتا تھا، اس کا املا اپنے طلبہ کو کراتا تھا۔ طلبہ اس کو املا لے کر اس کو یاد کر لیا کرتے تھے اور حفظ کیا کرتے تھے۔ ان طلبہ میں سے کچھ آگے چل کر علم میں مزید ترقی کر لیتے تھے۔ مزید ترقی کے بعد وہ اس مجموعے میں مزید اضافوں اور ترامیم کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ جہاں ان کو استاذ کی رائے سے اختلاف ہوتا تھا تو اس کا بھی ذکر کر دیا کرتے تھے کہ یہاں مجھے استاذ کی رائے سے اختلاف ہے۔ اس زمانے میں علم کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتا تھا کہ ایک آدمی جس نے کچھ کہہ دیا یا لکھ دیا تو اس پر کاپی رائٹ کے تحت اس کی اجارہ داری قائم ہو جائے۔ کسی کو اس سے استفادہ کی اجازت نہ ہو۔ یہ اسلامی تہذیب کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لئے جو علم کسی استاد سے شاگردوں تک پہنچا وہ

نمائندگی مشترک میراث ہوتی تھی اور ہر شخص کو اس میں رائے دینے کا حق ہوتا تھا۔ خود امام مالک کی موطا کے چند دو نسخے ہیں۔ ایک نسخہ ان کے شاگرد امام محمد کا ہے۔ اس میں امام محمد نے اپنی رائے کے مطابق بہت سے اضافے کئے ہیں۔ جہاں جہاں ان کو امام مالک کی رائے سے اختلاف تھا اس کو بیان کیا۔ اپنے استاد امام ابوحنیفہ کے ارشادات بھی بیان کئے۔ وہ نسخہ اگرچہ موطا امام مالک کا ہے لیکن موطا نے امام محمد کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے کئی بڑی کتابیں ہیں جن کے ایک سے زیادہ نسخے یا ورژن موجود ہیں۔ سیرت ابن اسحاق کے پندرہ ورژن کا تذکرہ ملتا ہے اور قدیم مصنفین مثلاً طبری، واقدی، ابن سعد، بلاذری وغیرہ کے ہاں اس کتاب کے اقتباسات یا روایتیں ملتی ہیں۔

محمد بن اسحاق یوں تو امام زہری کے شاگرد تھے اور انہوں نے زیادہ تر کسب فیض امام زہری ہی سے کیا۔ لیکن امام زہری کے بعد دوسرے اکابر علمائے سیرت سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ ان میں ایک عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم بھی تھے۔ یہ عمرو بن حزم وہی ہیں جن کو یمن کے علاقے میں بھیجتے وقت حضور نے ایک دستاویز لکھ کر دی تھی۔ ان کے پاس وہ دستاویز اور حضور کے زمانے کی کئی دوسری مزید دستاویزات موجود تھیں۔ ان کے پوتے عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم تھے۔ یہ عبداللہ بھی بڑے عالم تھے اور محمد بن اسحاق نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان کے والد عالم، قاضی اور فقیہ تھے۔ دادا عامل، وزیر اور معروف صحابی تھے۔ یہ خاندان بڑا علمی خاندان تھا۔ انہوں نے بھی ایک کتاب مغازی پر لکھی تھی لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچی۔

محمد بن اسحاق نے براہ راست صحابہ سے تو کسب فیض نہیں کیا تھا لیکن ان کو بعض صحابہ کرام کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بھی حضرت انس بن مالک کی زیارت کی تھی اور ان کو بھی تابعیت کا شرف حاصل ہے۔ ابن اسحاق اور امام ابوحنیفہ تقریباً معاصر تھے۔ امام صاحب کا انتقال 150ھ میں اور ابن اسحاق کا 151ھ میں ہوا۔ حضرت انس کا قیام عموماً مدینہ منورہ اور پھر دمشق اور بصرہ میں ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کرنے گیا تھا۔ حرم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک ہجوم ہے اور لوگ پروانہ وار لپک لپک کر اس ہجوم کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ والد نے کہا

سے پہلی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے یہود و نصاریٰ سے وہ روایات لے لیں جو سابقہ انبیا کے بارے میں تھیں اور ان روایات کو اپنی کتاب "کتاب المبتدا" میں شامل کرلیا۔ اب محدثین کا کہنا یہ تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمری لکھی جائے اور اس کے پس منظر، مقدمہ و تمہید میں یہود و نصاریٰ کی روایت لی جائیں تو یہ بات قابل قبول نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا شمار انتہائی محتاط محدثین میں ہوتا ہے۔ ان کے صاحبزادے نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ ابن اسحاق کو غیر مستند سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ ابن اسحاق کے دین و ایمان کے بارے میں کوئی تامل رکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر آپ ان کی روایت کیوں نہیں لیتے؟

محدثین کے انتہائی تقویٰ اور اونچے معیار کے لحاظ سے ابن اسحٰق کی دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ بزرگوں کا بیان الگ الگ نقل کرنے کے بجائے سب راویوں کی معلومات کو یکجا کرکے بیان کیا کرتے تھے۔ محدثین کا طریق کار یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو بیان کرتے وقت جن جن راویوں سے جو جو ارشادات سنے ہوتے تھے تو ان سب ناموں کی صراحت کے ساتھ پوری سند کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ مثلاً **قال حدثني عبدالرزاق، قال حدثني معمر قال حدثني محمد بن شهاب الزهري، قال حدثني نافع قال حدثني عبدالله بن عمر ان النبي ﷺ قال**۔ کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ یہاں کوئی ایک یا دو جملے بیان ہوئے ہوں گے۔ اب اس کے بعد اگر ایک جملہ اور ہے تو پھر آپ پوری سند بیان کریں۔ پھر تیسرا جملہ ہے تو پھر پوری سند بیان کریں۔ اب جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی تھی تو ان کی حد تک تو یہ اسلوب ٹھیک تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص سیرت کا کوئی واقعہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ ہجرت کیسے ہوئی تو اس کے لئے یہ انداز اختیار کرنا بہت مشکل ہوگا کہ ہر جملے پر یہ کہے کہ مجھ سے بیان کیا فلاں نے اور اس سے فلاں نے اور اس سے فلاں نے کہ جب حضرت اسماء نے حضور کا ناشتہ دان باندھا تو اپنا پٹکا کھول کر اس کے دو ٹکڑے کرکے باندھ دیا۔ پھر کہے کہ مجھ سے بیان کیا فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے اور فلاں سے فلاں نے کہ انہوں نے دوسرے ٹکڑے سے دودھ کی مشک میں گرہ لگا دی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں نے فلاں سے، فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے کہ کھانا

اس نے کئی اسنادوں کی عمومی خبر دی تھی۔ اب یہ سب تفصیلات الگ ہیں کہ اس طرح بیان سے
ان میں تسلسل نہیں رہ سکتا۔ واقعہ مکمل طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ابن اسحاق سے
زیادہ اور بعض لوگوں نے ظلم کیا کہ آغاز میں انہوں نے یہ بتانے پر اکتفا کیا کہ یہ روایت
مجموعی ہیں اور یہ کہ انہوں نے فلاں فلاں راویوں سے لی ہیں۔ یعنی بیان کرنے والے کئی
افراد کے نام ایک ساتھ بیان کئے ہیں اور پھر بتایا ہے کہ واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ محدثین کو اس پر
یہ اعتراض ہے کہ اس طرح بیان کرنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا جملہ کس راوی کا ہے
تا کہ اندازہ کیا جا سکے کہ اس بیان کا کون سا حصہ کم مستند ہے اور کون سا زیادہ۔ لہٰذا علم حدیث
کے معیار کے مطابق یہ انداز روایت قابل قبول نہیں تھا۔ یہی منظر تھا جس میں ابن اسحاق اور
آگے چل کر واقدی اور ابن سعد اور دوسرے بہت سے لوگ محدثین کے معیار سے فروتر
قرار پائے۔

امام احمد بن حنبل کے بیٹے نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ابن اسحاق پر کیا اعتراض ہے۔
امام صاحب نے جواب دیا کہ واللہ انی رأیتہ یحدث عن جماعۃ بالحدیث
الواحد' میں نے ان کو دیکھا کہ وہ بہت سے لوگوں سے ایک ہی واقعہ بیان کرتے ہیں اور لا
یفصل کلام ذا من ذا' اور اس کی بات کو اس کی بات سے الگ نہیں کرتے۔ اس لئے میں
معلوم نہیں کر سکتا کہ کون سا حصہ مستند ہے اور کون سا غیر مستند ہے۔

اس کے باوجود محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ابن اسحاق کے تقویٰ اور زہد کی وجہ سے
ان کی روایت پر اعتبار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے بیانات کو ان کے ان 'جرائم' کی وجہ
سے زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔ ابن اسحاق کے اس اسلوب روایت پر جن محدثین نے
تحفظ کا اظہار کیا ہے ان میں واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے ائمہ حدیث شامل ہیں۔ امام مالک،
امام نسائی، امام احمد، امام دارقطنی، امام بخاری کے استاذ مکی بن ابراہیم اور ائمہ جرح و تعدیل
امام یحییٰ بن سعید اور یحییٰ بن معین جیسے ماہرین فن نے ابن اسحاق کے اس اسلوب پر شدید تنقید
کی ہے۔ تاہم امام احمد کا ارشاد تھا کہ ان کی روایت مغازی وغیرہ میں تو قابل قبول ہے لیکن حرام
وحلال (فقہ و شریعت) کے باب میں نہیں۔ ابن سید الناس نے ان ساری تنقیدات کا جائزہ
لے کر ابن اسحاق کا شد و مد سے جو دفاع کیا ہے وہ قابل دید ہے۔

کام کیا۔ ہجو لکھی اور حضور کی شان میں گستاخیاں کیں۔ بعد میں مسلمان ہوئے تو اب ان پرانی باتوں کو بیان کرنے کا کیا فائدہ۔ مثلاً عکرمہ بن ابی جہل بہت عرصہ اسلام کے خلاف کارفرما رہے اور بعد میں مسلمان ہوئے۔ بہت اچھے مسلمان ہوئے۔ اب عکرمہ کی ان باتوں کو بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ اس سے بلاوجہ کی بدمزگی ہی پیدا ہوگی۔ ان وجوہات کی بناء پر ابن ہشام نے کہا کہ میں نے وہ چیزیں نکال دی ہیں۔ ان تمام ترامیم کے ساتھ ابن ہشام نے اس کتاب کا نیا ورژن تیار کیا اور اس میں کچھ اضافے کئے۔ جو چیزیں غیر واضح تھیں یا کچھ مشکل الفاظ یا محاورات تھے تو ان کی وضاحت کی اور یوں ایک ایسی کتاب ہمارے سامنے آگئی جو سیرت کا سب سے پہلا مستند، مقبول اور صف اول ماخذ ہے جو آج ہر جگہ موجود ہے جس کا شاید دنیا کی ہر اہم زبان میں ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں ایک سے زائد تراجم موجود ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور بہت سی دوسری زبانوں میں تراجم موجود ہیں۔ ابن ہشام پر مزید تفصیلی تبصرہ سیرت کی کچھ اہم کتب کے ضمن میں آئے گا۔

ابتدائی تدوین سیرت پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ہمارے وطن پاکستان کے ایک صاحب علم سیرت نگار کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ یہ علامہ ابو معشر نجیح السندی (متوفی ۱۷۰ھ) ہیں۔ ان کے بارہ میں بھی آتا ہے کہ انہوں نے مغازی (یعنی علم سیرت) پر ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ کتاب تو دستیاب نہیں ہے، لیکن اس کے ٹکڑے واقدی اور ابن سعد کے ہاں ملتے ہیں۔ اگرچہ دوسرے متعدد سیرت نگاروں کی طرح ابو معشر کا درجہ بھی علم حدیث میں زیادہ اونچا نہیں سمجھا جاتا، لیکن امام احمد جیسے بالغ نظر اور نقاد محدث ان کو بصیر فی المغازی (علم سیرت میں بصیرت رکھنے والا) قرار دیا کرتے تھے۔

-☆-

سوال و جواب

امام زہری کے بارے میں بہت سے لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات کہاں تک درست ہیں؟

میرے خیال میں امام محمد بن شہاب زہری اکابر اسلام میں سے ہیں۔ تمام بڑے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام مالک جیسے بڑے بڑے اور اہل تقویٰ لوگ شامل ہیں۔ اس لئے امام زہری کا مستند ہونا اور ایک امام حدیث ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ تاہم رائے اور اجتہاد کے معاملہ میں آدمی کی تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو امام زہری کی کسی تحقیق سے اختلاف ہو تو اس اختلاف کو بیان کرنے کا آپ کو حق ہے۔ لیکن اگر کسی شخصیت کی کسی بات سے کوئی اختلاف ہو اور اس کے نتیجے میں اس شخص کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ناروا شکوک کا اظہار کیا جائے تو یہ مناسب رویہ نہیں ہے۔ اگر ان کے معاصر محدثین نے ان کو مستند سمجھا ہے تو آج کے کسی آدمی کے لئے ان کے بارے میں شک کا اظہار کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں۔

☆

آپ نے بتایا کہ میثاق مدینہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن ڈاکٹر اکرم ضیا عمری کی کتاب مدنی معاشرہ ادارہ تحقیقات اسلامی نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ انہوں نے میثاق مدینہ پر بڑا کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی دستاویزات کی مکمل تفصیلی شقیں حدیث کی کسی مستند کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ صرف سیرت کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اکرم

ضیا عمری کا سوال ہے کہ اگر یہ میثاق اتنا ہی مشہور و معروف تھا تو حدیث کی کسی کتاب میں اس کی تفصیل کیوں مذکور نہیں؟

جہاں تک حدیث کی کتابوں کا تعلق ہے تو متعدد کتابوں میں اس میثاق کا تذکرہ موجود ہے اور یہ تو عام موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تحریر مرتب کی اور یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ سنن ابی داود میں یہ تذکرہ موجود ہے۔ حدیث کی کئی دوسری کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے جس سے یہ تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دستاویز مرتب کرائی اور مدینہ کے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ جہاں تک اس کے مکمل متن کا تعلق ہے تو سیرت کے باب میں ابن ہشام کی کتاب اتنی ہی مستند ہے جتنی کہ حدیث کے معاملہ میں حدیث کی کوئی بھی کتاب۔ ابن ہشام نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور ابن سعد نے طبقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب سیرت کی مستند کتابیں ہیں۔ اس لئے میثاق مدینہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

☆

مغربی محققین مسلمانوں کے مرتب کردہ مغازی اور حدیث کے اتنے بڑے مجموعے کو غیر مستند کہتے ہیں۔ ان کے تعصب کے علاوہ اس کی بنیاد کیا ہے؟ حالانکہ وہ اس میدان میں تحقیق بھی کرتے ہیں۔ اس بعد کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا کچھ کیا جا رہا ہے؟

مغربی محققین میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو پریسٹ یا پادری ہیں یا رہے ہیں۔ ان میں ایک گہرا مذہبی تعصب موجود ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو حکومتوں اور خاص طور پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جن کی تعداد ماضی میں بہت کم تھی لیکن اب بڑھ رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خالص علمی اور تحقیقی ذوق سے کام کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے objectively تحقیقی انداز میں سیرت پر کام کیا ہے ان کے ذہن میں

بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اور ان میں سے بہت سے کل علماء نے سیرت کے ماخذ کو مستند مانا ہے۔ ابھی حال میں ترک جو ہیں جن کی مثال دی جس نے حال ہی دو سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں بڑے جامع اور غیر جانبدار انداز میں اس بارے میں کلام کیا ہے اور ان ماخذ کے بارے میں رائے دی ہے۔ اسی طرح ماخذ کے بارے میں کئی لوگوں کا رویہ خاصا متوازن ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی آ رہی ہے۔ مستشرقین کے بارے میں اور شک کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے جس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں چوتھی پانچویں صدی ہجری کے بعد کے مصنفین نے سیرت کے نام پر بہت سا کمزور، موضوع اور رطب و یابس مواد جمع کر دیا ہے۔ بعض ایسی روایات جو بہت غیر مستند ہیں اور علم حدیث اور سیرت کے اصولوں کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہیں، وہ بہت کثرت سے سیرت کی کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے مغربی محققین کو سیرت کے تمام ذخائر پر شک کرنے کا موقع ملا۔

اگر خود مسلمان محققین معروضی طور پر اس سارے ذخیرے کا جائزہ لے کر رطب و یابس کو الگ الگ کر دیں تو جو غیر جانبدار اور معتدل مزاج مغربی مصنفین ہیں ان کے طرز عمل میں تبدیلی آ جائے گی۔ جو متعصب مصنفین ہیں وہ تو پہلے بھی نہیں مانتے تھے، اب بھی نہیں مانیں گے۔

☆

جب قرآن پاک جمع ہو رہا تھا تو لقد جاءکم رسول من انفسکم کی ایک مذکور تحریر نہیں مل رہی تھی جبکہ ہر آیت کے لئے دو گواہ ضروری تھے۔

یہ بات آپ نے شاید جزوی طور پر کہی ہے۔ اگر تفصیل جاننا چاہیں تو میری کتاب محاضرات قرآنی میں قرآن کی تدوین پر ایک الگ خطبہ ہے جس میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ میں پوری تفصیل یہاں بیان کروں گا تو بہت وقت لگے گا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے جو صحیفہ مرتب کیا تھا اس کے لیے سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ ان کے ساتوں ارکان کو ہر آیت یاد ہونی چاہئے۔ اور ان ساتوں ارکان کے پاس تحریری ذخائر

> آپ نے فرمایا کہ امام مالک نے فرمایا کہ عبدالملک بن مروان سے سرزد ہونے والا کام سنت ہے کیونکہ وہ سنت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دورِ حکومت میں بہت سے کام ایسے ہوئے جو سنت کی صریح خلاف ورزی پر مبنی تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ پر سنگ باری اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت۔

یہ آپ امام مالک سے پوچھئے گا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کے طرزِ عمل کو کیوں سنت قرار دیا۔ میں نے تو صرف ان کی رائے نقل کی ہے۔ یہ رائے موطا امام مالک میں موجود ہے جو حدیث کی مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اگر عبدالملک کے خلاف کوئی روایت یا شہادت ایسے ہی مستند ماخذ سے آپ کے پاس آئی ہو جتنا مستند موطا امام مالک ہے تو آپ کی رائے میں وزن ہو سکتا ہے۔ ورنہ علم حدیث اور علم تاریخ دونوں کے اصولوں کے تحت موطا امام مالک ہی کے بیان کو قبول کرنا چاہئے۔

☆

> آپ نے فرمایا کہ ابوجعفر منصور نے امام مالک سے حدیث اور ابن اسحاق سے سیرت پر کام کرنے کی درخواست کی۔ اسلام کے ان دو اساسی علوم کے خدمت گزار نے امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر قید کی سزا دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خلفاء کے مخالفین بہت بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے خیال میں خلیفہ منصور امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر کوڑے لگواتا ہے، قید کرواتا ہے اور جبری مشقت کرواتا ہے۔ میرے خیال میں یہ واقعات صحیح نہیں ہیں۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ زیادتیوں کے جو واقعات بعض کتابوں میں بیان ہوئے ہیں وہ غلط ہیں اور میں تاریخی اعتبار سے ان کو درست نہیں مانتا۔ یہ بعد کے مصنفین نے منسوب

گئے تھے۔ یہ تو صرف امام احمد بن حنبل پر ہوئی تھی۔ جس زمانے میں فتنہ خلق قرآن پر بہت زیادہ مباحثہ چلتا تھا تو امام احمد بن حنبل کے عقیدت مند اپنے امام کی بڑائی بیان کرنے کے لئے ان پر ہونے والے مظالم کی داستانیں بھی بیان کرتے ہوں گے۔ یہ ممکن ہے کہ بعد میں دوسرے اماموں کے معتقدین نے بھی اپنے اماموں پر مظالم کی داستانیں بیان کرنا شروع کر دی ہوں گی۔ یہی داستانیں بعض متأخر تذکرہ نویسوں نے کتابوں میں نقل کر دی ہیں۔ قدیم مآخذ کے بیانات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، نہ امام مالک کے ساتھ ہوا۔ امام مالک کا تو ان کے معاصر امرا اور خلفا بھی غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

☆

آپ نے ابن اسحاق کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں امام مالک نقل فرماتے ہیں کہ "كان دجالا من الدجاجلة"۔ آپ اس کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟

میں نے صاف طور پر عرض کیا ہے کہ ابن اسحاق کے بارے میں محدثین کی دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ابن اسحاق کو بعض محدثین قابل قبول اور معتبر سمجھتے ہیں اور ان کی رائے اور بیانات کو قبول کرتے ہیں جبکہ بعض محدثین قبول نہیں کرتے۔ امام مالک بھی ان محدثین میں شامل تھے جو ابن اسحاق کے بارے میں تامل رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کہا ہو، میں نہیں جانتا۔ لیکن امام مالک ان لوگوں میں سے تھے جو ابن اسحاق کی روایات کو قبول کرنے میں تامل کرتے تھے۔ بہت سے لوگ تامل نہیں کرتے تھے جن میں سے بعض کے اقوال میں نے بیان کیے۔ امام مالک کی رائے سر آنکھوں پر۔ لیکن ایسے حضرات بھی ہیں جو ابن اسحاق کی رائے کو قبول کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی میں نے مثالیں دی ہیں۔ پھر ابن اسحاق نے جو کچھ تفصیلات جمع کی ہیں اور جو ابن ہشام کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان میں سے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بقیہ کتب حدیث سے بنیادی طور پر مختلف ہو۔ تفصیلات اور جزئیات میں ابن اسحاق نے کچھ چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

☆

یہ نوشتے ان تمام صحابہ کرام کے پاس موجود تھے جو ان کو لکھا کرتے تھے۔ حضور کی ازواج مطہرات کے پاس بھی اپنے نسخے ہوا کرتے تھے۔

☆

استیعاب اور استقصاء سے کیا مراد ہے؟

استیعاب سے مراد ہے comprehensive coverage یعنی کسی چیز کا مکمل طور پر احاطہ کر دینا یا مکمل سروے کر لینا۔ استقصاء سے مراد ہے exhaustively کسی چیز کو جمع کر لینا۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب معلومات کو exhaust کرنے اور ان کا مکمل سروے کرکے فراہم کرنے کا کام بڑی اصل اور بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

☆

کیا یہ بات درست ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس لکھی ہوئی تورات تھی؟

بالکل درست ہے۔ جب تورات کی تختیاں لکھی ہوئی حضرت موسیٰ کو ملیں تو وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس تھیں اور بعد میں ان کے جانشینوں کے پاس آ گئیں۔ ان کا خاندان بنی لاوی جلاوطنی تک ان کے پاس تھیں۔ پھر جب ضائع ہو گئیں تو سب کی ضائع ہو گئیں۔

☆

ابن اسحاق کی جمع کردہ کتاب کا نام کیا تھا؟ کیا وہ موجود ہے؟

ابن اسحاق کی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔ جس حد تک وہ دستیاب ہے وہ سیرت ابن ہشام کی شکل میں ہے۔ اس کا ایک حصہ بعض مخطوطات کی شکل میں موجود تھا۔ ایک نامکمل مخطوطہ جامعہ قرویین فاس میں تھا جس کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم نے ایڈٹ کرکے شائع کرایا تھا۔ اس کے عربی اور اردو ترجمے دستیاب ہیں۔ اردو ترجمہ نقوش کے سیرت نمبر میں شائع ہوا تھا۔

سیرت کی موجودہ کتابوں میں الرحیق المختوم کافی مشہور ہے۔
اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

الرحیق المختوم بہت اچھی اور عمدہ کتاب ہے۔ آپ ضرور استفادہ کریں۔ بیسویں صدی میں جو بہترین کتابیں لکھی گئیں ان میں سے ایک الرحیق المختوم بھی ہے۔ یہ ایک عالمانہ اور مستند کتاب ہے۔

☆

حضرت زید بن ثابت نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن پاک لکھنے کا فریضہ انجام دیا، لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان کے دور میں ان سے مزید دو مرتبہ لکھوایا گیا۔ کیا انہوں نے پہلے جو لکھا تھا تو کیا اس میں کوئی کمی تھی یا بعد کے نسخے پہلے والے نسخے کی توسیع تھی؟

پتہ نہیں آپ نے میری بات سے کیا مطلب لیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت کو حضرت ابوبکر صدیق نے حکم دیا تھا کہ قرآن پاک کا ایک نسخہ ایسا تیار کر دیں جو اسی ترتیب کے مطابق ہو جس ترتیب کے مطابق رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ اور اس کو ایک جگہ کتابی شکل میں مصحف کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ حضرت زید بن ثابت نے وہ نسخہ مرتب کر دیا اور وہ کتابی شکل میں موجود رہا۔ بعد میں اسی نسخہ کی انہوں نے سات، پانچ یا گیارہ نقلیں کروائیں۔ بعض روایات میں پانچ کا ذکر ہے، بعض میں سات کا اور بعض میں گیارہ کا ذکر ہے۔ انہوں نے اسی نسخہ کی نقلیں تیار کیں۔ اپنے ہاتھ کے خط سے اسی hand writing میں اسی املا کے ساتھ۔ یہ نقلیں مختلف علاقوں میں بھیجی گئیں جن میں سے چار نقلیں آج بھی موجود ہیں۔ الحمدللہ مجھے چاروں کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ ایک لندن کے برٹش میوزیم میں ہے، دوسرا ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں ہے، تیسرا استنبول کے عجائب گھر توپ کاپی سرائے میں ہے اور چوتھا قاہرہ میں موجود ہے۔ تاشقند والے نسخہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ

لکھا ہے کہ سیدنا عثمان غنی اپنی شہادت کے وقت اسی کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس نسخے پر خون کے دھبے بھی بتائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ وہی نسخہ ہو۔

☆

> امام سیوطی نے لکھا ہے کہ الجرح مقدم علی التعدیل۔ ابن اسحاق پر جو جرح کی گئی وہ تعدیل پر مقدم ہے لہٰذا ابن اسحاق کو معتبر سمجھنا درست نہیں۔

لیکن ہم سے اور آپ سے بڑے بڑے علماء نے ابن اسحاق کو معتبر سمجھا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ اصول تھا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مطلقاً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جرح مفسر تعدیل مفسر پر مقدم ہے۔ جرح غیر مفسر تعدیل مفسر پر مقدم نہیں ہے۔ جرح و تعدیل پر ہمارے برصغیر کے ایک بڑے عالم کی ایک بہت اچھی کتاب 'الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل' ہے۔ آپ اس کو پڑھیں۔ اس میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ خود امام ابوحاتم رازی کی کتاب جرح و تعدیل پر ہے جو کئی جلدوں میں چھپی ہے۔ جس کی پہلی جلد میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے ابن اسحاق پر جرح کی، مثلاً امام مالک کی جو جرح بھی ایک روایت سے منسوب کی، یہ تحقیق ہے جرح ان کی ہے بھی کہ نہیں، لیکن امام مالک ابن اسحاق سے متفق نہیں تھے۔

جہاں تک میرے علم میں ہے امام مالک سے کوئی وجہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ابن اسحاق پر کیوں جرح کی۔ جن لوگوں نے ابن اسحاق کی تعدیل کی ہے وہ اپنی اس رائے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا تعدیل مفسر جرح غیر مفسر پر ترجیح رکھتی ہے۔

چوتھا خطبہ

مناہج سیرت

سیرت نگاری کے مناہج اور اسالیب

چوتھا خطبہ

مناہج سیرت

سیرت نگاری کے مناہج اور اسالیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین

قابل احترام صدر جلسہ جناب پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد صاحب

قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب

محترم جناب ایئر کموڈور افتخار احمد مروتی صاحب

برادران محترم،

خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: مناہج سیرت یعنی سیرت نگاری کے مناہج و اسالیب۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بات عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبوی پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اور کل ہم نے دیکھا کہ اس پر لکھنے والوں میں سب سے پہلے صحابہ کرام ہیں۔ حضرت براء بن عازبؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور دوسرے متعدد صحابہ کرام کے زمانے سے جو چیز لکھی جانی شروع ہوئی اور آج تک مسلسل لکھی جا رہی ہے۔ اس کی کمیت اور لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ لاکھوں صفحات لکھے گئے ہیں یا کروڑوں صفحات لکھے گئے ہیں۔ ہم قطعیت اور تحقیق تو دور کی بات ہے محض اندازے سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اس کے حبیب کی سیرت اور پیغام

کے بارہ میں کتنا اور کیا کچھ لکھا گیا ہے، کتنا لکھا جارہا ہے اور آئندہ کتنا لکھا جائے گا۔ اس لئے اس سارے ذخیرے کو جو لامتناہی ہے، متعین اسالیب میں تقسیم کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر تحریر کو کسی متعین اسلوب، متعین منہج یا کسی واضح methodology کے تحت رکھا جاسکے۔

جب ہم منہج یا methodology کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ سیرت کے سارے تحریری ذخائر کو متعین مناہج کے ذیل میں درج کیا جاسکے گا اور مناہج کی حد بندی میں لایا جاسکے گا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو خصوصیات نمایاں رہی ہیں جن کا کام بہت غیر معمولی ہے، ان میں بڑے بڑے مناہج اور نمایاں اور قابل ذکر اسالیب کون کون سے تھے، کس انداز اور کس اسلوب سے بڑے بڑے لوگوں نے سیرت نگاری کی۔ ان اسالیب کی تعداد جتنی بھی ہو، کتنے ہی غور سے ان اسالیب کو وضع کیا جائے، کتنے ہی اہتمام اور دقت نظر سے ان مناہج کو متعین کیا جائے، پھر بھی سیرت لٹریچر کا بہت بڑا حصہ ایسا رہے گا جو مناہج و اسالیب کی ان حدود اور تعریفات سے باہر ہوگا۔ اس حصہ پر غور کرکے نئے اسالیب اور مناہج تجویز کرنے پڑیں گے۔ پھر بھی سیرت کا ایک ذخیرہ اس دائرے سے باہر رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مناہج اور اسالیب کا تعین جو بھی شخص کرے گا، وہ ایک فرد کرے یا بہت سے افراد کریں، وہ بہرحال محض چند افراد کی فہم و بصیرت کے مطابق موضوع کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش ہوگی۔

میں پہلے دن کی گفتگو ہی میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ سیرت النبی ایک ایسا لامتناہی سمندر ہے جس کی حدود، گہرائی اور گیرائی کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن ناطق کی سیرت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا کہ لاتنقضی عجائبه، اس کے عجائب و غرائب کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے، اسی طرح سیرت کے بھی نئے نئے پہلو سامنے آتے جائیں گے اور سیرت کی عظمت اور معنویت کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ اس لئے تمہید کے طور پر یہ بات عرض کردینا ضروری ہے کہ سیرت کے مناہج اور اسالیب کے بارے میں جو بھی گفتگو ہے وہ سیرت کے صرف ایک بڑے حصہ کے بارے میں ہوسکتی ہے۔ پورے سیرت کے ادب کے بارے میں نہیں ہوسکتی۔

دوسری بڑی اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ اسالیب متعین اور بہت واضح نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سیرت نگار نے پہلے اپنے ذہن میں کوئی اسلوب متعین کیا ہو اور اس اسلوب کی حد بندی کے اندر رہتے ہوئے انہوں نے سیرت مرتب کی ہو۔ اس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ جس شخصیت نے سیرت نگاری کے لئے قلم اٹھایا، ان کا اپنا پس منظر کیا تھا۔ اگر وہ محدث تھے تو علم حدیث کے اسالیب اور مناہج، اصول اور قواعد خود بخود ان کے سامنے رہے۔ اگر وہ مورخ تھے تو مورخین کے اصول ان کے سامنے ہوں گے۔ اگر وہ متکلم تھے تو علم کلام کے مسائل ان کے سامنے ہوں گے۔ اگر وہ کسی دعوتی اصلاحی اور تجدیدی تحریک کے قائد تھے تو ان کی سیرت نگاری میں اصلاح اور تجدید کے پہلو نمایاں ہوں گے۔ یہ صرف نمایاں ہونے کی حد تک ہے۔ اس کو بہت لگے بندھے معیار کے طور پر نہیں دیکھنا چاہئے۔

سیرت کے دستیاب ذخیرہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے سیرت نگاری کے جو بڑے بڑے اسالیب ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

محدثانہ اسلوب

اس اسلوب میں ان شخصیات نے سیرت پر زیادہ کام کیا جو دراصل حدیث کے متخصص تھے اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ اور وقت علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں گزرا تھا۔ انہوں نے علم حدیث کے قواعد اور اصول کو سامنے رکھا۔ علم حدیث کے معیارات اور اصول و ضوابط کے پیش نظر مواد کا انتخاب کیا، اس کو ترتیب دیا اور اس کے بعد سیرت کے واقعات و موضوعات کی ترتیب سے اس مواد کو مرتب کر کے جمع کر دیا۔ محدثین کی نظر میں سب سے بنیادی اور اصل چیز یہ ہے کہ جو چیز ذات رسالت مآب ﷺ سے منسوب کی جائے وہ ٹھیک سو ایک فیصد صحیح ہو اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کی نسبت میں ذرہ برابر بھی کوئی تامل یا شک نہ کیا جا سکے۔ محدثین اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ جس راوی سے وہ روایت بیان کریں وہ براہ راست انہوں نے اپنی زبان سے سنی ہو۔ نہ صرف سنی ہو بلکہ سننے کی کیفیت معلوم اور واضح ہو۔ یہ کیفیت بھی محدثین بیان کرتے ہیں۔

جو لوگ حدیث کے طلبہ ہیں، وہ یہ جانتے ہیں جب کوئی محدث ایک حدیث بیان کرتا

بتاتا ہے۔ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس کے شیخ جب حدیث بیان کر رہے تھے تو میں تنہا سننے والا تھا یا اور لوگ بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ بات بھی واضح کرنی ہوتی کہ میں پڑھ کر سنا رہا تھا اور وہ سن کر تصدیق کر رہے تھے یا وہ پڑھ کر سنا رہے تھے اور میں سن رہا تھا یا کوئی اور پڑھ کر سنا رہا تھا اور محدث سن رہے تھے اور میں بھی وہاں موجود تھا۔ ان سب کے لئے الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ امام مسلم کی اصطلاحات سے جو لوگ واقف ہیں ان کو پتہ ہے کہ امام مسلم جب کہتے ہیں کہ حدثنا فلاں مثلاً حدثنا قتیبہ بن سعید تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قتیبہ بن سعید پڑھ کر سنا رہے تھے اور میرے علاوہ بھی کئی لوگ موجود تھے اور وہ ہم سب کو سنا رہے تھے۔ کیونکہ حدثنا میں ضمیر منصوب جمع ہے۔ اگر وہ کہیں کہ حدثنی قتیبہ بن سعید تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تنہا وہاں موجود تھا اور قتیبہ بن سعید صرف مجھے پڑھ کر سنا رہے تھے۔ اگر امام مسلم کہیں کہ اخبرنا قتیبہ بن سعید، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، امام مسلم کے روبرو ایک ایک کر کے سب پڑھ رہے تھے اور امام مسلم سن سن کر اس کی تصدیق وتصویب فرماتے جاتے تھے، اور لوگ اپنی یادداشتوں میں نوٹ کر رہے تھے۔ اگر وہ کہیں کہ اخبرنی قتیبہ بن سعید، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں امام مسلم کے روبرو تنہا بیٹھا ہوا تھا، اور حدیث پڑھ کر ان کو سنا رہا تھا۔ وہ سن کر تصویب فرما رہے تھے۔ اگر وہ لکھیں کہ اخبرنا قتیبہ بن سعید قراءۃ علیہ وانا اسمع، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی اور پڑھ رہا تھا، امام مسلم سن رہے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ بعد میں انہوں نے مجھے بھی اجازت دی کہ تم بھی اس کی روایت کرو۔

یہ تو پہلا مرحلہ ہوا۔ روایت حدیث کے آخر تک سارے مراحل میں یہی شرط پیش نظر ہوگی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ جس نے بیان کیا وہ کردار میں کیسا تھا؟ وہ انتہائی سچا انسان ہونا چاہئے۔ اس کے سچے اور کھرے انسان ہونے پر اتفاق رائے ہونا چاہئے۔ اس کی یادداشت محفوظ ہونی چاہئے۔ اس کے کردار اور شخصیت میں بلندی کا ایک خاص معیار ہونا چاہئے اور آخر تک یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ تک یہ بات اسی طرح درجہ بدرجہ نقل ہوئی چاہئے۔ پھر جتنا الفاظ جس راوی نے بولا ہے ان میں کسی ردوبدل کی گنجائش کا تصور بھی ممکن ہے۔ یہ محدثین کا معیار تھا۔ اب محدثین جب اپنے معیار پر احادیث یا روایات کو جانچتے تھے تو وہ تاریخی ضروریات یا مورخ کے تقاضوں کے مطابق روایت کا جائزہ لیتے۔

لیتے تھے۔ ان کو اس سے بحث نہیں ہوتی تھی کہ جو واقعہ زیر بحث ہے اس کی مکمل تصویر ان روایات سے بنتی ہے یا نہیں بنتی۔ مکمل تصویر کا بننا یا نہ بننا ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ مستند اور معتبر ذریعے سے آئی ہوئی ہونی چاہئے۔ یہ محدثین کا اسلوب تھا۔

محدثین میں جن حضرات نے سیرت نگاری کا کام کیا، ان میں تمام بڑے بڑے محدثین شامل ہیں۔ اس لحاظ سے کہ حدیث کے ہر مجموعے میں سیرت سے متعلق الگ الگ ابواب موجود ہیں۔ جہاد کے ابواب ہیں، مغازی کے ابواب ہیں، سیرت کے ابواب ہیں، رسول اللہ ﷺ کے خاندان اور ازواج مطہرات سے متعلق ابواب ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں ابواب ہیں، ہجرت سے متعلق مباحث ہیں۔ یہ سارے مضامین محدثین نے مختلف ابواب کے تحت جمع کر دیئے ہیں۔

مستند کتب حدیث میں سیرت کے بارے میں جتنا ذخیرہ ہے آپ اس کے بارے میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بالکل مستند، صحیح اور قابل اعتماد ہے، اس لئے کہ صحت سند کے ساتھ یہ ساری معلومات ان کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مثلاً ہجرت کا واقعہ کیسے پیش آیا، اور اس کی تمام تفصیلات ترتیب سے آپ دیکھنا چاہیں، تو یہ آپ کو حدیث کی کسی کتاب میں یکجا نہیں ملے گا۔ کل میں نے مثال دی تھی کہ مثلاً اگر ہجرت کا واقعہ بیان کریں گے تو اگر ایک واقعہ چار راویوں سے ملا ہو تو وہ چار احادیث الگ الگ بیان کریں گے۔ ہر ایک محدث کی نظر میں حدیثوں کی جو تعداد ہے وہ متن یا ثبوت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سند کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک محدث مثلاً امام بخاری، امام ترمذی یا کسی اور کو یہ بات پہنچی ہو کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر نے اپنا کمربند کھول کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ایک سے ناشتہ دان باندھا تھا اور دوسرے سے پانی کی مشک باندھی تھی۔ یہ بات ان کو چار اساتذہ سے پہنچی ہو تو وہ اس کو چار احادیث شمار کریں گے۔ اس کو چار جگہ بیان کریں گے۔ امام مسلم کو آپ دیکھیں تو انہوں نے ایک ایک متن کو چار چار، پانچ پانچ، چھ چھ بار روایت کیا ہے تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ بات میں نے فلاں فلاں اساتذہ سے سنی تھی۔ یعنی صرف اس استاد سے نہیں بلکہ فلاں استاد سے بھی سنی تھی۔ اور یہ بات جس طرح

مغازی کے واقعات کو جمع کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ وہ ہر ایک واقعہ کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے اور ان ساری معلومات کو یکجا کرکے اور مرتب کرکے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ کل میں نے عرض کیا تھا کہ عبدالملک بن مروان نے ان سے بہت سے سوالات پوچھے۔ ہجرت کا معاملہ ان سے دریافت کیا۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ کی وفات کی تاریخ کے بارے میں معلوم کیا۔ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے بارے میں ان سے پوچھا۔ انہوں نے جو جوابات دیے وہ کتابی شکل میں محققین نے الگ سے شائع کردیے ہیں۔

ان جوابات میں ان کا انداز یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے۔ میرے پاس اس سلسلہ میں جو معلومات ہیں وہ فلاں راوی، فلاں، فلاں اور فلاں سے پہنچی ہیں [illegible] کرتا ہے کہ ان لوگوں سے مجھے یہ معلومات ملی ہیں اور ان ساری معلومات کا خلاصہ یہ ہے۔ گویا تمام متعلقہ معلومات کو ایک مرتب اور مربوط انداز میں بیان کردیتے ہیں۔ چونکہ یہ بات ایک طرح کے ذاتی خطوط میں بیان ہورہی تھی اس لئے محدثین کو اس پر اعتراض نہیں ہوا اور انہوں نے اس کو ناقابل قبول قرار نہیں دیا۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جو ایک تاریخی ضرورت بھی تھی۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے۔ علمی ضرورت کی خاطر بھی اور ضرورت یا محض دلچسپی کی خاطر بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کیسے فرمائی۔ مکہ مکرمہ سے روانگی سے لے کر مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت ابوایوب انصاری کے مکان میں ٹھہرنے تک کی پوری تفصیل وہ جاننا چاہتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی کہ درمیان میں راوی کون کون آتے ہیں، کتنے ہیں کون کون راوی ہے۔ اس کی دلچسپی اس میں ہوگی کہ پوری بات تفصیل سے اس کے سامنے آجائے۔ چنانچہ بعض اہل علم نے بہت سے کام لے کر یہ کام کیا اور اس طرح کی مؤرخانہ تحریریں مرتب کیں۔ جن میں بعض کا میں ابھی ذکر کرتا ہوں۔

اس سے مورخانہ اسلوب پیدا ہوا اور جس اسلوب کو ان لوگوں نے اختیار کیا ان میں بہت سے نام قابل ذکر ہیں۔ کل ابن اسحاق کی بات ہوئی تھی۔ واقدی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ابن ہشام نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ کئی دوسرے حضرات نے یہ طرز اپنایا۔ شروع میں محدثین نے اس پر شدید نکیر کا اظہار کیا اور اس کو ناپسند فرمایا۔ امام احمد کے بارے میں کل میں نے عرض کیا تھا کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو ابن اسحاق پر اعتماد ہے تو انہوں نے

بھی یہی بات بیان فرمائی کہ مجھے ابن اسحاق پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ابن اسحاق روایات کو بیان کرنے کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہ طریقہ درست نہیں۔ یہ احتیاط اور تقویٰ کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا انتہائی اونچا معیار تھا۔ لیکن آخر کار امت میں سیرت نگاری کے ضمن میں اسی طرز کو قبول عام حاصل ہو گیا کہ ایک مرتب انداز میں اور ایک systematic narrative کے انداز میں واقعات کو بیان کیا جائے۔ یہ مورخانہ اسلوب تھا جس کے بانی حضرت عروہ بن زبیر کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اسلوب کو سب سے پہلے انہوں نے شروع کیا۔ پھر دوسرے اصحاب مثلاً امام زہری نے، ابن اسحاق نے پھر آگے چل کر واقدی نے اور ابن سعد نے اس اسلوب کو مزید پروان چڑھایا، اور تیسری صدی ہجری تک یہ طرز بیان ایک معروف اور متعارف اسلوب بن گیا۔ جن حضرات کو اس پر اعتراض تھا وہ بھی آہستہ آہستہ خاموش ہو گئے اور ان کا اعتراض بھی کمزور پڑ گیا، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جو باتیں مستند مآخذ کی بنیاد پر بیان کی جا رہی ہیں اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے، اس لئے انہوں نے اپنے اعتراض پر بھی نظر ثانی کی ہو گی۔

مؤلفانہ اسلوب

مورخانہ اسلوب کے نتیجہ میں سیرت پر پے در پے کتابیں آنی شروع ہو گئیں۔ جب یہ کتابیں بڑی تعداد میں آ گئیں تو پھر جلد ہی ایک تیسرا اسلوب سامنے آیا جس کو ہم مولفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ مولفانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے مختلف مآخذ اور کتب کو سامنے رکھ کر ایک تصنیفی انداز میں جس میں ایک مرتب، مربوط اور مستقل کتاب لکھی جاتی ہے سیرت پر کتابیں تیار کی جائیں۔ اس طرح سے کتابیں لکھنے کا رواج تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک سیرت کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اور اب جتنی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، ان میں سے اکثر کتابوں کے اسلوب کو آپ مولفانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔

فقیہانہ اسلوب

اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا ایک فقیہانہ اسلوب بھی تھا۔ فقیہانہ اسلوب سے

مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ ان سے کون کون سے فقہی احکام نکلتے ہیں۔ سیرت کے بہت سے واقعات، بالخصوص مغازی اور حضور کی مہمات کی جو تفصیل ہے وہ اسلامی قوانین کا ماخذ بھی ہے اور سنت کے بہت سے احکام بھی اس سے نکلتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ سیرت کے کون سے واقعہ سے سنت کا کون سا حکم نکلتا ہے، سیرت اور فقہ کی حدود مل جاتی ہیں۔ اس غرض کے لئے یعنی سنت کے تعین کے لئے بعض جگہ سیرت کے واقعات کو بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ جب پہلی اور آخری مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حضور نے زندگی میں ایک ہی بار حج کیا۔ جب حج فرض ہوا تو آپؐ نے گورنر مکہ حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا۔ دوسری مرتبہ جناب صدیق اکبر امیر حج کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کی زندگی میں آخری سال جب حج کا موقع آیا تو آپ نے پہلی اور آخری بار حج فرمایا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر حضور ﷺ ایک سے زائد مرتبہ حج فرماتے تو ہر مسلمان ہمت کرکے وہ حج کرنا چاہتا اور یہ ایک مشکل مسئلہ ہو جاتا۔ اس لئے حضور ﷺ نے ایک ہی حج پر اکتفا فرمایا۔

حضور ﷺ کے اس ایک حج کی تفصیلات بہت سے محدثین نے جمع کیں۔ صحابہ کرام نے بہت غور سے حضور ﷺ کے حج کو دیکھا۔ خود حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ خذوا عنی مناسککم، حج کے مناسک مجھ سے سیکھتے رہو۔ اس لئے صحابہ کرام ایک ایک چیز کو دیکھتے رہے اور اطاعت کرتے رہے۔ جن جن صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حج کو دیکھا، انہوں نے جس انداز سے سمجھا اس کو بیان کر دیا۔ یہ دیکھنے والے کے فہم پر بھی ہوتی ہے۔ دیکھنے والے نے کس حصہ کو دیکھا۔ کس حصہ کو زیادہ غور سے دیکھا، کس حصہ کو کم غور سے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی خیمے میں آرام فرماتے ہوں گے۔ کبھی وہ صحابہ جو دیکھ رہے ہوتے تھے وہ خود کسی ضرورت کی وجہ سے موجود نہ ہوتے ہوں گے۔ ہر وقت چوبیس گھنٹے پورے سفر میں تمام صحابہ تو نہیں دیکھتے رہے ہوں گے۔ کئی ایسے اوقات ہوں گے کہ ہر موقع نہیں ملا ہوگا کہ چوبیس گھنٹے حضور کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ اس لئے جس نے جتنا حصہ دیکھا اس کی بنیاد پر انہوں نے ایک رائے قائم کی۔ جب یہ سارا مواد بعد کے لوگوں تک پہنچا اور اس سے حج

سے تفصیلی احکام مرتب کیے جاتے تھے تو جس کو جس انداز سے معلومات ملی تھیں اس نے اس انداز سے احکام کا استنباط کیا اور تفصیلات کو اسی انداز سے مدون کیا۔

مثلاً حج کی تین مشہور اقسام ہیں۔ حج افراد، حج قران اور حج تمتع۔ یہ عجیب بات ہے کہ صحابہ کرام میں کچھ کا خیال تھا کہ حضور نے حج افراد فرمایا، کچھ کا خیال تھا کہ حج قران فرمایا اور کچھ کا خیال تھا کہ حج تمتع فرمایا۔ جن فقہا نے اپنی تحقیق سے یہ رائے قائم کی کہ حضور کا حج حج قران تھا، جیسے امام ابوحنیفہ، تو انہوں نے حج قران کو افضل قرار دیا۔ جن فقہا کی تحقیق میں حضور نے حج افراد فرمایا، جیسے امام احمد بن حنبل، انہوں نے حج افراد کو افضل قرار دیا۔ جن کی تحقیق یہ تھی کہ حضور نے حج تمتع فرمایا، تو انہوں نے تمتع کو افضل قرار دیا، جیسے امام شافعی۔ اب یہ تحقیق کا اختلاف ہے۔ یہ سارے مباحث بیک وقت سیرت کے مباحث بھی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں واقعاتی اعتبار سے حضور کے حج کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ یہ فقہی مسئلہ بھی ہے۔ حدیث کا مسئلہ بھی ہے کیونکہ حج کے احکام سے متعلق احادیث بھی اس میں زیر بحث آتی ہیں۔ یہ سیرت نگاری کا فقیہانہ اسلوب ہے، اس پر خاصا کام ہوا ہے۔

متکلمانہ اسلوب

فقیہانہ اسلوب کے ساتھ ایک اور اسلوب بھی ہے جس کو ہم متکلمانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ علم کلام کے نقطہ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کو دیکھا جائے اور جو چیزیں علم کلام کے نقطہ نظر سے اہم ہیں وہ نمایاں کی جائیں۔ یہاں علم کلام سے مراد یہ گفتگو نہیں ہے جو ہم اور آپ دن رات کرتے ہیں، نہ اس سے مراد ادب کا کوئی شعبہ ہے، جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ کلام ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی وہ علم یا فن ہے جس میں اسلامی عقائد کو عقلی دلائل سے بیان کیا جائے اور دوسرے مذاہب کے عقائد پر عقلی انداز سے تنقید کی جائے اور عقلی دلائل کی بنیاد پر اسلامی عقائد کی برتری ثابت کی جائے۔

یہ فن علم کلام کہلاتا ہے۔ اس کا رواج بھی سب سے پہلے محدثین کے ہاں ہوا۔ محدثین نے پہلے پہل وہ سوالات اٹھائے جن کا تعلق علم کلام سے تھا۔ علم کلام میں سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی عقلی دلیل کیا ہے۔ یہاں علم کلام کا تعلق سیرت سے

ساتھ استوار ہوتا ہے۔ جب حضورؐ کی نبوت پر عقلی دلیل کا مسئلہ آیا تو پھر معجزات کی بحث آئی۔ پھر معجزات کی واقعاتی تفصیلات کو جمع کرنے کی بات ہوئی۔ پھر معجزات کی تعداد پر بحث ہوئی۔ اس طرح یہ مسئلہ سیرت کا ایک بہت عظیم الشان مسئلہ بن گیا۔ گویا سیرت اور کلام کا ایک ایسا مشترکہ مضمون سامنے آیا جس کو ہم متکلمانہ سیرت کہہ سکتے ہیں۔ یا کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں۔

ادیبانہ اسلوب

سیرت کا ایک اور اسلوب جو بعد میں سامنے آیا اس کو ہم ادیبانہ اسلوب سیرت کہہ سکتے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بعد میں سامنے آیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ محدثین اور مستند ارباب سیرت کی بارگاہ میں اس اسلوب کو پذیرائی نہیں مل سکی اور نہ مل سکتی تھی۔ جن حضرات نے آگے چل کر اس اسلوب کے تحت سیرت کی کتابیں لکھیں، اگر آج اکثر محدثین زندہ ہوتے تو شاید ان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتے۔ ادیبانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کو خالص ادبی اسلوب نظم یا نثر میں مرتب کیا جائے۔ دراصل جب سیرت کے واقعات مرتب ہوگئے، مستند قرار پاگئے اور لوگوں تک پہنچ گئے تو بعض ادیب حضرات نے ان کو یا تو حکایت کے انداز میں یا نظم میں، یا مکالمہ اور کہانی کے انداز میں بیان کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس میں وہ لوگ جو سیرت پر سنجیدہ کتابیں نہیں پڑھنا چاہتے ان کے لئے سیرت کے مواد میں ادبی چاشنی اور رنگ پیدا کر دیا جائے کہ غیر متخصص بھی سیرت کا مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ اسلوب سب سے پہلے فارسی میں پیدا ہوا۔ فارسی کے لٹریچر سے اردو میں آیا۔ عربی میں اس کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس اسلوب پر زیادہ کتابیں بہت بعد میں اور زیادہ تر اردو اور فارسی میں لکھی گئیں تو یہ درست ہوگا۔ ادیبانہ اسلوب میں کچھ کتابیں نظم میں ہیں اور کچھ نثر میں بھی ہیں۔ نظم کا آغاز پہلے ہوا، نثر کا آغاز بعد میں ہوا۔ ویسے بھی ہر زبان کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر زبان میں نظم کا آغاز پہلے ہوتا ہے اور نثر کا بعد میں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں بہت سے ادیبوں نے سیرت کے واقعات کو نظم کیا۔ ایک ایک ہزار شعروں پر مشتمل نظمیں لکھی گئیں، بلکہ دو دو اور تین تین ہزار اشعار پر مشتمل نظمیں اور قصائد ہیں جن میں حضور

ﷺ کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا گیا۔ کسی نے معجزات کو بیان کیا ہے۔ کسی نے بعض خاص غزوات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرانہ اسلوب

سیرت نگاری کا ایک اور اسلوب جو بہت بعد میں پیدا ہوا، وہ مناظرانہ اسلوب تھا۔ اس سے مراد وہ اسلوب تھا جو مسلمان مسالک یا مدارس فکر کے مابین مناظروں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ ان مناظروں کے نتیجے میں مسلمانوں میں مختلف رائے رکھنے والے لوگوں نے سیرت کے مختلف واقعات کی تعبیر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کی۔ اس تعبیر میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل دیے اور دوسروں کے نقطۂ نظر پر تنقید کی۔ اس اسلوب پر تیسری چوتھی صدی ہجری کے بعد سے تھوڑا بہت کام تو ہر دور میں ہوتا رہا۔ لیکن زیادہ زور و شور سے برصغیر میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چیز سامنے آنا شروع ہوئی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ میں اس کو محض اتفاق نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی مناظرانہ تحریروں میں شدت برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں یہ مسائل بھی پیدا ہونے لگے اور ایسے ایسے مسائل اور سوالات اٹھائے گئے جو پچھلے بارہ سو سال میں نہیں اٹھائے گئے تھے۔ ہر فریق نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن پاک سے بھی استدلال کیا۔ یہ عمل نسبتاً محدود تھا۔ سیرت اور حدیث سے استدلال کی نوبت زیادہ آئی۔ اس کے نتیجے میں ایک مناظرانہ ادب سامنے آیا جس کی علمی حیثیت کے بارے میں تو سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کا کم سے کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مناظرہ اور بحث میں حصہ لینے والے تمام فریقوں کے پیروکاروں کے حلقوں میں سیرت کے بہت سے واقعات معلوم اور متعارف ہو گئے۔ سیرت کے جس واقعہ سے کسی خاص بزرگ نے استدلال کیا تو کم سے کم ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں میں وہ واقعات مشہور و معروف ہو گئے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر اس سارے مناظرانہ ہنگامے کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سیرت کا علم نسبتاً زیادہ عام ہو گیا۔

یہ سیرت کے وہ بڑے بڑے اسالیب ہیں جو حضرت عروہ بن زبیر کے دور سے لے کر آج تک گزشتہ تیرہ سو سال میں ہمارے سامنے آئے۔ جب شروع شروع میں یعنی پہلی صدی ہجری میں حضرت عروہ بن زبیر کے کام سے مغازی کی تدوین کا آغاز ہوا تو گویا پہلی صدی ہجری میں اسلوب مورخین بھی سامنے آگیا تھا اور اسلوب محدثین بھی سامنے آگیا تھا۔ تابعین جب سیرت کے ذخائر کو جمع کر رہے تھے تو صحابہ سے معلومات حاصل کر کے جمع کر رہے تھے۔ اس زمانے کی جو تحریریں آج موجود ہیں وہ یا تو محدثانہ یا مورخانہ انداز میں ہیں۔ یعنی دونوں انداز کی تحریریں موجود ہیں۔ عروہ کی تحریریں بھی ہیں جن کو مورخانہ اسلوب کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے بعض حضرات کی جو تحریریں محدثانہ اسلوب میں آج دستیاب ہیں ان میں محدثانہ اسلوب ہی کی پیروی کی گئی ہے کہ ہر واقعہ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ ہر راوی کا الگ الگ ذکر ہے اور روایت یا واقعہ کے جو جو حصے جہاں جہاں دستیاب ہیں سب کو جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔ اس کے برعکس مورخانہ اسلوب کے نمائندہ حضرات نے واقعہ کی تاریخی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو معاملہ ہوا ہے اس کی مکمل تصویر سامنے آجائے اور جہاں جہاں خلا ہے اس خلا کو مختلف واقعات اور روایات سے پر کیا جائے۔ یہ مورخین کا اسلوب تھا۔ محدثین کا اصل ہدف صرف یہ تھا کہ جو روایات موجود ہیں ان کو جوں کا توں آگے تک پہنچا دیا جائے۔ تاریخی واقعہ کی تفصیل مکمل ہو یا نامکمل ہو، تصویر مکمل ہو یا نامکمل رہے۔ یہ محدثین کی دلچسپی کا میدان نہیں تھا۔

اسلوب محدثین کے بڑے بڑے نمائندے تو خود بڑے بڑے محدثین ہی ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں میں سیرت کا انتہائی غیر معمولی ذخیرہ موجود ہے۔ کل کسی دوست نے 'الرحیق المختوم' کے بارے میں سوال کیا تھا۔ الرحیق المختوم کے مصنف نے کوشش کی ہے کہ اپنی کتاب کے لئے بنیادی معلومات اور روایات بخاری اور مسلم سے لی جائیں۔ انہوں نے اصل مواد ان دو کتب سے لیا ہے اور پھر جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے وہاں دوسری کتب حدیث سے معلومات لی ہیں۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ کتاب اگرچہ محدثین کے فراہم کردہ مواد پر مبنی ہے، لیکن ان کا اسلوب مورخانہ ہے۔ اس طرح کی اور کتابیں بھی لوگوں نے لکھی ہیں۔

بعض حضرات نے محدثانہ اسلوب کو اپنایا اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ روایت باللفظ کی مکمل پابندی کی جائے۔ روایت باللفظ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح راوی نے اپنے سے پہلے راوی سے سنا ہے اس میں کوئی لفظی تبدیلی کئے بغیر اس کو جوں کا توں آگے بیان کردے۔ یہ بات شروع ہی میں محدثین کے درمیان زیر بحث آئی کہ کیا کسی حدیث کی روایت میں روایت بالمعنی کی اجازت ہے۔ کیا کسی حدیث کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ محدثین نے بالاتفاق رائے دی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے تھے وہی بیان کئے جائیں۔ محدثین نے صرف صحابہ کرام کی روایت کے بارے میں ایک چیز کی اجازت دی کہ اگر کوئی صحابی کسی واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو اس کو قابل قبول سمجھا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے کا کوئی واقعہ، جس میں حضور ﷺ کا کوئی ارشاد موجود نہ ہو، وہاں روایت باللفظ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ یعنی حضور علیہ السلام کی سیرت کے کسی واقعہ کو کسی صحابی نے دیکھا اور اپنے الفاظ میں بیان کردیا تو ان کو اختیار ہے کہ وہ روایت باللفظ کی بجائے روایت بالمعنی کا انداز اپنائیں۔ جب صحابی کی روایت تابعی کو مل جائے تو پھر تابعی کے لئے جائز نہیں کہ ان صحابی کی روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔ آپ حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں۔ ایک ایک صفحہ پر یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ لفظ فلاں استاد کا ہے اور یہ لفظ فلاں استاد کا ہے۔ یہاں تک احتیاط کی انتہا کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر احتیاط نہیں ہوسکتی۔ کہ مثال کے طور پر سفیان نام کے سفیان ثوری اور دوسرے سفیان بن عیینہ دو بڑے محدثین ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک استاد نے حدیث کی روایت کے ضمن میں بیان کیا ہوتا تھا کہ حدثنی سفیان، کہ مجھ سے یہ حدیث سفیان نے بیان کی۔ شاگرد کو تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے استاد کون سے سفیان ہیں۔ لیکن اگر کسی شیخ نے دونوں سفیانوں سے کسب فیض کیا ہو اور ان کا کوئی شاگرد آگے بیان کرے کہ حدثنی سفیان۔ تو یہ التباس ہوسکتا ہے کہ یہاں کون سے سفیان مراد ہیں۔ مثال کے طور پر محدث الف سند بیان کریں کہ حدثنی سفیان، تو ان کے شاگرد اور راوی محدث ب یہ نہیں کہیں گے کہ حدثنی سفیان بن عیینہ۔ اس لئے کہ اگر وہ کہیں گے کہ حدثنی سفیان بن عیینہ تو یہ الفاظ استاد کے نہیں ہوں گے۔ استاد کے الفاظ تو صرف اتنے ہیں کہ حدثنی سفیان۔ تو ان کے شاگرد ان الفاظ میں یک طرفہ ترمیم نہیں

کردیں۔ یہ جائز نہیں۔ وہ یہ بات واضح کرنے کے لئے کہ یہ سفیان بن عیینہ ہیں، کہیں گے کہ
حدثنی سفیان وھو ابن عیینہ۔ مجھ سے سفیان نے بیان کیا اور یہاں ابن عیینہ مراد ہیں۔ تاکہ یہ
پتہ چل جائے کہ یہ لفظ 'ابن عیینہ' جس کا اضافہ میں نے کیا ہے یہ استاد کی زبان سے نہیں نکلا تھا،
میں نے یہ لفظ وضاحت کی خاطر بیان کیا ہے۔ جو قوم کسی کے نام کے مکمل اور نامکمل کرنے میں
احتیاط کرتی ہو کہ استاد نے جزوی نام بولا تھا اور میں مکمل نام بتارہا ہوں تو یہ تکمیل استاد سے
منسوب نہ کروں، وہ قوم رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ میں کس طرح
تساہل سے کام لے سکتی ہے۔ اس لئے محدثین کے اسلوب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی
زبان مبارک سے نکلے ہوئے کسی لفظ کے بارے میں کوئی تردد کی گنجائش نہیں تھی۔

پھر خود رسول اللہ ﷺ نے بھی صحابہ کرام کو اس کی تربیت دی کہ وہ آپ کی زبان
مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو جوں کا توں بیان کریں اور ان کی روایت بالمعنی سے احتراز
کریں۔ چنانچہ بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو کوئی چیز سکھائی، کوئی دعا
سکھائی، کوئی خطبہ لکھوانا چاہا۔ اس میں اگر کسی نے یادداشت کی کمی کی وجہ سے یا یہ سمجھ کر کہ دونوں
لفظ ایک ہی مفہوم کے ہیں، کوئی دوسرا لفظ بول دیا تو حضور نے اس کی اصلاح اور وضاحت
فرمائی، جس کی مثال میں پہلے دے چکا ہوں کہ ایک صحابی نے 'وبنبیک الذی ارسلت' کی
بجائے 'ورسولک الذی ارسلت' بول دیا تھا تو آپ نے ان کا کان پکڑ کر فرمایا تھا کہ کیا
میں نے ایسا کہا تھا۔ گویا یہ اس بات کی یاددہانی تھی کہ جو لفظ سکھایا جائے اس کو اسی طرح
یاد رکھا جائے۔ اس میں معنی کی شرکت کی وجہ سے ازخود کوئی ترمیم نہیں کرنی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ روایت باللفظ کی پابندی کی وجہ سے خود سیرت نگاروں اور مغازی
نویسوں کے بیشتر بیانات اور عبارات میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ اگر ایک استاد سے دو
راویوں نے حدیث لی ہے تو دونوں کے الفاظ بالکل ایک ہی ہوں گے۔ ان دونوں کے بیانات
کو اگر الگ الگ سامنے رکھ کر موازنہ کیا جائے تو ان دونوں میں ذرہ برابر فرق نہیں ملے گا۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ دونوں تابعین ہیں اور
دونوں نے کئی صحابہ کرام سے کسب فیض کیا ہے۔ بعض صحابہ کرام دونوں کے اساتذہ ہیں۔ ان
دونوں کے بیانات الگ الگ کتابوں میں منقول ہیں۔ دونوں کے بیانات اب الگ الگ

کتب میں بھی نقل ہو گئے ہیں۔ چونکہ سیرت نگاروں کے تلامذہ میں موسیٰ بن عقبہ کے بیانات کو محدثین کی نظر میں زیادہ مستند اور اعتبار حاصل تھا۔ اب جب کچھ لوگوں نے موسیٰ بن عقبہ اور عروہ بن زبیر کے بیانات کو الگ الگ جمع کر کے مرتب کر دیا اور اب ہم ان کا تقابل کرتے ہیں تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے کی ہو بہو نقل ہے۔ لفظاً لفظاً ایک ہی روایت دونوں جگہ چلی آ رہی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں نے اپنے اساتذہ سے جو کچھ سنا وہ بجنسہٖ اس کو ضبط تحریر میں لے آئے اور روایت باللفظ کے اصول کی مکمل پابندی کی۔

محدثین کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جو راوی ان کی ذات سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات تک درمیان میں آئے ہوں وہ پوری طرح سے پختہ حفظ میں یادداشت میں جس کو محدثین ضبط کہتے ہیں، اپنے کردار میں، سچائی میں اور جس استاد سے روایت کر رہے ہیں ان سے ملاقات اور تلمذ میں یقینی اور قطعی دلیل رکھتے ہوں۔ ان میں سے ہر چیز قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ ہو۔ ایسی حدیث محدثین کی نظر میں صحیح کہلاتی ہے۔ بعض جگہ ایسا ہوا کہ ان میں سے کسی ایک صفت میں کوئی راوی کمزور ہے۔ کسی کی یادداشت کمزور ہے۔ کسی کی یادداشت تو کمزور نہیں ہے لیکن کسی اور پہلو سے ان کے کسی معاملہ کو کمزور سمجھا گیا۔ تو جس حدیث یا روایت میں کوئی ایسے راوی آ گئے جو کسی ایک اعتبار سے بھی کمزور ہوں تو اس روایت کا درجہ کم سمجھا گیا۔ اب جو روایات موسیٰ بن عقبہ کی ہیں ان میں سے بعض کے راوی ایک بزرگ ہیں ابن لہیعہ، جو محدثین کی نظر میں کمزور ہیں۔ حضرات محدثین میں جن محدثین تک ان کی روایت آئی انہوں نے ان کو کمزور قرار دیا۔ موسیٰ بن عقبہ کی ذات اور ان کے حفظ و ضبط میں تو کوئی کلام نہیں تھا لیکن اس ایک راوی کی وجہ سے ان کی روایت کو بھی قبول کرنے میں تامل کیا گیا۔ محدثین کا یہ بھی اصول ہے کہ اگر کوئی روایت کسی ایک راوی کی وجہ سے کمزور قرار دی گئی ہو اور کسی دوسری روایت سے اس کی تائید ہو جائے تو پہلی روایت کی یہ کمزوری دور ہو جاتی ہے اور پھر اس کو کمزور نہیں کہا جاتا۔ اس کی علم اصول حدیث میں لمبی بحث ہے اور بہت سی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً حسن اور صحیح اور حسن لغیرہ اور صحیح لغیرہ وغیرہ کی فنی بحثوں میں نہیں جاتا۔ اب چونکہ عروہ اور موسیٰ بن عقبہ دونوں کی روایات بالکل ایک جیسی سامنے آگئی ہیں تو جن جن روایات میں، جو تعداد میں بہت تھوڑی تھیں، کوئی کمزوری تھی وہ کمزوری دور ہو جاتی ہے اور وہ اعتراض

جو نقش محدثین کی طرف سے تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عروہ بن زبیر بیک وقت اسلوب محدثین کے بھی پیروکار تھے اور اسلوب مورخین کے بھی۔ خاص طور پر جو تحریریں انہوں نے عبدالملک کے لئے لکھیں وہ مورخانہ اسلوب کا نمونہ ہیں۔ اور یہ اسلوب سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنایا۔ انہوں نے کسی خاص واقعہ کی ایک مکمل اور مربوط تصویر اپنے مکتوب الیہ کو بھیجی۔ عروہ بن زبیر کے بعد آہستہ آہستہ یہ اسلوب مورخین میں مقبول ہوتا گیا۔ بعض بڑے فقہا نے بھی کہیں کہیں اس اسلوب کو جزوی طور پر استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام شافعی جہاں ایک بہت بڑے فقیہ ہیں وہاں ایک بہت بڑے محدث بھی ہیں۔ امام شافعی کی اپنی کتاب 'کتاب الام' استناد کے بہت اونچے درجے پر فائز ہے۔ پھر امام مالک کی روایت سے امام شافعی کے علاوہ بعد کے محدثین نے بھی بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ مثلاً امام بیہقی نے۔ یہ خود مسلکاً شافعی تھے اور بہت بڑے محدث تھے۔ امام بیہقی آخری محدث ہیں جنہوں نے براہ راست روایت کر کے کوئی کتاب مرتب کی ہے۔ ان کا انتقال 458ھ میں ہوا۔ ان کے بعد کوئی ایسا محدث نہیں ہے جس نے براہ راست روایت کر کے رسول اللہ ﷺ کی احادیث مرتب کی ہوں۔ ان کے بعد آنے والے محدثین نے دوسرے مجموعوں کی بنیاد پر مجموعے مرتب کئے ہیں۔ براہ راست روایت کی بنیاد پر تدوین حدیث کا کام، امام بیہقی کے بعد کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

امام بیہقی نے کئی مقامات پر امام شافعی کی روایت سے احادیث نقل کی ہیں۔ ان کا انداز بھی ہے اور یہ تاریخی اور سیرت کے واقعات سے متعلق ہے۔ میں ایک حوالہ مثال کے طور پر دینا چاہوں گا۔ امام شافعی کے حوالے سے امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ امام شافعی کہتے ہیں کہ اخبرنی غیر واحد من اهل العلم والصدق من اهل المدینة ومکة من قریش وغیرهم، یعنی مجھ سے ایک سے زیادہ اہل علم نے جو سچائی کی صفت سے متصف تھے، جن کا تعلق مکہ اور مدینہ سے قریشی اور غیر قریشی قبائل سے تعلق رکھتے تھے، وکان بعضهم احسن اختصاصاً للحدیث من بعض، ان میں سے کچھ حضرات علم حدیث سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے، وقد زاد بعضهم علی بعضهم فی الحدیث، ان میں سے بعض نے اس حدیث کے نکتے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بیان کئے ہیں۔ اس تمہید کے بعد آگے امام

شافعی اصل بات بیان کرتے ہیں، وہ یہ کہ سیدنا عمر نے جب دیوان مرتب کیا تو بنی ہاشم سے آغاز کیا اور پھر اس کی پوری تفصیل امام شافعی نے بیان کی ہے۔ اب یہ گویا امام شافعی جیسے بہت بڑے محدث اور بہت بڑے فقیہ، صحابہ کے زمانے کا ایک تاریخی واقعہ بیان کر رہے ہیں کہ جب حضرت عمر فاروق نے دیوان مرتب کیا تو کیسے کیا۔ یہ صحابہ کرام کا اجتماعی طرز عمل ہے۔ سب صحابہ نے اجماع سے طے کیا۔ اجماع ماخذ قانون ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ماخذ شریعت ہے، لیکن امام شافعی اس کو واقعہ کو راویوں کا نام لئے بغیر بیان کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں نے بہت سے لوگوں سے معلومات جمع کیں، جن کے علم اور صداقت پر مجھے اعتماد ہے اور ان کی روایت کی بنیاد پر میں نے یہ واقعہ نقل کیا۔ یہ مثال اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جو اسلوب شروع میں مورخین نے اختیار کیا تھا اور جس پر ابتدا میں محدثین کو تامل تھا اور جس کے بارہ میں ان کے حلقہ میں شدید تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ وہ بتدریج مقبول ہوتا گیا۔ یہاں تک امام شافعی جیسے جید ترین علمائے حدیث نے بھی بالآخر اس کو اختیار کر لیا۔

اسلوب محدثین پر تامل ذکر کتابوں کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ میں کل کروں گا۔ لیکن ایک ضروری بات ابھی عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سیرت کے مصادر و ماخذ کے بارے میں محدثین نے یہ جو ملاحظات کی ہیں وہ ان کے صرف ایک پہلو کے بارہ میں ہیں۔ کل ایک دوست نے ابن اسحاق کے بارے میں امام مالک کا ایک تبصرہ بیان کیا تھا۔ اس طرح کے تبصرے مختلف محدثین نے مختلف سیرت نگاروں کے بارے میں کئے ہیں۔ امام احمد نے بھی کئے ہیں اور امام مالک نے بھی کئے ہیں۔ ہمارے مغربی محققین کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اس طرح کے کمزور بیانات کو جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سیرت کے جتنے بھی مصادر ہیں وہ سب قابل اعتماد نہیں ہیں۔ 1980-81 میں غالباً جرمنی میں ایک باقاعدہ سیمینار ہوا تھا۔ اس کا موضوع ہی یہ تھا کہ حضورﷺ کی سوانح عمری کے جو مصادر اور ماخذ ہیں وہ غیر مستند ہیں اور غیر مستند ماخذ کی موجودگی اور مستند ماخذ کی عدم موجودگی میں (نعوذ باللہ من ذالک) تاریخی اور حقیقی محمدﷺ کا پتہ کیسے چلایا جائے۔

اس لئے اس طرح کے ملاحظات کے بارے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کل میں

نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ جرح غیر مفسر قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ جرح اور تعدیل غیر مفسر اور تعدیل اور جرح مفسر دونوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک محدث کی رائے پر کسی راوی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ دینا مناسب نہیں ہے۔

ان تمام محدثین نے اپنی کتابوں میں جو مواد شامل کیا ہے وہ ہر اعتبار سے چھان پھٹک کر شامل کیا گیا ہے۔ آپ اس عقلی اعتبار سے دیکھیں، کہ کسی بیان کو جانچنے کے عقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں اور نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں۔ نقلی دلائل وہ ہیں جن کو علمائے حدیث نے اصول روایت کے نام سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے اصول کیا ہیں۔ اس کو آپ حدیث کا بیرونی نقد کہہ سکتے ہیں۔ پھر عقلی دلائل وہ ہیں جس کو اصول درایت کے نام سے بیان کیا ہے۔ جس کو آپ داخلی نقد حدیث کہہ سکتے ہیں۔ ایک حدیث کا بیرونی نقد ہے یعنی خارجی اور روایتی اعتبار سے اور دوسرا ہے حدیث کا داخلی نقد درایت کے اعتبار سے۔ دونوں اصولوں کی روشنی میں محدثین نے جو بیانات نقل کئے ہیں اور جو تمام کتب حدیث میں شامل ہیں۔ ان کی بنیاد پر لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی میں نے ہمارے شیخ ڈاکٹر صفی الرحمن مبارکپوری کی کتاب الرحیق المختوم کا ذکر کیا، وہ سب کی سب کتب حدیث سے ماخوذ ہے۔

پھر کتب حدیث میں سیرت سے متعلق جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان کا اہل علم نے الگ سے بھی مطالعہ کیا ہے۔ ایک دو ایسی کتابوں کا ابھی میں تذکرہ بھی کرتا ہوں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی جو صحیح بخاری کے بڑے شارحین میں سے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے شاید سب سے بڑے محدث تھے۔ ان کی کتاب میں سیرت کے مختلف مباحث پر جابجا گفتگو ہوئی ہے اور صرف روایت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر تو علم حدیث و روایت کی معراج پر تھے۔ انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں کی ہے جو اصول روایت اور اصول درایت پر پوری نہ اترتی ہو۔ ان کی اس پوری کتاب سے سیرت کا مواد نکال کر حال ہی میں ایک بزرگ نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ تین جلدوں کی یہ کتاب ایک جامع کتاب سیرت ہے جو حافظ ابن حجر کی کتاب فتح الباری سے ماخوذ اور مستخرج ہے۔ اس کتاب کو یقیناً حافظ ابن حجر نے بطور سیرت کے تو نہیں لکھا تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ حافظ ابن حجر ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ ان کی ترتیب

سے استخراج کر کے اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ سیرت کے مباحث مکمل طور پر سامنے آ گئے۔
اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے گویا سیرت پر محدثانہ انداز سے
تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے جس طرح صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا ہے، جس
کے پیش نظر یہ کہا گیا کہ لا ہجرۃ بعد الفتح، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایتی اور حدیث کے نقطہ نظر
سے سیرت کا حق بھی انہوں نے ادا کر دیا اور جو کچھ سیرت کے بارے میں علم حدیث کی روشنی
میں کہا جا سکتا تھا وہ انہوں نے کہہ دیا ہے۔ یہ فقہ سیرت کا قدیم ترین اور مستند ترین اسلوب ہے جس
نے سیرت کے تمام بنیادی مباحث کو محفوظ کر دیا۔ جس نے سیرت کی core متعین کر دی۔
اب اس میں جزوی تفصیلات تاریخ سے، ادب سے اور دیگر ذرائع سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔
جس کو ان ثانوی ذرائع سے آنے والے اس مزید مواد سے اتفاق ہو تو وہ اضافہ کرے اور جس
کو اتفاق نہ ہو وہ اضافہ نہ کرے۔ لیکن سیرت کے علم پر اس اضافی مواد کو قابل قبول سمجھنے سے
کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

صرف ایک کتاب کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ اس موضوع پر قدیم ترین کتاب بھی ہے اور
مستند ترین بھی۔ وہ امام ترمذی کی شمائل نبوی ہے۔ کتاب الشمائل سیرت نبوی کے اس خاص
موضوع کی جامع اور مکمل کتاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک، آپ کے شخصی عادات
و فضائل اور آپ کی ذاتی اور شخصی زندگی کے پہلو۔ یہ ان موضوعات پر سب سے قدیم، سب
سے مقبول اور سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ غالباً دنیا کی ہر اہم زبان میں اس کے تراجم
ہوئے ہیں۔ سب سے مشہور اردو ترجمہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا ہے۔ پہلی بار یہ
آج سے تقریباً اسی نوے سال پہلے شائع ہوا تھا۔ بعد میں اس کے لاتعداد ایڈیشن نکلے۔ اور آج
ہر جگہ دستیاب ہے۔

مسلم اسپین میں مسلمانوں کی روایت بہت مضبوط رہی ہے۔ بعض جید ترین اہل علم
اسپین میں پیدا ہوئے۔ افسوس کہ اسپین میں مسلمانوں کے علمی ذخائر کا بہت بڑا حصہ ضائع
ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بعض بڑے بڑے محدثین اسپین میں پیدا ہوئے اور انہوں نے علم
حدیث پر ایسا کام کیا تھا جو کسی اور نے نہیں کیا لیکن افسوس کہ وہ کام بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بقی
بن مخلد ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے پورے

روئے زمین کے چھ چکر لگائے۔ روئے زمین سے مراد دنیائے اسلام تھا۔ یعنی دنیائے اسلام کے انتہائی مشرقی مقامات جو چین کی سرحد بلخ کاشغر وغیرہ سے لے کر اسپین تک پھیلے ہوئے تھے، اس پورے علاقے کے انہوں نے چھ چکر لگائے تھے۔ ظاہر ہے گھوڑے یا اونٹ کی پشت پر یا شاید کچھ مقامات پر پیدل بھی سفر کیا ہوگا۔ یہ سفر کتنے وقت میں کیا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس وسیع علاقہ میں موجود اہل علم سے استفادہ کر کے انہوں نے حدیث کی ایک کتاب مرتب کی تھی جس کے بارے میں تمام محدثین اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حدیث کی اس جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی۔ وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ اسی طرح سے علم تفسیر کی بعض بہترین اور جید ترین ایسی کتابیں جو آج موجود ہیں اور تفسیر کی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ وہ بھی اسپین میں مرتب ہوئیں۔ اسپین کے مشہور شہر قرطبہ کے امام قرطبی کی تفسیر بیس بیس جلدوں میں بار بار چھپی ہے اور آج موجود ہے۔ کئی اعتبارات سے یہ قرآن حکیم کی ایک مکمل تفسیر ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے اور جن جن علوم وفنون سے مدد لی جا سکتی ہے وہ سارے کے سارے اس میں موجود ہیں۔ اسپین کی روایت کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ وہاں کی روایت بڑی مضبوط اور قوی تھی اور وہاں کی روایت میں کسی آدمی کے لئے اپنے آپ کو نمایاں کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ایک بہت بڑے محدث جن کے بارے میں خود اہل اندلس نے یہ کہا کہ ھو اعلم اھل المغرب، کہ اہل مغرب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وہ اعلم اہل المغرب علامہ حافظ ابن عبدالبر تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اپنے زمانے میں تذکرہ، تفسیر، سیرت اور اس طرح کے ہر فن میں اعلم اہل المغرب تھے۔ ان کی ایک کتاب موطا امام مالک کی شرح ہے۔ موطا امام مالک کی شرح میں آج تک ان سے آگے کوئی نہیں جا سکا ہے۔ ان کا انتقال 463ھ میں ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک ایک ہزار سال ہونے کو ہیں۔ ان ایک ہزار سالوں میں آج تک کوئی ایک شخص بھی موطا امام مالک کی شرح میں حافظ ابن عبدالبر سے آگے نہیں گیا۔ انہوں نے موطا امام مالک کی ایک شرح روایت کے نقطہ نظر سے لکھی اور دوسری فقہی نقطہ نظر سے لکھی تھی۔ یعنی موطا امام مالک میں جو فقہی مسائل بیان ہوئے ہیں وہ کیا ہیں اور دوسری یہ کہ جو روایات ہیں ان کے راوی کون کون ہیں، یوں علم اصول اور حدیث کے نقطہ نظر سے

نام کا مفہوم ہے سیر اور مغازی کے اختصار سے بیان کئے گئے چند موتی۔ اس میں انہوں نے موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، عروہ بن زبیر جیسے بھی لوگوں نے مغازی اور سیر پر کام کیا تھا، ان کے کام کو سامنے رکھا اور جائزہ لے کر ایک ایسی جامع کتاب لکھ دی جس کے بارے میں اہل علم نے کہا کہ اب سیر اور مغازی پر اس سے زیادہ مستند کتاب کوئی اور موجود نہیں ہے۔

اس میں مزید ایک اضافہ انہوں نے یہ کیا کہ جہاں جہاں صحابہ کرام کے نام نامکمل تھے ان کو مکمل کر دیا۔ بعض صحابہ کرام اپنے ناموں کی بجائے کنیت سے مشہور تھے۔ کہیں ان کی کنیت نہیں اور نام بیان ہوا ہے۔ کہیں واحد کا نام بیان ہوا ہے۔ کہیں کسی نے کہا کہ فلاں صاحب نے کہا کہ میرے دادا نے یہ کہا تھا۔ اب وہ دادا کون تھے، ان کا نام کیا تھا، دوسری جگہ ان کا تذکرہ کہاں ملتا ہے۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو علم حدیث اور رجال پر گہری نظر رکھتا ہو۔ لہٰذا ایک تو انہوں نے یہ کام کیا کہ جہاں جہاں کسی بھی وجہ سے کوئی خلا رہ گیا تھا، اس کو انہوں نے پر کر دیا۔ معلومات کی کمی کو پورا کر دیا۔ جہاں کوئی بات احتیاط کے خلاف تھی اور علم ضرورت سے آگے نکل گیا تھا، اس کو نکال دیا۔ چونکہ ماخذ ان کے سامنے تھے، اس لئے مستند ماخذ سے کام لے کر انہوں نے جگہ جگہ اضافے بھی کئے اور خلا کو بھی پر کیا۔ انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی لکھیں جو آگے چل کر بڑی بحث اور تحقیق کا موضوع بنیں اور جن کے بارے میں بہت سی آراء وجود میں آگئیں۔ میں خود کوئی رائے تو نہیں دے سکتا لیکن ایک چیز کا ذکر بطور مثال کرتا ہوں۔

عام طور پر مشہور ہے اور یہ بات بہت زیر بحث بھی آئی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ کا حضورؐ کے ساتھ نکاح ہوا تو آپ کی عمر کیا تھی۔ اکثریت کا نقطہ نظر بالکل واضح اور متعین ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ آج کل کے کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے اور عمر زیادہ بتاتے ہیں۔ یہ بحث چلتی رہتی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام لانے والوں میں جو اولین اور ابتدائی لوگ تھے ان میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی شامل تھیں۔ اسلام تب معتبر ہوگا جب آدمی کم سے کم پانچ چھ سال کا تو ہو۔ اگر اولین مسلمانوں میں حضرت عائشہ کا نام شامل ہے اور ان کی عمر کم سے کم پانچ سال بھی مان لی جائے تو ہجرت کے موقع پر ان کی عمر کم سے کم اٹھارہ سال ہونی چاہئے۔ یہی بات آج کل کے بعض

احادیث اور سیرت کے عمومی ڈھانچہ یا ہیکل عام سے متعارض ہو۔ یہ معلومات سیرت کے عمومی اسٹرکچر میں جہاں جہاں خلا ہے اس کی تکمیل کرتی ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو تحقیق کی میزان پر پوری نہ اترتی ہو یا دین کے معیار پر قابلِ اعتراض ہو۔

محدثین کے نقطۂ نظر سے دورِ متوسط میں لکھی جانے والی آخری کتاب علامہ ابن کثیر کی چار جلدوں پر مشتمل سیرت النبی ہے۔ علامہ ابن کثیر دمشقی اپنے زمانے کے جید ترین علمائے کرام میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث تھے اور ابن کثیر محدث کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی تفسیر ابن کثیر بہت مشہور ہے جس کا اردو اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ممکن ہے فارسی، ترکی اور دوسری کئی زبانوں میں بھی ہوا ہو۔ حافظ ابن کثیر ایک بالغ نظر مورخ بھی ہیں کیونکہ اسلامی تاریخ کی مستند ترین کتابوں میں سے ایک کتاب 'البدایہ والنہایہ' انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل القدر محدث کے شاگرد ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی شمشیرِ زبان سے کوئی بچ نہ سکا اور جس شخص کے خیالات میں ذرہ برابر کمزوری تھی وہ ان کے قلم کی تلوار سے محفوظ نہیں رہا یعنی شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ۔

ابن تیمیہ واقعی شمشیرِ زبان تھے اور جس چیز کے بارے میں واقعی ان کو شبہ ہوا کہ یہ چیز شریعت کے سو فیصد معیار سے ذرا بھی کم ہے انہوں نے اس کے ساتھ رعایت نہیں کی۔ ابن کثیر ان کے شاگرد تھے۔ تو ایسے استاد کے شاگرد سے یہ توقع کرنا کہ وہ کوئی کمزور یا ہلکی بات کریں گے یا جان بوجھ کر کوئی غلط چیز پیش کریں گے ممکن نہیں۔ غلطی تو ہر انسان سے ہو سکتی ہے اور اختلاف ہر انسان کی رائے سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مداہنت اور تساہل کی امید یا توقع علامہ ابن کثیر دمشقی سے نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے سیرت پر پہلے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس کو مکمل کر کے انہوں نے ایک مکمل تاریخ بنا دی جو البدایہ والنہایہ کے نام سے مشہور ہے یعنی ابتدا اور انتہا۔

البدایہ والنہایہ تاریخ کی کتاب ہے۔ یہ صدرِ اسلام کے بارے میں معلومات کی ایک کان ہے۔ ایک خزانہ اور معدن ہے۔ انہوں نے اس میں کوشش کی ہے کہ روایات کا محاکمہ اور موازنہ بھی کریں۔ جو بالکل بے بنیاد روایات ہیں ان کو سرے سے نظر انداز کر دیں۔ جو زیادہ

کمزور روایات میں ان کو الگ نمایاں کر دیں۔ جہاں کسی راوی سے کوئی غلطی ہوئی ہے اس کی نشاندہی کر دیں۔ جن لوگوں نے کسی غلط فہمی یا تساہل کی وجہ سے کسی کمزور، بے بنیاد یا موضوع روایت کو بھی قبول کر لیا تھا ان کی نشاندہی کی کہ یہ روایت کمزور ہے، یا بالکل موضوع ہے اور مردود ہے، ناقابل قبول ہے۔ جن لوگوں نے اسرائیلیات قبول کی تھیں اور جس سے بہت مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں انہوں نے ایک قطعی فیصلہ کیا اور تنقید کرکے اسرائیلیات کو بالکل صاف کر دیا کہ فلاں اور فلاں روایت قابل قبول نہیں ہیں۔

اسرائیلیات سے مراد وہ روایات ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے حلقے سے آئیں اور بعض مسلمان علما نے ان کو قبول کرنے میں اس لئے تامل نہیں کیا کہ ان سے سیرت یا اسلام کے کسی واقعہ کی تکمیل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ مثال کے طور پر قرآن میں کہیں آیا ہے کہ یہودی اور عیسائی حضور کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں یعرفونه کما یعرفون ابناءهم۔ اب اگر کسی سابقہ یہودی مسلمان عالم نے، جو اسلام سے قبل یہودی رہا ہو، اس نے کسی آیت یا حدیث کی وضاحت میں یہ کہا ہو کہ اسی مفہوم کی بات یہودیوں کی فلاں کتاب میں بھی آئی ہے۔ تو ایسی باتوں کو قبول کرنے میں بہت سے مسلمان علماء نے تامل نہیں کیا۔ اس سے قرآن کی تائید ہوتی تھی اس لئے انہوں نے بیان کر دی۔ لیکن یہ جو بات بیان کی جا رہی ہے کیا یہ واقعتاً بھی درست ہے؟ اس پر انہوں نے زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یا مثلاً رسول اللہ ﷺ کے اجداد کے بارے میں کوئی بات آئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عرب کے جو فلاں سردار تھے، حضور کے اجداد میں ان کا فلاں نام تھا، ان کی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو یہ بات ہوئی۔ اس کو قبول کرنے میں انہوں نے بھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اس طرح ایک ایک کرکے اسرائیلی روایات اسلامی ادب میں شامل ہوتی گئیں۔

یہ اسرائیلی روایات جن دو اسلامی میدانوں میں داخل ہو گئیں ان میں ایک سیرت کا میدان تھا۔ خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے پہلے کے واقعات، آپ کی ولادت اور بعثت کے بارے میں پیشین گوئیاں، آپ کے بارے میں سابقہ کتب کی پیشین گوئیاں، آپ کے آنے والے پیغمبر کے بارے میں جو خبر دی گئی، اس خبر کے بارے میں اگر قدیم کتابوں

میں کچھ تھا تو اس کا بیان۔ یہ میدان تھے جس میں سابقہ لٹریچر سے مواد آیا۔ بہت سے لوگوں
نے اس کو قبول کر لیا۔ ویسے بھی قصے کہانیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں اور عوام میں جلدی مقبول
ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کے کچھ قصے کہانیاں بہت کثرت سے پھیل گئیں۔ حافظ ابن کثیر نے
ان کہانیوں کا شدومد سے جائزہ لیا اور ایک ایک کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فلاں چیز قابل قبول
ہے اور فلاں بات ناقابل قبول ہے۔

حافظ ابن کثیر کی یہ کتاب ایک جامع کتاب ہے اور استیعاب واستقصاء کے دور میں
لکھی گئی ہے۔ کل میں نے اصطلاح استعمال کی تھی استیعاب واستقصاء، کل دوستوں نے کہا کہ
بڑا مشکل لفظ ہے، اس کی وضاحت کر لی جائے۔ استیعاب کا مطلب ہے کسی چیز کے بارے
میں مکمل معلومات جمع کرنا۔ استقصاء کا مطلب ہے کسی چیز کو exhaustively بیان کرنا۔
جب آپ کسی چیز کو exhaust کریں گے تو وہ عربی میں استقصاء کہلاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا
جب سارا مواد سامنے آ چکا تھا اور اب محدثین، مفسرین اور مورخین اس کو ایک ایک کر کے جمع
کر رہے تھے اور بڑے بڑے مجموعے مرتب کر رہے تھے۔ حافظ ابن کثیر نے یہ کتاب اسی دور
میں لکھی۔ ان کے پاس اپنے سے پہلے کے سارے ماخذ موجود تھے۔ انہوں نے اس کتاب
میں سیرت سے متعلق تمام چیزیں جمع کر دیں۔ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ بھی
ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شروع ہوا ہے۔ جن روایات کو انہوں نے مستند اور قابل
قبول سمجھا ان کو بیان کر دیا۔ جن کو انہوں نے کمزور سمجھا ان کو بیان نہیں کیا۔ پھر حضور کے شمائل
یعنی عادات وخصائل کے بارے میں ساری روایات انہوں نے بیان کی ہیں اور وہ احادیث
جن میں حضور کے فضائل بیان ہوئے ہیں وہ بیان کیں۔ حضور کے خصائص بیان کئے۔ پھر
چونکہ وہ خود بہت بڑے محدث تھے اس لئے جہاں جہاں حدیث کے نقطہ نظر کوئی چیز قابل
غور ہے اس پر توجہ دلائی ہے۔ کہیں حدیث کے نقطہ نظر سے کوئی چیز ایسی ہے جو عام سیرت
نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی تو وہ بھی انہوں نے نمایاں کر دی۔ وہ خود بہت بڑے فقیہ بھی
تھے اس لئے فقہیات سیرت پر بہت سا مواد ان کی کتاب میں موجود ہے۔ ان کے مصادر کا
دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کا انتقال غالباً 774ھ میں ہوا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں
وفات ہوئی تو ان سات سو سالوں میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان تک پہنچا۔ ان سب کا انہوں نے

استخلاص اور انتخاب کیا اور چار ضخیم جلدوں میں یہ کتاب مرتب کر دی۔

البدایہ والنہایہ کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے جس میں یہ چاروں جلدیں موجود ہیں۔ جو الگ سے بھی چھپی ہیں۔ اس علیحدہ شائع ہونے والے ایڈیشن میں نسبتاً بہتر کام ہوا ہے۔ اس لئے کہ متعدد محققین نے ان کی تخریج کی ہے اور اس پر اضافی کام بھی کیا ہے۔ حوالہ جات کی تکمیل کی گئی ہے۔ جہاں مشکل الفاظ ہیں ان کی شرح بھی کر دی ہے اور جو روایات علم حدیث کی آئی ہیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو نسخہ چار جلدوں میں الگ چھپا ہے وہ استعمال کرنا چاہئے اور تحقیق کی غرض سے اسی کو استعمال کرنا چاہئے۔ البدایہ والنہایہ کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس کتاب کے بجائے اصل کتاب ہی سے استفادہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ترجمہ میں نے پڑھ کر نہیں دیکھا اس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ کتنا مستند ہے۔ لیکن ترجمہ بہرحال موجود ہے۔

محدثین کے نقطہ نظر کی آخری کتاب کا ذکر کر کے میں اس محدثانہ اسلوب کی بات ختم کرتا ہوں۔ اصولاً تو اس کتاب کا تذکرہ دور جدید کی کتابوں کے عنوان کے تحت آنا چاہئے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ایک خاص انداز کی ہے اور اس دور میں اس انداز کی کوئی اور کتاب نہیں ہے اس لئے میرا جی چاہا کہ اس کتاب کو حافظ ابن کثیر کی کتاب کی ذیل قرار دیا جائے۔ آپ اس اعتبار سے اس کتاب کو ان کی کتاب کا تسلسل سمجھ لیں یا بطور جلد تکمیلی sister volume کے سمجھ لیں۔ شیخ سعید حوّی مصر میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے 'الاساس فی السنۃ وفقہہا' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے سیرت بھی بیان کی ہے، فقہیات سیرت بھی بیان کی ہیں۔ حدیثیات سیرت بھی بیان کی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر یوں لگا کہ فقہیات سیرت یا محدثانہ نقطہ نظر کے مطابق یہ دور جدید کی شاید بہترین کتاب ہے۔ اگر کوئی اس کو بہترین کتاب قرار دینے سے اتفاق نہ کرے تو کم سے کم چند بہترین کتابوں میں تو یقیناً اس کا شمار ہونا چاہئے۔ ان کے بنیادی مآخذ میں صرف کتب حدیث شامل ہیں۔ جتنی بھی کتب حدیث آج دستیاب ہیں ان سب کو انہوں نے سامنے رکھا ہے۔ بہت سی کتابیں جو اب چھپ گئی ہیں جو پہلے نہیں چھپی تھیں۔ بہت سی کتابیں جو باہر آ گئی ہیں۔ مخطوطات بھی اکثر کی اب دستیاب ہیں۔ اب تو حدیث کا کوئی قابل ذکر مخطوطہ غیر مطبوعہ موجود نہیں رہا۔ اگر کوئی اکا دکا ہے بھی تو اس کی تصویریں اور مائیکرو فلمیں اتنی کثرت سے دستیاب ہیں کہ ہر شخص کی دسترس

بھی ہیں۔

انہوں نے ایک اور دلچسپ چیز بیان کی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں نے بھی بیان کی ہے لیکن انہوں نے اس کو ایک خاص رنگ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حفظ سیرت اصل میں حفظ سنت کا اور حفظ سنت حفظ قرآن کا ایک شعبہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حفظ قرآن کا وعدہ کیا ہے 'انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون'۔ ذکر یوں تو قرآن مجید کا نام بھی ہے لیکن اس کے معنی یاددہانی کے بھی ہیں۔ اگر قرآن کو بطور یاددہانی کے محفوظ کیا گیا تو یہ یاددہانی تب محفوظ ہوگی جب اس کی تفسیر بھی محفوظ ہو۔ تفسیر ہم تک حدیث کے ذریعے پہنچی ہے۔ تفسیر تب محفوظ ہوگی جب صاحب تفسیر مکمل روشنی میں ہوں گے۔ تو گویا حفظ قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ حفظ حدیث بھی ہو، اور حفظ حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ حفظ سیرت بھی ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کو ایک تسلسل اور ایک ہی مقصد کے مختلف شعبے یا مرحلے قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قراء، محدثین اور اصولیین سب کا ہدف ایک ہے اور وہ ہے حفاظت قرآن، حفاظت تفسیر قرآن، حفاظت سیرت صاحب قرآن اور حفاظت احکام قرآن اور حفاظت ہدایت قرآن۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے ایک نیا اسلوب اپنایا ہے۔ آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال پہلے ایک مصنف شیخ محمد جعفر الکتانی گزرے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر علی کتانی مرحوم جو کئی بار یہاں یونیورسٹی میں بھی تشریف لائے تھے۔ اسی ہال میں ان کی تقریریں بھی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے جد امجد تھے اور شاید ساتویں آٹھویں دادا تھے۔ ان کی کتاب 'الرسالة المستطرفة لبیان مشهور کتب السنة المشرفة' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کتب حدیث کے مختلف مدارج قائم کئے ہیں۔ ان مدارج کو شیخ سعید الحوی نے سامنے رکھا ہے اور جب کوئی بات کہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث درجہ اول کی احادیث میں ہے، یہ درجہ دوم میں ہے اور یہ درجہ سوم میں ہے، وغیرہ۔ دیکھنے والے کو ایک نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ استناد اور صحت کے اعتبار سے کس معیار پر ہے۔ کون سا بیان ہے جو درمیانی سطح پر ہے اور کون سا بیان ہے جو عام کتب حدیث میں ملتا ہے۔ یہ سب کتب حدیث وہ ہیں جو عام طور پر مشہور اور متداول ہیں۔ اس طرح انہوں نے سترہ کتب حدیث کو چھان کر سیرت کے بارے میں دستیاب مواد کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ جو احادیث بیان کی ہیں

ان کا درجہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ صحیح ہے، حسن ہے، حسن لغیرہ ہے یا ضعیف ہے۔ مصنف نے احادیث کا درجہ متعین کرنے میں قدیم ائمہ فن کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ماہرین حدیث کی آرا کو بھی سامنے رکھا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، شیخ ناصر الدین البانی اور شیخ شعیب الارنؤط کی تحقیقات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ حدیث اور معاملات کو بیان کرنے میں ان کا انداز وہ ہے جو شبلی کی سیرت النبی کا ہے۔

شبلی کی سیرت النبی بڑی جامع ہے۔ انہوں نے دو موضوعات سے بحث کی تھی کہ ہمارے نبی کون تھے اور وہ ہمارے لئے کیا لائے ہیں۔ اس طرح سیرت کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یہی دو سوالات سعید حوی نے بھی اٹھائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کون تھے؟ یہ پہلا سوال ہے اور وہ کیا تعلیم لے کر آئے تھے؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ان دونوں سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ پہلی دو جلدیں خالص واقعات سیرت پر ہیں۔ ہر واقعہ کو بیان کرتے وقت اس سے نکلنے والے احکام اور فوائد بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً غزوہ بدر کو کتب حدیث کے نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اس واقعہ سے یہ سبق نکلتے ہیں۔ یہ عبرتیں پنہاں ہیں۔ یہ احکام نکلتے ہیں۔ ان کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ تمام بیانات کے مکمل حوالے دیئے ہیں جو سب کے سب کتب حدیث کے ہیں۔

تیسری جلد حضور کے شمائل، خصائل، اہل بیت اور حضور کے اقارب اور اصحاب پر ہے۔ نمایاں ترین اصحاب رسول کون تھے۔ انسان اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی شان کا اندازہ کرنے کے لئے صحابہ کی شان دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جس کے ساتھی اس شان کے ہوں تو اس کی اپنی شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر حضور کے اہل خاندان اور قریبی رشتہ دار اور اقارب کون لوگ ہیں۔ حضور کے اپنے شمائل اور خصائل کیا ہیں۔ چوتھی جلد پھر بقیہ نمایاں صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہے جس میں انہوں نے تقریباً 95 یا 100 کے قریب نامور ترین صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان آخری دونوں جلدوں میں خلفائے راشدین کا بھی بھرپور تذکرہ آ گیا ہے۔ یوں یہ کتاب خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور کو بھی محیط ہے۔

یہ تو وہ کتابیں تھیں جو محدثانہ اسلوب کے مطابق لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم اور مفید کتاب ڈاکٹر محمد محمد ابو شہبہ کی کتاب السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ ہے، جو دو ضخیم

جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دور جدید کی ہے جس کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

مورخانہ اسلوب کا آغاز بھی پہلی صدی ہجری ہی میں ہوگیا تھا۔ عروہ بن زبیر کا تذکرہ تفصیل سے آچکا ہے۔ یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب ہم مورخانہ اسلوب کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد وہ مورخین نہیں ہیں جو آج مغربی زبانوں میں تاریخ نویسی کررہے ہیں اور مورخین سمجھے جاتے ہیں یا جدید دور کی اصطلاحات میں مورخ کا جو مطلب ہے۔ ہماری مراد وہ مورخ نہیں۔ آج کے مورخ کے بارے میں سیرت النبی کے مقدمے میں علامہ شبلی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایک تصویر رکھتا ہے جس کو اپنے قارئین کے ذہنوں تک منتقل کرنا ہی اس کا اصل ہدف ہوتا ہے۔ مثلاً جب مغربی مورخین یونان کی تاریخ لکھتے ہیں تو یونان کی عظمت پہلے سے ان کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے ذہن میں پہلے سے ایک مفروضہ بیٹھا ہوتا ہے کہ علم وحکمت کا ہر موتی یونان کے صدف کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا ہر اچھا کام یونان میں ہوا ہے۔ جو اچھا کام یونان سے رہ گیا ہے وہ روما میں ہوا ہے۔ ہر بڑا کام، ہر ادارہ، ہر تنظیم، ہر چیز روما میں ہوئی ہے۔ جو چیز اس مفروضہ کے مطابق ہے وہ قابل قبول اور جو اس کے مطابق نہیں ہے وہ ناقابل قبول ہے۔ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک civilized یعنی مہذب دنیا ہے اور دوسری uncivilized یعنی غیر مہذب دنیا ہے۔ وہ خود مہذب ہیں اور ان کے علاوہ باقی سب لوگ غیر مہذب ہیں۔ مہذب لوگوں کو ساری اچھائیاں اور خوبیاں حاصل ہیں اور غیر مہذب لوگوں کو کوئی اچھائی یا خوبی حاصل نہیں ہے۔ یہ ان کا ایک انداز فکر ہے جس کے تحت وہ تاریخ لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے قدیم سیرت نگاروں کا یہ انداز فکر نہیں تھا۔

اسلوب مورخین سے مراد صرف یہ ہے کہ جن حضرات نے شروع میں سیرت نگاری کا کام کیا انہوں نے سیرت کے واقعات کے تسلسل اور تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ مختلف مآخذ سے معلومات جمع کرکے سیرت اور سیرت کے واقعات کی ایک مکمل اور متکامل تصویر بیان کردیں۔ یہ تو قدیم مورخین کا اسلوب تھا جن میں سے بعض کے نمونے ہم نے دیکھ لیے۔ ایک جدید اسلوب پچھلے سو ڈیڑھ سو سالوں سے مسلمانوں میں رائج ہوا ہے جو مغربی مورخین کے اسلوب سے متاثر ہے۔ آج کل اس اسلوب کے مطابق بھی کتابیں لکھی

جا رہی ہیں۔ اس اسلوب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ جو شواہد اور دلائل مغربی معیارات کے
مطابق قابل قبول ہوں ان سے کام لیا جائے اور سیرت کے وہ پہلو سامنے لائے جائیں جن کو
مغربی دانشور یا مغربی قاری نا قابل قبول قرار دیتا ہے۔ وہ پہلو جن کا تعلق خالصتاً مسلمانوں کے
ایمان اور عقیدے سے ہے ان کو زیادہ نمایاں نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ اسلوب مستشرقین کے اثر
سے آیا ہے اس لئے اس پر ہم دور جدید کے موضوع کے تحت بات کریں گے۔

جب اسلوب مورخین بہت نمایاں ہو گیا اور اس کو پختگی کی ایک سطح حاصل ہو گئی تو
سیرت نگاروں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی اس میدان میں آئے۔ انہوں نے، جیسا کہ
حافظ ابن کثیر نے کیا تھا، پہلے سیرت لکھی پھر سیرت کے مضامین کو پھیلا کر پوری تاریخ بیان
کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام کچھ اور حضرات نے بھی کیا۔ یہ سب حضرات جو مورخین تھے،
اسلوب مورخین کے مطابق کام کرتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے سیرت کو تاریخ کے عمومی مضمون کا
ایک حصہ قرار دیا اور تاریخ کے حصے کے طور پر سیرت کے مضامین سے بھی بحث کی۔ ان میں
قدیم ترین نام تو علامہ ابن جریر طبری کا ہے جو محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، مفسر بھی ہیں اور
مورخ بھی ہیں۔ ان کی تفسیر قرآن بھی مشہور ہے اور سیرت پر بھی ان کا کام ہے۔ مغازی پر
قدیم ماخذ اور مصادر کا بڑا حصہ انہوں نے اپنی تاریخ میں سمو کر محفوظ کر لیا ہے۔ چنانچہ عروہ بن
زبیر اور موسیٰ بن عقبہ کے مغازی اکثر و بیشتر انہی کی کتاب سے نکالے گئے۔ ابن جریر طبری
بنیادی طور پر مورخ، فقیہ اور مفسر قرآن تھے لیکن ان کی کتاب کا خاصا بڑا حصہ سیرت کے مواد پر
مشتمل ہے۔ اگرچہ تاریخ کا آغاز انہوں نے بہت پہلے سے یعنی ولادت آدم سے کیا ہے۔
اسلام سے پہلے اقوام کی تاریخ سے متعلق واقعات بھی بیان کئے ہیں۔ یہ بات کہ انہوں نے
بھی اسرائیلیات کا مواد اپنی کتاب میں شامل کیا، ان کی کتاب کی تاریخی حیثیت پر اثر انداز
ہوئی ہے۔ جو حضرات اسرائیلیات پر مبنی مواد سے اتفاق نہیں کرتے وہ ابن جریر طبری کے ان
بیانات کو مستند نہیں سمجھتے۔ جو حضرات اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے وہ ان کے بیانات کو مستند
سمجھتے ہیں۔ یہ محض تحقیق کا ایک مسئلہ ہے اور ہر محقق اپنی اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔

ابن جریر نے مورخین اور محدثین دونوں کے اسلوب کو جمع کیا۔ وہ ہر روایت سند کے
ساتھ الگ الگ بیان کرتے ہیں، لیکن اس سند کے بیان سے پہلے وہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا ہے۔ اختصار کے ساتھ اس کے پیش آنے کا ذکر کرتے ہیں، پھر
بتاتے ہیں کہ اس کے ثبوت میں یہ یہ بیانات اور روایات میرے سامنے آئی ہیں۔ وہ پھر ان
روایات کو سند کے ساتھ الگ الگ بیان کر دیتے ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ کے شروع میں
لکھا ہے کہ یہ وہ روایات ہیں جو مجھ کو مختلف ذرائع سے ملی ہیں۔ میں نے پوری سند کے ساتھ
ان کو بیان کر دیا ہے۔ اب یہ ہر قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان روایات کا خود جائزہ لے کر
طے کرے کہ کون سی روایت اس کے لئے قابل قبول ہے اور کون سی ناقابل قبول ہے۔

اب گزشتہ چند عشروں سے بعض لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ابن جریر کا ذخیرہ سارے کا
سارا غیر مستند ہے۔ حالانکہ ابن جریر کا یہ پورا ذخیرہ سارے کا سارا غیر مستند نہیں ہے۔ نہ یک قلم
اس سارے سرمایہ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ محققین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ابن جریر کے ہر
بیان کا الگ الگ جائزہ لیں، اس کو روایت اور درایت کے اصولوں پر پرکھیں اور پھر فیصلہ کریں
کہ ان کا کون سا بیان قابل اعتماد ہے اور کون سا محل نظر ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ یہ سارا مواد جو مجھے ملا ہے یہ مجھے فلاں فلاں ذرائع سے ملا ہے اور
ہر بیان کے ساتھ اس کے حوالے ہیں۔ اب آپ کا کام ہے کہ جا کر ان حوالوں کو دیکھیں اور
جائزہ لے کر آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا چیز صحیح ہے اور کیا نہیں۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک کتب
خانہ میں کتابیں رکھی ہیں۔ مثلاً یہ لائبریری جو پاکستان کی بہترین لائبریریوں میں سے ایک
ہے۔ اگر اس میں چند کتابیں غیر معیاری اور کمزور ہوں تو کیا آپ یہ کہہ دیں گے کہ ادارہ
تحقیقات اسلامی کے کتب خانہ کی ساری کتابیں ناقابل اعتبار ہیں ان کو دریا برد کر دیا جائے۔
یہ درست نہیں ہوگا۔ آپ خود جائیں، جائزہ لیں۔ جو کتاب آپ کو مستند لگے وہ دیکھیں اور جو
غیر مستند لگے وہ نہ دیکھیں۔ کتب خانہ میں تو غیر مسلموں کی کتابیں بھی ہیں، مستشرقین کی بھی ہیں
اور ملحدین کی کتابیں بھی ہیں۔ یہی معاملہ ابن جریر کی تاریخ کا ہے جس میں ہر طرح کا مواد
ہے۔ بعض لوگوں نے اپنے ذوق سے، بعض نے جان بوجھ کر اور بعض نے ناواقفیت کی وجہ سے
ابن جریر کی کتابوں کی مدد سے ایسے ایسے نقشے بنائے ہیں جو حقیقت سے بہت بعید ہیں، لیکن
ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اسلامی تاریخ ہے جو محض جنگ و جدل اور کشت و خون سے عبارت
ہے۔ حالانکہ اس میں کشت و خون کے واقعات بھی ہیں، تعمیر کے واقعات بھی ہیں، تخریب کے

واقعات بھی ہیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ بیان کیا ہے جو ان کو ملا۔ پھر اس میں بعض مسلکی عصبیات بھی آگئی ہیں۔ جس زمانے میں ناگفتہ بہ اور ناخوشگوار واقعات ہوئے ہیں، ان ناخوشگوار واقعات میں بعض وہ جلیل القدر شخصیات کے نام بھی آتے ہیں۔ وہ شخصیات ایسی محترم ہیں کہ جن کے نام پر ہر مسلمان کا سر جھک جاتا ہے۔ اس ضمن میں مختلف انداز کے واقعات اور حکایات بیان ہوئی ہیں۔ اب یہ بات قرین انصاف نہیں ہوگی کہ ایک شخص اپنے نقطہ نظر سے کسی ایک شخصیت کی تائید یا حمایت کے واقعات کو چن چن کر جمع کرے اور دوسری طرف کے واقعات کو نظر انداز کر کے کہے کہ اسلامی تاریخ یہ تھی۔ اس کے مقابلے میں کچھ دوسرے لوگوں نے یہ کیا کہ انہوں نے ایک دوسرے نقطہ نظر کے واقعات اور کچی روایات کے انبار سے نکال کر جمع کر دیے اور دعویٰ کیا کہ اسلامی تاریخ یہ تھی۔ حالانکہ اسلامی تاریخ نہ سو فیصد یہ تھی نہ سو فیصد وہ تھی۔ اسلامی تاریخ وہ تھی جو مستند ماخذ سے آئی ہے۔

یہ باتیں میں نے اس لئے عرض کی ہیں کہ ابن جریر کی تاریخ میں جو حصہ سیرت سے متعلق ہے اس میں خاصی روایات اسرائیلیات پر مبنی اور کمزور ہیں۔ خاصی روایات مختلف لوگوں نے ذاتی یا کسی کمزوری سے ایسی بھی بیان کی ہیں جو درست نہیں۔ خود مورخین میں بہت سے حضرات نے ابن جریر طبری کے بہت سے بیانات کو تحقیق کی میزان میں ہلکا قرار دے کر ناقابل قبول قرار دیا۔ جن میں ابن کثیر کی میں نے مثال دی۔ ابن کثیر ہی کے ایک ہم عصر علامہ ذہبی نے بھی تاریخ اسلام پر ایک کتاب لکھی جو مشہور ہے۔ اس کی ایک پوری جلد جو ابن کثیر کے کام کا ایک چوتھائی کے برابر ہوگا، سیرت کے واقعات سے متعلق ہے۔ امام ذہبی بڑے محدث تھے۔ فن رجال کے ماہر تھے۔ فن رجال پر جو چند بہترین کتابیں ہیں ان میں علامہ ذہبی کی کتاب بھی ہے۔ اس لئے اسلوب مورخین کے لحاظ سے مستند ترین کام ان دو حضرات کا ہے۔ علامہ ابن کثیر اور امام ذہبی۔ ان کتابوں کے علاوہ جو آگئی ہیں ان میں مسعودی کی مروج الذہب بھی ہے، یعقوبی کی بھی کتاب ہے اور دیگر کتابیں بھی ہیں جن کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان میں صحیح مواد بھی ہے اور غلط بھی ہے۔ رطب و یابس دونوں قسم کا ہے۔ کمزور مواد سب سے زیادہ یعقوبی کے ہاں ہے، پھر مسعودی کے ہاں ہے۔ ابن جریر کے ہاں بھی غیر مستند مواد پایا جاتا ہے لیکن یعقوبی اور مسعودی کے مقابلے میں تھوڑا ہے۔

طبقات زمانی کے حساب سے بھی کتابیں لکھیں۔ طبقات مکانی کے حساب سے جن لوگوں نے کتابیں لکھیں، انہوں نے مختلف شہروں کے حالات پر لکھیں۔ مثال کے طور پر خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد۔ یہ بغداد کی ایسی تاریخ نہیں جس میں صرف یہ لکھا ہو کہ یہ شہر کب بنا اور اس کی تاریخ کیا ہے۔ بلکہ تاریخ بغداد ایک بہت وسیع مضمون کو بیان کرتی ہے۔ اس کتاب کے لکھنے والے اصلاً محدث ہیں اور فقہ حدیث پر ان کی مستند ترین کتابیں ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے لکھا ہے کہ بغداد میں کون سے تابعین آئے۔ کون کون سے تبع تابعین آئے۔ علم حدیث اور تفسیر پر جو کام بغداد میں ہوا وہ کیا تھا۔ کس مفسر نے بغداد میں بیٹھ کر تفسیر بیان کی۔ کس محدث نے حدیث بیان کی۔ کس سیرت نگار نے سیرت بیان کی۔ بغداد میں علوم اسلامی کے بارے میں جو کچھ سرگرمیاں ہوئیں وہ سب اس میں لکھی ہوئی ہیں۔ بغداد اور اسلام، ان دونوں کے حوالے سے جو کچھ ذخیرہ معلومات خطیب بغدادی کو میسر ہو سکا ہے وہ سب تاریخ بغداد میں موجود ہے۔ یہ کتاب کوئی بارہ یا تیرہ جلدوں میں ہے اور پوری انسائیکلوپیڈیا ہے۔ امام ابوحنیفہ بغداد میں رہتے تھے اس لئے ان کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہ کے بارے میں معلومات خطیب بغدادی کو دستیاب ہوئیں (موافق اور مخالف دونوں) وہ اس میں موجود ہیں۔ امام شافعی ایک مرتبہ بغداد گئے تھے تو ان کے سفر بغداد کی پوری تفصیل موجود ہے کہ وہ کب آئے، کیوں آئے، کس سے ملے، کس کے ہاں ٹھہرے۔ تابعین میں سے جو لوگ بالخصوص جو بھی علماء، جو محدثین، جو مفسرین وغیرہ بغداد آئے وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔

اسی طرح ایک کتاب علامہ ابن عساکر کی 'تاریخ دمشق' ہے۔ ابن عساکر دمشق میں رہتے تھے۔ انہوں نے جو کتاب لکھی وہ بھی ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ایک صاحب علم خاتون اس کو ایڈٹ کر رہی ہیں۔ کچھ حصے چھپ چکے ہیں۔ دمشق کی ایک اکیڈمی مجمع اللغة العربیة اس کو شائع کروا رہی ہے۔ شروع میں انہوں نے اس کتاب کے مختلف حصے مختلف اہل علم کو مرتب کرنے کے لئے دیئے۔ پھر ایک محترم خاتون نے اس کو ایڈٹ کرنا شروع کیا۔ ان سے میری ملاقات 2001 میں دہلی میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک کتاب کی 80 جلدیں ایڈٹ ہو چکی تھیں۔ ان کا بیان یہ تھا کہ 120 جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہوگی۔ یہ طبقات مکانی کی ایک عجیب مثال ہے۔ اس کتاب میں دمشق کے بارے میں ہر چیز موجود ہے۔ بہت سے

کون کون سی مساجد تھیں۔ ان میں موذن کا تقرر کون کرتا تھا۔ امامت کون کرتا تھا۔ کیا اماموں کو رسول اللہ ﷺ کوئی تربیت دیا کرتے تھے کہ نہیں دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس میں ایک شعبہ دستاویزات کا ہے کہ دستاویزات نویس کون تھے۔ دستاویزات کو محفوظ کیسے رکھا جاتا تھا۔ عدالتی امور کیسے انجام پاتے تھے۔ عسکری امور کیسے انجام پاتے تھے۔ جبایات یعنی صدقات، عشور اور خمس وصول کرنے کا نظام کیا تھا۔ بیت المال کیسے کام کرتا تھا۔ اس طرح کے اہم اور دلچسپ موضوعات پر یہ ایک بہت مفید کتاب ہے جو مدینہ منورہ کے معاشرہ، مدنی ریاست اور معیشت کی بہت اچھی تصویر بیان کرتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے محدثین کے اسلوب سے کام لیا ہے۔ کتب حدیث سے مواد لیا ہے۔ مورخانہ اسلوب کو بھی نبھایا ہے کہ منتشر مواد کو یکجا کرکے اس کو بمع دلائل اور سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مواد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ احادیث کی تخریج بھی کرتے ہیں کہ کون سی حدیث کس کتاب میں ہے۔ اس کا مکمل حوالہ دیا ہے۔ کسی حدیث میں کوئی مشکل لفظ آیا ہے تو اس کی تشریح کی ہے۔ ان سے جو مسائل نکلتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ یوں یہ بیک وقت تاریخ، حدیث، سیرت اور حتیٰ کہ سیاسیات اور فقہ سمیت بہت سی موضوعات پر ایک مفید کتاب ہے۔

علامہ خزاعی کی یہ کتاب خاصے عرصہ تک اہل علم میں مقبول رہی اور لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے۔ اس کتاب کے لکھے جانے کے کئی سو سال بعد ایک اور صاحب علم بزرگ علامہ شیخ عبدالحی کتانی نے جن کا تعلق ابی جعفر کتانی کے خاندان سے تھا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ 1250ھ کے لگ بھگ ان کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خزاعی کی اس کتاب کو سامنے رکھ کر اس میں کچھ اضافے کئے۔ اتنے اضافے کئے کہ اس کا سائز تقریباً دوگنا ہوگیا اور انہوں نے اس کو مزید مکمل بنا دیا۔ اس کتاب کا نام ہے التراتیب الاداریہ فی نظام الحکومۃ النبویہ، حکومت نبوی کے نظام کی اداری تفصیلات۔ یعنی Institutional details of the government of the Prophet.

اس میں انہوں نے وہ سارے کے سارے موضوعات برقرار رکھے جو علامہ خزاعی کی اصل کتاب میں بیان ہوئے تھے۔ ان پر مزید اضافہ بھی کیا کیونکہ اس وقت تک مزید معلومات سامنے آ گئی تھیں۔ جو کتابیں کسی علاقے میں موجود تھیں اور دوسرے علاقے میں دستیاب نہیں

تھیں وہ علامہ عبدالحئی کتانی کو دستیاب ہوگئی تھیں۔ یہ لمبے لمبے سفر کرتے تھے۔ کئی بار حج کا سفر کیا۔ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ علامہ کتانی ایک جہاں گرد شخصیت تھے۔ یہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے مراکش میں بیٹھ کر ہمارے یہاں کے اہل علم پر کتاب لکھی۔ وہ برصغیر کے مصنفین یعنی لاہور، ملتان اور ہمارے دوسرے علاقوں کے مصنفین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کو اتنی واقفیت ہمارے علاقے سے بھی تھی۔ شاید اسی لئے ان کی کتاب زیادہ جامع اور مکمل ہے۔ اس میں خزاعی کی کتاب کا سارا مواد بھی ہے اور علامہ کتانی کا اپنا اضافہ بھی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے معاونین اور مشیر کون کون تھے۔ 'وزارت' کی ذمہ داری پر کون سے صحابہ کرام فائز تھے۔ پھر ایک بڑی اہم چیز جو علامہ کتانی نے اضافہ کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تحریر اور نوشت وخواند کا نظام کیا تھا۔ اس سے حضور کے زمانے کے نظام تعلیم پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ پھر عسکری انتظامات اور حربیات کی تفصیلات پر بھی بہت وسیع مواد فراہم کیا ہے۔

یہ سارا مواد جو علامہ عبدالحئی کتانی نے لیا ہے انتہائی مفید اور وسیع ہے۔ یہ کتاب اس دور کے اس اسلوب کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ بہت وسیع آخذ کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے تمام دستیاب کتب حدیث، تمام شروح حدیث سے بھرپور استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں، تاریخ کی تمام کتابیں، حتیٰ کہ برصغیر کے علمائے کرام کی کتابیں اور تصنیفات بھی ان کے سامنے تھیں۔ میں نے ایک گفتگو میں شیخ ابوجعفر سندھی کا ذکر کیا تھا جو ٹھٹھہ کے ایک بزرگ تھے، ان کی کتابیں بھی علامہ کتانی کو دستیاب تھیں۔ نواب صدیق حسن خان جو بھوپال کے نواب تھے، ان کی کتاب بھی ان کو دستیاب تھی۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی جو فرنگی محل کے مشہور علماء میں سے تھے ان کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ایک بزرگ مولانا محمد عبداللہ پنجابی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ یہ ہمارے لاہور کے رہنے والے ایک بزرگ تھے۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور محمد عبداللہ الفنجابی کے نام سے وہاں مشہور تھے۔ انہوں نے پ کو معرب کر کے ف کر دیا تھا۔ ان سے وہ مدینہ منورہ میں ملے اور ان کی کتابوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ بظاہر وہ برصغیر کی علمی روایت کی نقل کرنے والے پہلے مراکشی عالم ہیں۔ ان سے پہلے شاید کسی مراکشی عالم نے برصغیر کے اہل علم کا اتنی واقفیت سے ذکر نہیں کیا ہوگا۔ حضرت مجدد

الف ثانیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے صوفی اور تلامذہ میں شاہ ابوسعید مجددی ایک مشہور بزرگ تھے، محدث تھے اور مکہ مکرمہ میں جا کر آباد ہوئے ان کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ کتاب صوفیانہ اسلوب کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

میری خواہش تھی کہ متکلمانہ اسلوب کے بارے میں بھی ایک دو باتیں کروں۔ متکلمانہ اسلوب سے مراد سیرت کے وہ مباحث ہیں جن کا علم کلام سے بھی تعلق ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے سیرت کے موضوعات پر بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو علم کلام کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اب ان کا مختصر تذکرہ کلامیات سیرت کے عنوان کے تحت ہوگا۔

اس کے بعد سیرت نگاری کے ادبی اسلوب پر بات کرنے کا پروگرام تھا۔ سیرت پر ادبی انداز کی کتابیں عربی اور فارسی میں سب سے پہلے لکھی جانی شروع ہوئیں۔ نظم و نثر دونوں میں اہل علم و ادب نے عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ لیکن چونکہ وقت بہت تنگ ہو گیا ہے اس لیے میرے خیال میں اس وقت ہمیں ختم کر دینا چاہیے۔ ان شاء اللہ اگلی گفتگوؤں میں اس پہلو کو مزید واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

۔☆۔

سوال و جواب

متکلمانہ اسلوب سے کیا مراد ہے؟ تحریر کیجیے نیز بتائیے کہ شیخ محمد جعفر کتانی کی کتاب کا نام کیا ہے؟

متکلمانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ بنیادی مسائل جو اسلامی عقائد کی تائید سے متعلق ہیں یا ان عقائد کی مخالفت، تردید یا تشکیک کے بارے میں دوسرے مذاہب کے لوگوں نے جو باتیں کی ہیں، عقلی دلائل سے ان کا جواب دیا جائے۔ متکلمانہ انداز میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں یا وہ انداز جس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کرنے والے شواہد اور روایات کو جمع کیا گیا۔ خاص طور پر معجزات کی بحث سامنے آئی اور جو چیزیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص سے متعلق ہیں ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کیا جانے لگا۔ متکلمانہ اسلوب سے کتابیں لکھے جانے کا رجحان چوتھی پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اس کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی کہ مسلم معاشرہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ نئی نئی اقوام اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کا سابقہ بہت سی غیر مسلم اقوام سے پڑ رہا تھا جن میں یہودی، عیسائی، ایران کے آتش پرست، ہندوستان کے بت پرست اور اللہ جانے کن کن مذاہب کے پیروکار بھی تھے۔ یہ سب لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے ہوں گے، طرح طرح کے اعتراضات اٹھاتے ہوں گے۔ مسلمان علماء سیرت اور قرآن پاک کے حوالہ سے ان کا جواب دیتے ہوں گے۔ ان مسائل کے پس منظر میں اور ایسے ماحول میں ضرورت پیش آئی ہوگی کہ سیرت کے اس موضوع کو الگ سے بھی مرتب کیا جائے تاکہ زیادہ بہتر طریقے سے متکلمانہ انداز میں ان مسائل کا جواب دیا جا سکے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کو متکلمانہ اسلوب کی کتابیں کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس سلسلے کی تحریرات میں ایک خاص موضوع کا مبحث سیرت بھی

ہے۔ اس لئے مزید تفصیل ان شاء اللہ کو معلومات سیرت کے تحت تفصیل میں پیش کر دی جائے گی۔

شیخ جعفر الکتانی کی کتاب کا نام ہے: التراتیب الاداریہ یا اس کا دوسرا نام نظام الحکومۃ النبویہ ہے۔ اس کا اردو خلاصہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا مستند ہے۔ لیکن عربی میں شائع ہوا ہے۔

☆

کیا شیخ علی بن محمد الخزاعی کی کتاب اردو میں موجود ہے؟

میری معلومات کی حد تک اس کا اردو ترجمہ موجود نہیں ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے "تخریج الدلالات السمعیۃ"۔

☆

جس کتاب کا آپ ذکر کریں اور وہ اردو میں موجود ہو تو براہ کرم نام بتا دیا کریں۔

میں بتاتا رہتا ہوں۔ جن جن کا مجھے علم ہوتا ہے ان کا نام میں بتاتا ہوں۔ لیکن میری کمزوری اور مشکل یہ ہے کہ عربی کتابوں کے اکثر اردو تراجم کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ اس لئے کہ خود مجھے اردو ترجمہ دیکھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ عربی سے براہ راست استفادہ کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

☆

ان معلومات کو مختصر وقت میں کیسے بیان کیا جائے؟

یہ محاضرات ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ ان شاء اللہ بعد میں ان کو کاغذ پر منتقل کیا جائے گا۔ پھر ابتدائی اور ضروری نظرثانی کے بعد شائع ہوں گے اور آپ کی خدمت میں ہوں گے۔ پھر آپ چاہیں تو اس کا خلاصہ کر لیں اور چاہیں تو پورا سامنے رکھیں۔

حافظ ابن القیم کی کتاب زاد المعاد سیرت نگاری میں کس اسلوب کی نمائندہ ہے؟

حافظ ابن القیم کی کتاب زاد المعاد سیرت نگاری میں فقہیانہ اسلوب کی نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔ کل ان شاء اللہ اس کا مختصر اور پھر فقہیات سیرت میں اس کا تفصیلی تذکرہ ہوگا۔ میں نے پہلے ہی عرض کردیا تھا کہ بعض کتابوں کا تذکرہ بار بار آئے گا۔ اس لئے کہ بعض کتابیں اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ مختلف موضوعات کے تحت ان کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے زاد المعاد بھی ایک ہے۔

☆

وضاحت فرمائیے کہ کیا علامہ ابن عبد البر کو خلیفہ وقت عبد الرحمن الناصر نے بغاوت کے الزام میں پھانسی دے دی تھی۔

میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو بہت دکھ کی بات ہے۔ لیکن میں نے نہیں سنا۔

☆

آپ نے مختلف اسالیب سیرت کا ذکر کیا لیکن متصوفانہ اسلوب کا ذکر نہیں کیا۔

متصوفانہ اسلوب کا ذکر تو میں پہلے ہی دن روحانیات سیرت کے ضمن میں بیان کرچکا ہوں۔ روحانیات سیرت علم سیرت کا ایک الگ موضوع تو ضرور کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کوئی الگ اور مستقل بالذات کتاب اس نقطہ نظر سے لکھی ہوئی میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے میں نے آج کی گفتگو میں الگ سے اس اسلوب کا ذکر نہیں کیا۔ سیالکوٹ کے ایک بزرگ نے دو جلدوں میں ایک کتاب 'سیرت نبوی پر متصوفانہ نظر' لکھی تھی۔ اس کتاب

میں سیرت کے روحانی پہلوؤں پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ بزرگ دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی کتاب کے بارہ میں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی معیاری کتاب نظر نہیں آئی۔ اس لئے اس کو سیرت کے جدید ادب میں میں نے شامل نہیں کیا۔

☆

خطیب بغدادی نے امام اعظمؒ کے بارے میں بہت کچھ جھوٹ لکھا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

یہ تو خطیب بغدادی سے پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جن میں بغداد یا دمشق کا حوالہ ہے۔ آپ نے شاید خود خطیب بغدادی کی کتاب نہیں دیکھی بلکہ آپ نے خطیب بغدادی کے بارے میں ذرا تند اختلاف کا تبصرہ ہی پڑھا ہے۔ خطیب بغدادی نے دونوں روایات جمع کی ہیں۔ جنہوں نے امام صاحب پر تنقید کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں اور جنہوں نے امام صاحب کے حق میں بات کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں۔ میرے خیال میں اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ان کو وہ روایات بیان نہیں کرنی چاہئیں جو امام صاحب پر تنقید میں آئی ہیں تو یہ ایک دوسری رائے ضرور ہے۔ لیکن خطیب بغدادی کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ خطیب بغدادی نے اس کو objectivity کے خلاف سمجھا ہو۔ خطیب بغدادی کی ان روایات کا بہت سے اہل علم اور محققین نے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر ترکی کے رہنے والے ایک بزرگ تھے، شیخ محمد زاہد الکوثری، جو عثمانیوں کے آخری دور میں استنبول میں شیخ الاسلام کے دفتر کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ایک کتاب تانیب الخطیب لکھی تھی جس میں خطیب بغدادی کی ان تمام روایات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ میرے خیال میں خطیب بغدادی نے جو کچھ کہا ہے اس کا اس کتاب میں بہت مؤثر جواب دے دیا گیا ہے۔ اب ان کو مطعون کرنا شاید مناسب نہ ہو۔

☆☆

آپ نے الدرر فی مغازی والسیر کے سلسلہ میں قافیہ بندی کا ذکر کیا ہے۔ یہ محض ایک حقیقت ہے۔ ایک بزرگ نے دو کتابیں لکھی ہیں جس میں قافیہ بندی کی ہے۔ ایک ہے 'انزال الصواعق علی من یا کل بالملاعق' اور دوسری ہے 'القهر الالهي على من بنى في المغاني'۔

ایک اور بزرگ تھے۔ ہندوستان میں شاردا ایکٹ کے نام سے ایک قانون منظور ہوا تھا جس میں بچوں کی شادی پر اس طرح کی کوئی ممانعت کا ذکر تھا۔ اس پر ان بزرگ نے کتاب لکھی تھی 'ضرب شارد الابل في ذم شاردا بل'۔

☆

براہ مہربانی مزاحی کا پورا نام اور کتاب کا نام بتا دیں۔

خزاعی کا پورا نام علی بن محمد الخزاعی ہے۔ کتاب کا نام ہے 'تخریج الدلالات السمعیة'۔ عبدالحی کتانی کی کتاب کا نام ہے 'التراتیب الاداریة فی نظام الحکومة النبویة'۔

☆

یہ بہت عجیب بات ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ہی حج کیا اور اس کی تعیین میں بھی صحابہ کرام کو اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا حج تھا؟

میرے خیال میں تو یہ ہے اور احادیث میں حج کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ جن صحابہ نے حضور کے حج کو دیکھا انہوں نے اپنی فہم کے مطابق اس کی وضاحت کی۔ یہ بات کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کے حج کو تینوں قسم کا سمجھا شاید یہ ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ اب آپ جس قسم کا حج کریں گے تو آپ کو اطمینان ہوگا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔ اگر حضور نے جو حج کیا اس کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ ایک ہی رائے ہوتی

تو ہمارے اور آپ کے لئے تنوع کم ہو جاتا۔ حج تمتع نسبتاً آسان ہے۔ ہم جیسے کمزور انسانوں کے لئے تمتع کرنا آسان ہے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ حضور نے تمتع کا حج نہیں کیا تو مجھے تمتع کا حج کرنے میں تامل ہوتا۔ اب جو بھی حج کروں گا مجھے یقین ہے کہ کچھ محققین کی نظر میں یہ سنت کے مطابق ہے۔ شاید ہمارے لئے اس میں آسانی ہے مشکل نہیں۔

☆

کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس گھر میں یا آپ کی نگرانی میں قرآن تیار ہو رہا تھا؟

میں تو بہت پہلے بیان کر چکا ہوں کہ حضورﷺ ہر ہفتہ دس دن بعد، جب بھی ضرورت محسوس کرتے، تمام صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور جس صحابی کے پاس جو تحریری ذخیرہ یا نوشتہ ہوتا تھا اس کی آپ سماعت فرمایا کرتے تھے۔ اس میں اگر کوئی غلطی ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرما دیتے۔ متفرق آیات ہوتیں تو آپ ان کی ترتیب بیان فرمایا کرتے تھے۔ جب کوئی سورۃ مکمل ہو جاتی تھی اس کو بھی بیان فرما دیا کرتے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں بخاری میں حضرت زید بن ثابت کی روایت آئی ہے: کنا نؤلف القرآن من الرقاع فی حضرۃ رسول اللہ ﷺ، یعنی حضور کی موجودگی میں ہم قرآن پاک کو پرچیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے جمع کیا کرتے تھے۔ مخالفین نے انہی اجتماعات کو دیکھ الزام لگایا تھا کہ یہ اساطیر الاولین ہیں۔ جو انہوں نے لوگوں سے لکھوا رکھی ہیں۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ یہ کام خود حضور کی نگرانی میں تسلسل کے ساتھ ہو رہا تھا۔

☆

کیا ابن کثیر نے تمام قسم کی اسرائیلیات کو قبول کرنے پر پابندی لگائی ہے؟

اسرائیلیات کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل ذہن میں رہنی چاہئے۔ اسرائیلیات تین قسم کی ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سو فیصد اسلامی روایت کے مطابق ہیں اور قرآن پاک اور احادیث

کتابوں میں دیئے گئے بیانات سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادے تھے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق۔ یہ بات اسرائیلیات میں بھی شامل ہے اور بائبل میں بھی ہے۔ ظاہر ہے اس میں اور قرآن پاک کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بیان بالکل صحیح ہے اور اس کو بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو صریحاً قرآن پاک اور حدیث سے متعارض ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بعض پر اخلاقی نوعیت کے الزامات ہیں۔ یہ بیان کرنا بالکل غلط اور ناجائز ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو نہ تو قرآن پاک سے بالکل متعارض ہیں نہ موئید ہیں۔ ان کی روایات کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ ممکن ہے ایک محقق کی نظر میں اسرائیلیات کی ایک روایت قرآن کی مخالف نہ ہو۔ دوسرے محقق کی رائے میں وہ قرآن کے خلاف ہو۔ جو جتنی گہرائی میں غور کرے گا اس کو ویسے ہی پہلو نظر آئیں گے۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسرائیلیات کے بارے میں شروع سے جو اختلافات اور بحثیں ہیں وہ اسی درمیانے درجے کی روایات کے بارے میں ہے۔ پہلے درجے کی روایات کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان کو قبول کرلیا جائے۔ دوسری قسم کی روایات کے بارے میں بالاتفاق یہ رائے ہے کہ اسے مسترد کردیا جائے۔ جو اختلاف ہے وہ تیسری قسم کے بارے میں ہے۔

پہلی قسم کے بارے میں حضور نے فرمایا تھا کہ حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج۔ یعنی بنی اسرائیل سے کوئی روایت بیان کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

☆

ایک بہن نے انگریزی میں سوال کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ
جن کتابوں کے نام لے رہے ہیں، ان کی فہرست مرتب
کرکے تقسیم کردیں۔

میں نے پہلے سے کتابوں کی کوئی مکمل فہرست بنا کر نہیں رکھی۔ ذہن میں جو چیز آتی

چاہتی ہے وہ بیان کرتا جاتا ہوں۔ لہٰذا فی الوقت تو فہرست بنانا بہت دشوار ہے۔ لیکن ان شاء اللہ جب یہ کتاب چھپ جائے گی تو اس میں شامل یہ سارے نام جو ریکارڈ ہو رہے ہیں وہ سب آپ کے سامنے تحریری صورت میں آجائیں گے۔

☆

مؤرخانہ اسلوب رکھنے والی وہ قدیم کتابیں جن میں کسی بیان کردہ واقعہ کا کوئی حصہ ایسا ہو جس کا ثبوت حدیث نبوی سے نہ ہو سکے وہ اسے میں اور آپ تو تسلیم کرلیں گے۔ لیکن ایک مستشرق کے اعتراضات کے جواب میں اس کا دفاع کیسے کریں گے؟

مستشرقین میں جو لوگ نسبتاً معتدل مزاج کے ہیں اور ایک معروضی رویہ رکھتے ہیں وہ تو معقول بات کو مان لیتے ہیں۔ لیکن جو متعصب اور شدت پسند ہیں وہ تو قرآن پاک کو بھی نہیں مانتے۔ احادیث کو بھی نہیں مانتے۔ انہوں نے یہ تک تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج نہیں نکل رہا۔ پاکستان نام کا کوئی ملک اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اگر کوئی ان طے شدہ امور، روشن حقائق اور واضح اور بدیہی چیزوں کا انکار کرے تو اس کو آپ مرفوع القلم سمجھیں گے۔ اس لئے میں ایسے مستشرقین کو مرفوع القلم سمجھتا ہوں اور ان لوگوں کی ایسی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو بدیہیات کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں جو سنجیدہ اور ذمہ دار لوگ ہیں وہ ایسی چیزوں کا انکار نہیں کرتے۔ اگر کسی نے انکار کیا ہو اور اس کو دلائل سے قائل کرلیا جائے تو وہ بعض اوقات مان بھی لیتے ہیں۔

مستشرقین کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن دو باتیں پیش نظر رکھی جائیں۔ ایک تو یہ کہ مستشرقین مسلمان نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ سیرت بیان کرتے وقت ہمارے عقائد ہی کے مطابق بات کریں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کی بعض تحریریں گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ یہ بات خطرناک بھی ہے اور اس سے برائی

پہنچتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، وہ انگریزی اور مغربی زبانوں میں اسی انداز سے ان امور کو بیان کریں جس انداز سے مستشرقین بیان کرتے ہیں تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دونوں نقطۂ نظر موجود ہوں۔ اور کوئی شخص اگر مستشرقین کی رائے سے متاثر ہوا ہے تو اس کے سامنے دوسری رائے بھی موجود ہو۔

☆

طبقات صحابہ کے بارے میں آپ نے جن تین کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام دوبارہ بتا دیں۔

وہ تین کتابیں یہ ہیں۔

(۱) علامہ ابن عبدالبر کی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب'

(۲) حافظ ابن حجر کی 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ'

(۳) علامہ ابن اثیر کی 'أسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ'

☆

ایک سوال ہے کہ روایت اور درایت میں کیا فرق ہے؟

علم حدیث میں روایت سے مراد یہ ہے کہ کسی حدیث کا جائزہ لے کر یہ طے کرنا کہ اس کی صحت کو معیار روایت کے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اس کا راوی کون ہے، بیان کرنے والے راویوں کا درجہ کیا ہے۔ ان کا حافظہ اور کردار کیسا تھا، وہ سچے تھے کہ نہیں تھے۔ یہ روایت کہلاتا ہے۔

درایت یہ ہے کہ حدیث کے اندر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر آپ عقلی انداز سے غور کریں کہ کیا یہ واقعہ ہو بھی سکتا تھا۔ جیسے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ خلیفہ منصور کے پاس کچھ یہودی ایک دستاویز لے کر آئے اور دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ مراعات دی تھیں اور اس دستاویز پر سعد بن معاذ اور حضرت امیر معاویہ دونوں کے نام بطور گواہ لکھے ہوئے تھے۔ خلیفہ منصور نے امام اوزاعی سے رائے مانگی تو انہوں نے ایک نظر ڈالتے ہی تردید کر دی

جعلی ہے۔ اس لئے کہ جب حضرت سعد ؓ ایمان لائے تھے تو حضرت سعد بن معاذ کا انتقال ہو چکا تھا۔ تو یہ دونوں بیک وقت ایک دستاویز کے گواہ نہیں ہو سکتے۔ اس کو روایت کہتے ہیں۔

☆

کیا حضورؐ کی پیدائش اور اعلان نبوت سے پہلے کے اقوال اور افعال نبوت کا حصہ ہیں؟

میرے خیال میں یہ چیزیں ہمارے لئے قابل احترام محبوب اور مقدس تو ہیں لیکن شریعت کا حصہ صرف وہی اقوال اور افعال ہیں جو حضورؐ نے بطور نبی کے ارشاد فرمائے۔ تاہم نبوت سے پہلے کی تفصیلات کو جمع کرنے میں بھی اتنی ہی احتیاط سے کام لیا گیا ہے جس احتیاط سے دوسری احادیث کو جمع کرنے میں کام لیا گیا ہے۔

☆

موضوع احادیث کیوں گھڑی گئیں اور وہ کون سے لوگ تھے جو اس عمل بد میں شامل تھے۔

موضوع احادیث میں کئی طرح کی احادیث شامل ہیں۔ کچھ احادیث تو وہ ہیں جن کے راوی جھوٹے تھے۔ مثلاً کسی راوی کے بارے میں ثابت ہو گیا کہ یہ جھوٹا آدمی تھا یا غلط بیانی کرتا تھا۔ اگر ایک واقعہ میں کسی راوی کی غلط بیانی کسی محدث کے سامنے ثابت ہو گئی تو اس کی تمام روایات کو موضوع قرار دے دیا گیا۔

کچھ لوگوں نے دیانت داری سے لیکن غلط فہمی کی وجہ سے کسی بات کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیا۔ بات اچھی ہونا اور چیز ہے اور آپ کا ارشاد نبوی ہونا اور چیز ہے۔ کسی نے کوئی اچھی بات سن کر غلط فہمی کی بنیاد پر یہ سمجھا کہ یہ شاید حضورؐ کا ارشاد ہے۔ محدثین نے چیک کر کے بتا دیا کہ یہ حضورؐ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔ یہ حدیث بھی موضوع حدیث ہے۔

کچھ لوگوں نے کسی سیاسی غرض سے بددیانتی یا کسی ذاتی غرض یا گروہی مقصد کے لئے کوئی بات حضورؐ سے منسوب کر دی۔ بنو عباس کا ایک خلیفہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں، وہ بیٹھا ہوا

کہ اس کے سامنے کوئی شخص کبوتر اڑا رہا تھا۔ وہاں پر ایک شخص نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ **لا سبق الا فی حافر او خف**، یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ صرف دو چیزوں میں مقابلہ کرانا جائز ہے یعنی اونٹ اور گھوڑوں کا۔ چونکہ خلیفہ بیٹھا ہوا تھا اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ کوئی صاحب کبوتر اڑا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ خلیفہ کی توجہ حاصل کرنے کا اچھا موقع ہے۔ اس نے ایک لفظ بڑھا دیا **او جناح** یا پرندوں کے درمیان۔ لیکن خلیفہ بھی کوئی آج کل کے حکمرانوں کی طرح شریعت سے بالکل نابلد نہیں تھا۔ اس کو علم تھا کہ اصل حدیث کیا ہے۔ اس لئے فوراً کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، اگر آئندہ ایسی جرأت کی تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ یہ حصہ حدیث میں شامل نہیں ہے۔ اس طرح کے خوشامدی لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں۔

☆

حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شادی کے وقت کیا تھی۔ آپ نے
مورخین کی رائے تو بتا دی لیکن صحیح عمر نہیں بتائی۔

میں نے عرض کیا نا کہ ہمارے ارباب حدیث اور ارباب سیر کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شادی کے وقت نو سال تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ عرب کے ماحول میں لوگ جلدی grow کیا کرتے تھے۔ لہٰذا بچوں کی شادیاں کم سنی میں ہو جاتی تھیں۔ بیسیوں صحابہ کرام کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ انہوں بارہ تیرہ سال کی عمر میں شادیاں کیں۔ اس لئے عام محدثین اور سیرت نگار اس کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ جن روایات کی بنیاد پر نو سال کی عمر ثابت کی جاتی ہے وہ کمزور ہیں یا ان میں کوئی بات محل اعتراض ہے۔ لیکن بعض دوسرے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ تھی۔ یہ اقلیت کی رائے تھی۔ اس لئے میں نے بیان کیا کہ علامہ ابن عبدالبر جیسے محقق کی کتاب میں بھی اشارۃً وہی رائے موجود ہے جو اقلیت کی رائے تھی۔ لیکن یہ ان کی رائے ہے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

☆

آپ نے بتایا کہ روایت بالمعنیٰ نہیں ہونی چاہئے، لیکن معاشرہ میں عام لوگوں سے ہٹ کر بعض اوقات علمائے کرام بھی یہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے اور پھر وہ بیان کردیتے ہیں۔

جب روایت بالمعنیٰ کی ممانعت کی جارہی تھی تو یہ وہ زمانہ تھا جب علم حدیث مدون ہورہا تھا اور حدیث کی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر روایت بالمعنیٰ کی اجازت دے دی گئی تو احادیث گڈمڈ ہوکر ہم تک پہنچیں گی۔ اب ساری احادیث مکمل اور مرتب ہوچکی ہیں۔ ان میں کسی تحریف کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے اب علماء اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی یادداشت سے اپنی زبان میں اور اپنے الفاظ میں حدیث بیان کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اگرچہ بہتر اب بھی یہی ہے کہ جو کچھ حضورؐ کی زبان مبارک سے نکلا تھا وہی بیان کیا جائے۔ لیکن ہر شخص کو احادیث کے الفاظ یاد نہیں ہوتے اور اگر یہ شرط لگادی گئی تو کوئی بھی شخص حدیث کا مفہوم بیان نہیں کرسکے گا اور حضورؐ کے پیغام کی اشاعت محدود ہوجائے گی۔ اس لئے میرے خیال میں اس زمانے کے لحاظ سے یہ اجازت ہونی چاہئے۔

☆

اسمعین کے عالم بڑے مشہور ہوئے۔ آپ نے اسمعین کے جس عالم کا ذکر کیا ان کا نام بتائیے۔

ان کا پورا نام بتاچکا ہوں علی بن محمد الخزاعی، کتاب کا نام ہے تخریج الدلالات السمعیہ۔

☆

ایک سابقہ نشست میں جناب خالد مسعود صاحب نے فرمایا تھا کہ لفظ اُمّی کا عرف عام میں جو معنیٰ کیا جاتا ہے وہ

درست نہیں۔

یہ سوال تو آپ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے ہی پوچھتے تو بہتر تھا۔ میں ان کی طرف سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ اُمّی کے بارے میں عام طور پر مفسرین اور سیرت نگاروں نے دو مفہوم بیان کئے ہیں۔ ایک تو اُمّی کا وہی مفہوم ہے جو عام طور پر مشہور ہے یعنی جس نے کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ دوسرا مفہوم جو بعض لوگوں نے بیان کیا ہے اس کے مطابق اُمّی سے مراد وہ لوگ ہیں جو ام القریٰ (مکہ معظمہ) کے رہنے والے ہیں۔ ام القریٰ کے باشندوں کے لئے بھی بعض جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

☆

کیا ابن خلدون نے اپنی تصانیف میں سیرت پر کچھ لکھا ہے۔

میری ناچیز اور محدود معلومات کے مطابق ابن خلدون نے سیرت پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن تاریخ ابن خلدون میں انہوں نے سیرت کے دور کو بھی لیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ ان کو سیرت نگار بھی کہہ سکتے ہیں۔

☆

کل کی نشست میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمانؓ کے دور میں تدوین قرآن کی جو بات ہوئی تھی ان دونوں میں کیا فرق تھا۔ اور جو مکتوب پہلے سے تھا اس کو جلایا گیا تھا یا نہیں؟

ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں ایک نسخہ جامع ترتیب کے ساتھ سرکاری طور پر لکھوایا گیا اور مسجد نبوی میں خلیفہ کی نگرانی میں موجود رہا۔ مقصد یہ تھا کہ جس کو ترتیب کے بارے میں کوئی تامل ہو یا کسی کی یادداشت میں کمی ہو وہ اس نسخہ کے مطابق چیک کرکے اس کو درست کرلے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں یہ ہوا کہ اسی نسخہ کی

مزید کاپیاں کرا کر بھیج دی گئیں اور سابقہ نسخوں کو رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ کے دور میں اسلامی ریاست کی حدود آرمینیہ سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر سوڈان کے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس پورے علاقے میں آج بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک ذاتی نسخہ کا جائزہ لے کر چیک کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی ترتیب وغیرہ درست ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا آج بھی ممکن نہیں تو اس دور میں کیسے یہ ممکن ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضرت عثمان نے حکم دیا کہ ان سب نسخوں کو ضائع کر دیا جائے۔ جو نسخے چمڑے اور پتھر پر لکھے ہوئے تھے ان کو دھو دیا گیا۔ دھونے کے بعد دوسرے کام میں لایا گیا۔ اور جو دھوئے نہیں جا سکتے تھے ان کو جلوا دیا گیا اور جلانے کے بعد ان کو احترام کے ساتھ کہیں حفاظت سے دفن کر دیا گیا۔

☆

سیرت النبی کی قلم بندی، تنظیم، ترتیب، تدوین، استدلال اور سند سازی کے لئے قرآن کی کئی آیات رہنمائی کرتی ہیں۔

قرآن پاک تو سارے کا سارا سیرت کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے ''جمال قرآن در شان محمدؐ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ایک ایک سورۃ کا الگ الگ جائزہ لے کر بتایا ہے کہ یہ سیرت کے کون سے پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

☆

ایک صاحب نے بلاوجہ انگریزی میں سوال کیا ہے۔ بات اردو میں ہو رہی ہے تو آپ اردو ہی میں سوال پوچھیں۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک یہاں اس محفل میں موجود ہے اور درود شریف سن رہی ہے۔

میرے خیال میں مسلمانوں کی طرف سے بھیجا جانے والا درود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچایا جاتا ہے۔ جو آپ درود بھیجتے ہیں وہ حضور تک پہنچایا جاتا ہے اور آپ کے علم میں آجاتا ہے۔ یہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ میں کوئی بحث اٹھانا نہیں چاہتا لیکن دورِ جدید کے بعض بڑے محققین نے اس بات کی تردید کی ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی ذاتِ رسالت مآب سے محبت اور عقیدت سے ہے۔ انہوں نے تحقیق کرکے ان احادیث کو بھی کمزور قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ احادیث واقعی کمزور ہوں، لیکن میں سردست اس بحث میں نہیں جاتا۔ اگر کمزور بھی ہوں تو اسی طرح احادیث کے بارہ میں مختلف رائیں ہوسکتی ہیں۔ ایک حدیث ایک کی رائے میں ثابت شدہ اور دوسرے کی رائے میں غیر ثابت شدہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔

ایک بات میں ذرا وضاحت سے کہہ دوں۔ نکیر اسلام کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے منکر پر اظہار ناپسندیدگی کرنا۔ منکر پر ناپسندیدگی کا حسبِ استطاعت اظہار کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ منکر وہ ہے جو قرآن پاک اور حدیث کی نص قطعی کی رو سے حرام ہے یا ناجائز ہے۔ معروف اور منکر دو اصطلاحات ہیں۔ بدکاری منکر ہے، چوری، منافقت، جھوٹ بولنا، جعل سازی، اور دوسری چیزیں منکر ہیں۔ ان چیزوں کے منکرات ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان پر نکیر کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ یہ جو مشہور حدیث ہے۔ اس میں منکر سے یہی منکر مراد ہے۔ لیکن جو چیزیں مختلف فیہ ہوں۔ جن میں قرآن وحدیث کی تعبیر کا مسئلہ ہو۔ اور اس تعبیر کی بنیاد احادیث یا قرآن کی آیات پر ہو اس رائے سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ منکر نہیں ہوتی۔ اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر کوئی اس طرح کی مختلف فیہ بات پر نکیر کرتا ہے تو وہ شریعت کو نہیں سمجھتا ہے۔

میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص مختلف فیہ چیزوں پر نکیر کرتا ہے وہ شریعت کو نہیں سمجھتا۔

☆

There is also a Sirah in English by Maulana Maudoodi-

مولانا مودودی کی سیرت کا انگریزی ترجمہ ابھی میری نظر میں نہیں آیا۔ مولانا کی سیرت کا ذکر ان شاء اللہ میں دورِ جدید میں سیرت کے موضوع پر گفتگو کے دوران کروں گا۔ مولانا کی سیرت کی کتاب بہت اچھی کتاب ہے لیکن مکمل نہیں ہے۔ اگر وہ اس کو مکمل کر دیتے تو یقیناً وہ ایک غیر معمولی کتاب ہوتی۔ اس کی دوسری جلد خاص طور پر بہت اچھی ہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک اس کا انگریزی ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا۔ اگر ہو گیا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔

جزاکم اللہ

٭٭٭

پانچواں خطبہ

چند نامور سیرت نگار

اور ان کے امتیازی خصائص

پانچواں خطبہ

چند نامور سیرت نگار
اور ان کے امتیازی خصائص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

فاضل احترام صدر جلسہ جناب ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری،
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
برادران محترم!
خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا موضوع ہے: 'چند نامور سیرت نگار اور ان کے امتیازی خصائص'۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت مشکل موضوع ہے۔ اس لئے کہ ایک اعتبار سے ہر سیرت نگار نامور سیرت نگار ہے۔ کوئی مخلص سیرت نگار ایسا نہیں ہے جو ان شاء اللہ روز قیامت نامور نہیں ہوگا۔ اس لئے سیرت نگاروں کی طویل، لا متناہی اور مبارک فہرست میں سے نامور سیرت نگاروں کا تعین اور انتخاب اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ کوئی بھی شخص قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ فلاں سیرت نگار نامور سیرت نگار ہے اور فلاں سیرت نگار نامور سیرت نگار نہیں ہے۔ پھر نامور سیرت نگاروں کا جو بھی معیار مقرر کیا جائے گا اس معیار پر بھی

سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سیرت نگار پیدا ہوئے۔ کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مختصر سی نشست میں نامور سیرت نگاروں کی فہرست ہی بیان کر سکے۔

چند روز قبل میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ایرانی محقق نے 12 جلدوں میں سیرت کی ایک کتابیات تیار کی ہے۔ اس میں 29 ہزار سے زیادہ اندراجات ہیں۔ ان 29 ہزار اندراجات میں صرف 29 اندراجات ہی منتخب کئے جائیں۔ ہر اندراج پر دس منٹ بھی بات کی جائے تو 290 منٹ درکار ہیں۔ اس لئے خاصی دیر غور و خوض کے بعد چند نام تجویز کئے ہیں۔ اور آج خاصی دیر تک یہی کام کرتا رہا۔ مختلف فہرستیں بنائی گئی، بار بار کئی نام تجویز کئے کہ آج ان پر گفتگو کی جائے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ انتخاب کرنا بہت دشوار تھا کہ کس سیرت نگار کا انتخاب کیا جائے اور کس کے کام پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ انتخاب کرنے میں پہلی ترجیح ان بزرگان علم و تحقیق کو حاصل ہے جنہوں نے ہمارے لئے فن سیرت کو مرتب کیا، محفوظ کیا اور اس کو اتنی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا کہ بعد میں آنے والوں کے لئے ایک دائمی شاہراہ تحقیق قائم کردی۔

نامور سیرت نگاروں میں کچھ حضرات تو وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے برصغیر سے ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ آخر میں برصغیر کے عنوان سے ہونے والی گفتگو میں پیش کیا جائے گا۔ کچھ نامور سیرت نگار وہ ہیں جن کا تعلق دور جدید سے ہے۔ ان کا تذکرہ دور جدید کے موضوع پر ہونے والی گفتگو میں سامنے آئے گا۔ اس لئے آج کی گفتگو صرف ان متقدمین تک محدود ہے جن کا تذکرہ پہلے نہیں ہوسکا اور ان کا کام اس درجہ کا ہے کہ انہوں نے اپنے بعد آنے والوں کے لئے بنیادیں متعین کیں۔ راستے کے نشانات وضع کئے۔ اس فن کے قواعد و ضوابط اور بنیادی اصول طے کئے۔ جن سے کام لے کر بعد میں آنے والوں نے سیرت کے عنوان پر یہ پورا کتب خانہ تیار کیا جس کی کتابیات کی ایک فہرست 29 ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔

برادران محترم!

سیرت کی تقریبا تمام ابتدائی کتابوں کی بنیاد محققین کی رائے کے مطابق چار بڑی شخصیتوں کے کام پر قائم ہے۔ یہ چار بڑی شخصیتیں وہ ہیں جنہوں نے سیرت نگاری کے باقی

ابتدائی دور یعنی دوسری صدی ہجری تقریباً پوری اور تیسری صدی ہجری کے ابتدائی حصہ میں سیرت نگاری کے فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی ابتدائی تدوین اتنے مضبوط خطوط پر کردی کہ آئندہ آنے والوں کے لئے ان خطوط سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہ شخصیات چار ہیں۔

۱۔ محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ)

۲۔ محمد بن عمر الواقدی (متوفی ۲۰۷ھ)

۳۔ محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)

۴۔ عبدالملک بن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ)

ابن اسحاق کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ابن اسحاق کے بارے میں میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ان کو علم سیرت سے وہی نسبت ہے جو حکیم ارسطاطالیس کو علم منطق سے، امام شافعی کو علم اصول فقہ سے اور خلیل بن احمد الفراہیدی کو علم عروض سے ہے۔ ابن اسحاق سے پہلے فن سیرت موجود تھا۔ علم سیرت کا سارا مواد بھی موجود تھا۔ لیکن ابن اسحاق نے اس کو اجتماعی مربوط خطوط پر استوار کیا۔ اس انداز سے مرتب کیا کہ بعد میں آنے والا ہر شخص ان کا ممنون احسان ہے۔

ابن اسحاق کے علاوہ جو تین نام معروف ہیں وہ واقدی، ابن سعد اور ابن ہشام کے ہیں۔ گفتگو کا آغاز انہی تین سے کرتے ہیں۔ ان تین یا چار سیرت نگاروں کا تذکرہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ ابتدائی دو صدیوں میں سیرت پر کام کرنے والے لوگ بہت محدود تھے۔ کوئی تین چار درجن سیرت نگاروں کے نام تو گزشتہ دو چار دنوں کی گفتگو میں سامنے آ چکے ہیں۔ خود مغربی مصنفین اور محققین نے اس کثرت تعداد کو محسوس کیا ہے۔ انہوں نے سیرت پر ابتدائی کام کرنے والے لوگوں کی فہرستیں مرتب کی ہیں۔ ایک جرمن محقق اور مستشرق وسٹن فیلڈ نے آج سے کم و بیش سوا سو سال پہلے غالباً ۱۸۸۲ء میں عرب میں علم تاریخ کے آغاز اور ارتقاء پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس نے بہت سے نام گنوائے اور تجزیے کئے۔ اس کی تحقیق کے مطابق ابن اسحاق سے پہلے 27 افراد تھے جنہوں نے سیرت پر کام کیا۔ ان ستائیس نامور سیرت نگاروں میں تین صحابہ کرام کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق سے ان 27 میں مزید اضافے کئے ہیں۔
اب یہ تعداد تقریباً 40 ہے۔ ان چالیس میں چار وہ صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں جنہوں نے سیرت
اور مغازی پر تحریری ذخیرے چھوڑے ہیں۔ اس لئے ہم ایک ایسے مقدس اور محترم فن پر بات
کر رہے ہیں جس کے مرتبین میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چار صحابہ کے اسمائے گرامی بھی
آتے ہیں۔

سیرت کے فن کو جس مؤرخ اور سیرت نگار نے اپنی زندگی بھر کی تحقیق اور کاوش سے
چار چاند لگا دیئے۔ جس نے مغازی پر ساری معلومات جمع کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیں
کہ آج غزوہ بدر، غزوہ احد اور حنین وغیرہ اس طرح ہمارے سامنے ہیں جیسے کسی کے سامنے
فلم دکھا دی گئی ہو۔ یہ کارنامہ جس بزرگ کا ہے ان کا نام محمد بن عمر الواقدی ہے۔ محمد بن
عمر الواقدی سیرت نگاروں میں بڑا نمایاں نام اور مقام رکھتے ہیں۔ جو بات کل ابن اسحٰق کے
بارے میں کہی گئی تھی وہ واقدی پر بھی بدرجہ اتم صادق آتی ہے۔ ابن اسحٰق سے کہیں زیادہ
واقدی کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ ان کے بیانات کی تاریخی اور استنادی حیثیت کیا ہے۔
ان کے بیانات اور تحقیقات کی علمی اور تاریخی حیثیت کے بارے میں تو کبھی بھی کوئی شبہ نہیں
رہا۔ ابن اسحٰق کی طرح واقدی کے بارے میں بھی بہت سے محدثین نے یہ تاثر ظاہر کیا کہ وہ
تمام روایات کو جمع کر کے ان کو ایک مرتب نقشے کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور محدثین کے لئے
یہ تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس پوری روایت بلکہ قصہ یا مجموعہ روایت میں کون سا الفاظ کس
راوی نے بیان کیا ہے۔ یوں ان اجزا کا الگ الگ طور پر معیار استناد مقرر کرنا ممکن نہیں رہتا۔
یہ ایک بڑا اعتراض ہے جو محدثین نے بہت سے مؤرخین اور ارباب سیرت پر کیا ہے اور واقدی
پر بھی کیا ہے۔ لیکن واقدی نے کس محبت، کس عقیدت اور کس محنت اور اہتمام کے ساتھ سیرت
کے واقعات کو جمع کیا، ان میں سے چند جھلکیاں میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

خطیب بغدادی جو خود ایک بہت بڑے محدث ہیں اور علم حدیث کے ائمہ میں ان کا
شمار ہے۔ علوم حدیث پر ان کی کتابیں بہت اونچا مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے واقدی کے
بارے میں لکھا ہے کہ واقدی نے مشرق سے لے کر مغرب تک دنیائے اسلام کے لوگوں سے
کسب فیض کیا۔ ان کا ذکر مشرق و مغرب میں ہر جگہ موجود ہے۔ اور کسی شخص کے لئے جو سیرت

اور ابتدائی تاریخ اسلام سے شغف رکھتے ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ واقدی کی تحقیقات یا تصنیفات اور کارناموں سے صرف نظر کر سکیں۔

واقدی نے مغازی کے علاوہ براہ راست سیرت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات پر رسول اللہ ﷺ سے متعلق بہت سے ایسے معاملات پر جو عام سیرت نگار اس وقت بیان نہیں کرتے تھے، ان سب کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ علاوہ ازیں واقدی ایک بہت بڑے فقیہ اور محدث بھی تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہوں نے علم مغازی اور سیرت میں اسلام کے بین الاقوامی قانون کے قواعد وضع یا جمع کئے اور ان کو اس موضوع پر ابتدائی تالیفات میں سے ایک تالیف پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مغازی سے دلچسپی دو قسم کے حضرات کو تھی یعنی مؤرخ، محدثین اور قانون دان اور فقہاء۔ مؤرخ اور سیرت نگار کی دلچسپی واقعات اور تفصیلات جمع کرنے سے تھی۔ مؤرخ اور سیرت نگار کی دلچسپی یہ تھی کہ کسی واقعہ کا مکمل نقشہ سامنے آ جائے۔ فقیہ اور قانون دان کی دلچسپی یہ تھی کہ اس واقعہ سے، جو جنگ کا واقعہ ہو، صلح کا واقعہ ہو، معاہدے کا واقعہ ہو، جو جو قوانین بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کے لئے نکلتے ہیں ان کی نشاندہی کی جائے۔ واقدی کا شمار دونوں قسم کی شخصیات میں ہے۔ وہ محدث بھی رہے۔ انہوں نے فقہ پر بھی کتاب لکھی۔ ایک کتاب انہوں نے اختلاف حدیث پر بھی لکھی۔ یعنی وہ احادیث جن کے بظاہر مختلف احکام نکلتے ہیں ان احادیث کے درمیان تطبیق کیسے پیدا کی جائے۔ اور اس ظاہری اختلاف کو کیسے دور کیا جائے۔ اس پر محدثین نے بڑی سے بڑی کتابیں لکھتے چلے آئے ہیں۔ امام شافعی نے اس پر کتاب لکھی۔ اور بھی کئی محدثین اور فقہاء نے اس پر کام کیا ہے۔

سیرت پر واقدی کا جو کارنامہ ہے وہ سب اس سے تو بخوبی واقف ہیں۔ واقدی کی عظیم کتاب مغازی پر مطبوعہ موجود ہے۔ لیکن انہوں نے جو کام بین الاقوامی قانون پر کیا تھا اس کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے۔ ان کا یہ کام ابھی دستیاب ہے اور آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اور امام شافعی جیسے کبار اور قابل احترام فقیہ اور محدث نے واقدی کے کام کو محفوظ کر لیا ہے۔ امام شافعی کی آٹھ جلدوں میں ایک ضخیم کتاب ہے جو حضرت شافعی کی اساس اور بنیاد مانی جاتی ہے، کتاب الام، یعنی mother book۔ ان آٹھ جلدوں میں چوتھی جلد میں امام شافعی نے

پاس کچھ ہے نہیں تو آپ میری کوئی مدد کریں۔ واقدی نے بیگم سے مشورہ سے وہ تھیلی جوں کی توں اٹھا کر ان کو دے دی۔

تھوڑی دیر میں واقدی کے ہاشمی دوست ان کے پاس آئے اور کہا کہ بھئی کیا قصہ ہے۔ میں نے آپ کو جو تھیلی دی تھی وہ کہاں گئی۔ واقدی نے بتانے میں تامل کیا لیکن جب ہاشمی دوست نے اصرار کیا تو بعد میں بتادیا کہ فلاں دوست کو دے دی۔ ہاشمی دوست نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس تھیلی کے کچھ نہیں تھا۔ جب وہ آپ کو دے دی تو اپنے ایک دوسرے دوست سے کہا کہ مجھے کچھ مدد چاہئے۔ انہوں نے میری ہی تھیلی مجھے بھیج دی۔ صاحب یہ تینوں چاروں دوست ایک جگہ جمع ہوئے اور آپس میں اس دلچسپ اتفاق بلکہ لطف پر اظہار خیال کررہے تھے کہ ان ہاشمی دوست کو وزیر اعظم کی طرف سے بلاوا آیا۔ وزیر اعظم کو اطلاع ملی کہ مجلس میں واقدی بھی موجود ہیں انہوں نے کہا سب کو لے آؤ۔ چاروں چلے گئے۔ وزیر اعظم نے سارا واقعہ سن کر سب کو ایک ایک ہزار درہم دیئے اور واقدی کو دو ہزار درہم دے کر کہا کہ اس میں ایک ہزار تمہاری بیگم کے لئے ہیں کیونکہ اسی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ سارے درہم ہاشمی دوست کو دے دیئے جائیں۔ جو خاتون حضور کے خاندان کے ایک آدمی کے لئے اپنی ضروریات قربان کردے وہ اس کی مستحق ہے کہ اس کو بھی ایک ہزار درہم کی تھیلی دے دی جائے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ واقدی کس مزاج اور کس انداز کے آدمی تھے۔

مغازی اور سیرت نبوی کے بارے میں تمام مورخین اور سیرت نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ مغازی کے بارے میں ان سے زیادہ جاننے والا کوئی اور آدمی اس وقت دنیائے اسلام میں موجود نہیں تھا۔ محمد بن سلام ایک مشہور مورخ اور ادیب ہیں، جنہوں نے طبقات پر ایک کتاب لکھی ہے 'طبقات الشعراء'۔ یہ واقدی کے چھوٹے ہم عصر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ 'کان الواقدی عالم دھرہ'۔ واقدی اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تھا جو مغازی کے علم کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا۔ واقدی کو کتابوں سے اتنی دلچسپی تھی کہ ایک مرتبہ جب ایک مکان سے دوسرے مکان منتقل ہورہے تھے اور اپنا سامان لے جانے لگے تو 120 اونٹوں پر اپنی کتابیں لے کر گئے۔ ان کے جو مسودات تھے وہ 600 صندوقوں میں محفوظ تھے۔ ہر صندوق اتنا بڑا تھا کہ دو آدمی اس کو اٹھاتے تھے۔

واقدی کی زندگی کا بیشتر حصہ مدینہ منورہ میں اور بہت تنگدستی میں گزرا۔ مدینہ منورہ میں وہ دن رات اسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کے خاندانوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان سے پوچھ پوچھ کر وہ دستاویزات جمع کرتے تھے جو حضور کے زمانے سے اس خاندان میں چلی آرہی ہوں۔ حضور کے زمانے کا اگر ناپ تول کا پیمانہ کسی گھر میں محفوظ ہوتا تھا تو اس کو منگوا کر دیکھتے تھے اور ناپ تول کے بارہ میں معلومات مدون کرتے تھے۔ کسی نے اگر کسی غزوہ کے بارے میں کوئی معلومات بتائیں تو وہ جمع کیں۔ پھر خود جا کر ان مقامات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں خلیفہ ہارون رشید نے حج سے واپسی پر مدینہ منورہ کا دورہ کیا۔ ایک دن شام کے وقت خلیفہ کا آدمی واقدی کے پاس آیا۔ ان دنوں یحیٰی بن خالد برمکی وزیر اعظم تھا۔ اس نے کہا کہ آج رات امیر المومنین رسول اللہ ﷺ کی یادگاریں دیکھنے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ چلیں اور انہیں مدینہ منورہ کے مختلف مقامات کی زیارت کرائیں۔ واقدی نے کہا بہت اچھا۔ عشاء کی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر وہ خلیفہ کے ساتھ نکلے۔ وہ خلیفہ کو ایک ایک مقام پر لے جاتے رہے۔ خلیفہ وہاں نوافل ادا کرتے اور عبادت میں وقت گزارتے۔ یوں وہ فجر کی نماز تک اسی کام میں مصروف رہے۔ اس کے بعد واقدی گھر آگئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک آدمی پیغام لے کر آیا کہ آپ کو وزیر اعظم یحیٰی بن خالد برمکی نے بلایا ہے۔ وزیر اعظم نے واقدی سے کہا کہ 'امیر المومنین جب سے نماز فجر سے فارغ ہوئے ہیں اس وقت سے مسلسل رو رہے ہیں "ان امیر المومنین لم یزل باکیا"۔ وہ ان تمام زیارات میں ساتھ جانے پر آپ کے بہت شکر گزار ہیں اور آپ کے لئے یہ 10 ہزار درہم بھیجے ہیں۔ واقدی نے وہ دس ہزار درہم قبول کر لئے اور جو قرض چلا آرہا تھا وہ ادا کیا۔ کچھ ضروریات کی تکمیل کی، کچھ کتابیں خریدیں اور یوں چند ہی مہینوں میں وہ رقم ختم ہوگئی۔

جب تنگدستی پیش آئی اور مزید رقم کی پھر ضرورت پڑی تو بیگم نے مشورہ دیا کہ وزیر اعظم سے آپ کا تعارف ہے۔ خلیفہ بھی آپ کو جانتا ہے۔ آپ بغداد جائیں اور کوشش کریں شاید کوئی فائدہ ہو۔ عورتیں تو ہمیشہ تعجب کرتی ہیں۔ یہ بیچارے محقق اور کتابیں چھوڑ کر بغداد کے لئے روانہ ہوگئے۔ بغداد جانے کے لئے بھی خاصی رقم درکار تھی۔ وہاں قیام کے لئے

بھی پیسے درکار تھے۔ آپ کے پاس نہیں تھے۔ کسی نہ کسی طرح بصرہ پہنچ گئے۔ وہاں پیسے بالکل ہی ختم ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں سے فوجیوں کا کوئی گروپ بغداد جا رہا تھا۔ انہوں نے واقدی سے بصرہ آنے کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی بغداد جانا چاہتے ہیں۔ فوجیوں نے واقدی کو بھی اپنے ساتھ کشتی میں سوار کر لیا اور بغداد کی طرف چل پڑے۔ واقدی خود بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم انہوں نے میری اتنی خدمت کی کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی بھی اتنی خدمت نہیں کرتا ہوگا۔ انہوں نے ان کو کھلایا پلایا اور بغداد میں جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں ان کو بھی ٹھہرا لیا۔ اب واقدی نے اپنے یہاں آنے کا مقصد ان پر ظاہر کرنا عزت نفس کے خلاف سمجھا۔ وہ پوچھتے تو واقدی مختلف عذر کرتے رہے کہ یہ کام ہے اور وہ کام ہے۔ اسی اثنا میں ظاہر ہے لمبا سفر کر کے آئے تھے، کپڑے پرانے ہو گئے تھے۔ ایک دن وزیر اعظم کے ہاں پہنچے تو کسی نے جانے ہی نہیں دیا۔ عام طور سے لوگوں کو لباس اور حلیہ دیکھ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ یہ روز جاتے تھے اور وزیر اعظم سے ملاقات کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جب ملاقات کا موقع نہیں ملا تو مایوس ہو کر مدینہ منورہ واپس جانے لگے۔ مدینہ منورہ کے راستے میں ایک منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے تو ان کے ایک دوست سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی جو فقیہ اور عالم تھے، اور مدینہ کے قاضی مقرر ہو کر جا رہے تھے۔ جب انہوں نے واقدی سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے پوری داستان سنا دی۔ دوست نے کہا کہ چلئے میں آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ وہ دوبارہ واپس ہوئے۔ بغداد آئے اور وزیر اعظم سے ملاقات کروائی۔ وزیر اعظم بہت خوش ہوئے اور چلتے ہوئے ان کو 500 درہم پیش کر دیئے۔ انہوں نے اس رقم سے کچھ اپنی ضروریات پوری کیں۔ اپنی حالت بہتر بنائی اور چار پانچ دن مزید وہاں رہے۔ وزیر اعظم نے ان سے کہا کہ جب تک آپ یہاں ہیں تو مغرب کی نماز ہمارے ساتھ پڑھا کریں۔ وہ روزانہ مغرب کی نماز پڑھنے وہاں جاتے اور واپسی پر یحیی بن خالد ان کو پانچ سو درہم دے دیا کرتے تھے۔ اس دوران انہوں نے خلیفہ سے بھی واقدی کی ملاقات کروائی اور یاد دلایا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے آپ کے رہنما کے فرائض ادا کئے تھے۔ خلیفہ نے بہت بڑی رقم ان کو دے دی اور اس کے بعد واقدی واپس آ گئے۔

یہ واقدی کا پس منظر ہے۔ انہوں نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گزار دی۔ ابن ندیم

نے واقدی کی لکھی ہوئی 28 کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ واقدی نے بڑے بڑے اساتذہ سے کسب فیض کیا جن میں امام مالک اور معمر بن راشد بھی شامل ہیں۔ معمر بن راشد وہی بزرگ ہیں جن کا پہلے تذکرہ ہوچکا ہے۔ امام سفیان ثوری بھی ان کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ ایک خوشی کی بات ہمارے برصغیر کے لوگوں کے لئے یہ ہے کہ ہمارے سندھ کے ایک بزرگ ابو معشر نجیح السندی جو بڑے سیرت نگار تھے وہ بھی واقدی کے اساتذہ میں شامل تھے۔ سندھ سے جاکر وہ مدینہ منورہ گئے تھے۔ پھر بغداد میں رہے جہاں واقدی نے ان سے کسب فیض کیا۔

واقدی کا طریقہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے خاندانوں میں جایا کرتے تھے اور یہ پوچھتے تھے کہ کیا آپ کے خاندان میں کوئی ایسا شخص ہے جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے مغازی کا علم رکھتا ہو۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے آباؤ اجداد میں کوئی شہید ہوا ہو۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جس نے حضور کے ساتھ کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا حضور نے اس کو کسی مہم پر بھیجا ہو۔ جب ایسا ہوتا تھا کہ فلاں خاندان میں کوئی شخص نکل آیا تو اس سے جاکر ملتے۔ واقدی تفصیلات پوچھتے غزوہ کے موقع پر جاکر اس جگہ کا خود مطالعہ اور مشاہدہ کرتے تھے اور ان معلومات کا موازنہ اس علاقے سے کرتے تھے تاکہ ایک مکمل تصویر اور نقشہ ان کے سامنے آجائے۔ یہ بات واقدی کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ انہوں نے محض نظری طور پر معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان مقامات کو دیکھنے کی کوشش کی اور ہر جگہ خود جاکر اس نقشے اور اس جگہ کا معاینہ کیا۔ وہاں جو بھی جغرافیائی چیزیں موجود ہوتی تھیں ان سب کو قید تحریر میں لاتے اور اس جگہ کا مکمل نقشہ بناتے۔

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سخت گرمی کے موسم میں دیکھا کہ واقدی کے ایک ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ ہے۔ جیب میں قلم رکھا ہوا ہے اور کاندھے پر پانی کی چھوٹی سی مشک ہے اور تیز تیز کہیں جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں تو بتایا کہ آج ہی بعض صحابہ کرام کی اولاد میں سے کچھ لوگوں سے غزوہ حنین کے بارے میں معلومات ملی ہیں۔ میں حنین کا مقام دیکھنے جا رہا ہوں۔ یاد رہے کہ حنین مکہ مکرمہ سے 70/80 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدل جارہے

ہوں گے۔ پہلے ایک دن میں تو نہیں پہنچے ہوں گے۔ دو تین دن جانے میں اور دو تین دن
آنے میں لگتے ہوں گے۔ ایک دو دن کام کے لئے رکنے بھی ہوں گے تو گویا پورے ہفتہ دس
دن کا یہ پروجیکٹ صرف ایک راوی کی روایت کی تصدیق کرنے کے لئے اور ایک غزوہ کا
مقام دیکھنے کے لئے تھا۔

پھر جیسے جیسے یہ لکھتے جاتے تھے اس کو مرتب کرتے جاتے تھے۔ پھر اپنی مرتب کردہ
تحریروں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کئی محققین نے بیان کی ہے۔ بعض جدید محققین
اس کو ایک طرح سے پڑھتے ہیں میں دوسری طرح سے پڑھتا ہوں۔ ابن سید الناس نے نقل
کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قاسم ابن تمیم الحربی یا ابراہیم الحربی کہتے ہیں کہ میں نے فلاں سے سب کو
یہ کہتے ہوئے سنا کہ 'رأیت الواقدی یوماً جالساً الی اسطوانة فی المسجد' میں
نے واقدی کو مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا۔
'وهو يدرس' یہ لفظ ہے جس کو کچھ لوگوں نے غلط طریقے سے پڑھا ہے 'وهو يدرّس' یعنی وہ
درس دے رہے تھے، پڑھا رہے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ای شیئ تدرس؟ آپ کیا
پڑھا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا 'حزبی من المغازی' مغازی میں سے اپنی منزل۔ میرا
خیال ہے یہ یُدرِّس یا یُدرِس نہیں ہے بلکہ یدرُس ہے یعنی وہ اس کو پڑھ رہے تھے اور یاد
کر رہے تھے۔ حزب یعنی ورد اپنے پڑھنے کا ہوتا ہے دوسروں کو پڑھانے کا نہیں ہوتا۔ اگر
پڑھا رہے ہوتے تو آگے حلقہ بیٹھا ہوتا۔ اس میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ پوچھنے کی
ضرورت تب ہوتی ہے جب آدمی آہستہ آہستہ اور تنہا پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس سے پتا لگتا ہے کہ وہ
روزانہ تنہا بیٹھ کر مغازی کی اپنی منزل یاد کرتے تھے۔ جو جو لکھتے جاتے تھے اس کو زبانی یاد بھی
کرتے جاتے تھے۔

اس طرح سے واقدی نے کتاب المغازی کے نام سے ایک بہت مفصل اور مربوط
کتاب تیار کی۔ یہ کتاب مخطوطات کی شکل میں طویل عرصہ تک لوگوں کو دستیاب رہی اور تقریباً
ہر دور کے سیرت نگاروں نے ان مخطوطات سے استفادہ کیا ہے۔ اس مخطوطہ کی طباعت کی
نوبت بیسویں صدی کے وسط میں آئی۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ جو مخطوطہ شائع ہوا ہے یہ مکمل نہیں
ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو edit کرکے

شائع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نامکمل ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکمل شکل میں ہم تک پہنچایا نامکمل شکل میں۔

اس وقت یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ کتاب کا آغاز ہجرت کے واقعات سے ہوتا ہے۔ اور اس ابتدائی تمہید میں چند صفحات کے بعد غزوہ بدر کا ذکر ہے۔ یہ غزوہ تبوک کے بعد جیش اسامہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ غزوہ تبوک آخری غزوہ تھا اور جیش اسامہ وہ تھا جس کی تشکیل کا حکم حضور نے دیا تھا اور عمل درآمد سیدنا ابوبکر صدیق نے کروایا تھا۔ اس کی تفصیل پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مکمل کتاب ہو جس میں انہوں نے غزوات ہی کو بیان کیا ہو، اور اسی وجہ سے اس کا نام کتاب المغازی رکھا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ابتدائی ابواب ضائع ہو گئے ہوں اور ہم تک نہ پہنچے ہوں۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ پوری کتاب تین جلدوں پر مشتمل اور کوئی ڈیڑھ ہزار صفحات پر محیط ہے۔ ایک ایک غزوہ کے بارے میں جتنی تفصیل دی جا سکتی تھی اتنی تفصیل انہوں نے بیان کر دی ہے۔

غزوات کے ساتھ ساتھ دوسری بے شمار تفاصیل بھی واقدی کی اس کتاب میں موجود ہیں۔ عہد نبوی میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدات کا پس منظر کیا تھا۔ اگر کسی قبیلہ نے دوسرے کسی دو قبیلوں کے درمیان ثالثی کرائی تو اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اگر کوئی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ہے تو اس کا تذکرہ ہے۔ جا بجا اس کے بھی اشارے ملتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حربی اور عسکری امور کے لئے سراغ رسانی کا جو شعبہ قائم کیا تھا وہ کیسے کام کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی غزوہ کے لئے جاتے تو پہلے آپ اس علاقہ اور دشمن کے بارہ میں مکمل معلومات جمع فرماتے۔ بعض صحابہ کرام کے بارے میں صراحت ہے کہ ان کو اس کام کے لئے بھیجا۔ بعض کے نام نہیں ہیں لیکن یہ ذکر ہے کہ حضور نے سراغ رساں بھیجے۔ پھر اس کا ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فوجوں کی تربیت کیسے کی۔ ان کی پریڈ اور قواعد کیسے ہوتی تھی۔ بعض دستے پہرہ داری کے لئے مقرر کئے جاتے تھے کہ وہ گشت لگاتے رہیں اور خطرات کی نشاندہی کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جس کو آج کل counter intelligence کہتے ہیں اس کا بھی انتظام فرمایا۔ اپنے لئے معلومات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کے بارے میں بھی معلومات جمع کی جائیں اور

دشمن کو ہمارے بارے میں معلومات جمع کرنے سے روکا جائے۔ یہ پوری تفصیلات واقدی کے ہاں بہت تفصیل سے ملتی ہیں۔

تاریخ کے طالب علم کے نزدیک واقدی کی جو خوبی ہے وہ محدثین کے ہاں قابل اعتراض بات ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو پورے واقعہ کا مکمل نقشہ بیان کرنے سے پہلے تقریباً بیس راویوں کے نام دے کر لکھتے ہیں کہ فکل حدثني من هذا الحديث طائفة، ان میں سے ہر ایک نے اس واقعہ کا ایک حصہ مجھ سے بیان کیا۔ وبعضهم اوعى من بعض 'بعض لوگ جو حصہ بیان کرتے تھے ان کو بہت اچھی طرح یاد تھا بعض کو یہ بات اچھی طرح یاد نہیں تھی۔ وغيرهم قد حدثني ايضاً' ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات نے یہ واقعات بیان کئے ہیں۔ فكتبت كل ما حدثني 'جو کچھ جس شخص نے بیان کیا اس سے وہ سب قلم بند کیا' قالوا' انہوں نے یہ کہا۔ اس کے بعد پھر ہجرت کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس تاریخ کو مدینہ منورہ میں قدم رنجہ ہوئے۔ کس وقت اور کس دن یہ واقعہ پیش آیا۔ واقدی نے خاص طور پر تاریخوں کا تعین کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ کون سا واقعہ کس دن اور کس تاریخ کو پیش آیا۔ کون سے غزوات اور سرایا کے لئے حضور کس وقت گھر سے نکلے۔ کس تاریخ کو نکلے۔ صبح کو نکلے کہ شام کو نکلے۔ ظہر کے وقت نکلے کہ عصر کے وقت نکلے۔ نماز پڑھ کر مدینہ منورہ سے نکلے یا پہلی منزل پر پہنچ کر نماز پڑھی۔ اس طرح کی جزوی تفصیلات کا واقدی نے بڑا اہتمام کیا ہے۔

واقدی نے شروع کے آٹھ دس صفحات میں پہلے تمام غزوات کا ایک خلاصہ دیا ہے۔ اس میں 27 غزوات اور 47 سرایا کا ذکر کیا ہے۔ یعنی 27 مہمات وہ تھیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے براہ راست شرکت فرمائی اور 47 وہ تھے جو آپ نے مختلف صحابہ کرام کی سرکردگی میں بھیجے۔ تین مرتبہ حضور نے عمرہ فرمایا۔ یہ واقدی کی ایک رائے یا تحقیق ہے جس سے بہت سے محدثین اتفاق کرتے ہیں اور بعض محدثین اختلاف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اکثر محدثین اور سیرت نگاروں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے تین عمرے فرمائے۔

غزوہ بدر کا بیان واقدی کی کتاب کے 153 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ مفصل بیان سیرت کی کسی بھی کتاب میں نہیں ہے۔ حدیث اور سیرت کی کسی بھی کتاب میں

غزوہ بدر کا چار پانچ یا دس صفحات سے زیادہ نہیں ہے۔ واقدی نے چونکہ پوری زندگی اس کام میں لگائی۔ جو جو معلومات جمع ہو سکتی تھیں وہ جمع کیں۔ کفار مکہ کی طرف سے کون کون لڑنے کے لئے آیا۔ کون کون مرا، اس کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اس میں کوئی اختلاف ہے کہ نہیں ہے۔ صحابہ میں کون کون سے لوگ شہید ہوئے۔ اصحاب بدر کی مکمل فہرست قبیلے کے لحاظ سے موجود ہے کہ فلاں صحابی فلاں قبیلے سے تھے۔ اسلحہ کون کون سا تھا۔ گھوڑے کتنے تھے اور کس کس کے تھے۔ اونٹ کتنے تھے اور کس کس کے تھے۔ ہتھیار کس کس کے تھے۔ کون کون ہتھیار بند تھا اور کس کس کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ بہت منطقی ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے۔ غالباً وہاں اگر کوئی روئداد نویس بھی بیٹھا ہوتا تو شاید اتنی تفصیل اور ترتیب کے ساتھ نہ لکھ سکتا تھا جتنا واقدی نے ڈیڑھ سو سال بعد محنت کر کے ان واقعات کو جمع کیا ہے۔

اس کے بعد ایک اور اہم خدمت جو واقدی نے کی ہے، وہ غزوات اور سیر کا فقہی پہلو ہے۔ وہ خود بھی حدیث کے بڑے عالم تھے۔ اختلاف حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ قاضی بھی تھے، فقہ بھی جانتے تھے اور بین الاقوامی قانون پر کتاب لکھی تھی۔ اس لئے ان کو ان غزوات کے فقہی، دینی اور قانونی پہلوؤں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہر غزوہ اور ہر بڑے واقعہ کے بعد قرآن پاک میں اس پر جو تبصرہ آیا ہے وہ بھی نقل کیا ہے اور اس کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ مثلاً غزوہ بدر بیان کرنے کے بعد سورۃ انفال میں جہاں جہاں غزوہ بدر پر تبصرہ ہے، ان آیات کو نقل کیا ہے، ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے اور تفسیر بیان کرنے میں جہاں جہاں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے وہاں اس سوال کا جواب بھی دیا ہے۔ گویا سیرت قرآنی، جس کے بارے میں کل ڈاکٹر انیس صاحب نے کہا تھا کہ نیا رجحان ہے، اس پر بھی واقدی نے قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ گویا یہ رجحان واقدی کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی واقدی نے قرآن حکیم سے بھی واقعات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ چیز ان کی کتاب المغازی میں موجود ہے۔ پھر ہر جنگ اور ہر غزوہ کے بعد اس کے شرکا کے بارے میں جس حد تک معلومات ہو سکتی تھیں وہ بیان کی ہیں اور ان کے نام دے دیئے ہیں۔

واقدی کا انداز خالص مورخانہ ہے۔ انہوں نے ایک منطقی اور مرتب و مربوط انداز سے معاملات اور تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ پہلے وہ ماخذ اور حوالہ جات بیان کرتے ہیں۔ سب

کے نام بتاتے ہیں۔ واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ تاریخ اور محل وقوع کو بیان کرتے ہیں۔ متعلقہ معلومات دیتے ہیں کہ اس دستے کا سربراہ کون تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ خود سربراہی فرما رہے تھے تو مدینہ میں جانشینی کے لئے کس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ مسلمانوں کا شعار یعنی password کیا تھا۔ چونکہ ہر جنگ میں فریقوں کو کوئی خاص یونیفارم نہیں ہوتا تھا۔ حلیے، لباس، زبان سب کے ایک ہی جیسے تھے۔ خاص طور پر بڑی فوجوں کے درمیان جنگ کے مواقع پر رات کے وقت یہ تعیین دشوار ہوتا تھا کہ اپنا کون ہے اور دشمن کون ہے۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ تھا کہ جب جنگ کے لئے نکلتے تھے تو ایک خفیہ لفظ متعین فرما کر سب سپاہیوں کو بتا دیتے تھے۔ واقدی نے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ ہر غزوہ کا پاس ورڈ کیا تھا۔ کسی میں یا منصور امت تھا۔ کسی میں اس طرح کے دیگر الفاظ ہوا کرتے تھے۔

واقدی نے غزوات کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اور دیگر سیرت نگاروں کے بیان کردہ واقعات میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ واقعہ کا جو بنیادی حصہ ہے۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے جو اصل حقائق واقدی نے بیان کئے ہیں ان میں اور ابن اسحاق میں یا دیگر محدثین کے بیان کردہ واقعات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے تشریف لے گئے۔ 313 صحابہ ساتھ تھے۔ ابتدا میں خیال یہ تھا کہ قریش کے قافلہ سے مڈبھیڑ ہوگی۔ لیکن وہاں جا کر بدر کے مقام پر پتہ چلا کہ قافلہ نکل گیا اور اس کے دفاع کے لئے ایک ہزار افراد کا لشکر آرہا ہے۔ پھر حضور نے صحابہ کرام کو تیار کیا کہ مقابلہ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ کفار کے 70 سردار مارے گئے۔ صحابہ کرام میں بھی کچھ شہید ہو گئے۔ یہ گویا واقعہ کا خلاصہ ہے۔ واقدی کے بیانات سے بھی واقعہ کے اسی بنیادی خاکہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔

واقدی کے ہاں اس خاکہ میں رنگ بھرنے اور بقیہ تفصیلات فراہم کرنے کا اہتمام ہے۔ ان کی یہ تحقیق راویوں کے بیانات اور چشم دید گواہی پر مشتمل ہے۔ غزوہ بدر کس مقام پر ہوا۔ آج تو وہ مقامات خاصے بدل گئے۔ لیکن خاصے بدلنے کے باوجود بڑی حد تک آج بھی وہ جغرافیائی محل وقوع اسی طرح موجود ہے۔ لیکن واقدی کے زمانے میں بالکل ہی وہی شکل رہی ہوگی۔ اس لئے واقدی نے محل وقوع کی جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان کے قطعی اور یقینی ہونے

میں شک وشبہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ واقدی سے پہلے کے مورخین، مثلاً ابن اسحاق، عروہ بن زبیر یا امام زہری کے ہاں وہ تفصیلات نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ابن اسحٰق یا عروہ بن زبیر نے مختلف مہمات کی تاریخوں کے بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ واقدی نے اس بات کا اہتمام کیا کہ ہر غزوہ کی تاریخ اور اس کی ترتیب کے بارے میں بھی تحقیق کی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے احکام کے بارے میں تدریج کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جو احکام دیئے گئے اور جو قوانین نافذ کئے گئے وہ تدریج کے ساتھ دیئے گئے۔ اگر کوئی بڑی برائی تھی تو اس کو یکدم منع نہیں کیا گیا۔ پہلے اس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس کے بعد اس کو بعض صورتوں میں حرام قرار دے دیا گیا۔ پھر مزید بعض صورتوں میں حرام قرار دے دیا گیا۔ بالآخر مکمل طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ یہ تفصیل اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب مختلف احکام کی تاریخ معلوم ہو۔ بعض احکام کی تاریخ تو نہیں معلوم، لیکن یہ معلوم ہے کہ فلاں حکم فلاں مہم کے دوران نازل ہوا۔ اگر اس مہم کی تاریخ معلوم ہو تو اس حکم کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وقائع نبوی میں اور غزوات نبوی میں تاریخ اور ترتیب کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ کام واقدی نے بڑی تحقیق کے ساتھ کیا ہے۔ اس مفید تحقیق کاوش کے لئے امت کو واقدی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ ہر محقق کے کام سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض تاریخوں کے بارے میں بعد کے محققین نے واقدی سے اختلاف کیا اور دلیل کے ساتھ ثابت کیا کہ واقدی کی تحقیق اس معاملہ میں نظر ثانی کی محتاج ہے۔ اس طرح کے ایک دو واقعات بھی ملتے ہیں۔ غزوات کی تفصیلات کے ساتھ اس دور کے مدینہ منورہ اور اسلامی معاشرہ کے عام خصائص کی بابت قیمتی معلومات کتاب المغازی میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ واقدی کا مقصد تو وہ معلومات جمع کرنا نہیں تھا۔ لیکن ضمناً بہت ساری ایسی معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں جس سے اس دور کے مدینہ منورہ اور معاشرہ کے بارے میں بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر مدینہ منورہ میں زراعت کا انتظام کیا تھا۔ کون کس زمین کا مالک تھا۔ کس کی زمین میں کیا کاشت ہوتا تھا۔ یہودیوں کے پاس کون کون سی زمینیں تھیں۔ کن کن قبائل کے ساتھ کون کون سے قبائل کی تجارت تھی۔ اس سے مدینہ منورہ کی زراعت اور تجارت کے بارے میں بہت سی معلومات

سامنے آجاتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں کھانے پینے کی عادات کیا تھیں۔ کس قسم کا کھانا کھایا جاتا تھا۔ اچھے، بااثر اور اہل ثروت لوگ کس طرح کا کھانا کھاتے تھے اور غریب اور بے سہارا لوگ کس قسم کا کھانا کھاتے تھے۔ پھر وہاں موجود مشرکین کن بتوں اور دیویوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کی الگ دیویاں اور الگ بت ہوتے تھے۔ بعض بت ایسے تھے جو بڑے سمجھے جاتے تھے اور کئی قبیلے مل کر اس کو پوجتے تھے۔ اس کے علاوہ قبیلوں کے الگ الگ بت اور دیویاں تھیں۔ یہ معلومات کوئی خاص دینی اہمیت نہیں رکھتیں، لیکن تاریخی دلچسپی کے پیش نظر واقدی نے ان کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔

پھر جو عام معاشرتی زندگی اور تمدنی اور ثقافتی امور ہیں، ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں واقدی کے ہاں معلومات ملتی ہیں۔ اس زمانے میں تجارتی کاروان کیسے جایا کرتے تھے۔ قافلے کیسے جاتے تھے۔ ظاہر ہے عرب کے لوگ دور دراز علاقوں کے سفر کے لئے قافلوں میں جایا کرتے تھے۔ رحلة الشتاء والصيف کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے۔ شام اور یمن تک تجارتی قافلے جایا کرتے تھے۔ یہ کیسے جاتے تھے۔ جب لاکھوں روپے کا سامان لے کر جا رہے ہوں گے تو اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے لئے جو تفصیلات واقدی نے دی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح آج کل ٹور آپریٹرز ہوتے ہیں اسی طرح کے ٹور آپریٹرز ہوا کرتے تھے جو بڑے پیمانے پر اونٹ تیار رکھتے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لئے باقاعدہ کل وقتی اور جز وقتی ملازمین ہوتے تھے۔ ان کے پاس راستہ بتانے والے لوگ ہوتے تھے۔ سپلائی کا سامان وہ ساتھ بھیجا کرتے تھے۔ پانی کا انتظام ساتھ ہوتا تھا اور مسافروں سے پیشگی معاوضہ لے کر منزل پر پہنچا دیا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات جو پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں، ان کو جمع کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ طریقہ کار رائج تھا۔

واقدی نے جو معلومات جمع کی ہیں، ان کے بارے میں محدثین کے تحفظات اور ملاحظات کے باوجود عام طور پر سیرت نگاروں نے واقدی کی جمع کردہ ان تفصیلات کو قبول کیا ہے۔ ایک مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ واقدی نے سیرت اور غزوات کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کے بیشتر حصے کی تائید حدیث کی کتابوں سے ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مسند

امام احمد میں بہت سی ایسی احادیث ہیں جو واقدی کے ان بیانات کی تائید کرتی ہیں جن کی عام کتب حدیث سے تائید نہیں ہوتی۔

محدثین کا بڑا اعتراض تھا کہ واقدی اور ان کی طرح دوسرے لوگ بہت سے راویوں کے بہت سے بیانات کو یکجا کر کے بیان کرتے ہیں۔ اس پر اس زمانے میں بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا۔ واقدی کے تلامذہ بھی یہ اعتراض کرتے تھے۔ ابن سید الناس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واقدی اپنے تلامذہ کے حلقہ میں غزوات کے بارے میں کوئی درس دے رہے تھے۔ بعض طلبہ نے کہا کہ یہ طریقہ کار ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے کہ آپ پچیس راویوں کے نام لے لیتے ہیں اور ان سب کی مشترکہ معلومات کو ایک بیان کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہر راوی کے حالات اور اس کی فراہم کردہ روایات و معلومات کو الگ الگ بیان کریں۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، لیکن اس طرح درس بہت طویل ہوا کرے گا اور وقت بھی بہت صرف ہوگا۔ طلبہ نے کہا: کوئی بات نہیں ہمیں منظور ہے۔ واقدی نے کہا: آپ مجھے ایک ہفتہ کی مہلت دے دیں۔ اگلے ہفتہ آئیے گا تو میں اس طرح پڑھاؤں گا۔ اگلے ہفتہ طلبہ آئے۔ طلبہ کہتے ہیں کہ غاب عنا جمعة 'پورے ہفتہ تک ہمارے پاس نہیں آئے'۔ ثم اتانا بغزوة احد 'پھر غزوہ احد پڑھانے کے لئے آئے'۔ بعشرين مجلدا 'بیس جلدوں کے ساتھ'۔ یعنی بیس جلدیں لے کر آئے اور کہا کہ یہ غزوہ احد کے بارے میں تمام راویوں کے الگ الگ بیانات کا مجموعہ ہے۔ ایک اور راوی نے بیان کیا کہ سو جلدیں لے کر آئے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ بتایا کہ ہر جلد میں ایک راوی کے حالات و روایات میں نے الگ بیان کئے ہیں۔ تو غزوہ احد اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو یہ بیس جلدیں آپ کو سناؤں گا۔ ہم نے کہا کہ ردنا الى الطريق الاول 'نہیں وہ پہلے والا طریقہ ٹھیک ہے۔ آپ اسی طرح پڑھائیے'۔

ہمارے ہاں بہت سے لوگ محدثین کرام کے تحفظات کو بیان کرنے میں بے احتیاطی کرتے ہیں۔ محدثین کرام کے تحفظات اپنی جگہ سر آنکھوں پر۔ محدثین نے واقدی کے بارے میں بھی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ محدثین واقدی کے تمام ذخیرہ معلومات کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ خود امام مالک نے بعض جگہ واقدی کے بارے میں تحفظ کا اظہار کیا ہے۔ ظاہر ہے امام مالک حدیث کے سب سے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔ انہوں نے

بھی انہی تحفظات کا اظہار کیا جن کا اظہار بقیہ محدثین کرتے تھے۔ لیکن کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ امام مالک کو سیرت کے کسی معاملے پر کسی رہنمائی کی ضرورت پڑی تو انہوں نے واقدی ہی سے پوچھا۔ ایک مرتبہ امام مالک پڑھا رہے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی جادوگر جادو کے ذریعے کسی کو قتل کردے تو اس کی سزا کیا ہونی چاہئے۔ یہ ایک خالص قانونی سوال ہے۔ اس پر غور کیا گیا تو یہ بحث بھی آئی کہ مشہور ہے کہ ایک یہودی عورت نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اس واقعہ میں کیا ہوا تھا؟ کیا حضور ﷺ نے اس عورت کو کوئی سزا دی تھی یا نہیں۔ امام مالک نے کہا کہ میں اہل علم سے مشورہ کرکے بتاؤں گا۔ امام مالک نے واقدی کو خط لکھا۔ واقدی نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ امام مالک نے بعد میں اپنے شاگردوں کو بتایا کہ 'سألت اهل العلم'، میں نے اہل علم سے پوچھا ہے۔ 'فاخبرونی انه قتلها'، اور انہوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو سزائے موت دی تھی۔ اس لئے اگر ایک جادوگر جادو کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو اس کی سزا سزائے موت ہوسکتی ہے۔ واقدی کے طرز روایت کے بارے میں یہی بات امام احمد نے بھی فرمائی۔ امام احمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو واقدی پر کیا اعتراض ہے۔ آپ نے فرمایا 'ما انکر علیه جمعه الاسانید ومجیئه بالمتن واحدا'، میں جس چیز کو ناپسند کرتا ہوں وہ تمام سندوں کو ایک جگہ جمع کرنا اور پھر ان کو ایک متن میں بیان کرنا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محدث ابراہیم الحربی نے کہا ہے کہ ایسا کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ اسلوب اپنایا ہے۔

ایک اور بات ایک بہت بڑے آدمی نے کہی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ابن سید الناس نے کہی ہے۔ ایک حد تک درست بھی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب ایک آدمی بہت زیادہ لکھتا ہے تو بعض باتیں عام ڈگر سے ہٹ کر بھی کہہ جاتا ہے۔ جب عام ڈگر سے ہٹ کر وہ کوئی بات کہتا ہے تو پھر اعتراض بھی ہوتا ہے اور اعتراض کرنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ سخت اعتراض کرتے ہیں اور کچھ نرمی بھی کرلیتے ہیں۔ چونکہ واقدی نے بہت لکھا۔ اس میں بعض ایسی تفصیلات بھی آگئیں جو عام ڈگر سے ہٹ کر تھیں۔ لوگوں نے اس کو عجیب سمجھا۔ عام لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ان کے مزاج سے ہٹ کر کوئی بات کی جائے تو وہ اس

کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں جس نے واقدی کو بھی قابلِ اعتراض سمجھا ہے۔

واقدی کی یہ کتاب 'کتاب المغازی' ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں 1855 میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی اشاعت میں بہت دلچسپی لی۔ یہ وہی ڈاکٹر اسپرنگر ہیں جو کلکتہ میں رہتے تھے اور مشہور محقق اور مستشرق تھے۔ جن کی علمی خدمات کا بہت سے لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے حافظ ابن حجر کی الاصابہ بھی مرتب کر کے شائع کروائی تھی۔

جرمن مستشرق ولہاوزن نے اس کا جرمن ترجمہ بھی کیا۔ یہ 1882 میں چھپا۔ جرمن ترجمہ ولہاوزن نے کس معیار کا کیا میں نہیں جانتا کیونکہ میں جرمن زبان سے بخوبی واقف نہیں ہوں۔ لیکن بعض مستشرقین نے اس ترجمہ کی بنیاد پر ایک دلچسپ بات لکھ دی۔ اس پر 1920-25 میں ہندوستان میں بڑی بحث اور گفتگو ہوئی۔ مارگولیتھ ایک مشہور مستشرق ہیں۔ انہوں نے سیرت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے لکھا، نقل کفر کفر نباشد، میں ان کی بات کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ بہادر نہیں تھے۔ میں نے اور قطعی واقعہ میں ان کو دوسرے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔ اس دعویٰ کی تائید میں انہوں نے کہا کہ غزوہ بدر میں حضور نے جونہی خون کا پہلا چھینٹا دیکھا تو آپ خوف سے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ جنگ ہو رہی ہے۔

اب یہ بات تو ہر کسی کے علم میں ہے کہ حضور نے ہر جنگ میں قیادت فرمائی۔ اسلام سے پہلے بھی ایک معرکہ میں شرکت فرمائی تھی۔ یہ بات جو مارگولیتھ نے کہی یہ کسی بھی سیرت نگار نے، حضور کے قریب رہنے والے لوگوں میں سے کسی نے بھی نہیں کہی۔ بلکہ ہر ایک نے یہی گواہی دی کہ حضور اشجع الناس تھے۔ بہادر ترین تھے۔ جنگ میں صحابہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی حفاظت کے لئے حضور کے پاس جا کھڑے ہوتے تھے۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور ﷺ تن تنہا دشمن کی خبر لینے چلے گئے۔ ایک زمانے تک مدینہ منورہ پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ تمام صحابہ کرام راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے باہر سے کسی شور کو آتے سنا۔ پہرے داروں نے یہ سمجھا کہ شاید حملہ ہو رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ رسول ﷺ کو اطلاع دی جائے۔ کسی نے کہا

کرتے ہی جائیے۔ پہلے جا کر دیکھ لیں کہ واقعہ کیا ہے۔ ابھی لوگ یہ طے کر رہے تھے کہ جدھر سے شور آرہا تھا دیکھا کہ اسی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آرہا ہے۔ قریب آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خود گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور فرما رہے تھے کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ آیا ہوں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس طرح کے واقعات کی روشنی میں یہ بات اس نے کیسے کہی کہ غزوہ بدر کے موقع پر آپ نعوذ باللہ خوف سے بے ہوش ہو گئے۔

اس بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مارگولیتھ کو خط لکھا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات میں نے ول ہاؤزن کے ترجمہ سے لی ہے۔ ول ہاؤزن کے ترجمے میں انہوں نے دیکھا تو واقعی اس نے یہی لکھا تھا۔ ول ہاؤزن نے دعویٰ کیا کہ واقدی نے بھی یہی لکھا ہے۔ واقدی نے وہی لکھا ہے جو عام سیرت نگار بیان کرتے ہیں۔ اس کا قرآن پاک میں بھی ذکر ہے کہ جس وقت غزوہ بدر شروع ہونے والا تھا تو اذ یغشیکم النعاس "تم پر ایک نیند کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا" اور اللہ تعالیٰ نے تم کو مدد کی بشارت دے دی۔ ہوا یہ تھا کہ صحابہ کرام کے مشورے سے رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک چھوٹی سی چٹان پر ایک چھپر بنا دیا گیا تھا۔ آپ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اس چھپر پر تشریف فرما تھے۔ فجر کی نماز کے بعد سے حضور دعا میں مصروف تھے۔ تمام رات فوجوں کی ترتیب میں مصروف رہے تھے۔ فوجوں کی صف بندی اور جنگ کی منصوبہ بندی میں ساری رات جاگ کر گزاری تھی۔ آپ کا حکم تھا کہ جب تک میں نہ کہوں آپ میں سے کوئی جنگ شروع نہ کرے۔ یہ کہہ کر حضور اپنے عریش پر تشریف لے گئے۔ یہ مسلم فوج کے پیچھے تھا۔ سامنے مسلمان فوج تھی۔ وہاں حضور مسلسل دعا میں مصروف رہے۔ ابھی سورج نکلنے ہی والا تھا کہ حضور کو ہلکی سی اونگھ آگئی۔ فغشیہ النوم۔ یہ واقدی کے الفاظ ہیں کہ آپ کو نیند نے آلیا۔ اسی اثنا میں جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نیند کا ایک جھونکا آیا، کفار قریش نے تیر اندازی شروع کر دی۔ اس سے بعض مسلمان زخمی ہوئے اور خون بہہ نکلا۔ جب حضور کو اطلاع ہوئی کہ کفار نے حملہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کا خون بہہ نکلا ہے تو حضور ایک دم سے گھبرا کر اٹھے۔ یہ عبارت ہے جس کا ترجمہ انہوں نے یہ لیا کہ غشی آگئی اور بے ہوش ہو گئے اور گھبرا کر اٹھے کو یاد کرا تھے، یوں گھبرا کر کا ذکر کر دیا۔ ممکن ہے ول ہاؤزن کا ماخذ کوئی ترجمہ ایسا ہو جو میں نہیں جانتا۔ لیکن واقدی کی اس سادہ سی عبارت کے اس ترجمہ سے یہ غلط فہمی پیدا

ہوئی اور ایک طویل عرصے تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ واقدی کی کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی بہت پہلے ترجمہ ہوا تھا جو کہ شائع شدہ موجود ہے۔

واقدی کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام محمد بن سعد کا ہے جن کی کتاب طبقات ابن سعد کی طرف میں پہلے مختصراً اشارہ کر چکا ہوں۔ محمد بن سعد اپنے استاد سے زیادہ معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ تحقیق کے معیار اور علمی تنقید کے اعتبار سے ان کو نسبتاً زیادہ اونچا مقام ملا۔ انہوں نے سیرت کے تذکرے اور سیرت کی روایت میں علمی تحقیق کا رجحان پیدا کیا۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے دلائل نبوت پر مواد جمع کیا۔ حضور کے معجزات اور نبوت کے دلائل پر وسیع معلومات جمع کئے۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے شمائل نبوی پر سب سے پہلے کتاب کا مجموعہ فراہم کیا۔

طبقات ابن سعد کو یورپ کے مستشرقین نے ایک ٹیم کے ساتھ ایڈٹ کیا تھا۔ اس ٹیم نے ۱۹۰۳ء میں اس کا کام شروع کیا اور کئی سال تک کے کام مسلسل صرف کر کے یہ پوری کتاب مکمل کیا۔ اس ٹیم میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔ جوزف ہورووٹز کا میں ذکر کر چکا ہوں وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھے۔ بروکلمان جو مشہور مورخ و تاریخ نویس ہے اور جس کی کتاب تین چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔ ان لوگوں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن آٹھ جلدوں میں مرتب کیا۔ طبقات ابن سعد سیرت کے بارے میں معلومات کے معتبر ترین اور وسیع ترین خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ ابن سعد نے بھی پچھلے لوگوں کی طرح تخلیق آدم سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔ حضور سے پہلے کی دنیا کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ اکثر اسرائیلیات سے لی گئی ہیں۔ اسرائیلیات کے بارے میں علماء کی رائے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسرائیلیات کا وہ حصہ جو قرآن پاک اور سنت کے بیانات کے مطابق ہے وہ قابل قبول ہے۔ جو قرآن وسنت کے بیانات کے مطابق نہیں وہ ناقابل قبول ہے۔ ظاہر ہے کہ ابن سعد اور واقدی نے ایسی کوئی چیز نہیں لی جو صراحتاً قرآن وسنت سے متعارض ہو۔ البتہ ایسی کوئی چیز جس کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی تفصیل موجود نہیں تھی، ایسی باتوں کے بارے میں اختلاف رہے گا کہ ان کو قبول کیا جائے کہ نہیں۔ کچھ لوگوں نے اس کو قبول کرنے اور بیان کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ کچھ لوگوں نے اس کو بیان کرنے میں حرج سمجھا۔ ابن سعد اول الذکر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور

انہوں نے واقدی کے مواد کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

ابن سعد نے ایک بات کی طرف بالواسطہ طور پر اشارہ کیا ہے۔ یہ اشارہ دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے علامہ اقبال کے حوالے سے کہی تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیا کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تمہید تھی۔ اس لئے نبوت خاتم الانبیاء کو یعنی ختم نبوت کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہیدی نبوتوں کا بھی بیان کیا جائے۔ تمہیدی نبوتوں کے بیان سے ختم نبوت کی عظمت اور حقیقت مکمل طور پر سامنے آسکتی ہے۔ اس لئے تمام انبیا کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے۔ یہی بات علامہ اقبال نے یوں کہی تھی کہ

All previouse prophets were Muhammad in the making.

ابن سعد کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے فرامین، احکام اور وثائق کا ایک بڑا مجموعہ اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ یہ مجموعہ دراصل ان کے استاد واقدی نے جمع کیا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ میں نے یہ فرامین اپنے استاد واقدی سے لئے ہیں۔ واضح رہے کہ واقدی نے جہاں جہاں سے ان فرامین اور دستاویزات کی نقل کی ہے تو انہوں نے اصل فرامین سے نقل کی ہے اور یہ کہ واقدی کا بیان ہے کہ انہوں نے اصل فرامین خود دیکھے تھے۔ تب انہوں نے ان کی نقلیں بنائیں۔

ابن سعد کے اساتذہ میں واقدی کے علاوہ مشہور فقیہ اور محدث سفیان بن عیینہ بھی شامل ہیں۔ وکیع بن الجراح جو امام بخاری کے اساتذہ اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں، وہ بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ فضل بن دکین مشہور محدث ہیں وہ بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ سفیان بن حرب بھی ابن سعد کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ان حضرات کے علاوہ ابن سعد نے موسیٰ بن عقبہ اور ہمارے سندھ کے سیرت نگار ابومعشر نجیح السندی کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا۔ ابن اسحاق کی سیرت بھی ان کے سامنے تھی۔ جہاں تک اسرائیلیات کے مواد کا تعلق ہے تو وہ اکثر و بیشتر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی سے ماخوذ ہے جن کا درجہ اسناد محدثین کی نظر میں زیادہ بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ محدثین کی بڑی تعداد نے

ابن سعد کو ثقہ اور حافظ قرار دیا ہے۔ بعض محدثین نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ خطیب بغدادی نے ان تمام محدثین کے اقوال الگ الگ جمع کر دیئے ہیں جو ابن سعد کی تائید کرتے ہیں یا ان پر تنقید کرتے ہیں۔ متاخر دور کے دو بڑے محدثین، خطیب بغدادی اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں ابن سعد کو ثقہ اور قابل اعتماد مانتے ہیں۔ امام سخاوی جو متاخر دور کے بڑے مورخین اور محدثین میں سے ہیں انہوں نے بھی ابن سعد کی ثقاہت کی تعریف و تصدیق کی ہے۔

ابن سعد سیرت نگار اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے۔ ایک مرتبہ مامون نے کسی اہم معاملہ میں مشورے کے لئے سات بڑے فقہا کو بلایا تھا۔ ان میں ابن سعد بھی شامل تھے۔ وہ فقیہ اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ قرات میں بھی درک رکھتے تھے۔ علم انساب کی بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انساب اس دور میں تاریخ کا اہم حصہ تھا۔ اس کو جانے بغیر تاریخ سے واقفیت مشکل ہوتی تھی۔

طبقات ابن سعد کی پہلی دو جلدیں سیرت کے بارے میں ہیں۔ بقیہ دو جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے حالات بیان کئے ہیں۔ صحابہ کے حالات بیان کرنے میں انہوں نے حضرت عمر فاروق کی ترتیب کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے جب دیوان مرتب کیا۔ سپاہیوں کی فہرستیں بنائیں۔ تو پہلے وہ صحابہ شامل کئے جو حضور کے خاندان کے تھے۔ پھر وہ جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے قریب کی رشتہ داری رکھتے تھے۔ پھر وہ جو ان کے بعد حضور سے قرب رکھتے تھے۔ حضور کی قرابت کی نسبت سے انہوں نے فہرست بنائی تھی۔ ابن سعد نے بھی یہی ترتیب رکھی ہے۔ سب سے پہلے خاندان بنی ہاشم کو رکھا ہے۔ بنی ہاشم میں السابقون الاولون کو پہلے رکھا ہے۔ پھر بدری صحابہ کو اور پھر بقیہ صحابہ کو رکھا ہے۔ ترتیب مکانی کا بھی لحاظ کیا ہے۔ ترتیب زمانی کے بعد ترتیب مکانی یعنی مختلف شہروں کے حساب سے بیان کیا ہے۔ جب صحابی کا ذکر پہلی مرتبہ آتا ہے تو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ جب کسی اور موقع کے حوالے سے تذکرہ آتا ہے تو بتا دیتے ہیں کہ میں پہلے فلاں جگہ بیان کر چکا ہوں۔

طبقات ابن سعد ہر دور میں مستند ماخذ سمجھی گئی۔ بعد میں بھی جن لوگوں نے صحابہ کرام کے تذکرے یا اسلامی تاریخ پر کتابیں لکھیں، ان سب نے ابن سعد سے استفادہ کیا۔ ابن سعد

سے استفادہ کرنے والوں میں بلاذری جیسے ثقہ اور قابل اعتماد مؤرخین بھی شامل ہیں۔ کل میں نے صحابہ کرام کے بارے میں تین بڑی کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں سے دو کتابیں ابن سعد سے استفادہ کرکے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک ابن اثیر ہیں جن کی اسد الغابہ مشہور ہے، اور دوسرے حافظ ابن حجر ہیں جن کی کتاب الاصابہ اس موضوع کی مستند ترین کتابوں میں سے ہے۔ ان کے علاوہ بھی بقیہ محدثین ومورخین، ابن کثیر، ذہبی اور ابن عساکر جن کی تاریخ دمشق کا کل ذکر آیا تھا، ان سب حضرات نے ابن سعد سے استفادہ کیا ہے۔

ابن سعد کے بعد سیرت نگاروں میں جو نام سب سے نمایاں ہے وہ ابن ہشام کا ہے۔ ابو محمد عبد الملک ابن ہشام یمن کے رہنے والے تھے۔ ایک واسطہ سے ابن اسحاق کے شاگرد تھے۔ عجیب بات ہے کہ بنیادی کام ابن اسحق نے کیا۔ سیرت پر ابن اسحق کا کام بہت بڑا ہے۔ لیکن ان کی کتاب کو اتنی شہرت حاصل نہ ہوئی جو ابن ہشام کی کتاب کو ہوئی۔ ابن ہشام نے اس کتاب کا نسخہ اپنے استاد زیاد بن عبد اللہ البکائی کے ذریعے حاصل کیا۔ اس پر کام کیا، محنت کی اور اس کا ایک نیا نسخہ تیار کیا۔ وہ نسخہ اتنا مقبول ہوا کہ لوگوں نے ابن اسحق کی اصل کتاب کو چھوڑ دیا اور ابن ہشام کی کتاب نے اصل کتاب کی جگہ لے لی۔ ابن ہشام نے ایک غیر معمولی کام کیا تھا کہ فن سیرت پر مستند ترین، جامع ترین اور قدیم ترین کتاب مرتب کی ہے۔ یہ اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے محدث بھی تھے، فقیہ بھی تھے، مورخ بھی تھے اور ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ادب اور شعر میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے جید ترین علماء سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنی جو قرآنی ادبیات اور لسانیات کے ماہر تھے، ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ انہوں نے قرآن کے مجاز پر، قرآن کے غرائب اور مشکل الفاظ پر کتابیں لکھی تھیں۔ ابو عبیدہ کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ امام بخاری نے ان کی کتاب کا بیشتر حصہ اپنی کتاب صحیح بخاری میں شامل کرلیا ہے۔ امام بخاری جہاں کسی حدیث میں موجود مشکل لفظ کے معنی بیان کرتے ہیں، یا کسی آیت کی لغوی یا لسانی تشریح کرتے ہیں یا کوئی اور ایسی بات بیان کرتے ہیں جس کا تعلق لغت اور ادب سے ہو تو ابو عبیدہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ افسوس کہ بعض مستشرقین نے چند معمولی اور غیر اہم باتوں کو بنیاد بنا کر ابو عبیدہ کے کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور سیرت نگار جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم جو حضور کی طرف سے یمن بھیجے گئے گورنر کے پوتے تھے۔ وہ بھی ابن ہشام کے اساتذہ میں سے تھے۔ ابن ہشام کے اپنے والد اور دادا بھی صاحب علم تھے جو تبع تابعین کا دور پا چکے تھے تبع تابعین کا دور ان کے باپ دادا سے شروع ہوگا۔

ابن ہشام نے سیرت ابن اسحاق کا تفصیل سے جائزہ لیا اور اس کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ سیرت ابن اسحاق کے بارے میں پہلے عرض کیا تھا کہ اس کے تین حصے تھے۔ ایک کا عنوان تھا کتاب المبتدا، جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور کی ولادت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ تھا المبعث۔ اس میں حضور کی پیدائش سے لے کر ہجرت تک کے واقعات ہیں۔ تیسرا حصہ المغازی کا تھا جس میں ہجرت سے لے کر وفات تک کے تمام غزوات کی تفصیلات و واقعات ہیں۔ اس کتاب میں ابن اسحاق نے مختلف ذرائع سے ملنے والی تمام معلومات جمع کر دیں۔ چنانچہ یہ کتاب بہت ضخیم تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنی ضخیم تھی کیونکہ اس وقت اس کے ایک نسخہ کا جزوی حصہ ملا ہے۔ وہ شائع ہوا ہے لیکن اصل کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ شروع کے کئی سو سال تک دنیا کے مختلف علاقوں میں متداول رہی۔ بہت سے اہل علم کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کے حوالے دیئے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ سقوط بغداد کے موقع پر جب بہت سے کتب خانوں کو ضائع کر کے دریا برد کر دیا گیا اور اس میں لاکھوں کتابیں ضائع ہوئیں۔ ابن اسحاق کی کتاب بھی شاید اسی افراتفری میں ضائع ہوئی۔ ابن ہشام نے اس کتاب کا جائزہ لیا اور اس کا ایک نیا نسخہ تیار کیا۔ پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ المبتدا کے نام سے جو پہلی جلد تھی وہ قریب قریب پوری کی پوری نکال دی۔ ابن ہشام نے خود مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے بہت سی ایسی چیزیں بیان کر دی تھیں جن کا حضور کی سیرت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سابقہ انبیاء بنی اسرائیل کے واقعات، حضرت موسیٰ کے بعد کون کون سے نبی آئے، ان کی زندگی کیسی تھی۔ یہ ساری معلومات انہوں نے یہودی عیسائی ماخذ سے لے کر بیان کی تھیں۔ ان معلومات کو براہ راست حضور کی سیرت لکھنے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر یہ سب اسرائیلیات تھیں جن کا بڑا حصہ کلبی کی روایات کی بنیاد پر لیا گیا تھا۔ کلبی کے بیانات اور اسرائیلیات دونوں کے مستند یا غیر مستند ہونے کے بارے میں بہت سے سوالات ہمیشہ موجود رہے

ہیں۔ اس لئے ابن ہشام کی رائے میں اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے ان تمام حصوں کو اختصار کے ساتھ خلاصہ سے بدل دیا جس سے اجمالاً یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ پیغمبر کون کون تھے اور باقی حصہ حذف کر دیا۔ پھر حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اور حضور کے جد امجد معد بن عدنان تک چند صفحات میں تلخیص کر دی ہے اور یوں پوری جلد کو آٹھ دس صفحات میں تلخیص کر کے باقی مباحث کو نکال دیا۔

ابن ہشام نے دوسرا کام یہ کیا کہ ابن اسحٰق کے کام کے ادبی حصہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔ ابن اسحاق نے جو معلومات جمع کی تھیں تو ان میں بہت سے اشعار اور قصائد بھی بیان کئے تھے۔ یہ قصائد وہ تھے جو مختلف جنگوں اور معرکوں کے موقع پر مختلف شعراء نے لکھے تھے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک شاعر ہوتا تھا۔ وہ شاعر اپنے قبیلے کے کارناموں کو بلند اور دوسرے قبائل کی کمزوریوں کو قصائد کی صورت میں بیان کیا کرتا تھا۔ یہ سارا ذخیرہ سیرت سے متعلق تو نہیں تھا لیکن سیرت کے دوران وجود میں آیا تھا جس کو ابن اسحٰق نے اپنی سیرت میں شامل کر لیا تھا۔ ابن اسحاق خود ادیب یا شاعر نہیں تھے اس لئے ان کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ کون سے اشعار حقیقی ہیں اور کون سے منسوب یا الحاقی ہیں۔ بہت سے اشعار بعد میں بھی غلط طور پر مختلف شاعروں سے منسوب ہو گئے۔ بعض اوقات کسی قصیدہ میں بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے اشعار لگا دئیے اور ہر ایک نے تک بندی کی۔ اصل شاعر نے شاید پانچ شعروں کی نظم کہی ہوگی۔ ہوتے ہوتے وہ بیس تیس شعر ہو گئے۔ اب اساتذہ اور ماہرین فن کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنا حصہ اصلی اور کتنا حصہ الحاقی ہے۔ یہ اندازہ ابن اسحٰق کو نہیں ہوا۔ انہوں نے جو سنا وہ اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ ابن ہشام خود بڑے ادیب اور نحوی تھے۔ ابو عبیدہ جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا۔ خلف الاحمر جیسے ماہر شعریات کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ انہوں نے غیر مستند اور غیر ضروری اشعار کو نکال دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ابن ہشام نے ایک اور کام یہ کیا کہ ایسے اشعار اور قصائد جن سے بعد میں قبائل کو کوئی بدمزگی پیدا ہو سکتی تھی ان کو بھی نکال دیا۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر میں قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل بھی لڑنے کے لئے آئے تھے۔ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے اور صحابہ کرام میں بڑا نمایاں مقام حاصل کیا۔ بہت سی فتوحات میں شریک رہے۔ حضرت عکرمہؓ

جب اطلاع ملی کہ عکرمہ اسلام قبول کرنے آرہے ہیں تو آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ عکرمہ کی موجودگی میں کوئی شخص ان کے باپ کو برا نہ کہے۔ یہ بات حضور علیہ السلام اسی شخص کے بارے میں فرما رہے تھے جس کو حضور نے اپنی امت کا فرعون قرار دیا تھا۔ اب ابن ہشام نے کہا کہ اگر کسی نے شاعری میں عکرمہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے تو بعد میں ان جذبات کو دہرانے اور بیان کرنے سے بدمزگی پیدا ہوگی۔ صحابہ کرام کی اولاد میں سے جو بدر میں تھے ان کی اولاد ہے وہ عکرمہ پر تنقید کرے گی۔ کسی کے آباء و اجداد ہوں تو مزید بدمزگی پیدا ہوگی اس لئے میں نے وہ حصہ حذف کر دیا۔ یہ اچھی بات تھی۔ ممکن ہے کسی کو اس سے اختلاف ہو لیکن ابن ہشام کا جذبہ بہت اچھا تھا۔

بعض اشعار لغویات سے پُر ہوتے اور غیر معیاری تھے وہ بھی حذف کر دیئے گئے۔ غیر معیاری اشعار سے مراد کسی پر اخلاقی لحاظ سے ایسا حملہ کرنا تھا جو بیان کرنا مناسب نہ ہو۔ ایسے اشعار بھی حذف کر دیئے گئے۔ اسی طرح سے ابن اسحاق نے جزوی طور پر جگہ جگہ بعض اسلامی معلومات بیان کر دی تھیں جن کے بارے میں ابن ہشام کا خیال تھا کہ وہ براہ راست سیرت سے متعلق نہیں تھیں۔ اس لئے جب پڑھنے والا پڑھتا تھا تو سیرت کے واقعات کا تسلسل نہیں رہتا تھا۔ تو وہ واقعات بھی انہوں نے نکال دیئے ہیں۔ پھر ابن ہشام نے اس کے ساتھ ساتھ بعض جگہ حواشی اور چھوٹے چھوٹے نوٹس کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ نوٹس بڑے اضافے صفحات کے ہوتے ہیں، بعض چند سطروں کے ہوتے ہیں۔ لیکن قاری کو ابن ہشام سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے اپنے نوٹس ہیں۔ جہاں کوئی مشکل لفظ آیا ہے اس کی تشریح کر دی ہے۔ کوئی شعر یا قصیدہ ہے تو اس کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ اس کا شعری مقام اور مرتبہ کیا ہے۔ جہاں کچھ اشعار غلط طور پر منسوب ہو گئے ہیں تو بتا دیا ہے کہ یہ اشعار فلاں کے نہیں بلکہ فلاں کے ہیں۔ کوئی بات عام طور پر مشہور ہے لیکن تحقیق نہیں ہے تو ابن ہشام نے تحقیق کی ہے کہ یہ بات اس طرح ہے۔ غرض یہ سارا کام ابن ہشام نے کیا اور ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مختصر بھی ہے، مستند بھی ہے اور ضروری معلومات کے اعتبار سے مکمل بھی ہے۔

ابن ہشام کا یہ کام اتنا مفید اور اچھا تھا کہ عام لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ بعض

مقبولیت اصل کتاب کو حاصل ہوئی تھی اس سے کہیں بڑھ کر مقبولیت اس کے اس تلخیص اور مہذب ایڈیشن کو حاصل ہوئی۔ یہ اردو والا مہذب نہیں، بلکہ عربی والا مہذب ہے، یعنی edited، refined version۔ ابن ہشام کی اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ کئی لوگوں نے اس کے خلاصے لکھے۔ ایک خلاصہ ابھی کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے مصر کے مشہور عالم عبدالسلام ہارون نے تیار کیا تھا جو بہت مقبول ہوا اور بار بار چھپا ہے۔ کئی لوگوں نے اس پوری کتاب کو نظم بھی کیا۔

سیرت ابن ہشام کے درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر عرب ملک میں دو چار ایڈیشن ابن ہشام کے نکلے ہوں گے۔ اردو، انگریزی اور جرمن زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں۔ آج سیرت جو کچھ ہے اس کا بہت بڑا حصہ ابن ہشام کی اس کتاب کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ کتاب تو یہ دراصل ابن اسحاق کی ہے لیکن ابن ہشام نے اس پر کام کیا ہے۔

سیرت کی ایک اور کتاب جو اس قابل ہے کہ اس کا تذکرہ کیا جائے، ویسے تو سیرت کی ہر کتاب اس قابل ہے کہ اس کا تذکرہ ہو۔ لیکن بعض خاص اوصاف کی وجہ سے یہ وہ کتاب ہے جس کا اہتمام کے ساتھ تذکرہ ضروری ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف شاید یہ سوال میں نے اشارہ کیا تھا۔ یہ کتاب ایک ایسی شخصیت نے لکھی جو اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد شخصیت ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اہل سنت کے چار فقہی مسالک حنفی، شافعی، حنبلی اور شافعی مشہور ہیں۔ ایک فقہ جعفری اور زیدی ہے۔ ایک فقہ اباضی ہے جو خوارج کی ایک شاخ ہے۔ ایک اور فقہ بھی ہے جو اس وقت دنیا میں عملاً موجود نہیں ہے۔ لیکن اکا دکا لوگ اس کی پیروی کرنے والے موجود ہیں۔ یہ فقہ ظاہری کہلاتی ہے۔ فقہ ظاہری دراصل تیسری صدی ہجری کے ایک فقیہ داؤد بن سلیمان ظاہری سے منسوب ہے۔ ان کی فقہ کی بنیاد دو اصولوں پر ہے۔ ایک تو وہ قرآن پاک اور سنت کے ظاہری الفاظ کو لیتے ہیں اور ان کے کسی مجازی معنی کو قبول نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک اور حدیث میں جو لفظ آیا ہے اس کا ڈکشنری میں جو بھی مفہوم ہے وہ صحیح ہے اور اس ظاہری مفہوم کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں لیا جائے گا۔ دوسرے وہ کسی قسم کے قیاس analogical reasoning کو قبول نہیں کرتے۔ جو لفظ

میں جو کیا گیا ہے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

ابن حزم نے سیرت سے متعلق دو بہت بڑے کام کئے۔ ایک تو انساب پر ایک کتاب لکھی جو آج مطبوعہ موجود ہے۔ چونکہ وہ خود مزاجاً بہت سخت تھے اور معاملات کا بہت تنقیدی نظر اور باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے اس لئے انہوں نے انساب میں رسول اللہ کا نسب مبارک، آپ کے آباؤ اجداد، ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کے بارے میں سارا مواد سامنے رکھ کر اس کا بھی خوب دقت نظر سے جائزہ لیا۔ اس جائزہ کے نتیجہ میں انہوں نے ایسا بہت سا مواد مسترد کر دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ جس کو انہوں نے قابل اعتبار سمجھا وہ مواد ایک کتاب کی شکل میں مطبوعہ موجود ہے۔ علم حدیث میں یہ علامہ ابن عبدالبر (محدث اعظم اہل المغرب) کے شاگرد تھے۔

ان ابن حزم نے جوامع السیرۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور سیرت پر جتنی کتابیں ان کے زمانے میں دستیاب اور متداول تھیں ان کو جمع کر کے ان کی ایک ایسی تلخیص تیار کی جس سے سیرت کا ایک جامع، پاکیزہ، صاف ستھرا اور منقح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ کتاب مختصر ہے۔ ایک جلد میں ہے۔ یہ کتاب دنیائے مغرب میں سیرت پر لکھی جانے والی دو تین اہم کتابوں میں شامل ہے۔ دو کتابوں کا میں نے ذکر کیا تھا۔ تیسری کتاب یہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے اور خاص طور پر ہمارے شمالی افریقہ میں یہ کتاب بہت مقبول رہی اور مصر سمیت کئی ممالک میں چھپتی رہی ہے۔

سیرت پر ایک اور کتاب جو بڑی قابل ذکر ہے وہ ابن ہشام کی سیرت کی شرح ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ابن ہشام نے جو کتاب مرتب کی تھی اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ تقریباً ایک درجن تلخیصوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ تہذیبیں ہوئیں، تلخیصیں لکھی گئیں۔ ان شرحوں میں جو شرح بہت مقبول اور متداول ہے وہ الروض الانف کے نام سے پانچ جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے۔ کئی بار چھپ چکی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر کام کیا ہے۔ علمی اور تحقیقی انداز میں ایڈٹ بھی ہوئی ہے۔ تازہ ترین edited version پانچ جلدوں میں ہے اور بہ آسانی دستیاب ہے۔ یہ علامہ ابوالقاسم عبدالرحمن السہیلی (متوفی ۵۸۱ھ) کی لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس پر سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ جو قصائد تھے ان کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی۔

جہاں جہاں مشکل الفاظ آئے ان کو بیان کیا۔ جہاں جہاں وہ کسی خاص نکتہ پر توجہ دینا چاہتے ہیں اس نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ ابن ہشام کے بیان کو مزید واضح کرنے اور مزید مدلل ہونے کی ضرورت ہے وہاں حسب ضرورت اس کا اضافہ کر دیا۔ جہاں کوئی بات ابن ہشام کے ہاں نامکمل نظر آئی اس کی تکمیل کر دی۔ خاص طور پر ایک چیز جس کا انہوں نے اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اگر کسی واقعہ سے کوئی اہم نکتہ نکلتا ہے یا کوئی درس ان کے سامنے آتا ہے یا کوئی سبق ملتا ہے تو اس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم آج کل کی اصطلاح میں فقہ السیرۃ کہہ سکتے ہیں۔ فقہ سیرۃ پر ان شاء اللہ آگے بحث ہوگی۔ اس موضوع پر سب سے پہلے جو قیمتی اور عالمانہ اشارے ملتے ہیں وہ سہیلی کے ہاں الروض الانف میں ملتے ہیں۔ سہیلی خود ایک بہت بڑے ادیب اور نحوی تھے۔ اس لئے انہوں نے نحوی قواعد وضوابط پر بھی بات کی ہے۔ جس قصیدے کے کسی شعر سے کوئی نحوی اصول نکلتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ علامہ سہیلی بھی اندلس کے رہنے والے تھے۔ بحر متوسط کے ساحل پر ایک شہر مالقہ کے رہنے والے تھے۔ تقویٰ، زہد اور استغناء میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اپنے لڑکپن میں نابینا ہو گئے تھے۔ بعد میں جتنی کتابیں لکھیں وہ سب انہوں نے املا کرا کر لکھوائیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی مفید ہے کہ اس سے ابن ہشام کے لکھے ہوئے کام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ابن ہشام نے جہاں جہاں کوئی ایسی چیز بیان کی تھی جس کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، یا کسی چیز کی شرح درکار تھی تو وہ علامہ سہیلی نے بیان کر دی ہے اور ابن ہشام کی کتاب کو سمجھنا بہت آسان بنا دیا ہے۔

علامہ سہیلی محدث بھی تھے، فقیہ، لغوی، نحوی، ماہر انساب اور مفسر اور مورخ بھی تھے۔ ان کی شرح میں ان سب حیثیتوں کی جھلک صاف محسوس ہوتی ہے۔ ان علمی خوبیوں کی وجہ سے ابن ہشام کی وہ شرح جو علامہ سہیلی نے الروض الانف کے نام سے لکھی وہ بہت جلد مقبول ہوگئی اور دنیائے اسلام کے ہر علاقے میں مقبول و متداول رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس کی بھی شرحیں لکھیں اور اس پر حواشی لکھے۔ بعض لوگوں نے اس کی تلخیص کی۔ بعد میں آنے والے تقریباً ہر سیرت نگار نے اس سے استفادہ کیا۔ علامہ ابن قیم کی تحریروں اور تصنیفات میں جابجا اس کے تذکرے اور حوالے ملتے ہیں۔

ایک اور کتاب جو قابل ذکر ہے وہ بھی اتفاق سے ایک اندلسی عالم ہی کی ہے، الاکتفاء ہے۔ مصنف ہیں: علامہ ابوالربیع سلیمان الاندلسی (متوفی ۶۳۴ ھ)۔ ان کی کتاب الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء، یعنی حضور اور آپؐ کے پہلے تین خلفاء، سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا عثمان غنیؓ کے دور میں جتنے مغازی ہوئے، ان پر انہوں نے لکھا ہے۔ یہ خود اندلس میں عیسائی حملہ آوروں کے خلاف جہاد میں شریک رہے۔ جہاد میں خود بھی حصہ لیا۔ محدث بھی تھے کیونکہ علم حدیث پر کئی کتب کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے کئی بنیادی ماخذ کو سامنے رکھ کر مرتب کی۔ جو قدیم ترین کتابیں تھیں، جن میں ابن اسحٰق کی مغازی بھی تھی اور موسیٰ بن عقبہ کی کتاب بھی تھی۔ وہ سب کتابیں ان کے سامنے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے واقدی کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان ساری کتابوں کو سامنے رکھ کر الاکتفاء کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی۔ اس کتاب کا بنیادی وصف معلومات کی جامعیت اور ان کا تنوع ہونا ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کئی ایسی کتابیں جو آج موجود نہیں ہے۔ مثلاً موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق کی اصل کتابیں جن ان کا بیشتر حصہ آج موجود نہیں ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے طویل اقتباسات ان کی کتاب میں مل جاتے ہیں۔ جن کتابوں کی مدد سے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا استخراج کیا گیا ان میں یہ کتاب الاکتفاء بھی شامل ہے۔

کتاب کا آغاز معد بن عدنان کے زمانے سے ہوتا ہے اور ولادت نبوی تک تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں ان حقائق کو بیان کیا ہے۔ حضور کے اجداد اور خاندان کے بارے میں تفصیل دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے واقعات سیرت کے عام انداز کی طرح بیان کئے ہیں۔ دوسری جلد مغازی اور فتوحات کے لئے خاص طور پر مخصوص ہے۔ یہ مواد انہوں نے زیادہ تر زبیر بن بکار کی نسب قریش سے لیا ہے جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔ ایک چیز جو اس کو سیرت کی بقیہ کتابوں ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کون کون سے مذہبی عقائد مروج تھے۔ عربوں میں مذہبی اختلاف کیا تھا۔ کن کن بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ کس قبیلے میں کیا رسوم تھیں۔ ان کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔

کتاب الاکتفاء کے بعد جس کتاب کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ وہ نہ صرف ادبیات

اللہ ﷺ الی المدینہ تو آپ نے دیکھا کہ یہودی روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ یہودیوں نے کیوں روزہ رکھا ہے۔ جواب دیا گیا کہ آج کے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ظلم اور اس کی سختی سے نجات دلائی تھی تو شکرانے کے طور پر ہم آج کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کی نجات اور کامیابی کی یاد میں روزہ رکھنے کا زیادہ حق تو ہمیں حاصل ہے۔ آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ تم بھی روزہ رکھا کرو۔ یہ ایک روایت ہے۔ اس وقت سے مسلمان عاشورہ کا روزہ رکھتے چلے آرہے ہیں۔ عاشورہ کا روزہ پہلے فرض تھا۔ جب رمضان کے روزے آئے تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ اب یہ روزہ مستحب یا سنت ہے۔ یہاں تک تو حدیث میں موجود ہے۔ لیکن شروع سے یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ مسلمان یوم عاشورہ کا جو روزہ رکھتے ہیں اس کی اصل تاریخ کیا ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ ۱۰ محرم کو عاشورہ ہے اور دس محرم کو روزہ رکھنا چاہئے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ محرم وصفر عربی مہینے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں یہ کیلنڈر رائج نہیں تھا۔ ان کا اپنا کیلنڈر تھا۔ یہودی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عاشورہ ان کے کیلنڈر کے پہلے مہینے تشری کی دس تاریخ ہے۔ اسی دن موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو کیا یہودی سال کے پہلے مہینے تشری کی دس تاریخ تھی؟ یہ بات تو واضح ہے کہ اس دن دس محرم نہیں تھا۔ یہودیوں کے حساب سے کوئی اور تاریخ تھی۔ رسول اللہ ﷺ تو ربیع الاول میں تشریف لائے تھے۔ اب یہ بحث بہت عرصہ سے رہی ہے کہ عاشورہ کے روزہ سے کیا مراد ہے۔ کیا یہودیوں کا دس تشری کا روزہ مراد ہے یا دس محرم مراد ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے دس محرم مراد ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں دس محرم مراد نہیں ہے۔ دونوں طرف کے حضرات کے پاس دلائل ہیں۔ ابن قیم نے اس بحث کو زادالمعاد میں شامل کیا ہے اور اپنی رائے بیان کی ہے۔ اسی طرح اور طرح طرح کے واقعات جو اصلاً سیرت کے واقعات ہیں لیکن ان سے کسی فقہی معاملہ کو سمجھنے اور طے کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے ابن قیم نے ان سے بحث کی ہے۔

زادالمعاد کی تیسری جلد ساری کی ساری جہاد اور مغازی کی تفصیلات اور دروس وعبر پر مشتمل ہے۔ بڑی ضخیم جلد ہے اور پوری جلد میں جہاد اور مغازی ہی پر بحث کی ہے۔ یوں تو

نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضور خاتم النبیین ﷺ مانتے ہیں، ان کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔
یہ کتاب میں نے ان کے اطمینان اور شرح صدر کے لئے لکھی ہے۔ کوئی منکر یا دشمن اس کتاب
کو نہ دیکھے اور اگر دیکھے تو اعتراض نہ کرے۔ اس طرح انہوں نے پہلے ہی قدم پر معاملہ صاف
کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ تین کتابیں اور بھی ہیں جو تفصیلی گفتگو اور تعارف کی مستحق ہیں لیکن تفصیل
کا وقت نہیں رہا۔ اس لئے ذرا اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ ان کتابوں میں سے ایک شیخ علی
بن برہان الدین حلبی کی جامع کتاب ہے جو سیرت حلبیہ کے نام سے معروف ہے۔ کتاب کا
اصل نام انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون۔ انسان سے مراد ہے آنکھ کے اندر
کی پتلی۔ آدمی کو بھی انسان کہتے ہیں لیکن عربی میں آنکھ کی پتلی کو بھی انسان کہتے ہیں۔ انسان
العیون یعنی آنکھوں کی پتلی، جیسے آنکھوں کی پتلی بہت محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح سے رسول اللہ
ﷺ کا ذکر مبارک لوگوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ یہ مفہوم وہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب
سات ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ کراچی میں بھی چھپا ہے۔
ہندوستان میں بھی چھپا ہے۔ چونکہ مصنف حلب کے رہنے والے تھے اس لئے کتاب سیرت
حلبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس دور کی کتاب ہے جس کو میں نے استیعاب کا زمانہ
کہا تھا۔ یعنی معلومات کو جمع کرنے اور یکجا کرنے کا زمانہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب معلومات
کا خزینہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ایک تبصرہ ہے جو بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔ کل
میں نے عرض کیا تھا کہ زیادہ معلومات جمع کی جائیں گی تو ان میں کمزور باتیں بھی آجائیں گی۔
کمزور باتیں آجائیں گی تو ان پر اعتراض ہوگا۔ اس کتاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ
اس میں بعض باتیں بہت کمزور ہیں۔ خاص طور پر معجزات وغیرہ کے بارے
میں غیر مستند روایات کا خاصا ذخیرہ اس میں آگیا ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ جس زمانے
میں یہ حضرات یہ کتابیں تحریر فرما رہے تھے وہ عقلیات کا زمانہ نہیں تھا۔ لوگ دین پر اعتراض
نہیں کرتے تھے۔ اپنی عقل کو دین کے معاملہ میں فیصل کن نہیں سمجھتے تھے۔ جب ایک بار معجزہ کو
مان لیا تو پھر جس نے جو روایت بیان کی اس کو بلا تامل تسلیم کر لیا۔ زیادہ تحقیق کی ضرورت اس
لئے محسوس نہیں کی کہ وہاں انکار اور شبہ کا ماحول نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ ہے۔ اعتراض کا یہ رجحان

ہے۔ یہاں دمشق کے لئے شام کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو شامی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی کتاب کو سیرت شامیہ کہا جاتا ہے۔ کتاب کا اصل نام سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد ہے۔ یہ بھی بہت مستند اور جامع کتاب ہے۔ بارہ جلدوں میں ہے۔ کئی بار چھپی ہے۔ انہوں نے کئی سو کتابیں سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

ایک آخری کتاب جس کا تذکرہ کر کے میں آج کی گفتگو ختم کر دیتا ہوں علامہ مقریزی کی جامع کتاب امتاع الاسماع ہے۔ یہ بڑے مشہور مصنف، مورخ، ادیب اور ماہر معاشیات تھے۔ پورا نام تقی الدین مقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) ہے۔ ان کی بہت ساری کتابیں ہیں۔ ان میں سے ایک 'امتاع الاسماع' ہے۔ یہ پندرہ جلدوں میں ہے۔ اس کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی زندگی، آپ کا خاندان اور اولاد، آپ کے معجزات اور آپ کے عادات و خصائل کا تذکرہ ہے۔ یہ اس وقت تک لکھی جانے والی تمام کتابوں کا خلاصہ تھا۔ مقریزی انتہائی عالم فاضل انسان تھے۔ انہوں نے پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔ تاریخ، ادب اور معاشیات میں بھی درک رکھتے تھے۔ مقریزی نے ہی وہ اصول دریافت کیا تھا جو مغربی لکھنے والے گریشم سے منسوب کرتے ہیں۔ گریشم لا، معاشیات کا ایک قانون ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جعلی سکہ کھرے سکہ کو شکست دے دیتا ہے۔ یہ قانون گریشم کا نہیں ہے۔ مقریزی کا ہے اور مقریزی نے ہی نے اس کو پہلی مرتبہ باقاعدہ تحریری طور پر بیان کیا ہے۔ سیرت پر ان کی اصل کتاب چودہ جلدوں میں ہے۔ پندرہویں جلد فہارس پر مشتمل ہے۔ مقریزی بھی مصر کے رہنے والے تھے۔

افسوس کہ وقت ختم ہو گیا۔ مغرب کی جماعت تیار ہے۔ ارادہ تھا کہ علامہ قسطلانی کی المواہب اللدنیہ اور اس کی شرح جو علامہ زرقانی نے لکھی ہے، ان دونوں کا تذکرہ بھی ہو۔ دونوں بہت جامع کتابیں ہیں۔ علامہ شبلی نے شرح المواہب اللدنیہ کے بارہ میں لکھا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ زرقانی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی۔ علامہ شبلی کا یہ تبصرہ بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب کمزور اور غیر مستند بیانات سے خالی نہیں۔ یہ کمزور روایات علامہ قسطلانی کی اصل کتاب میں تو بہت کم ہیں، لیکن اس کی شرح میں بہت ہیں۔ علامہ قسطلانی کا پورا نام شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) ہے۔ یہ

اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔

علامہ زرقانی بھی اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے۔ ان کی شرح مؤطا امام مالک مشہور ہے۔ پورا نام محمد بن عبدالباقی زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) ہے

اور پہلے تینوں خلفاء کی زندگیوں سے بھی اس باب میں بہت رہنمائی ملتی ہے۔ لیکن یہ بات کہ مسلمانوں میں اگر کوئی باغی ہو تو ان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہئے، یہ سنت ابھی تک دستیاب نہیں تھی۔ اس معاملہ میں اب تک کوئی عملی رہنمائی موجود نہیں تھی۔ سیدنا علی بن ابی طالب کی زندگی میں یہ سنت ملتی ہے کہ باغی لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔ مسلمان باغیوں سے کیسے عہدہ برآ ہونا چاہئے۔ چونکہ کتاب الاکتفا مغازی پر ہے۔ مغازی غیر مسلموں کے ساتھ جنگوں سے متعلق موضوع ہے۔ اس لئے انہوں نے پہلے تین خلفا کے دور کا ذکر کیا ہے اور سیدنا علی بن ابی طالب کے دور کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

☆

آپ نے سیرت ابن ہشام کے اردو تراجم کا ذکر فرمایا ہے۔
ان میں مستند کونسا ہے؟

میرے لئے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کتابوں کے اردو ترجموں کا الگ الگ اصل سے مقابلہ کر کے موازنہ نہیں کیا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ کسی ایسے شخص سے معلوم کریں جو اردو ادب کا آدمی ہو۔ اور جس نے ان ترجموں کا موازنہ کیا ہو۔ میں نے نہیں کیا۔

☆

ہندوستان میں اردو زبان میں سیرت پر جو کام ہوا ہے اس
کا تذکرہ خطبے میں نہیں آیا۔

آپ نے شاید عنوانات کی فہرست نہیں دیکھی۔ عنوانات میں ایک مستقل عنوان ہے برصغیر میں علم سیرت۔ اس عنوان کے تحت برصغیر میں ہونے والے کام کا تذکرہ آئے گا۔

☆

زاد المعاد میں جہاد سے متعلق احکام موجود ہیں۔

زاد المعاد کی تیسری جلد پوری جہاد پر ہے۔ اس کے شروع میں انہوں نے جہاد پر مختصر علمی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جہاد کی چار قسمیں یا چار درجات ہیں۔ ایک جہاد بالنفس، دوسرا جہاد بالکفار، تیسرا جہاد بالمنافقین اور چوتھا جہاد بالشیطان ہے۔ یہ جلد چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ چھ سو صفحات کو یہاں دہرانا ممکن نہیں۔

☆

ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کا اردو ترجمہ کس نام سے ہے؟

اس وقت مجھے نام یاد نہیں۔ لیکن اردو ترجمہ موجود ہے۔

☆

ابو محمد علی بن حزم نے دو کام کئے۔ ایک سیرت سے براہ راست متعلق ہے۔ دوسرا کام کون سا ہے؟

ایک کتاب تو انساب پر ہے اور دوسری جوامع السیرۃ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ یہ سیرت کی کتابوں کی تلخیص ہے۔ انساب پر ان کی کتاب سے بھی سیرت کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں۔

☆

ابن قیم کی کتاب کی خصوصیت ذرا دوبارہ بتا دیں۔

ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہ بیک وقت حدیث، فقہ، سیرت، روحانیت اور تصوف سمیت ہر فن کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سیرت کے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے روزمرہ زندگی کے لئے ملنے والی رہنمائی کا بہت واضح تذکرہ اور مفصل بیان سامنے آجاتا ہے۔ سیرت مبارکہ کے نتیجہ میں پاکیزہ اخلاق کیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں یہ بیان کیا ہے۔ سیرت کے واقعات سے جو سبق ملتے ہیں وہ بھی بیان کئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد پوری کی پوری مغازی کے بارے میں ہے جس میں انہوں نے

اور وہ قوی ظاہری نقطۂ نظر سے فقہی احکام کی تشریح کیا کرتے تھے۔

☆

Can you please repeat the name of the author of the book which focus on the Prophet Muhammad as a politician and diplomat.

رسول اللہ ﷺ کو سیاستدان کہنا میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔ سیاستدان کا ایک خاص مفہوم ہے۔ رسول اللہ نبی اور رسول تھے اور نبی آخر الزمان تھے۔ آپ نے زندگی کے ہر شعبے کے لئے ہدایات اور رہنمائی چھوڑی۔ سیاستدانوں اور سفارتکاروں کے لئے بھی رہنمائی چھوڑی۔ تاجروں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی رہنمائی عطا فرمائی۔ ان میں سے ہر پہلو پر الگ سے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک کتاب جو بڑی جامع کتاب ہے۔ اس کا تذکرہ پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ایک صاحب افضال الرحمن کے نام سے ہیں۔ انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے دس بارہ جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا آف سیرت کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک پوری اور بڑی ضخیم جلد رسول اللہ کی سیرت کے سیاسی اور سفارتی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔

مہربانی فرما کر میلاد پڑھنے کی فضیلت اور اہمیت کے بارے میں بیان فرمائیں۔ عوامی سطح پر اس کو کس طرح رائج کیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ لینا ہو تو آپ کسی مفتی سے پوچھئے۔ یہ فتویٰ کا معاملہ ہے آپ کسی مفتی سے معلوم کیجئے۔

☆

مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

☆

ان شخصیات کا کیا جائے جو کسی دوسرے پر جادو کرواتے ہیں۔

یہ بھی آپ کسی شخص سے پوچھیں۔

☆

اگر کوئی کسی کے جادو کا توڑ کرنا چاہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟

چونکہ میں نے جادو نہیں سیکھا اس لئے میں اس کا توڑ بھی نہیں جانتا۔

☆

زاد المعاد کے بارے میں سید ابو الحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب کتب خانے میں بیٹھ کر نہیں بلکہ حالت سفر میں لکھی گئی ہے۔

میں نے بھی یہی سنا ہے کہ یہ کتاب حالت سفر میں لکھی گئی تھی۔ وہ غالباً حج کرنے جا رہے تھے اور سفر کے دوران یہ کتاب لکھی۔ ان زمانے میں لوگوں کے حافظے بہت غیر معمولی ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر علمائے حدیث کا حافظہ دوسرے لوگوں کی نسبت بہت تیز ہوتا ہے۔ میں نے حدیث کے ایسے علماء دیکھے ہیں جو اپنی یادداشت سے علم رجال و روایت کی تفصیل اس طرح بیان کرتے تھے کہ ہم اور آپ کتاب میں سے دیکھ کر بھی بیان نہیں کر سکتے۔ اگر ابن قیم نے سفر حج کے دوران یہ کتاب لکھی ہو تو یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے۔

☆

انجمن کے علما نے سیرت کے میدان میں کیوں قدم رکھا۔
باقی علما بھی تو تھے۔

باقی علما نے بھی بہت قابلِ قدر اور وسیع کام کیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس وقت گفتگو میں آنے والی تمام کتب کے مصنفین کا تعلق انجمن سے تھا۔ یہ انتخاب جان بوجھ کر نہیں کیا گیا۔ مجھ سے عرض کیا گیا کہ میں خاص دور تک کوئی بھی دس کتابیں منتخب کرنے کے لئے سوچ کر آؤں۔ ہر کتاب اس قابل تھی کہ اس پر گفتگو کی جائے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اردو کتابوں کا تذکرہ برصغیر کے موضوع کے تحت ہونے والی گفتگو میں آجائے گا۔ انگریزی کتابیں دور جدید کے سیاق و سباق میں بیان ہو جائیں گی۔ اس لئے میں نے اردو اور انگریزی کی کتابیں چھوڑ دیں اور عربی کتابوں پر اکتفا کیا۔ کتابیں بہت زیادہ ہیں اور ان میں انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔ انجمن کے علاوہ بھی برصغیر میں سیرت پر کتابیں لکھی گئیں۔ ابھی میں نے سیرت شامیہ اور سیرت حلبیہ کا ذکر کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ کا ذکر کیا۔ المواہب اللدنیہ بھی بڑی مشہور کتاب ہے۔ یہ کتابیں مصر اور شام میں لکھی گئیں۔

☆☆

محاضرے کے دوران چائے کے پروگرام میں آپ سمیت ہم
سب کھڑے کھڑے پیتے ہیں۔ کیا کھڑے ہو کر پینا اور کھانا
سنت کے خلاف نہیں ہے؟

یہ بھی آپ کسی مفتی سے پوچھئے۔

☆☆

عقیدۂ آخرت اور ایک خدا کا تصور تو ہر مذہب میں
ہے۔ ایک خدا کا صحیح تصور دین اسلام کی دین ہے۔ ان عبادات
اور عقائد کی عملی صورت اور ان پر مرتب ہونے والے عملی
اخلاقیات کے اثرات پر لکھی جانے والی کتابوں کے نام

ارشاد فرمائیں۔

ان شاء اللہ کل اصحابِ سیرت پر گفتگو کے دوران اس پر بات ہوگی۔

☆

آپ نے سیرت کے کچھ اہم مصادر کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ان کتب میں تاریخ الخمیس کا کیا مقام ہے۔

تاریخ الخمیس بہت عالمانہ اور فاضلانہ کتاب ہے۔ دراصل تاریخ کی ہر کتاب میں اور خاص طور پر جو متقدمین علماء نے لکھی ہیں، ان میں حدیث اور سیرت پر معلومات کے ذخائر موجود ہیں۔

☆

ابن قیم کی تمام کتابیں کیا اردو میں موجود ہیں؟

تمام کتابیں تو اردو میں موجود نہیں ہیں۔ میرے علم کی حد تک زاد المعاد اور اعلام الموقعین کا اردو ترجمہ دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کتاب ترجمہ ہوئی ہو تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔

☆

سیرت کی جو کتابیں مغربی محققین نے تحقیق کر کے شائع کی ہیں، ان پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

میرے خیال میں ان کتابوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مخطوطات ہر جگہ دستیاب ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو مخطوطات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں۔ میری نظر سے کوئی ایسی چیز نہیں گزری کہ کسی محقق نے غلط طور پر جان بوجھ کر منسوب کی ہو۔

☆

پروگرام کے شروع میں نعت پڑھنے کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

فتویٰ کی بات تو کسی مفتی سے پوچھئے۔ ویسے یہاں میں نعت پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بھی صحابہ کرام نعتیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

میں فتویٰ نہیں دے رہا، بلکہ یہ میری ایک ذاتی رائے ہے، اس کا اظہار کر رہا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے تلاوت قرآن کے فوراً بعد نعت خوانی کا اہتمام کر کے گویا قرآن پاک کو جو سراسر کلام الٰہی اور معجزہ کبریٰ ہے عام انسانوں کے کلام کے برابر کر دیا ہے۔ کم از کم مجھے ہر تلاوت کے بعد لازمی طور پر نعت پڑھنے سے، جو بہرحال انسانوں کا کلام ہے، یہی تاثر ہوتا ہے۔ اگر تلاوت کے بعد پہلے کچھ اور ہو اس کے بعد نعت ہو تو یہ تاثر نہ ہوگا۔

☆

کیا واقدی شیعہ تھے؟ اگر نہیں تو بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو شیعہ کیوں لکھا ہے؟

اس زمانے میں تشیع اور مفہوم میں ہوتا تھا۔ کئی شیعہ حضرات میں بعد میں جو شدت پیدا ہوئی، وہ اس زمانے میں نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہر وہ شخص جو حضرت علی یا اہل بیت سے زیادہ محبت رکھتا تھا وہ شیعہ کہلاتا تھا۔ واقدی کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔ ان کی کتاب کو پڑھ کر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرقہ وارانہ مفہوم میں شیعہ ہوں گے۔ کتاب میں کئی ایسی چیزیں بھی ہیں جو شیعہ روایت کے خلاف ہیں۔ مثلاً شیعہ روایت یہ ہے کہ مرحب کا قتل حضرت علی نے کیا تھا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کیا تھا۔ عمرو بن عبد ود کے بارے میں شیعہ روایت ہے کہ اس کو حضرت علی نے قتل کیا تھا۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ کسی اور صحابی نے قتل کیا تھا۔ اگر واقدی بعد کے جانے مانے معنوں میں شیعہ ہوتے تو اس طرح کی روایات کو بیان نہ کرتے۔

☆

ابن حزم ظاہری تھے کہ مالکی؟ ابن حزم مالکی کی کتابوں کے بارہ میں بتائیے۔

ابن حزم مالکی سے تو میں واقف نہیں ہوں۔ ممکن ہو کوئی بزرگ گزرے ہوں۔ ابن حزم ظاہری مالکی نہیں تھے۔ پہلے شافعی مسلک کے پیرو تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا الگ مسلک اختیار کیا تھا ظاہری مسلک۔ انہوں نے اس مسلک کو اتنی ترقی دی کہ آج ظاہری مسلک ابن حزم ہی کے خیالات کا نام ہے۔

☆

کیا اسلام میں کھڑے ہو کر کھانا پینا جائز ہے؟

کسی مفتی سے پوچھئے۔ میرے خیال میں تو ضرورت کے وقت جائز ہے۔ اگر بیٹھنے کا صحیح انتظام موجود ہو تو کھڑے ہو کر کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا "شرب قائما"۔ اسی شمائل ترمذی میں جس کا میں نے کئی بار ذکر کیا ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ حضور نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ جہاں جگہ تنگ ہو، زیادہ لوگ ہوں اور بیٹھنے کا بندوبست نہ ہو سکتا ہو تو وہاں کھڑے ہو کر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔

☆

چھٹا خطبہ

ریاست مدینہ

دستور اور نظام حکومت

چھٹا خطبہ

ریاست مدینہ

دستور اور نظام حکومت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام صدر جلسہ جناب ڈاکٹر محمود الحسن عارف،
وائس چانسلر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
قابل احترام جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی
محترم جناب امیر الحق راجہ صاحب،
برادران مکرم،
خواہران محترم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: ریاست مدینہ، دستور اور نظام حکومت۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کے سیاق و سباق میں نظام حکومت، دستور، ریاست، حکمرانی کے آداب اور لوازم ریاست کا ذکر گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں بہت کثرت سے ہوا ہے۔ اس عرصہ میں دنیا کی مختلف زبانوں میں سیرت پر بہت سا ایسا مواد سامنے آیا ہے جس نے ایک طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قائم کردہ اداروں، آپ کی برپا کردہ اصلاحات اور آپ کی آوردہ تبدیلیوں کے بارے میں بہت وسیع اور قیمتی معلومات پیش کی ہیں، لیکن اس کے ساتھ

ساتھ ان تحریروں کا ایک منفی اثر بھی ہو سکتا ہے اور ممکن ہے یہ اثر پیدا ہوا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے عظیم الشان اور منفرد کارنامے کو محض ایک ریاست کا قیام، محض دنیاوی معاملات کی تشکیل، محض نظم و نسق کی بہتری اور فراہمی سمجھ لیا گیا ہو۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے بارے میں یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ پیغمبر آخر الزمان، خاتم الرسل، ہادئ سبل اور مولائے کل ہیں۔ آپ کا اصل مقصد اور ہدف جس کی خاطر آپ کو دنیا میں بھیجا گیا وہ قرآن مجید میں فرائض چہارگانہ کی صورت میں بیان کر دیا گیا۔ یتلو علیھم آیاتہ۔ یعنی قرآن مجید کی آیات تلاوت کر کے لوگوں تک پہنچانا، ویزکیھم لوگوں کی اخلاقی، روحانی اور مادی اصلاح کرنا یعنی تزکیہ نفس، ویعلمھم الکتاب والحکمۃ، کتاب اللہ کے اسرار و رموز کی تعلیم دینا اور اس کی بنیاد پر اللہ کی وحی کی روشنی میں جو دانائی آپ کو عطا ہوئی جس کے سرچشمے آپ کی ذات مبارک سے جاری ہوئے ان کی تعلیم انسانیت کو دینا۔ یہ تھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بنیادی ذمہ داری۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے چونکہ آپ کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا، کسی اور شریعت کو نازل نہیں ہونا تھا، کسی اور کتاب کا نزول مقدر میں نہیں تھا، اس لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کو جامع اور کامل اسوۂ حسنہ بنایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ جہاں افراد اور عام انسانوں کے لئے نمونہ ہیں، وہاں آپ کی ذات مبارک حکمرانوں کے لئے، فرمانرواؤں، فاتحین، جرنیلوں اور سربراہان مملکت کے لئے بھی نمونہ ہے۔ اس لئے اللہ کی سنت اس کی متقاضی ہوئی کہ آپ کی ذات گرامی میں نبوت اور حکمرانی دونوں کی صفات جمع فرمائی جائیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو تبدیلی فرمائی، جو انسانی تاریخ کی اتنی ہمہ گیر تبدیلی ہے جس کی مثال دنیا کی کسی اور تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ تبدیلی جس نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی دی ہوئی تربیت سے اصلاح پذیر نہ ہوا ہو اور اس کے اثرات اور ثمرات اور اس کے آثار و برکات اس نے قبول نہ کئے ہوں۔ اس ساری تبدیلی کے تحفظ کے لئے، اسلام کے تمدن کی بقا کو یقینی بنانے اور اسلامی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے ریاست ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ریاست اور حکومت اسلام کا مقصد نہیں بلکہ اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کی منزل نہیں، نشان منزل ہے۔ اسی ضرورت کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں ریاست قائم فرمائی جو بعد کی تمام ریاستوں کے لئے ایک طرز کا نمونہ ہے اور نمونہ رہے گی۔ جس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی انسان کے لئے نمونہ ہے۔ اس ریاست نے جو قوانین نافذ کئے وہ آج بھی قوانین کا سرچشمہ ہیں اور تمام قوانین کے لئے معیار اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت کا آغاز فرمایا اور آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت دنیا میں متعدد بڑی بڑی سلطنتیں اور ریاستیں قائم تھیں۔ بعض بڑی بڑی سلطنتوں کے قوانین بھی موجود تھے جن میں سے آج بھی تحریری طور پر کچھ قوانین موجود ہیں۔ روم اور فارس کی سلطنتیں تو مشہور ہیں اور ان کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں بھی آیا ہے۔ لیکن روم اور فارس کے علاوہ ہمارے موجودہ برصغیر میں اور دنیا کے کئی متمدن مقامات پر بڑی متمدن ریاستیں اور حکومتیں قائم تھیں۔ چین میں ترقی یافتہ تمدن اور ریاست کا بھی لوگوں کو علم تھا۔ خود جزیرہ عرب میں متعدد مقامات پر شمال اور جنوب کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں جو سلطنت روم یا فارس کے زیر نگیں تھیں یا ان کی باجگزار تھیں۔ اس لئے عرب ریاست کے وجود سے پوری طرح آشنا تھے اور انہیں معلوم تھا کہ حکمرانی کیا ہوتی ہے اور بادشاہی کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ قدیم عرب شاعری حیرہ، غسان اور کندہ کے حکمرانوں کے تذکرہ سے بھری پڑی ہے۔

لیکن جزیرہ عرب کے درمیانی علاقہ میں خاص طور پر صحرائی مقامات پر صورت حال قدرے مختلف تھی۔ یہاں کے اصل باشندے قبائلی نظام سے مانوس تھے۔ ان میں کسی مدت تاریخ کے دوران کوئی متمدن ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ ان علاقوں میں قبائلی نظام رائج تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور خود مختار یونٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ جو قبیلہ جتنا بڑا ہوتا تھا اتنا ہی اس کا اثر و رسوخ ہوتا تھا۔ قبائل میں عام طور پر فیصلے طاقتور لوگوں کی مرضی اور جمہوری رضا مندی سے کئے جاتے تھے۔ جس شخص کو قبیلہ کا سربراہ چن لیا جاتا تھا وہ عموماً اپنے قبیلے کا سب سے نمایاں اور بعض حالات میں سب سے معمر فرد ہوتا تھا۔ سربراہ قبیلہ کی ذاتی صلاحیتیں اور اس کا شخصی

سرداری کے انتخاب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ اس قبائلی سرداری کی کامیابی ہونا کافی تھی۔ اکثر و بیشتر یہ سب چیزیں فیصلہ کن ثابت ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ قبیلے کے معمر ترین افراد کو نظر انداز کر کے نسبتاً کم سن لوگوں کو قبیلے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اپنے والد ابوقحافہ کی موجودگی میں وہ قبیلے کے سربراہ بنے اور ان کو اپنے قبیلے میں نمایاں ترین مقام حاصل ہوا۔ اس سے کہ اسلام سے پہلے ہی اہل قبیلہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت ابوقحافہ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ صلاحیتوں، کردار اور شخصیت کے اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔

یہ سمجھنا درست نہیں کہ عربوں کے ہاں قبائل کے اندر کوئی باقاعدہ نظم و نسق نہیں ہوتا تھا۔ جاہلی ادب اور دور جاہلی کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ہر قبیلہ ایک بہت منظم یونٹ ہوا کرتا تھا۔ عرب قبائل میں مضبوط داخلی تنظیم موجود تھی۔ اس داخلی تنظیم میں ہر دس افراد پر ایک عریف مقرر ہوتا تھا۔ یہ عریف اپنے دس افراد کی ہر چیز کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ان کے تمام معاملات اور ضروریات کی ذمہ داری اس عریف کی ہوتی تھی۔ ہر دس عریفوں کے اوپر یعنی سو آدمیوں کے اوپر ایک نقیب مقرر ہوتا تھا۔ نقیب اپنے ماتحت عرفاء کے ذریعے پورے سو لوگوں کا ذمہ دار ہوتا تھا اور یوں 110 آدمیوں کی ذمہ داری نقیب کے سپرد ہوتی تھی۔ نقیب کے اوپر بھی ذمہ دار اور عہدیدار ہوتے تھے۔ ہر قبیلہ میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ عریف اور نقیب کے یہ ادارے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں بھی قائم رہے۔ ان کو آپ نے مزید پختگی دی۔

عریف اور نقیب کے علاوہ ایک اہم ادارہ موالات کا ہوتا تھا۔ اس ادارہ کے ذریعے قبیلے سے باہر کا آدمی قبیلے کی رکنیت حاصل کر سکتا تھا اور رکنیت کے حقوق و ذمہ داریوں میں دوسرے افراد قبیلہ کے ہم پلہ شمار ہوتا تھا۔ اسلام نے اس ادارہ کو بھی نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مزید بہتر بنایا۔ اس ادارہ نے اسلام کی وسیع اشاعت اور اسلامی معاشرہ کی توسیع کے دور میں اسلامی معاشرہ کے اندرونی استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے رسول اللہ ﷺ ایک معاہدہ کے نتیجہ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے ایک ریاست قائم فرمائی۔ شریعت کے تفصیلی احکام نافذ فرمائے۔ معاشرتی، تمدنی، عائلی اور دیگر اصلاحات نافذ فرمائیں۔ ان تمام چیزوں کو کچھ مغربی مستشرقین میں سے بہت سوں

تو یہ سمجھنے میں ناکامی ہوتی ہے کہ ایک پیغمبر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے۔ خاص طور پر عیسائی حضرات پیغمبری کے جس تصور سے مانوس ہیں وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا زہد و استغناء ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دنیا سے بیزاری اور ترک دنیا کا رجحان ہے۔ ان کے تصور میں رہبانیت، ترک دنیا اور دنیا کے تمام معاملات سے لاتعلق رہنا ہی نبوت کی شان ہے۔ اس لئے ان میں سے بہت سوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک نبی اور پیغمبر ریاست کیسے قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے معتدل سے معتدل ترین لوگوں نے بھی اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا۔ منٹگمری واٹ، انگریز مستشرق جو بہت معتدل مشہور ہیں۔ انہوں نے Muhammad at Mecca اور Muhammad at Madina کے نام سے دو بہت مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے بین السطور میں ہر جگہ یہ بات نمایاں ہے کہ مکہ میں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انداز ایک نبی کا تھا، لیکن مدینہ میں آپ کے مزاج، انداز اور پیغام میں تبدیلی آئی اور وہاں جا کر آپ ایک بادشاہ اور حکمران بن گئے۔

یہ اعتراض یا شبہ ایک تو اسلام کے مزاج اور رسول ﷺ کے پیغام کی جامعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام محض زاہدوں، مرتاضوں اور مستغنیوں کی تربیت کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ آپ تارک الدنیا لوگوں کی فوج بنانے کے لئے نہیں آئے تھے۔ آپ فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کی جامعیت پیدا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ایک جگہ آپ نے خود فرمایا کہ انا نبی الملحمۃ انا نبی المرحمۃ، میں جہاں رحمت کا نبی ہوں وہاں میں جنگ کا نبی بھی ہوں۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ انا الضحوک القتال، میں جہاں انسانوں کے لئے مسکراہٹیں بکھیرنے کے لئے آیا ہوں وہاں بدکرداروں اور ظالموں کے لئے شمشیر براں بھی ہوں اور مجھے ان کے ساتھ جنگ کرنے کو مکلف بنایا گیا ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک میں پہلے دن سے ہی یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔

جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں کفار کو دعوت دے رہے تھے تو آپ نے بارہا یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ آپ کی اس دعوت کو قبول کر لینے والے عرب وعجم کے حکمران بن سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت ابتدائی دور میں جب حضور علیہ السلام کے عم محترم جناب ابوطالب زندہ تھے اور کفار مکہ

کرتے ہیں۔ اگرچہ مغربی مصنفین کسی شہری ریاست کا ذکر نہیں کرتے لیکن کسی کے نظر انداز کرنے سے تاریخ کے حقائق ختم نہیں ہو سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکی شہری ریاست کئی سو سال تک قائم رہی۔

اس ریاست میں قصی نے پہلے دس شعبے قائم کئے اور ان کو قریش کے دس قبائل میں تقسیم کیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ مزید شعبے قائم ہوتے گئے جو مختلف قبائل میں تقسیم کئے جاتے رہے۔ یوں کل پچیس عہدے قائم ہو سکے۔ ہر قبیلہ کا سربراہ پیدائشی اور خاندانی طور پر اس عہدے کا حامل بھی ہوتا تھا جو اس خاص قبیلے کا عہدہ تھا۔ جناب صدیق اکبر کے خاندان میں دیات کی ذمہ داری تھی اور خاص طور پر یہ ذمہ داری کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جائے یا دیت ادا کی جائے تو اس کی دیت یا تاوان ادا کرنے کا معاملہ۔ ایسے تمام مقدمات کا فیصلہ جناب صدیق اکبر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق کے خاندان میں سفارت کا عہدہ تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وزارت خارجہ کا عہدہ۔ دوسرے قبائل سے معاملات طے کرنے کے لئے جب قریش کی نمائندگی کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت عمر فاروق یا ان کے خاندان کے بزرگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اسی طرح سے مختلف خاندانوں میں مختلف عہدے قائم تھے۔ بنی عبدالدار جو عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا وہ بیت اللہ کا متولی تھا اور بیت اللہ کی چابی بنی عبدالدار کے سربراہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ جناب قصی کا قائم کردہ یہ عہدہ آج تک قائم ہے۔ آج بھی اس وقت جو بنو عبدالدار ہی کے ایک سردار کے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی ہوتی ہے اور ترک سلاطین اور دیگر کوئی بھی چھوٹا یا بڑا حکمران آج تک اس خاندان سے بیت اللہ کی چابی واپس لینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ نبوت کی دعوت دے رہے تھے تو اس وقت اس خاندان کے سربراہ عثمان بن طلحہ الحجبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ہجرت کا فیصلہ فرما چکے تھے۔ کفار مکہ کی طرف سے سختی انتہا پر تھی۔ حضور کا جی چاہا کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہو کر عبادت کریں اور نوافل بیت اللہ کے اندر ادا کریں۔ ہجرت سے چند دن پہلے حضور علیہ السلام نے عثمان بن طلحہ سے فرمایا کہ تم اگر میرے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھول دو تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ عثمان بن طلحہ نے بڑے تکبر اور استہزا سے کہا کہ اب

میں تمہارے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھولوں گا؟ یہ طنزیہ جواب دیا اور دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن آئے گا جب بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جس کو چاہوں گا دوں گا۔ عثمان بن طلحہ نے کہا جس دن تمہارے ہاتھ میں بیت اللہ کی چابی آئے گی تو شاید قریش تو سارے مر گئے ہوں گے یا قریش تو ذلیل ہو گئے ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، وہ دن قریش کی ذلت کا نہیں بلکہ قریش کی عزت کا دن ہوگا۔ اس کے بعد حضور ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ بیت اللہ میں الوداعی داخلہ کا موقع نہیں مل سکا۔

جب فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ اور آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ پھر آپ بیت اللہ کے اندر تشریف لے جانے کے ارادے سے کھڑے ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو طلب فرمایا۔ انہوں نے آکر دروازہ کھول دیا۔ آپؐ اندر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر اندر عبادت میں مصروف رہے۔ جب آپ بیت اللہ سے باہر نکلے تو آپؐ کے دست مبارک میں چابی تھی۔ لوگ باہر بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے عثمان بن طلحہ سے پوچھا کہ تمہیں یاد ہے میرے اور تمہارے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یاد ہے۔ آپ نے پوچھا کہ میں نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے دہرایا کہ آج کا دن قریش کی عزت کے آغاز کا دن ہے۔ اس وقت حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ آج کے دن یہ چابی ہمیں دے دیجئے، ہمارے خاندان میں رہے گی۔ حضرت علی نے کہا ہمیں دے دیجئے۔ اور بھی کئی صحابہ نے خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے عثمان بن طلحہ کو بلا کر چابی انہی کو دے دی اور فرمایا کہ تم اس کو رکھو۔ وتبقی فیکم خالدة تالدة لا یاخذها منکم الا ظالم یہ چابی تم رکھو۔ یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ کوئی تم سے نہیں لے گا۔ اگر کوئی تم سے لینا چاہے گا تو وہ ظالم ہوگا۔ صرف کوئی ظالم ہی تم سے یہ چابی لے سکے گا۔ دوسرا کوئی نہیں لے سکے گا۔ اب کوئی بھی شخص زبان رسالت مآب سے ظالم نہیں بننا چاہتا تھا۔ بڑے سے بڑے حکمران نے بھی یہ جرات نہیں کی کہ یہ چابی اس خاندان سے واپس لے لے۔

میں نے 25 جنوری 1981ء کو یہ منظر دیکھا ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس تھی۔ بیت اللہ میں اس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ اجلاس نماز عشاء کے بعد کوئی نو ساڑھے نو بجے ختم

وجاہت اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے ان کی رائے بھی لی۔ جناب ہاشم نے قریش کے قبیلہ کے لئے روم کی سلطنت سے بہت سی مراعات حاصل کیں۔ یمن میں ایرانیوں کی جو کالونیاں تھیں وہاں سے بھی قریش کے لئے رعائتیں حاصل کیں۔ اسی طرح آس پاس کی دوسری ریاستوں مثلاً حبشہ سے مراعات حاصل کیں۔ یہ تمام مراعات اور سہولتیں قبیلہ قریش کو جناب ہاشم کی وجہ سے حاصل ہوئی تھیں۔

جب قرآن مجید میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ لايلف قريش ايلفهم رحلة الشتاء والصيف ○ فليعبدوا رب هذا البيت ○ الذي اطعمهم من جوع وامنهم من خوف ○ کہ جس بیت اللہ کی تولیت کی وجہ سے تمہیں یہ مراعات حاصل ہوئی ہیں اس بیت اللہ کے کچھ حقوق بھی تم پر عائد ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش کو یہ عزت افزائی بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے حاصل تھی۔ بیت اللہ کی خدمت اور تولیت سے جو اعزاز حاصل ہوا ہے اور جو بین الاقوامی شناسائی ملی ہے تو اس کا کم سے کم اتنا حق تو ادا کرنا چاہئے کہ اس پروردگار کی عبادت کریں جس پروردگار کے نام سے یہ گھر منسوب ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کا حوالہ تھا کہ انہی کے خاندان کی برکت سے اور انہی کے آباؤ اجداد کے طفیل تمہیں یہ ساری مراعات حاصل ہوئیں۔ اور آج انہی ہاشم کے پڑپوتے کے ساتھ تم جو ظلم کر رہے ہو اس پر تمہیں غور کرنا چاہئے۔

رسول اللہ کی بعثت کا دسواں سال تھا۔ اس سال کو حضور نے عام الحزن قرار دیا تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک ایسی خاتون جنہوں نے پچیس سال شب و روز حضور کی معیت میں وقت گزارا تھا۔ نبوت کی سب سے پہلے تصدیق انہوں نے کی تھی۔ اپنا پورا اثر رسوخ، خاندان، مال و دولت ہر چیز اسلام پر نچھاور کر دی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جناب ابو طالب بھی انتقال کر گئے تھے جنہوں نے ہر مرحلہ پر حضور کی سرپرستی اور مدد فرمائی تھی اور آپ کی ذات گرامی کو بے مثال تحفظ فراہم کیا تھا۔ اس لئے اس سال کو حضور نے بجا طور پر عام الحزن قرار دیا۔ اس حالت میں جو شخص ابو طالب کا جانشین بنا وہ بدقسمتی سے ابولہب تھا جو حضور کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں خاندان چونکہ قبائلی نظام کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ قبائلی مدد اور سپورٹ کے بغیر کسی شخص کے لئے اس معاشرہ میں زندہ رہنا اور کام کرنا تقریباً ناممکن

تھا۔ اس لئے اب دعوت اسلامی کے راستہ میں بے پناہ مشکلات آ کھڑی ہوئیں۔

جب تک جناب ابو طالب زندہ رہے تو ان کی مدد اور سرپرستی جناب رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھی۔ وہ قبیلہ بنو ہاشم اور پورے قریش کے سردار تھے۔ ان کو اپنے قبیلہ کی تائید بھی حاصل تھی اور جس حد تک ان کے بس میں ہوا انہوں نے قریش کو بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ ساری حمایت ابولہب نے ختم کر دی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مکہ مکرمہ میں دعوت کا کام جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آس پاس کے قبائل سے مدد لینے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ کوئی قبیلہ اسلام کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام قرب و جوار کے مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔ طائف کی داستان سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضور یہ بھی کرتے تھے کہ حج کے لئے جب مختلف قبائل کے لوگ مکہ مکرمہ آتے تھے تو حضور علیہ السلام منیٰ میں ان کے ٹھکانوں پر جا کر ان کو دعوت دیا کرتے تھے۔ لیکن ان عمومی اجتماعات کا نتیجہ بالکل حوصلہ افزا نہ تھا۔ ہر قبیلہ کی طرف سے یا تو ایک ادائے بے پروائی کا رویہ ہوتا تھا یا مخالفت کا ہوتا تھا۔ اگر کسی عرب قبیلہ نے روایتی اخلاق اور مہمانداری کے مطابق آپ کا خیر مقدم کیا بھی یا آپ کی بات سننے کے لئے تیار ہوا تو پیچھے سے ابولہب کے بھیجے ہوئے کارندے جو تعاقب میں ہوتے تھے وہ خرافات بکتے تھے۔ یوں اس قبیلہ کو یہ خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ مکہ میں بیٹھے قریش کی مخالفت کیوں مول لیں۔ اس لئے وہ حضور ﷺ کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔

پہلی مرتبہ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک صاحب سے حضور ﷺ کا رابطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ یہ صاحب سوید بن صامت تھے جو مدینہ میں اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کی وجہ سے الکامل کی وجہ سے مشہور تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ انہوں نے توجہ سے بات سنی اور حضور ﷺ کے پیغام میں دلچسپی لی۔ ان کے پاس حکمت لقمان کے کچھ اجزا لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میرے پاس بھی اسی طرح کی چیز ہے جو آپ بیان فرما رہے ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کے پیغام کو قبول تو نہیں کیا لیکن مخالفت بھی نہیں کی۔ اس کے بعد سوید بن صامت کا انتقال ہو گیا۔ سیرت نگاروں میں اب یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ سوید بن صامت اسلام قبول کر چکے تھے یا نہیں۔ اور کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے یا نہیں۔

اس کے بعد غالباً اسی سے اگلے سال مدینہ منورہ کا ایک اور گروہ مکہ مکرمہ حج کرنے کے لئے آیا۔ یہ قبیلہ اوس کی ایک شاخ بنو عبدالاشہل کے کچھ لوگ تھے۔ یہ قریش مکہ سے ایک معاہدہ کرنا چاہتے تھے جس کے مطابق خزرج کے ساتھ لڑائی میں قریش مکہ اوس قبیلہ کا ساتھ دیں۔ حضور ﷺ ان کے پاس بھی بات کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے بہت غور سے آپ کی بات سنی۔ اخلاق سے پیش آئے۔ اور کہا کہ ہم اس وقت تو ایک اور کام کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے اس موقع پر ہم کسی اور کام پر توجہ نہیں دے سکتے۔ انہوں نے بھی حضور ﷺ کی بات قبول نہیں کی۔

اہل مدینہ کے ساتھ حضور ﷺ کا پہلا باقاعدہ رابطہ اس وقت ہوا جب آئندہ سال یعنی غالباً سنہ گیارہ نبوت میں مدینہ منورہ سے آنے والے چھ حجاج کرام کے ساتھ حضور ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ چھ کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا اور مدینہ چلے گئے۔ بعض لوگوں نے اس کو پہلی بیعت عقبہ قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے حضرات لوگ نے اس کو بیعت قرار نہیں دیا کیونکہ اس موقع پر کسی باقاعدہ بیعت کا باقاعدہ ذکر نہیں ملتا۔ کسی سیرت نگار نے ان حضرات کی بیعت کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ان حضرات نے واپس جاکر مدینہ منورہ میں دعوت اور تبلیغ کا کام کیا۔ اگلے سال جب یثرب کے لوگ حج کے لئے آئے تو بارہ حضرات کا ایک باقاعدہ وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان بارہ میں سے پانچ حضرات تو پچھلے سال والے تھے اور غالباً سات افراد نئے تھے۔ ان بارہ افراد نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ بیعت کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی مبلغ کو بھیجیں۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان کا تعلق بھی بنی عبدالدار سے تھا۔ انہوں نے مدینہ جاکر اسلام کی دعوت دینا شروع کردی۔ ان کی تبلیغ بہت مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئی۔ جلد ہی مدینہ منورہ کے ہر گھر، خاندان اور برادری میں اسلام کا نام اور چرچا پھیل گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ مسلمان بھی ہو گئے۔ اس کے اگلے سال 72 افراد اسلام قبول کرنے کے ارادے سے بقیہ حجاج کے ساتھ آئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ بیعت کی اور عقبہ کے مقام پر حضور ﷺ کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کیں۔ عقبہ وہ جگہ ہے جب آپ منیٰ سے مکہ مکرمہ کی طرف آئیں تو بائیں طرف ایک

بہت اونچا پہاڑ ہے جس کی شکل دیوار کی سی ہے۔ اس کے اندر ایک راستہ جاتا ہے جہاں ایک مسجد ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں یہ ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

یہ بات بڑی دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ان ملاقاتوں میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی موجود تھے۔ اسی لیے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ بہت ابتدا میں اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور ﷺ کے حکم اور مشورہ ہی سے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ وہاں کی موجودگی کی اس سے تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مدینہ کے لوگوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صحابہ کو ہمارے ساتھ جانے کی ہدایت دیں اور خود بھی مدینہ تشریف لے آئیں۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو ہجرت کر کے مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ صحابہ ایک ایک کر کے مدینہ منورہ جانے لگے۔ یہ جو معاہدہ ہوا، جس میں باقاعدہ بیعت بھی ہوئی اس کو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بیعت، بیعت حرب کہلاتی ہے۔ پہلی بیعت النساء کہلاتی ہے۔ بیعت النساء کے لفظی معنی تو ہیں عورتوں کی بیعت۔ لیکن عورتوں کی بیعت سے مراد بیعت کے وہ الفاظ ہیں جو سورۃ ممتحنہ میں آئے ہیں جس میں حضور علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے کہ جب آپ خواتین سے بیعت کریں تو فلاں فلاں چیزوں کی بیعت لیں۔ خواتین چونکہ میدان جنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ تو ان سے یہ وعدہ لینا مناسب تھا کہ وہ میدان جنگ میں جا کر لڑیں۔ اس وجہ سے ان سے جنگ میں حصہ لینے کی بیعت نہیں لی جاتی تھی۔ اس لیے جنگ کے علاوہ اور چیزوں کی بیعت کو بیعت نساء کہا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلی بیعت کو بیعت نساء کے نام سے یاد کیا گیا۔

دوسری بیعت میں انصار مدینہ نے یہ وعدہ کیا کہ ہم آپ کا دفاع بھی کریں گے، آپ کے لیے لڑیں گے۔ جو آپ پر حملہ آور ہوگا اس کو ہم اپنے اوپر حملہ آور سمجھیں گے اور آپ کے ساتھ ہر سرد و گرم میں شریک رہیں گے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر چیز میں ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ جب یہ بیعت ہوئی تو بعض انصاری صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں فتح کر دے تو آپ واپس مکہ چلے جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟ انہوں نے مناسب انداز میں یہ سوال حضور ﷺ کے سامنے رکھا۔ جواب میں آپ مسکرائے اور فرمایا: میرا خون تمہارا خون، تمہارا خون میرا خون، تمہاری صلح میری صلح اور میری صلح تمہاری صلح۔ اب تمہارے

وہاں ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔ اس نئی ریاست کا حضور کی تشریف آوری سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام جانا شروع ہو گئے۔ جو جو صحابی وہاں پہنچتے گئے انہوں نے وہاں ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ 11 ذی الحجہ سن 13 نبوی کو مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ اس کے سربراہ کے طور پر بعد میں وہاں تشریف لے گئے۔

مدینہ منورہ جانے سے پہلے جو بیعت ہوئی اس کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک سیاسی وریاستی بندوبست کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ انصار مدینہ نے طے کیا کہ ہم ہر معاملے میں آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ یعنی سمع و طاعت۔ آپ کے ارشادات قانون کا درجہ رکھیں گے اور ہم ان کی پیروی کریں گے۔ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اپنی ذمہ داری انجام دیں گے۔ آپ کے احکام کو بجا لانے میں ہم اپنی قوت استعمال کریں گے۔ جو حق کا معاملہ ہوگا اس میں صرف حق کی پیروی کریں گے اور کسی قبائلی عصبیت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ حق کے معاملہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور سے خوف نہیں کھائیں گے۔

معاہدے کے نتیجے میں مدینہ میں ایک چھوٹی سی کانفیڈریشن قائم ہوئی۔ کانفیڈریشن اس لئے کہ یہ ایک قبائلی معاشرہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان قبائلی یونٹوں کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ ہر قبیلہ میں عریف اور نقیب مقرر فرمائے تاکہ اس قبیلہ کی طرف سے بات کر سکیں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے مہاجرین کے نمائندے بھی مقرر فرمائے۔ اس طرح سے کئی یونٹ قائم ہوگئے۔ ان یونٹوں کے باہمی اتحاد سے ایک اسلامی ریاست مشترکہ وجود میں آگئی جو داخلی طور پر خود مختار یونٹوں پر مشتمل تھی۔

مدینہ منورہ کے احوال پر اگلے ہفتے بات ہوگی۔ جس شہر کو مدینہ منورہ کا نام دیا گیا یہ کوئی ایک شہر نہیں تھا۔ بلکہ یہ بہت سی بستیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ایک بہت بڑا رقبہ تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ غالباً درست ہوگا کہ وہ موجودہ اسلام آباد کے رقبے کے برابر تھا۔ اس کا طول تقریباً تیرہ چودہ یا شاید پندرہ میل کے قریب تھا۔ عرض بھی بارہ میل کے درمیان تھا۔ تمام سیرت نگاروں نے اس کی شمالی اور جنوبی حد جبل احد اور جبل عیر کو قرار دیا ہے۔ جبل عیر سے پرے تک

کل مدینہ کا ایئرپورٹ ہے۔ ایئرپورٹ سے شہر کی طرف جاتے ہیں تو راستے میں جبل عیر پڑتا ہے۔ جبل احد اور جبل عیر کے درمیان شمالاً جنوباً یہ حد ہے۔ اور شرقاً غرباً بھی وہی بارہ میل کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں بہت سارے گاؤں اور چھوٹے قلعے تھے۔ ان کے لئے آطام کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ یہ قلعے اس نوعیت کے تھے جس کو اردو میں گڑھی کہتے ہیں۔ گڑھی سے مراد ایک ایسی بڑی حویلی ہے جو دفاعی طور پر مضبوط بنائی گئی ہو۔ جس کے اندر ایک سے زائد خاندان رہتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ بھی وہاں رہتا ہو۔ اس کے باہر ان کی زمینیں ہوں جس پر وہ کاشت کرتے ہوں۔ کچھ لوگ باہر کھیتوں پر رہتے تھے۔ کچھ لوگ اطم یعنی گڑھی میں رہا کرتے تھے۔ اس طرح کے تقریباً 72 آطام مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں موجود تھے۔ اس وقت بھی بعض آطام کے اثرات مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ اگر آپ وہاں تشریف لے جائیں تو کعب بن اشرف کے اطم کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ خود شہر مدینہ کے اندر بھی بعض آطام کے آثار موجود ہیں۔ اسی طرح بعض باغات بھی ابھی تک موجود ہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا باغ ہے جو ایک قبیلہ کی ملکیت ہے۔ اس باغ کے درمیان میں یا اس کے ایک طرف بڑی حویلی قائم ہے جس میں وہ سارا قبیلہ یا خاندان رہتا تھا۔ اس پورے رقبہ میں ان اطام کے علاوہ بارہ پندرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں کا نام یثرب تھا اور جو نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ اسی کی وجہ سے کبھی کبھی اس پورے علاقہ کو یثرب بھی کہا جاتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں وہ بھی تھا جس میں آج مسجد نبوی موجود ہے۔ یہ گاؤں بنو مالک بن نجار کی ملکیت تھا۔ وہاں ایک خالی جگہ دو یتیموں کی ملکیت تھی جو حضور نے معاوضہ دے کر خریدی اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس پورے علاقہ کا نام مدینۃ النبی یا مدینہ قرار پایا۔

مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام بکھرے باہم متحارب اور مختلف قبائل کی بنیاد پر ایک مدنی نظم و نسق قائم کیا گیا۔ اس کی سربراہی اتفاق رائے سے رسول اللہ ﷺ نے سنبھالی اور یوں اس طویل جنگ و ابتلا کی روایت ختم ہوگئی جو مدینہ منورہ کے مختلف قبائل کے مابین جاری تھی۔ ہجرت سے غالباً سات آٹھ سال قبل ایک جنگ شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ بعاث کہلاتی تھی۔ کئی سال جاری رہی اور اوس اور خزرج کے قبائل آپس میں شمشیر آزما ہوئے۔

یہودیوں کے کچھ قبائل نے اوس کا ساتھ دیا اور کچھ قبائل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ کئی سال بعد ہجرت سے تقریباً چار پانچ سال پہلے کہیں جا کر یہ جنگ ختم ہوئی۔ اس جنگ سے مایوس ہو کر اور اس سے پریشان ہو کر اوس اور خزرج کے بعض لوگوں نے یہ تجویز دی تھی کہ ہمیں ایک مشترکہ سربراہ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کی تجویز کے مطابق وہ منتخب سربراہ عبداللہ بن ابی تھا جو بعد میں منافقین کا سردار کہلایا۔ اس کی مشترکہ سرداری یا بادشاہی کا معاملہ باقاعدہ طے تو نہیں ہوا تھا لیکن تجویز زیر غور تھی۔ بعض لوگ متفق تھے اور بعض لوگ نہیں تھے۔ یقیناً عبداللہ بن ابی اور اس کے رفقاء کی یہ کوشش ہوگی کہ تجویز پر عمل ہو جائے۔ اسی اثناء میں ہجرت کا واقعہ پیش آ گیا اور جتنے انصاری صحابہ یعنی اوسی اور خزرجی تھے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گرد جمع ہو گئے اور وہ حیثیت رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہو گئی جو بعض لوگوں کے خیال میں عبداللہ بن ابی کے لئے سوچی جا رہی تھی۔

حضور ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ہی مدینہ منورہ کا داخلی نظم و نسق طے فرما دیا تھا۔ جو مہاجرین تھے وہ مختلف انصاری خاندانوں کے ساتھ ان کے خاندانوں کے فرد قرار پائے۔ انصاری خاندانوں میں بارہ نقیب پہلے ہی مقرر کر دئے گئے تھے۔ سعد بن عبادہ خزرج قبیلے کے نقیب النقباء کہلاتے۔ جو بقیہ نقباء منتخب کئے گئے اور جن کو ان کے قبیلوں نے پہلے ہی منتخب کیا تھا وہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو پہلے سے ہی اپنی اپنی قوم میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت براء بن معرور کے بارے میں ابن ہشام کی روایت ہے کہ ان کے بارے میں لوگوں نے کہا کہ هو سيدنا و شريفنا و ابن سيدنا و ابن شريفنا وہ ہمارے سردار بھی ہیں، با عزت آدمی ہیں، ہمارے سردار کے بیٹے ہیں اور شریف آدمی کے بیٹے ہیں۔ اس طرح سے جب یہ سارا انتظامی بندوبست مکمل ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے آپ نے تین کام کئے۔ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ اس سے پہلے قبا میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے مواخاۃ کا عمل مکمل فرمایا۔ جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے تشریف لائے تھے ان کو مدینہ کے خاندانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ مواخاۃ دراصل ایک قدیم عرب ادارہ کے احیا کا ایک نیا انداز تھا۔ یہ ولاء کے نام سے

عرب میں رائج تھا۔ اسلام کے بعد بھی رائج رہا۔ ولاء سے مراد یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر چاہے
تو اپنے قبیلے سے تعلق ختم کرکے کسی دوسرے قبیلے سے تعلق جوڑ سکتا تھا۔ اگر دوسرا قبیلہ قبول
کرلے تو وہ شخص پھر اس دوسرے قبیلے کا فرد بن جاتا تھا۔ اس کو ولاء کا تعلق کہا جاتا تھا۔ جو شخص
اس طرح کا تعلق قائم کرتا تھا اس کو مولی الموالات کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ شخص جو ولاء کے ذریعے
مولی بنا ہو۔ مولی کے معنی دوست، تعلق رکھنے والا، مدد کرنے والا، مدد کی توقع رکھنے والا۔ یہ
سب معنی مولی کے لفظ کے ہیں۔

تیسرا کام حضور نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مورخین نے میثاق
مدینہ کا نام دیا ہے۔ بعض نے اس کو معاہدہ کہا ہے۔ اس کے قدیم ترین راویان مثلاً امام
ابوداؤد، امام احمد بن حنبل اور سیرت نگاروں میں ابن ہشام اور ابن سعد اور محدثین میں کئی
افراد نے اس کے لئے کتاب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ کتاب رسول اللہ ﷺ للانصار
والمہاجرین یعنی الانصار والمہاجرین۔ کتاب کا عربی ترجمہ فیصلہ یا چارٹر ہوتا ہے۔ قرآن
پاک میں کتاب کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لولا کتاب من اللہ سبق
لمسکم فیما اخذتم عذاب الیم۔ "اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ آچکا ہوتا"۔ کلا ان الکتاب
الابرار لفی علیین۔ کلا ان کتاب الفجار لفی سجین۔ لہذا کتاب کا لفظ قرآن پاک
میں جہاں کہیں بھی کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور مفہوم میں آیا ہے اس سے مراد فیصلہ اور حکم ہے۔
اس لئے یہاں کتاب کے معنی میثاق یا معاہدہ وغیرہ درست نہیں ہے۔ یہ چارٹر یا فیصلہ ہے جو رسول
اللہ ﷺ نے کیا۔ یقیناً اس چارٹر کو جاری کرنے میں حضور نے قبائل سے بات کی۔ اور چارٹر کی
تفصیلات ان کے مشورہ سے طے کیں۔ جب انصار کے ذمہ داروں سے ابتدائی گفتگو ہو رہی
تھی تو حضرت انس کے گھر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر
میں تشریف فرما تھے جب یہ معاہدہ ہو رہا تھا۔ حضرت زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ میں
حضور کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ حضور ایک ایک جملہ املا فرماتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا۔ میرا
گھٹنا حضور کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ معاہدہ لکھا
جارہا تھا۔

اس کے بعد جب یہ معاہدہ مکمل ہوگیا۔ عام طور پر مورخین کا اور جدید مورخین میں سے

بہت سے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ معاہدہ جو اس وقت 47 یا 52 دفعات پر مشتمل ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ معاہدہ دو الگ الگ اوقات میں کیا گیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک ہی معاہدہ ہے اور ایک ہی وقت میں کیا گیا تھا۔ تقریباً تمام قدیم مصنفین اس کو ایک ہی وقت میں ہونے والا ایک معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ جدید مصنفین میں سے مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور کئی اور حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ دو الگ الگ دستاویزات تھیں جو دو مختلف اوقات میں مرتب ہوئیں اور بعد میں ان کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ پہلی پچیس دفعات تو ہجرت کے بالکل ابتدائی دنوں میں مرتب ہوئیں۔ اور یہ مہاجرین اور انصار اور انصار کے مختلف قبائل کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا۔ دوسرا حصہ غزوہ بدر کے بعد مرتب ہوا۔ اس کی رو سے یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہوئے۔ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں ایک جگہ دو کتابوں کا حوالہ ہے کتابہ ﷺ للمہاجرین والانصار اور کتابہ ﷺ لیہود۔ اس سے پتہ چلا کہ قدیم مصنفین میں سے ابن منظور افریقی بھی اس کو دو دستاویزات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ امام ابوداؤد نے بھی اپنی کتاب الخراج والفئی والامارۃ، جو سنن ابوداؤد کا ایک حصہ ہے، اس کے باب نمبر 21 میں جس کا نام ہے باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ المنورۃ ۔ کہ یہودیوں کا اخراج مدینہ منورہ سے کب اور کیسے ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیسے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک کتاب تحریر فرمائی تھی اور یہ کہ غزوہ بدر کے بعد یہودی بھی اس چارٹر میں شامل ہو گئے تھے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ یہ دو الگ الگ معاہدے تھے جو بعد میں ایک دستاویز میں جمع کر دیئے گئے۔ اس کی دفعات ڈاکٹر حمید اللہ نے 52 قرار دی ہیں۔ ونسنک جو مشہور ڈچ مستشرق تھے، انہوں نے 47 دفعات قرار دی ہیں۔ بعض اور مصنفین نے 56 دفعات قرار دی ہیں۔

یہ تحریر یا دستاویز ایک آئینی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اور ول ہاؤزن اور کئی دوسرے جدید مصنفین نے بجا طور پر اس کو انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور کہا ہے۔ یقیناً یہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری اور مدون دستور ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے تحریری دستور مرتب کر کے نافذ کیا گیا ہو۔ اس کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔ پہلی دو دفعات بڑی اہم ہیں جو میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتاب من محمد النبی ﷺ بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم انھم امۃ واحدۃ من دون الناس۔ اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ ایک چارٹر ہے جو پیغمبر اسلام محمد (ﷺ) نے جاری کیا ہے۔ یہ ان مومنین اور مسلمین کے درمیان ہے، جن کا تعلق قریش اور یثرب سے ہے اور ان تمام لوگوں سے جو بعد میں ان کی پیروی کرتے ہوئے ان کے ساتھ آملیں۔ اور ان کے ساتھ جہاد کریں۔ یہ تو فریقین کا ذکر آگیا کہ یہ وہ پارٹیاں ہیں جن کے درمیان یہ چارٹر جاری کیا گیا۔

امۃ واحدۃ من دون الناس میں من دون کا لفظ بڑا اہم ہے۔ دون کا لفظ عربی زبان میں کسی چیز کو exclude کرنے کے لئے آتا ہے۔ من دون کا صحیح ترجمہ to the exclusion of ہے۔ یہ ایک امت واحدہ ہے، تمام انسانوں سے الگ۔ اس کو انگریزی میں کہا جائے تو یوں کہا جائے گا: They shall constitute one single indivisible Ummah to the exculs on of all other human beings.

یہ چارٹر حضور ﷺ نے بطور سربراہ ریاست دیا ہے۔ پہلی مرتبہ ایک قبائلی نظام میں ایک ریاست قائم ہو رہی ہے۔ پہلی مرتبہ ایک ایسی امت قائم ہو رہی ہے جو مختلف قبائلی وابستگیوں سے ماوراء ہے۔ پہلی مرتبہ ایک دینی عقیدہ کی بنیاد پر ایسی وحدت قائم کی جارہی ہے جو رنگ و نسل سے بالاتر ہے۔ ان دفعات سے یہ باتیں خود بخود سامنے آتی ہیں۔

ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک مدینۃ النبی کا نام زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ مدینۃ النبی کا نام اگر عام ہوگیا ہوتا تو شاید یثرب کے بجائے وہی لکھا جاتا۔ بعد کی بعض دستاویزات میں مدینہ کا لفظ شامل ہے۔ جو قبائل اس دستاویز میں شامل ہوئے آگے چل کر ان کی فہرست الگ الگ دفعات میں بیان کی گئی ہے۔ یہودی قبائل ابتدا میں اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے۔ خود کئی عرب غیر یہودی قبائل بھی شروع شروع میں اس دستوری چارٹر میں شامل نہیں تھے۔ اوس کے بہت سے گروپ شروع ہی میں شامل ہوگئے، چند قبائلی

کسی سے جنگ یا صلح کا معاملہ نہیں کرے گا ''الا علی سواء وعدل بینھم'' ہوا کرے گی کہ
سب کے لئے ایک جیسا نظام ہو اور عدل کے ساتھ سب کے لئے ایک جیسا نظام اختیار
کیا جائے گا۔

بعض چیزیں اس دستاویز میں اور بھی ہیں جو اگر موقع ملا اور وقت ہوا تو ان شاء اللہ
خطبات سیرت کے تحت گفتگو میں پیش کروں گا۔

یہودی جب اس چارٹر میں غزوہ بدر کے بعد شامل ہو گئے تو ان کے لئے بعد میں 24
مزید دفعات کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں پہلی دفعہ میں ہے وان یھود بنی عوف امۃ مع
المومنین، بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ along with the
Muslims ایک الگ امت ہوں گے۔ للیھود دینھم وللمسلمین دینھم۔
یہودیوں کا اپنا دین ہوگا اور مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا۔ دونوں جنگ کے دوران اپنے اپنے
اخراجات برداشت کریں گے۔

یہ میثاق جو سنہ دو ہجری میں جاری ہوا۔ انسانی تاریخ میں پہلا تحریری اور مدون دستور
ہے۔ حجاز اور عرب کی تاریخ میں بھی پہلی مرتبہ ایسی دستاویز مرتب ہوئی۔ صحابہ کرام کے پاس
اس دستاویز کی نقلیں موجود رہیں۔ صحابہ کے خاندانوں میں ان نقول کی بہت اہتمام سے
حفاظت کی جاتی تھی۔ امام بیہقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے خاندان میں ایک
صاحب کے پاس میں نے اس کی نقل دیکھی ہے۔ امام بیہقی کا انتقال 458ھ میں ہوا تھا۔ اس
سے پتہ چلا کہ 458ھ تک اس کی نقلیں صحابہ کے خاندانوں میں موجود تھیں۔ یہ ایک کثیر
القبائلی یعنی multi-tribal اور کثیر المذاہب یعنی multi-religious اور کثیر الثقافتی یعنی
multi-cultural حکومت تھی جس میں بالادستی شریعت کو حاصل تھی۔ آخری قانون اللہ اور
اس کے پیغمبر کا فرمان تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس میں بطور حکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ تمام
قبیلوں کو داخلی خودمختاری بھی دی گئی اور سابقہ روایات کی اچھی چیزوں کو اس میں جگہ دی گئی۔
اسلام کا ایک مزاج جو مدینہ منورہ کے دور میں بہت نمایاں ہوا۔ وہ دوسری اقوام اور دوسرے
تمدنوں اور تہذیبوں کی مثبت اور تعمیری چیزوں کو اپنے لینے اور اپنے نظام میں سمو لینے کا ہے۔
مسند امام احمد کی روایت میں حضور نے فرمایا کہ یعمل فی الاسلام بفضائل الجاھلیۃ، کہ

معاملات میں جاہلیت کے زمانے کی تمام فضیلتوں اور اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا۔ اس سے کسی بھی قوم، کسی بھی علاقے یا کسی بھی زمانے میں جو بھی اچھی چیز مروج ہے تو اس کو اسلامی نظام میں بھی جذب کر کے قبول کیا جائے گا اور کسی اچھی بات کو اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جائے گا کہ وہ کسی غیر اسلامی ماحول سے آئی ہے۔

پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں باقاعدہ نظم و نسق قائم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل سے تعلق کی تدریج کے کام کو مکمل فرمایا۔ اس دستاویز یا دستور کے بعد جب مدینہ منورہ کے داخلی نظم و نسق کے کام سے ذرا فرصت ملی تو رسول اللہ ﷺ نے آس پاس کے قبائل پر توجہ دی اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے معاہدوں کا آغاز فرمایا۔ اس غرض کے لئے مختلف قبائل میں بہت سی مہمات بھی بھیجی گئیں۔ پہلی مرتبہ جو دستہ بھیجا گیا وہ حضور ﷺ نے اپنے عم محترم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے جنوب میں بنی ضمرہ کے قبیلہ میں بھیجا۔ وہاں ان گفتگوؤں اور مہمات کے نتیجہ میں ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ عہد نبوی کے وثائق کے مجموعوں میں دستیاب ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے شمال میں جہینہ قبیلے کے پاس ایک دستہ بھیجا گیا۔ ان سے بھی دوستی کا معاہدہ ہوا اور وہ بھی اس بندوبست میں شامل ہو گئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو مدینہ منورہ کی بنیادی ریاست تھی جو معاہدے کے شرکاء پر مشتمل تھی۔ پھر مدینہ منورہ کے وہ آطام یا بستیاں تھیں جو معاہدہ میں تو شریک نہیں تھیں لیکن عملاً انہوں نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دائرہ آپ کہہ سکتے ہیں جو حضور نے مدینے کے چاروں طرف ایک حلقہ اثر کی صورت میں قائم کیا۔ اس دائرہ میں مدینے کے چاروں طرف بسنے والے قبائل کی دشمنیوں کو ختم کرنا اور ان کو اسلام کے حق میں مائل کرنا اور مسلمانوں سے دوستی کرنے کے لئے آمادہ کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے جنوب میں ان قبائل سے رابطے ہوئے جو مکہ مکرمہ کے راستے میں تھے۔ بنو ضمرہ سے، پھر بنو جہینہ سے معاہدہ کیا گیا۔ پھر مزینہ کا قبیلہ جو بہت بڑا قبیلہ تھا اور مدینہ منورہ کے مغرب میں آباد تھا، اس سے معاہدہ کیا گیا۔ یہ سب معاہدات ہجرت کے بہت ابتدائی دنوں میں اور بہت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ان دوستانہ معاہدات سے مدینہ کے دفاع کو منظم کرنے اور مسلمانوں کو امن وسکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے دوسرے انتظامات پر توجہ دی اور اس ننھی سی ریاست میں مختلف شعبے قائم فرمائے۔ ہم آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صیغہ خارجہ تھا۔ ایک توقیعات، فرامین اور دستاویزات کا شعبہ تھا۔ ایک شعبہ احتساب تھا۔ شعبہ داخلہ، شعبہ خارجہ، شعبہ مالیات، شعبہ عساکر یعنی فوجی نظم و نسق، شعبہ تعلیم، یہ سارے شعبے ایک ایک کر کے قائم کر دیئے گئے۔ ان میں سے شعبہ تعلیم، معیشت، مذہبی امور کے شعبوں پر ان شاء اللہ آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ آج جو دو تین اہم شعبے ہیں ان کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

سب سے پہلا اور ابتدائی کام جو رسول اللہ ﷺ کو سربراہ ریاست کے طور پر کرنے کی ضرورت پیش آئی وہ شعبہ خارجہ کی تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے اہم کام یہی تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دشمنوں کے اس سمندر میں کیسے محفوظ و مامون بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے آس پاس کے قبائل سے روابط ناگزیر تھے۔ دستور مدینہ بھی ایک طرح سے مختلف قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات تھی۔ اس میں بھی خارجہ معاملات کا ایک عنصر موجود تھا۔ پھر جہینہ، ضمرہ اور مزینہ کے ساتھ جو تعلقات اور معاہدے کئے گئے وہ بھی امور خارجہ کی پہلی کڑی یا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں حضور علیہ السلام کے سامنے تین مقاصد تھے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی کہیں تو صراحت ملتی ہے اور کہیں ان معاہدات کے الفاظ سے ان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بنیادی ہدف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو فروغ دیا جائے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ چنانچہ مختلف قبائل کے ساتھ ہونے والوں معاہدوں میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کے داعیوں کا راستہ نہیں روکیں گے۔ مسلمان داعی اگر کہیں جا رہے ہوں تو ان کو مہمان نوازی اور تحفظ فراہم کریں گے۔ ان کو اپنے ہاں ٹھہرائیں گے۔ اس کے عوض میں مسلمان ان کے ساتھ یہ اور یہ کریں گے۔

ان معاہدات کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب کے معاشرہ میں امن و امان قائم ہو۔ عدل و انصاف کو فروغ ہو اور تمام قبائل کو اس طرح سے ایک لڑی میں پرو دیا جائے کہ وہ ان مشترکہ مقاصد کی خاطر عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ پھر آخری مقصد یہ تھا کہ اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کا ایک رعب اور دبدبہ عرب میں قائم ہو کر

کوئی دوسری قوت ان کی طرف میلی نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ ریاست مدینہ کی خارجہ پالیسی کی سمت یہ تین بنیادی اہداف تھے جن کے تحت معاہدات کئے گئے۔ اور اس طرح تبلیغ اسلام کو آسان بنایا گیا۔ اندرونی استحکام کو یقینی بنایا گیا۔ انسانی جان کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا۔ دشمنوں پر معاشی دباؤ قائم رکھنے کے سامان کئے گئے۔ دشمن کے دوستوں سے دوستی کی کوشش کی گئی۔ دشمن کے دشمنوں سے دوستی مزید بہتر بنائی گئی۔ دشمن کے اطراف میں اپنے دوستوں کی ایک ڈھال بنائی گئی۔ یعنی خیبر کے یہودیوں کے اطراف میں بھی اور قریش مکہ کے اطراف میں بھی بسنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدے کئے گئے۔ دشمن قبیلوں کے درمیان اگر کوئی اتحاد تھا تو اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ معزز دشمنوں کا احترام کرکے ان کا دل جیتنے کی کوشش کی گئی۔

تالیف قلب ریاست کے شعبہ خارجہ کی پالیسی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تالیف قلب کے طور پر بہت سے اقدامات کئے گئے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط کا سامنا کرنا پڑا تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مدینہ منورہ سے بڑی تعداد میں کھجوریں اور جو کی کھیپ بھیجی اور کہلا بھیجا کہ ہماری طرف سے یہ سامان خورد و نوش مکہ کے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اس طرح کے اقدامات وقتاً فوقتاً کئے گئے۔ یہ صیغہ خارجہ تھا جس میں بنیادی ذمہ داری سیدنا عمر فاروق کی تھی۔ ان کا قبیلہ مکہ مکرمہ میں بھی شہری ریاست میں امور خارجہ اور سفارت کا ذمہ دار تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جو مہمات بھیجیں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں بہت کثرت سے مہمات بھیجی گئیں۔ مدینہ منورہ کے چاروں طرف حتی کہ مکہ مکرمہ کے قریب کے رہنے والے بعض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدات کئے گئے۔ اسی اثناء میں حضور نے سفراء بھی بھیجے۔ بعض سفراء کا نام ملتا ہے۔ ایک سفیر جن کو کئی مواقع پر حضور نے بھیجا وہ اس زمانے کی سب سے بڑی ریاست کے حکمران کے پاس بھیجے، دحیہ بن خلیفہ الکلبی تھے۔ بنی کلب سے آپ کا تعلق تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور بااثر قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کی بہت سی داستانیں جاہلی ادب میں مشہور ہیں۔ لمبی لمبی اور طویل جنگیں اس قبیلہ نے مختلف لوگوں سے کیں۔ پورے عرب میں اس قبیلے کے سرداروں کا رعب داب مشہور و معروف تھا جس کا تذکرہ

عرب شاعروں میں ملتا ہے۔ اس قبیلے سے حضرت دحیہ کا تعلق تھا۔ چونکہ یہ قبیلہ ایک ایسے علاقے میں آباد تھا جس میں وہ قبائل آباد تھے جو قیصر روم کے باجگزار تھے اس لئے اس قبیلہ کی حیثیت ایک طرح سے بفر زون کی سی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ اس قبیلے کے تعلقات قیصر روم کے درباریوں سے بھی رہے ہوں۔ اس لئے جناب دحیہ بن خلیفہ الکلبی کو حضور ﷺ نے قیصر روم کے دربار میں بھیجا۔ ان کے بارے میں ایک بات تمام سیرت نگاروں نے لکھی ہے کہ صحابہ کرام میں ان سے زیادہ خوبصورت آدمی کوئی نہیں تھا۔ جب وہ قیصر روم کے پاس دمشق پہنچے اور بتایا گیا کہ عرب سے ایک بہت خوبصورت سفیر آیا ہے تو تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں میں اس خوبصورت نوجوان کو دیکھنے کے لئے کھڑی تھیں، جو عرب سے پیغمبر عربی کا خط لے کر آیا ہے۔

[illegible] ابھی حضرت دحیہ بن خلیفہ کی خوبصورتی کا ذکر تو ہو گیا لیکن یہ بات شاید کچھ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ جب بھی جبریل امین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں آتے تھے۔ کئی مرتبہ صحابہ کرام نے بیان کیا کہ ہم نے دحیہ کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ریاست سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ حضور کے بتانے سے لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ جبریل امین تھے جو دحیہ بن خلیفہ کی شکل میں کئی بار حضور کے پاس آئے۔

بقیہ سفراء میں حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا ذکر ہو چکا ہے جو حبشہ کے بادشاہ کے نام مبارک لے کر گئے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص جیسے ہی اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ آئے ان کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ مختلف حکمرانوں کے پاس جب حضور کا سفیر جایا کرتا تھا تو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ مکتوب الیہ کے لئے کوئی ہدیہ بھی دیتے تھے۔ باہر سے کوئی سفیر آیا کرتا تو اس کو بھی ہدیہ دیا کرتے تھے۔ حضور کی طرف سے سفرا کو ہدیہ دیا جاتا تھا۔ طے شدہ طریقہ کار تھا کہ جب آپ بستر مرگ پر تھے اور دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اجیزوا الوفود کما کنت اجیزھم، جیسے میں مختلف وفود کو انعامات دیا کرتا تھا تم بھی انعامات دیتے رہنا۔ دور سے آنے والے سفیر کوئی ناراضی لے کر نہ جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کے سفیروں میں ایک سفیر اور بھی تھا جس کو آپ نے حمیرا علاقے دو

وثائق بھی کہہ سکتے ہیں۔ شعبہ مراسلات اور وثائق کا کام رسول اللہ ﷺ کی خط وکتابت اور دوسرے سربراہوں اور حکمرانوں سے مراسلت کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ اس شعبہ میں سب سے نمایاں خدمات حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت انجام دیا کرتے تھے۔

اس شعبہ میں عربی کے علاوہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی دستاویزات تیار کی جاتی تھیں۔ عبرانی زبان ان یہودیوں میں مروج تھی جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، جبکہ اور خیبر کے یہودیوں میں غالباً سریانی زبان مروج تھی۔ غالباً ان کی علمی زبان سریانی ہوگی۔ وہاں سے جو تحریر آتی تھی وہ سریانی میں آتی تھی اور حضور کا جواب عربی زبان میں جاتا تھا۔ جب ان کا خط آتا تھا تو پڑھنے کے لئے کسی یہودی کو بلاتے تھے۔ آپؐ نے حضرت زید بن ثابت سے فرمایا کہ مجھے یہودیوں پر بھروسہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ترجمہ کرکے بتادیں۔ اس لئے تم جاکر سریانی سیکھ لو۔ وہ یہودیوں کے ایک مدرسہ میں گئے جو مدراس کہتے ہیں۔ انہوں نے سترہ دنوں میں سریانی زبان سیکھ لی اور واپس آگئے۔ وہ سریانی کے علاوہ بھی کئی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں میں رسول اللہ ﷺ کی مدد کیا کرتے تھے۔ دستاویزات کا ریکارڈ بھی رکھا کرتے تھے۔

یہ بات بہت سے سیرت نگاروں نے نقل کی ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی تھی۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ عرب کے یہودی خط وکتابت تو عربی ہی میں کرتے ہوں گے، لیکن ان کا رسم الخط عبرانی یا سریانی ہوگا۔ شاید اسی لئے حضرت زید بن ثابتؓ نے سترہ دنوں میں یہ زبان سیکھ لی ہوگی۔ بہرحال عام انداز کی مراسلت حضرت زید بن ثابتؓ کے ذمہ تھی۔ جب کوئی اہم معاہدہ ہوتا تھا تو عموماً سیدنا علی بن ابی طالب تحریر فرمایا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ سمیت کئی معاہدے سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

'وزارت خارجہ' کے ماتحت ایک شعبہ مہمانداری بھی تھا۔ اس کے سربراہ کچھ زمانے تک حضرت بلال رہے۔ پھر ایک صحابی معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی، جو حضرت ابوہریرہ کے قبیلہ کے تھے، اس شعبہ کے نگران ہوئے۔ ان کو آپ افسر مہمانداری یا کہہ لیں کہ چیف آف پروٹوکول کہہ لیں۔ دار الکبریٰ کے نام سے ایک بڑا مکان تھا۔ یہ مکان حضرت عبدالرحمٰن بن

عوف نے مدینہ میں اپنی تجارت چل پڑنے کے بعد بنایا تھا۔ انہوں نے حضور کے کہنے پر یہ مکان خالی کر کے شعبہ مہمانداری کو دے دیا۔ یہاں باہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جب تعمیر ہو رہا تھا تو کئی مرتبہ حضور اس کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس مکان میں کھجوروں کے کئی درخت بھی تھے اور حضور کے مہمان اس مکان میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

ایک دوسرا مکان تھا جو ایک خاتون رملہ بنت حارث کا تھا۔ انہوں نے بھی ایک بہت بڑا مکان بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ باہر سے آنے والا کوئی وفد یا کسی قبیلہ کا سفیر اس مکان میں بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب بنو حنیفہ کا وفد آیا تو اس میں تین آدمی تھے۔ وہ سب کے سب حضرت رملہ کے مکان میں ٹھہرے۔ دونوں وقت کا کھانا نبی کی طرف سے آتا تھا۔ کھانے کی تفصیل بھی موجود ہے کہ ایک وقت کا کھانا دودھ اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرے وقت کا کھانا گوشت اور گھی پر مشتمل ہوتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اس انتظام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ 9 ہجری میں خالد بن سعید بن العاص چیف آف پروٹوکول تھے۔

ایک مرتبہ چار سو آدمیوں پر مشتمل قبیلہ مزینہ کا وفد آیا۔ وفد کا مقصد پہلے سے موجود معاہدہ کی تجدید اور از سر نو اسلام میں داخل ہونا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق سے جو وزیر خارجہ تھے، ان کی دیکھ بھال اور مہمانداری کا بندوبست کرنے کے لئے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ بڑے وفد کے لئے زیادہ ذمہ دار شخص سے کہا جائے گا۔ چھوٹے وفد کے لئے کم ذمہ داری والے افسر سے کہا جائے گا۔ تو آپ نے گویا اپنے وزیر خارجہ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی۔ جب وفد کی روانگی کا وقت آیا تو آپ نے حضرت عمر فاروق سے فرمایا کہ روانہ ہوں تو ان کو جاتے وقت خاص مقدار میں زاد راہ دے دینا۔

حضرت عمر نے عرض کیا کہ اتنے زیادہ لوگوں کو خاص مقدار میں زاد راہ کہاں سے دے دوں۔ آپ نے فرمایا کہ کہیں سے بھی دے دو۔ یہ تفصیل روایت میں موجود ہے۔ حضرت عمر مختلف جگہوں پر گئے اور جو نہ ملا۔ یہ چار سو آدمیوں کو کیا زاد راہ دوں۔ واپس آکر حضور سے شکایت کی کہ اتنے زاد راہ کا انتظام مشکل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ رملہ بنت حارث کے جس مکان میں وفد کو ٹھہرایا ہے اس میں بہت کھجوریں لگی ہیں وہاں سے توڑ کر دے دو۔ حضرت عمر

کہتے ہیں کہ میں یہ بھی لگا کر وہاں گیا تو دیکھا کہ کھجوریں اتنی نہیں تھیں کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے لئے کافی ہوتیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ حضورؐ نے جیسے فرمایا ہے اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک آدمی کو کھجوریں تول کر دینے پر لگایا اور ایک دوسرا آدمی ٹوکریاں بھرنے لگا۔ باہر بیٹھا کر بنی مزینہ کے لوگوں کو دیتے رہے۔ چار سو آدمیوں کا زاد راہ مکمل ہو گیا اور درختوں میں کھجوریں جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ میں نے جا کر حضورؐ کو اطلاع دی کہ سب کو زاد راہ مل گیا ہے۔

رملہ بنت حارث کے مکان کے بارے میں سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ گویا دار الوفود ــــــــ بہت بڑی حویلی تھی۔ دار گھر کو نہیں بلکہ حویلی کو کہتے ہیں جس میں کئی گھر ہوں۔ اس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور وفود عرب کو اس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک وقت میں کئی کئی وفود آ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں بعض وفود حضرت عبدالرحمن بن عوف کے گھر میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ کا مکان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ضرورت اگر باقی رہتی تو مسجد نبوی کے صحن میں اور باہر خیمے لگوا کر مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔

بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے ایک بڑا اہم میدان بین الاقوامی قانون ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون کا ماخذ تو سیرت نبوی ہی ہے۔ ان دونوں کا انتہائی گہرا ربط ہے جس کی طرف کئی بار اشارے کئے جا چکے ہیں۔ اسلام کا سارا بین الاقوامی قانون نکلا ہی سیرت سے ہے۔ ایک بات اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ مغربی مصنفین تو خیر جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ بات آج کل کا انٹرنیشنل ہیومینیٹیرین لاء International Humanitarian Law ہے۔ پچھلے تیس چالیس سال میں بین الاقوامی قانون میں ایک نئی شاخ، ایک نئی جہت یا پہلو سامنے آیا ہے جس کو International Humanitarian Law کہتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون تو ریاستوں کے درمیان تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ انٹرنیشنل ہیومینیٹیرین لاء یعنی آئی ایچ ایل کا مقصد یہ ہے کہ جنگ سے متاثر ہونے والے زخمی، شہری، پناہ گزین، قیدی اور اس طرح کے غیر محارب لوگوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور ان کو جنگ کے اثرات بد سے محفوظ رکھا جائے۔ اس پر ایک نیا قانون سامنے آیا ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے

معاہدات کی بنیاد پر یہ قانون مرتب ہوا ہے۔ اب تجویز ہے کہ اس پر عمل درآمد کے لئے عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ چنانچہ بعض عدالتیں بنی ہیں۔ International Criminal Court قائم ہوئی ہیں۔ بعض دوسری عدالتوں اور جوڈیشل فورم کی تشکیل کا مسئلہ زیر غور ہے۔

لیکن تاریخ میں پہلی مرتبہ بین الاقوامی قانون کی ایسی ہدایات، جن میں آئی ایچ ایل کے بنیادی احکام دیے گئے ہوں وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دی گئیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب بھی صحابہ کرام پر مشتمل دستہ بھیجا۔ یا خود قیادت فرماتے ہوئے تشریف لے جاتے تو تین چار چیزوں کی ہدایت اور تاکید بہت اہتمام سے فرماتے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو آج آئی ایچ ایل کے چار بڑے معاہدات میں مرتب کی گئی ہیں۔ آئی ایچ ایل کے کنونشن نمبر ایک، دو اور تین، ان معاہدات کو آپ انہی نبوی ہدایات کی تشریح کہہ سکتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں 'الا لا یجھزن علی جریح' میدان جنگ میں دشمن کا فوجی اگر زخمی ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ زخمی ہے تو اٹھالیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ 'ولا یتبعن مدبر' کوئی اگر فرار ہو جائے تو اس کا پیچھا کر کے اس کو پکڑنے یا مارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ 'ولا یقتل اسیر' کوئی جنگی قیدی ہو جائے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ 'ومن اغلق علیک بابہ فھو آمن' اور اگر کوئی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے تو اس کو بھی امان دے دی جائے۔

اسی طرح سے ایک اور دستاویز ہے جو کئی لوگوں نے نقل کی ہے۔ امام ابوعبید نے کتاب الاموال میں نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی دستہ بھیجتے تھے۔ یا کسی امیر کو سربراہ مقرر کرتے تھے اور اس کو جن چیزوں کی ہدایت فرماتے تھے وہ بھی چار چیزیں ہوتی تھیں۔ اس میں یہ چار جملے بھی خاص طور پر ہوتے تھے۔ 'لا تغلوا'، دھوکہ مت دینا، مال میں ہیرا پھیری مت کرنا۔ 'ولا تغدروا'، کسی سے غدر، خیانت اور وعدہ شکنی نہ کرنا۔ 'ولا تمثلوا' اور کسی مردہ کی لاش کی بے حرمتی مت کرنا، mutilate مت کرنا۔ 'ولا تقتلوا ولیدا' کسی بچے کو قتل مت کرنا۔ 'ولا امراۃ' نہ کسی عورت کو قتل کرنا، کسی پادری یا مذہبی شخصیت کو قتل مت کرنا۔ یہ ساری ہدایات اس میں لکھی ہوتی تھیں۔

ریاست مدینہ میں وزراء بھی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے آج کی طرح کی وزارتیں نہیں ہوتی تھیں کہ الگ الگ وزارت اور عملہ ہو۔ البتہ مختلف معاملات پر مشورہ لینے کے لئے اور وغیرہ

فلاں فلاں غزوے میں لکھا جا چکا ہے۔ اکتتبت فی غزوۃ کذا و کذا۔ ایک نوجوان نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں اسے پہلے حج کرا دوں، جبکہ میں فلاں غزوہ میں لکھا جا چکا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ غزوہ سے پہلے جاؤ اور بیوی کو حج کرواؤ۔ ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ بعض بدل کر دوبارہ حاضر ہوئے اور وہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیوی کو حج کے لئے لے جاؤ۔ تیسری مرتبہ جب اسی طرح کیا تو حضور نے پہلے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر فرمایا کہ پہلے بیوی کو حج کرواؤ اس کے بعد غزوہ کرنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر غزوہ میں جانے والے شرکا کی ایک فہرست بنتی تھی۔ اس کے مطابق لوگ جاتے تھے اور اس کے مطابق ساری کارروائی ہوتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو طرح کے ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ کچھ ہتھیار تو وہ ہوتے تھے جو ہر فرد کے اپنے ذاتی ہوتے تھے۔ عرب میں قبائلی معاشرہ تھا۔ ہمارے ہاں کے قبائلی معاشرہ میں بھی ہر فرد کا ذاتی اسلحہ الگ ہوتا ہے۔ عرب میں بھی یہی معاملہ تھا۔ اس ذاتی اور انفرادی اسلحہ کے علاوہ کچھ بڑا اسلحہ تھا جو ریاست کی ملکیت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں یمن کی طرح جو علاقے زیادہ متمدن اور بڑے تھے وہاں دو بڑے ہتھیار بھی استعمال ہوتے تھے۔ ایک منجنیق اور دوسرا دبابہ کہلاتا تھا۔ میں نے ایک جگہ منجنیق کی تصویر دیکھی ہے۔ اس کو آپ موجودہ دور کے ٹینک یا توپ کا ایک ابتدائی ماڈل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ فوج کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ اس کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک بہت بڑا وزنی پتھر لے کر قلعوں کی دیواریں توڑنے کے لئے دور سے پھینکا جاتا تھا۔ تاکہ قلعہ بند دشمن کے قلعہ کی دیوار توڑ کر اندر داخل ہوا جائے۔ یہ بہت سادہ سی چیز ہوتی تھی۔ اس میں ایک بڑے پتھر کو رسیوں اور بانسوں کے زور سے بہت قوت کے ساتھ دور تک مارا جا سکتا تھا۔ اس سے قلعہ کی دیوار ٹوٹ جایا کرتی تھی۔ یہ چیز عرب کے شہروں یعنی مکہ، طائف، مدینہ وغیرہ میں نہیں تھی۔ یمن میں ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے دو صحابہ کرام کو یمن سے منجنیق چلانے کا طریقہ سیکھنے اور ایک منجنیق خرید کر لانے کے لئے بھیجا۔ وہ اس کو بنانے اور چلانے کی تربیت بھی حاصل کر کے واپس آئے۔ غیر مسلموں سے بڑے ہتھیاروں کے بنانے کی تربیت حاصل کرنا، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طرح سے ہالینڈ سے سیکھ کر آنا، یہ صحابہ کرام کی سنت ہے۔ صحابہ کرام

یمن سے منجنیق بھی لائے، اس کو بنانے اور استعمال کرنے کی تربیت بھی لے کر آئے۔ حضور ﷺ نے اس کو طائف کی فتح میں استعمال بھی کیا۔

دوسرا اسلحہ دبابہ تھا۔ آج کل عربی میں ٹینک کو دبابہ کہتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں دبابہ سے مراد ایک ایسی سواری تھی جس کو لکڑی یا لوہے کی چھت سے ڈھک دیا جاتا تھا اور اس پر کوئی ایسی چیز لگا دیا کرتے تھے جس پر تیر اثر انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ جب قلعہ میں داخل ہونے کے لئے کسی اور طریقے سے دشمن کے قریب جانا ہوتا تھا تو دبابہ سے دشمن پر تیروں کی بارش ہوتی تھی وہ دبابہ خود تیراندازوں سے محفوظ رہتا۔ دبابے میں کچھ چیدہ سپاہی بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ قلعہ کے قریب جا کر اس کا دروازہ یا دیوار توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ اس دور کے دبابہ کو آج کی بکتر بند گاڑی کا پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل ابن ہشام نے بھی لکھی ہے اور الروض الانف نے بھی لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے سراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم فرمایا۔ اس کی دو شکلیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض افراد مستقل طور پر مختلف قبائل میں اس کام پر مامور تھے کہ وہ اس قبیلے میں اسلام کے خلاف جو بھی تیاریاں ہورہی ہوں ان کے بارے میں معلومات سے اسلامی ریاست کو مطلع کیا کریں۔ چنانچہ حضرت عباس کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ قریش مکہ کی تیاریوں سے حضور ﷺ کو مطلع فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کررہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ اس کی درجنوں مثالیں ہیں اور کتب المغازی میں واقدی نے تقریباً ہر موقع پر ایک آدھ روایت ایسی دی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سراغ رسانی کا ایک منظم اور موثر شعبہ موجود تھا۔ اس پر ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک مضمون بھی ہے Military Intelligence During the Life Time of the Prophet of Islam کے عنوان سے۔ یہ مضمون Pakistan Historical Society کے جرنل میں چھپا ہے۔ یہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ counter intelligence یعنی جوابی سراغ رسانی کا بھی ایک شعبہ تھا جو دشمن کی اپنی جاسوسی کو غیر موثر بنانے اور ان کو غلط معلومات فراہم کرکے گمراہ کرنے کا کام کرتے تھے۔

امور خارجہ اور عسکریات کے علاوہ جو سب سے اہم شعبہ تھا وہ عدلیہ یعنی عدل وقضا تھا۔ اسلام آیا ہی عدل کے لئے ہے۔ اسلام کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اس لئے پہلی چیز جس کی طرف میثاق مدینہ میں بھی بار بار اشارہ موجود ہے اور حضور کے انتظامات میں بھی نظر آتا ہے کہ امیر یا حاکم کی ذمہ داری عدل و قضا کا بندوبست تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین عدالت کی تھی۔ آج بھی ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو بہت سے ممالک میں اپیل کے اختیارات حاصل ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہیڈ آف دی اسٹیٹ کو اپیلیٹ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی نبی اور سربراہ ریاست کے طور پر دو حیثیتیں تھیں۔ دونوں حیثیتوں میں حضور علیہ السلام کو آخری عدالت اپیل کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل میں الگ الگ قاضی بھی مقرر فرمائے۔ بعض افراد کو معلم اور قاضی دونوں کی ذمہ داریاں دیں۔ چنانچہ مشہور حدیث کے مطابق حضرت معاذ بن جبل کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا گیا۔ یہ حضرات مختلف قبائل میں جو قاضی مقرر تھے وہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا فیصلہ confirmation کے لئے بعض صورتوں میں مدینہ منورہ بھیجا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ قاضی کو پتہ نہیں چلا کہ اس معاملہ میں صحیح حکم کیا ہے یا ان کو تامل ہوا تو انہوں نے توثیق کے لئے اپنا فیصلہ حضور ﷺ کو بھیج دیا۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ از خود suo moto کارروائی کیا کرتے تھے اور خود ہدایت دیتے تھے کہ فلاں معاملہ کا فیصلہ اس طرح کرو۔

حضرت عتاب بن اسید جو مکہ مکرمہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے سامنے قبل از اسلام کے ایک سودی معاملہ سے متعلق دعویٰ کا مقدمہ آیا۔ مدعی کا دعویٰ تھا کہ یہ تو سود کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اس لئے سود کی حرمت کے باوجود بھی مجھے اپنے سابقہ واجبات کو حاصل کرنے کا استحقاق ہے۔ عتاب نے حضور علیہ السلام کو خط لکھا اور تفصیل بتا کر حضور سے رہنمائی کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے دربار میں ریفرنس بھیجے جاتے تھے اور آپ عدالتوں کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔

ایک بار ایک قبائلی سردار کا قتل ہو گیا۔ تو قاتلین نے دیت ادا کی اور اس کی اطلاع حضور کی خدمت میں بھیجی گئی کہ دیت ادا کر دی گئی ہے۔ یہ بات خواتین کے لئے شاید خاص دلچسپی کی ہوگی

کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں اس مقتول کی بیوہ کو دیت میں حصہ دیا گیا ہے یا نہیں۔ اس خیال کی بنیاد پر کہ حضور ﷺ نے اس علاقہ کے گورنر کے نام ایک نامہ مبارک لکھا کہ قاتل مقتول کی دیت اور ترکہ میں اس کی بیوہ کو اس کا حصہ دلوایا جائے اور مجھے اطلاع دی جائے کہ یہ کام ہوگیا یا نہیں۔ اس طرح سے حضور نے ایک موثر اور مرتب ہیئت کا حامل صیغہ عدالت قائم فرمایا۔

حضور ﷺ نے بطور قاضی کے جو فیصلے کئے وہ الگ سے جمع کئے گئے ہیں۔ اقضیۃ الرسول کے نام سے ایک قدیم ترین کتاب ہے جو اسپین کے ایک بزرگ امام محمد بن الفرج القرطبی نے لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی دربار رسول کے فیصلے کے نام سے چھپا ہے۔

امام ابو بکر بن ابی شیبہ مشہور محدث ہیں۔ امام ابو داؤد اور امام ترمذی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مسند ابن ابی شیبہ ان کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ انہوں نے بھی اقضیۃ الرسول پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کئی کتابیں اور بھی اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضور کے بہت سے فیصلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے بھی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی تھی۔ پاکستان میں حال ہی میں ہماری سپریم کورٹ کے سابق رجسٹرار جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان کی رہنمائی اور تعاون سے ایک کتاب دس بارہ جلدوں میں تیار ہو رہی ہے۔ اس کی پہلی جلد چھپی ہے جس میں حضور ﷺ کے کئے ہوئے تمام فیصلے اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں جمع کئے گئے ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جن لوگوں کو قاضی مقرر فرمایا ان میں سیدنا عمر بن الخطاب کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی موجودگی میں مدینہ میں متعدد مقدمات کے فیصلے حضرت عمر کرتے تھے۔ یمن کے ایک علاقے میں حضرت علی بن ابی طالب اور ایک دوسرے علاقے میں حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا تھا۔ حافظ شامی نے سیرت شامی کے آٹھ ابواب میں سے ایک پوری فصل میں یہ فیصلے جمع کئے ہیں۔ آج Ombudsmann کا اردو ترجمہ ہے۔ امبڈزمین کے ادارہ کے بارے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تصور سویڈن سے آیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس ادارہ کا آغاز سویڈن میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور

حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو دیوان مظالم کے نام سے ترقی دی۔ دیوان مظالم دراصل ایک اعلیٰ سرکاری عدالت تھی جو اعلیٰ سرکاری حکام اور بااثر لوگوں کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف شہریوں کی شکایات سنا کرتی تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں اس کا بندوبست بعض علاقوں میں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو باقاعدہ شکل دی۔ اس کے بعد دنیائے اسلام کے بیشتر مسلم ممالک میں یہ ادارہ قائم رہا۔ اسپین سے اس کو یورپیوں نے سیکھا۔ وہاں سے بعض یورپی غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں اس ادارہ کے بارے میں واقفیت حاصل کر گئے۔ انگلستان میں پارلیمنٹری کمیشن اور سویڈن میں اومبڈز مین کے نام سے یہ ادارہ بنایا گیا۔ اس وقت دیوان مظالم کے نام سے یہ ادارہ صرف سعودی عرب میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں یہ ادارہ چودہ سو سال سے مسلسل قائم ہے اور کسی نہ کسی حد تک اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں ماضی میں کام کرتا تھا۔

صیغۂ احتساب بھی اسی زمانے میں قائم ہوا تھا جس کو ہمارے صوبہ سرحد میں حسبہ کے نام سے قائم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ جس کو ہمارے اخبار والے حسبہ لکھتے ہیں۔ یہ لفظ حسبہ نہیں ہے بلکہ صحیح کے نزدیک حسبہ ہے یعنی احتساب۔ یہ محتسب ایک ایسا نیم عدالتی ادارہ ہے جو اس کام کے لئے قائم کیا جاتا تھا کہ عام معاشرتی اخلاق کا تحفظ کرے اور اسلام کے معاشرتی اخلاق کے بارے میں نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں انجام دے۔ یہ ادارہ بھی حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔

یہ وہ عدالتی ادارے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمائے۔ مدینہ منورہ میں جو غیر مسلم رہتے تھے ان سے بھی ریاست کے امور میں کام لیا جاتا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایسی ذمہ داریاں جو ریاست کے strategic interests سے متعلق ہیں، یا شریعت کی فہم اور تعبیر سے متعلق ہیں وہاں غیر مسلم کا تقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جو فنی مہارت کے معاملات ہیں وہاں غیر مسلموں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے اہم ترین مواقع پر غیر مسلموں سے کام لیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے اور ہر عرب قبیلہ سو اونٹوں کے لالچ میں آپ کی جان کے درپے تھا تو آنحضورؐ کو راستہ بتانے کے لئے جو آدمی رکھا گیا وہ عبد اللہ

بن اریقط ایک غیر مسلم تھا۔ اس غیر مسلم پر حضور نے اعتماد کیا اور وہ نہایت قابل اعتماد آدمی ثابت ہوا۔ اگر وہ سو اونٹوں کی لالچ میں آ کر حضور کو گرفتار کرانا چاہتا تو اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ لیکن حضور کا انتخاب دیکھئے کہ آپ نے جس آدمی کا چناؤ کیا اس نے ایک دوسرے راستے سے حضور کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ حضرت عمرو بن امیہ الضمری کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ حضور کے ہاں بھی سفیر رہے۔ جب وہ بطور سفیر پہلی مرتبہ بھیجے گئے تو اس وقت وہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ بات ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی فرانسیسی سیرت کی جلد اول میں لکھی ہے۔

اسی طرح سے کئی اور غیر مسلم حضرات سے کام لیا گیا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ غیر مسلموں سے ایسی اطلاعات مل جاتی تھیں جن کو دینا ان کی نیت میں نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ بدر کے موقع پر تشریف فرما تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اب تجارتی قافلہ سے نہیں بلکہ قریش کے لشکر سے ہی مقابلہ ہوگا۔ ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ لشکر میں کتنے آدمی ہیں۔ حضور نے دو صحابہ کرام کو اس غرض کے لئے بھیجا کہ دشمن کی تعداد کا پتہ لگائیں۔ وہ کوشش کے باوجود بھی تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ ایک لڑکا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس کو مشکوک سمجھ کر ساتھ لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ صحابہ نے لڑکے سے قریش کی فوج اور قافلے کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرام کو خیال تھا کہ یہ لڑکا تجارتی قافلہ میں شریک ہے اور اس کے بارے میں معلومات کو چھپا رہا ہے۔ لڑکا کہنے لگا کہ میں نے قافلہ نہیں دیکھا۔ البتہ قریش کا لشکر دیکھا ہے۔ صحابہ نے اس پر سختی کی تو اس نے تسلیم کیا کہ ہاں میں نے قافلہ کو دیکھا ہے۔ اسی دوران رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ سچ بول رہا تھا تو تم اس کو مار رہے تھے جب اس نے جھوٹ بولا ہے تو تم نے چھوڑ دیا۔ اس نے قافلہ کو نہیں بلکہ لشکر ہی کو دیکھا ہے۔ آپ نے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے قریش کے لشکر کو دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میں ان کو وہاں قیام کرتے دیکھ کر آیا ہوں۔ پوچھا کہ لشکر میں کتنے آدمی تھے تو اس نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ صحابہ کرام نے سمجھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تم نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے۔ آپ نے پوچھا یہ بتاؤ کہ کتنے اونٹ ذبح کر کے کھاتے ہیں۔ اس نے کہا ایک دن میں نے دیکھا تو اونٹ ذبح ہوئے تھے ایک اور دن دیکھا دس اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ

نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں اور واقدی وغیرہ کے نزدیک تھے۔ ان کی تعداد بھی نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہی تھی۔

یہ شعبہ جو حضور نے معلومات اور سراغ رسانی کا قائم فرمایا اس میں تین ذیلی شعبے تھے۔ قرآن پاک میں ایک جملہ آیا ہے ولا تجسسوا ایک دوسرے کا تجسس نہ کرو۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس میں تو جاسوسی سے منع کیا گیا ہے تو پھر جاسوسی کا شعبہ کیسے اسلامی ہو سکتا ہے۔ آج بھی اسی طرح سے ایک ذمہ دار آدمی آکر پوچھ رہے تھے کہ جناب! میں قرآن کی تفسیر پڑھ رہا تھا کہ یہاں پر حکم لا تجسسوا نظر آگیا۔ ہمارا تو کام ہی تجسس ہے۔ ہم کیا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ عربی زبان میں تین الفاظ ہیں۔ ۱: تجسس ۲: تحسس ۳: تعسس۔ تجسس کا مطلب ہے کسی شخص یا فرد کی خامیوں کی ٹوہ لگانا۔ یا بنی اذهبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ جاؤ اور یوسف کے بارے میں پتہ چلاؤ۔ ایک تحسس ہوتا ہے جو کسی جرم کو روکنے کی خاطر اور کسی برائی کو وجود میں آنے سے پہلے ختم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ تعسس وہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سرزد ہوئی ہو اور اس برائی کے بعد تحقیق کی جائے۔ یہ تجسس ہے جس کی ممانعت ہے۔ تحسس اور تعسس کی ممانعت نہیں ہے۔ وہ سنت اور سیرت سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں کی آبادیاں مدینہ کے باہر بھی تھیں۔ جو قبائل اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض مراعات عطا فرمائیں۔ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا کہ من کان علی یہودیتہ او علی نصرانیتہ فانہ لا یفتن عنها۔ جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم ہے اس کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نجران کے عیسائیوں کو ایک چارٹر عطا کیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ان کو تمام حقوق اور مراعات دیئے جا رہے ہیں۔ ان کے پادریوں اور گرجوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ وہ اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے۔ لیکن وہ اخلاقی شریعت کی بالادستی قبول کریں گے۔ مسلمانوں کو ٹیکس دیں گے اور سود کا کاروبار نہیں کریں گے۔ اس معاہدہ میں واضح طور پر یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے سود کا کاروبار کیا تو یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ گویا اگر ربا کا کاروبار کرو گے تو تمہاری شریعت منسوخ کر دی جائے

کی۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروق کو اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی سود کا کاروبار کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے یہ معاہدہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کو جلاوطن کرکے شام بھیج دیا گیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں جو سلوک غیر مسلموں سے ہوا اس ضمن میں ایک بات کرکے میں گفتگو ختم کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل سے جو معاہدے کئے تو ان قبائل کے سرداروں کو آپ نے اپنے نمائندے کے طور پر تسلیم کرلیا۔ بہت کم صورتیں ایسی ہوں گی کہ کسی نئے آدمی کو مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر صورتوں میں اسی آدمی کو مقرر کیا گیا۔ بعض صورتوں میں حضور نے دو چیزوں کی یقین دہانی کرائی۔ ایک لا یومر علیکم من لیس منکم، جو شخص تمہارے قبیلے سے نہیں ہے اس کو تم پر امیر مقرر نہیں کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی کرائی کہ تمہارے عمال تمہارے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ باہر سے عمال کا تقرر کیا جانا قبیلوں اور علاقوں کے لئے مسئلہ ہے۔ دوسری یہ یقین دہانی فرمائی کہ تمہارے اپنے وسائل جو کچھ ہیں اور پانی وغیرہ کی صورت میں ہیں وہ تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور کوئی ان کو تمہاری رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کرسکے گا۔ یہ بھی علاقوں کا مسئلہ ہے کہ ہمارے وسائل دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ کسی علاقے کے لوگوں کو یہ شکایت یا خیال ہو جائے کہ ہماری دولت فلاں کھا گیا یا فلاں کھا گیا تو اس سے ریاست کی وحدت اور سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ بہت دنوں سے رہتا ہے۔ اگر پہلے دن سے یہ دو چیزیں طے کی گئی ہوتیں کہ تمہارے صوبے پر تمہارے ہی آدمی کو مقرر کیا جائے گا، تمہارے وسائل تمہارے ہی کنٹرول میں رہیں گے اور تمہاری ہی اجازت سے استعمال ہوں گے تو شاید پاکستان نہ ٹوٹتا۔

۔۔۔

سوال و جواب

حضور ﷺ نے جو مہمات غزوہ بدر سے پہلے بھیجی تھیں وہ اس بات کی علامت تھیں کہ قریش مکہ کے ساتھ لڑائی کا آغاز نبی ﷺ نے کیا تھا۔ حالانکہ اصل مقصد دین کا غلبہ تھا۔

میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ ہجرت کے فوراً بعد جو مہمات بھیجی گئیں وہ سب پر امن سفارتی مہمات تھیں۔ ان کا مقصد جنگ یا ہتھیاروں کا استعمال نہیں تھا۔ ہتھیاروں کا استعمال تو قرآن پاک کی اس آیت کے بعد کیا گیا جس میں فرمایا گیا کہ اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضور غزوہ بدر کے لئے نکل رہے تھے۔ اس سے پہلے تو اجازت ہی نہیں تھی۔ اس لئے ہجرت کے فوراً بعد کے مہینوں میں کسی فوجی اور عسکری مہم کا بھیجا جانا اسلام کے مزاج اور رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار کے مطابق نہ ہوتا۔ اس وقت جو مہمات بھیجی گئیں وہ خالصتاً پر امن اور سفارتی تھیں۔ ان کو صرف اصطلاحاً غزوہ یا سریہ کہا جاتا ہے۔ وہ فوجی مہمات نہیں ہیں۔

☆☆

آپ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے مختلف قبیلے مختلف مذاہب اور تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں ایک مرکزی حکومت قائم کی تھی۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج کل کی وفاقی ریاستوں کے مشابہ تھی۔

ممکن ہے کہ یہ ریاست وفاقی نظام سے مشابہ ہو۔ در اصل اس کو وفاقی ریاست بھی کہا جا سکتا ہے۔ کامن ویلتھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جزوی طور پر وہ وفاقی ریاست سے بھی مشابہ تھی

اور جزوی طور پر تاسیس وطن کے ساتھ بھی مشابہ تھی۔

☆

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی روشنی میں پاکستان کے لوگوں کو
سیاست پر زور دینا چاہئے یا دعوت و تبلیغ کے ذریعے اسلامی
اقدار پھیلانے پر زور دینا چاہئے۔

میرے خیال میں تو سیاست پر زور دینے اور تعلیم و تربیت کو نظر انداز کرنے سے ہی سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بات میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ سیرت مبارکہ کی روشنی میں کام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اسلامی اقدار، اخلاق اور تمدن، دعوت و تبلیغ کے ذریعے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد جب اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق وجود میں آجائیں تو پھر ان کے تحفظ کے لئے ریاست کی ضرورت پڑتی ہے۔ ریاست مقصد نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

☆

کیا حضور کے زمانے میں مدینہ اور خیبر کے علاوہ دوسرے
مراکز میں بھی یہودی آباد تھے؟ آج کل کے دور میں
سرزمین مدینہ پر یہود کا حق ملکیت تاریخی اعتبار سے کس حد
تک درست ہے؟

حضور کے زمانے میں مدینہ اور خیبر سے باہر بھی بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے۔ مدینہ اور جزیرہ عرب میں تو یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کچھ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر جزیرہ عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے اور یہ ان کی اولاد ہے۔ یہ کہا جاتا ہے، ممکن ہے صحیح ہو۔ یہودیوں کی بڑی تعداد بہرحال جزیرہ عرب سے باہر آباد تھی۔ اس لئے مدینہ منورہ پر ان کا دعویٰ کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اگر سابقہ سکونت کو دعووں کی بنیاد مان لیا جائے تو اسپین پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ پرتگال اور یہاں تک کہ امریکہ پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ امریکہ کو

سب سے پہلے مسلمانوں نے دریافت کیا تھا اور وہاں ایک قوم جو سو فیصد مسلمان تھی اور جو چینی کہلاتی تھی آباد تھی۔ اس کا وجود ابھی کچھ دن پہلے دریافت ہوا ہے۔ انگریزی میں اس کو ظفر کہتے ہیں۔ ظفر میں تبلیغ اسلام کا کام بڑے زور و شور سے ہو رہا ہے۔ اگر پرانی تاریخی روایات کے حوالے سے ملکوں کی قسمت کے فیصلے ہونے لگیں تو پوری دنیا کا نقشہ بدلنا پڑے گا۔ اس کے لئے دنیا شاید تیار نہ ہو۔

☆

مدینہ کا پرانا نام یثرب کیوں تھا؟

مجھے نہیں معلوم کہ مدینہ کا پرانا نام یثرب کیوں تھا۔ تاہم بہت سے عرب مؤرخین نے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح یثرب کو اس شہر کے بانی کا نام بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

☆

میثاق مدینہ کے بعد حضور کے حکم پر صحابہ کرام کی چھاپہ مار
کارروائیاں کس حد تک درست تھیں؟

ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ جس چیز کو آپ چھاپہ مار کارروائیاں کہہ رہے ہیں وہ غزوہ بدر کے بعد شروع ہوئیں۔ غزوہ بدر کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد چھاپہ مار کارروائیاں درست تھیں۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ شروع ہو جائے اور پاکستان کی نیوی یہ محسوس کرے کہ ہندوستان کا کوئی تجارتی جہاز پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اسلحہ لے جا رہا ہے اور پاکستان کی نیوی اس کو روکے تو یہ بالکل حق بجانب ہوگا۔ دنیا کے ہر قانون اور اخلاق کی رو سے اس کی اجازت ہوگی۔ اس لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے قریش کے جو تجارتی قافلے روکے وہ جائز تھے اور ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جو قافلے روکے گئے وہ صرف دو تھے۔ اس کا مبالغہ آمیزی سے ذکر ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بہت سے قافلے روکے گئے ہوں۔ حضور ﷺ نے اصلاً جس قافلہ کو روکنے کے لئے

نکلے تھے۔ یہ وہ قافلہ تھا جو ہر دو فریق کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا بڑا واقعہ پیش نہیں آیا کہ جس میں تجارتی قافلے روکے گئے ہوں اور ان سے بہت مال و دولت حاصل کی گئی ہو۔

☆

کیا عبرانی لفظ مدرش اور مدراس ایک ہی ہے جس کے معنی وقف الگ ہیں؟

میں عبرانی نہیں جانتا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک لفظ ہے کہ دو ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں مدراس کا لفظ ملتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں یہودی مدرسہ چلایا کرتے تھے لیکن یہ دونوں ایک ہی لفظ ہوں۔

☆

دارالحرب اور دارالاسلام کو دورِ نبوی میں کس حیثیت سے دیکھا گیا۔

یہ دونوں اصطلاحات بعد کی ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں یہ اصطلاحات نہیں تھیں۔ یہ دوسری صدی ہجری کے اوائل کی اصطلاحات ہیں۔ فقہائے اسلام نے اپنے زمانے میں جب صورت حال کا جائزہ لیا تو اپنے فہم اور تصور کے مطابق اصطلاحات وضع کیں۔ اس وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک پوری دنیا دو حصوں یا دو داروں اور کیمپوں میں تقسیم تھی۔ دارالحرب اور دارالاسلام۔ امام شافعی کے نزدیک تین حصوں میں تقسیم تھی، دارالاسلام، دارالحرب اور دارالعہد۔ بعض اور فقہاء کے نزدیک چار حصوں میں تقسیم تھی۔ یعنی دارالصلح، دارالحرب، دارالعہد اور دارالاسلام۔ یہ کوئی ایسی متعین اور سخت تقسیم نہیں ہے جس کا ذکر قرآن یا حدیث میں آیا ہو۔ یہ الفاظ اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے فقہاء کے فہم کی ترجمانی کرتے ہیں۔

☆

حضرت عباسؓ بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت حضور کے ساتھ تھے۔

> نتیجے کے طور پر وہ مسلمان شمار کیے جاتے تھے۔ پھر کفار مکہ کی طرف سے لڑتے ہوئے قیدی کیوں بنے؟ کیا ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے؟

ممکن ہے آپ کو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہو۔ لیکن جب وہ بدر میں کفار مکہ کی فوج کے ساتھ تشریف لا رہے تھے تو حضور نے فرمایا تھا کہ عباس قریش کے ساتھ بادل نخواستہ آ رہے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شخص کی زد تک آ جائیں تو اس پر حملہ نہ کرے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کو ان کی اصل حیثیت اور کیفیت کے بارے میں علم تھا۔ کسی بھی خفیہ کارندے کے بارے میں یہ اعلان نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں شخص ہمارا خفیہ کارندہ ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اجنبی والا سلوک کیا جائے۔ اس لئے اگر وہ بطور مسلمان کے خفیہ طور پر مکہ میں رہے تو یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ کفار مکہ کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیتے تو ان کا اعتماد ختم ہو جاتا۔ اس لئے ساتھ روانہ ہو گئے۔ میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت یا تضاد نہیں ہے۔

☆

> آپ نے فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد دعوت و تربیت ہے اور حکومت ایک ضرورت ہے۔ اس دور میں مختلف جماعتیں جو اسلامی حکومت کے لئے کام کر رہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں کیونکہ اجتماعی معاملات اللہ کی کتاب کے مطابق نہیں ہو رہے ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

یہ وضاحت تو آپ ان جماعتوں سے طلب کریں جو یہ کام کر رہی ہیں اور پوری قوم کو آپ کے بقول اجتماعی طور پر کافر قرار دے رہی ہیں۔ ان کی طرف سے میں کیسے وضاحت کر سکتا ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ ان کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے، اس کی روشنی میں وہ بات درست نہیں ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، جمعیت

علمائے پاکستان کا لٹریچر دیکھیں تو ان کا کہنا بھی ہے کہ ہم دراصل دعوت و تبلیغ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور دعوت و تبلیغ کے کام میں ایک غلط حکومت رکاوٹ بن سکتی ہے اس لئے حکومت کو بدلنے کا مقصد بھی ہمارا ایک ثانوی یا جزوی مقصد ہے۔ اس لئے نظری اعتبار سے وہ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو میں نے عرض کی۔

مولانا مودودی نے ماچھی گوٹھ میں غالباً 1956 میں ایک تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے پروگرام کے چار مدارج بیان کئے تھے۔ ایک تطہیر عقائد، دوسرا تعمیر عقائد، تیسرا اصلاح معاشرہ اور چوتھا اصلاح حکومت۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم ان چاروں پر کام کریں گے۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہی ہے اس لئے ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم الحمدللہ اجتماعی طور پر کافر نہیں ہیں۔ ہم اجتماعی طور پر بھی مسلمان ہیں اور انفرادی طور پر بھی مسلمان ہیں۔ پاکستان ایک مسلم اور اسلامی ریاست ہے۔ جیسے مسلمان انفرادی طور پر خطا کار ہو سکتے ہیں، اور گناہگار ہوتے ہیں، اسی طرح اجتماعی طور پر بھی مسلمانوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ اس طرح ہماری ریاست مسلمان ہے لیکن اس سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ ریاستی غلطیوں کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ پاکستانی ریاست یا پاکستانی معاشرہ کو کافر ریاست یا کافر معاشرہ کہنا میرے خیال میں غلط ہے۔ مسلمانوں کی یوں اجتماعی تکفیر کرنے والوں کو اللہ سے توبہ کرنی چاہئے۔

☆

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقرر کردہ نقیب اور عریف کی ریاستی ذمہ داریوں میں کیا فرق تھا؟

نقیب اور عریف تو مختلف سطحیں تھیں۔ عریف دس آدمیوں کا سردار تھا۔ نقیب دس عریفوں کا سردار تھا۔ نقیب کی ذمہ داری عریف کی نگرانی تھی اور عریف کا کام یہ تھا کہ اپنے قبیلہ کے دس آدمیوں کا دستہ تیار رکھے۔ ان کی ضروریات کی نگرانی کرے، ان کی تربیت کرے۔ ان

تے اور قبائلی سرداروں کے درمیان واسطہ بنتے۔ جب حکومت کو کسی بارے میں کوئی رائے درکار ہوتی تو اپنے لوگوں کے ساتھ مشورہ کر کے حکومت تک ان کی رائے پہنچا دیتے۔ یہ ایک طرح سے ایک بالواسطہ انتخاب کا نظام بھی تھا۔ ایک طرح سے لوکل گورنمنٹ سسٹم کا حصہ تھا اور ایک اعتبار سے قبائلی سسٹم کو زیادہ بہتر بنانے کا ایک طریقہ تھا۔

☆

کیا رسول اللہ ﷺ نے بینکاری کا کوئی نظام متعارف کرایا ہے؟

میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن جو مقاصد آج کل بینکاری نظام سے حاصل کیے جاتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے مطابق اس وقت بھی حاصل کیے جاتے تھے۔ لوگ اپنی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے۔ تجارت کے لیے قرض بھی حاصل کرتے تھے۔ مضاربہ اور مشارکہ کی صورت میں مشترکہ کاروبار بھی ہوتے تھے۔ ان سب کی مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں۔

☆

دشمن افواج کو گرفتار کرنے کے بعد اگر مسلمان افواج کے پاس جگہ نہ ہو یا اردگرد دشمن کی فوج موجود ہو اور حالات نازک ہوں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میجر موجود ہیں ان سے پوچھیں۔ میں نے تو کبھی فوج کی کمان نہیں کی، اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اسلامی احکام وہ ہیں جو میں نے بیان کیے۔ ان احکام کی روشنی میں جو آسان اور قابل عمل حل ہو وہ اختیار کرنا چاہیے۔ کسی زخمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کسی قیدی کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ دشمن کے فوج کے ساتھ جو کچھ درست ہے اس پر مثلہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ احکام ہیں ان کے مطابق جو مناسب

انتظام ہونا چاہئے۔

☆

میثاق مدینہ کے حوالے تاریخ کی کتب میں تو ملتے ہیں لیکن یہ
حدیث کی کتابوں میں بھی ہیں؟

بھی میں مسند احمد اور سنن ابی داؤد کا حوالہ دے چکا ہوں۔ ان دونوں کتابوں میں
اس کا ذکر موجود ہے۔

☆

سوال: محمد میاں نے عہد نبوی میں مشرکین مکہ کی طرف سے
اپنے لئے ایک وقت میں دس اونٹ ذبح کرنے کا لکھا ہے
کیونکہ عام دستور یہ تھا کہ سو آدمیوں کے لئے ایک اونٹ ذبح
کیا جاتا تھا۔

بھی بات تو میں نے عرض کی ہے کہ حضور نے اونٹوں کی تعداد سے اندازہ لگایا کہ لشکر کی
تعداد کتنی ہے۔ ایک دن نو اونٹ اور ایک دن دس اونٹ ذبح کئے گئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ
دشمن کی تعداد نو سو اور ہزار کے درمیان ہے۔

☆

ہمارے دین نے ہمیں یہ لکھا کہ غیر مسلموں کو اسلام کی
دعوت دیں۔ اگر ایمان لائے تو ٹھیک ورنہ ذمی بن کر رہے یا
پھر اس کے ساتھ جنگ ہے۔ امریکہ بھی آج کل یہی
کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنا سب کچھ میرے حوالے کرکے ذمی
بن کر رہو اور اگر نہیں مانتے تو جنگ کرو گے۔ اگر ہمارا دین
یہ کہے تو ٹھیک ہے اور اگر امریکہ کہے تو ظلم ہے؟

رکھتا ہو کہ لوگ اس کی تابعداری کریں، جب عامۃ الناس اس سے بیعت کر لیں تو یہ کافی ہے۔ اس طرح کے درجنوں حوالے دیئے جا سکتے ہیں جس میں عامۃ الناس کے اظہار اعتماد کو ریاست کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ نبی ﷺ کے عہد میں خاندانوں میں عہدے تقسیم کئے جاتے تھے۔ خاندانوں کی اہلیت کس بنیاد پر طے کی جاتی تھی؟

اسلام سے بہت پہلے، حضور کے جد امجد جناب قصی کے زمانے سے یہ تقسیم شروع ہوئی تھی۔ قبیلے کا سربراہ اپنی شخصی اور ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے چنا جاتا تھا۔ اس میں اس کا تجربہ، معیار، علم و فہم اور سمجھ یہ ساری چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اس کی مثال آپ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی شخصیتوں میں ملے گی۔ ان حضرات کی خوبیوں سے اندازہ کر لیں کہ وہ کس شان کے لوگ تھے۔ یہ سب اسلام لائے تو اپنے اپنے قبیلے کے سربراہ تھے۔ ابوجہل اپنے خاندان کا سربراہ تھا اور ایسی شخصی صفات اور صلاحیتوں کا حامل تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے قبول اسلام کی دعا مانگی تھی۔ اگر اسلام لانا اس کی قسمت میں ہوتا تو شاید حضرت عمر فاروقؓ کے مقام اور مرتبے کا حامل ہوتا۔ یہ طریقہ تھا سربراہ چننے کا۔ جو قبیلے کا سربراہ ہوتا تھا وہ اس قبیلے کو حاصل روایتی منصب کا مالک بھی ہوتا تھا۔

☆

بیت اللہ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ ابھی تک یہ اسی خاندان کے پاس چلی آ رہی ہے۔ کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ یہ چابی نسل در نسل منتقل ہوگی؟

آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ چابی تمہارے خاندان میں رہے گی۔ خالدۃ تالدۃ۔ اسی لئے یہ چابی اسی خاندان میں چلی آ رہی ہے۔

آپ نے فرمایا تھا کہ نبی کریمؐ کے زمانے میں عریف اور نقیب
کا ادارہ موجود تھا۔ کیا اس کو آج کے دور میں لوکل گورنمنٹ
سسٹم کہا جا سکتا ہے؟

جی ہاں، کہا جا سکتا ہے۔
ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق نے 1981-82 میں ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کو یہ کام کرنے کے لئے بھی کہا گیا تھا۔ اس کمیٹی میں میں نے عریف اور نقیب کی بنیاد پر لوکل گورنمنٹ کا ایک اسٹرکچر بنایا تھا۔ اب بھی اس کی کاپی میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ وہ خاکہ جنرل ضیاء صاحب کو بھیجا بھی تھا لیکن شاید انہوں نے یا ان کے رفقاء نے اس کو پاکستان کے لئے قابل عمل نہیں سمجھا۔

☆

حضور رحمت للعالمین تھے تو ان کو غزوات کی کیا ضرورت تھی؟

رحمت للعالمین ہی کا تقاضا ہے کہ بدمعاشوں، بدکرداروں اور ظالموں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔ یہ رحمت کے خلاف ہے کہ آپ ظالم اور مظلوم کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کریں۔ جس نے چوری کی ہے اور جس کے ہاں چوری ہوئی ہے ان دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولنا، جس نے قتل کیا ہے اور جو قتل ہوا ہے ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا عدل کے خلاف ہے۔ حضور رحمت للعالمین تھے۔ آپ کی رحمت کا سب سے بڑا تقاضا عدل ہے۔ جس کے قرآن میں بار بار اشارے ہیں۔ عدل اور رحمت کا تقاضا ہے کہ بدکاروں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔

☆

موجودہ دور کی سب سے بڑی اسلامی مملکت سعودی عرب کے
بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

آپ نے ہی بتایئے کہ وہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کس اعتبار سے ہے۔ اگر اس اعتبار سے ہے کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں تو پھر تو انڈونیشیا اور پاکستان زیادہ بڑی مملکتیں ہیں۔ اگر اس اعتبار سے کہ وہاں حرمین واقع ہیں تو بلاشبہ وہ سرزمین مقدس اور یقیناً قابلِ احترام ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق افسوس ہے کہ آج کی کوئی مملکت اسلامی مملکت نہیں ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام ہم سب کی آرزو ہے۔ وہ جب قائم ہوگی کہ معاشرہ اسلامی ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جب معاشرہ کے افراد کی اکثریت اسلام سے بے بہرہ ہو۔ عبادات کی پابند نہ ہو۔ چوری بدکاری جھوٹ اور اس طرح کے جرائم میں مبتلا ہو اور حکومت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسی قائم ہو جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

کسی نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے میں بہت امن تھا۔ آپ کے زمانے میں بدامنی کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ میرے جیسے لوگوں پر حاکم تھے میں تم جیسے لوگوں پر حاکم ہوں۔

☆

عہدِ حاضر میں یہودی نواز علما فرماتے ہیں کہ بیت المقدس میں جہاں پہلے ہیکل سلیمانی تھا۔ اسلامی رواداری کی بنیاد پر وہاں یہودی عبادت گاہ کی تعمیر کا حق تسلیم کیا جانا چاہئے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ جب حضرت عمر فاروق کے دور میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس وقت عیسائیوں سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدہ پر سیدنا عمر فاروق، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت خالد بن ولید اور حضرت معاذ بن جبل جیسے بڑے بڑے صحابہ کے دستخط تھے۔ اس میں عیسائیوں کے کہنے پر یہ شرط رکھی گئی تھی کہ یہودیوں کو بیت المقدس میں داخلہ کی اور آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ قرارداد نامہ عہدہ عمریہ کہلاتا ہے۔ دستاویز آج بھی موجود ہے۔ مسلمانوں نے اس دور سے لے کر 1908ء میں سلطان عبدالحمید خان کی خلافت کے خاتمہ تک اس کی پابندی کی۔ اس کے بعد مغربیت اور روشن خیالی کے نام پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع ہوئی جس کے نتائج آپ کے

جاتے ہیں۔

ہیکلِ سلیمانی یا بیت المقدس پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر یہودیوں کا کوئی حق تھا تو عیسائی یہ حق کب کا ان سے لے چکے تھے۔ مسلمانوں نے ایک معاہدہ کے تحت بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا اور مسلمانوں کو اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہئے۔ اگر آج کچھ پست ہمت اور پست حوصلہ لوگ تاریخ کو بھلانا چاہتے ہیں تو یہ ان کی پست حوصلگی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ قوموں کی تاریخ میں چالیس پچاس سال کوئی مدت نہیں ہوتی۔ چین کے ایک جزیرے پر پانچ سو سال سے پرتگال کا قبضہ ہے۔ ایک دوسرے جزیرے پر چار سو سال تک انگریزوں کا قبضہ رہا۔ لیکن چین نے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا اور بالآخر وہ جزائر خالی کرائے گئے۔ جزیرہ مکاؤ پر پانچ سو سال تک قبضہ رہا۔ پانچ سو سال گزرنے کے بعد خالی کرالیا گیا۔ فاکس لینڈ پر برطانیہ دو سو برس سے قابض ہے لیکن ارجنٹائن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہ تو بزدلی اور پست ہمت مسلمان قیادتیں ہیں جو دس پانچ دس سال ہی کے بعد حوصلہ ہار کر مسلمانوں کی چیز دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں، کسی مسلمان لیڈر کی ذاتی یا خاندانی جاگیر نہیں ہیں۔ نہ کسی بزدل اور پست حوصلہ لیڈر کے فیصلہ کی وجہ سے اسلام پابند ہے۔

☆

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمانہ جاہلیت کی جو باتیں اسلام میں رائج ہونے کی اجازت دے دی تھی وہ کون سی باتیں تھیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ جاہلیت کی ہر اچھی بات، ہر اچھا اخلاق اسلام میں رائج رہنے کی اجازت دی تھی۔ کاروبار کے تمام جائز طریقے مثلاً مشارکہ، مضاربہ، حضور نے ان کی اجازت دی۔ شادی بیاہ کے بہت سے طریقے تھے۔ ان میں سے جو طریقے اسلام کے مزاج کے مطابق تھے اس کی حضور نے اجازت دی۔ اس طرح کے جائز امور کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔

جب مقامی لوگوں کو اپنے اپنے وسائل کے حقوق حاصل ہوں گے تو مرکز کے ذرائع آمدنی کیا ہوں گے؟

مرکز کو زکوٰۃ کی آمدنی سے حصہ ملے گا۔ اس کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا۔ کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جائے گی۔ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جایا کرتی تھی۔ زکوٰۃ کا نظام حضور کے زمانے سے یہ چلا آرہا ہے کہ اس کا ایک حصہ مرکز کو ملتا تھا۔ مرکز کے پاس ان شاء اللہ وسائل کی کمی نہیں ہوگی۔ اسلام پر عمل درآمد سے وسائل میں کمی نہیں آئے گی۔ اسلام سے انحراف کے نتیجے میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام سے وابستگی کی صورت میں مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔

☆

حکومت ضرورت ہے مقصد نہیں۔ یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کردیں۔

حکومت مسلمانوں کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ اے مسلمانو تم حکومت قائم کرو۔ یہ کہا گیا ہے کہ تم امت قائم کرو۔ تم میں سے ایک امت ہونی چاہئے جو اچھائی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے۔ تم لوگوں کو اخلاق سکھاؤ۔

اس کام کو کرنے میں اگر حکومت رکاوٹ بنتی ہے تو اس کی اصلاح کرو۔ اور اگر تم میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ حکومت دے دے تو وہ اس کو اسلام کے مطابق چلائے۔ اس لئے اصل اور بنیادی ذمہ داری معاشرہ کی اصلاح اور دینداری کا قیام ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ایک ہوتا ہے مطلوب لعینہ، اور ایک ہوتا ہے مطلوب لغیرہ۔ یعنی مقصود لعینہ اور مقصود لغیرہ۔ یعنی وہ چیز جو per se مقصود ہے۔ Some thing to be required or to be done per se۔ ایک وہ چیز ہے جو کسی اور مقصد کی خاطر ایک ذریعے کے طور پر ضرورت کی وجہ سے اختیار کی جائے۔ تو حکومت کی ضرورت بطور وسیلہ اور ذریعے کے ہے بطور خود مقصود

حکومت پاکستان نے حدود آرڈیننس کے حوالے سے ایک تحریک شروع کی ہے، جو مغربی سازش ہے۔ قرآن و حدیث کی رو سے ذرا وضاحت فرمائیے۔

جب حکومت پاکستان کا ترمیمی آرڈیننس آئے گا پھر اس پر رائے دی جا سکے گی۔ ابھی رائے دینا قبل از وقت ہے۔ ممکن ہے کہ جو ترمیم آئیں وہ اچھی ہوں۔ اگر اچھی ہیں تو ان کو قبول کرنا چاہئے اور اگر ان میں کوئی خرابی ہے تو اس کی نشاندہی کرنی چاہئے۔

☆

میثاق مدینہ اور دستور مدینہ میں کیا فرق ہے؟

میثاق مدینہ ہی کو دستور مدینہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے حضور نے "کتاب" کی اصطلاح استعمال کی۔ ہذا کتاب من محمد عبداللہ و رسولہ۔ کتاب کا لفظی معنی چارٹر ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو دستور کہا ہے، بعض نے معاہدہ کہا ہے۔ یہ مختلف تعبیرات ہیں۔

☆

کاؤنٹر انٹیلی جنس جب دشمن کے جاسوسوں کو غلط معلومات دیتے ہیں تو کیا جھوٹ کے زمرے میں آتے ہیں؟

یہ جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔ کسی مسلمان نے جھوٹ نہیں بولا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا لعلنا امرنا ھم بذالک۔ شاید ہم ہی نے انہیں یہ کام کرنے کے لئے کہا ہو۔ حضور نے کوئی بات غلط نہیں فرمائی۔ لیکن اس سے دشمن نے وہی مفہوم لیا جو حضور دینا چاہتے تھے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ میثاق مدینہ میں چار قبائل نے شرکت نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ ان قبائل میں مسلمان بھی شامل

تھے؟

جی ہاں! ان قبائل میں اکا دکا مسلمان بھی شامل تھے۔ یعنی اوس کے جو چوتھائی شروع شروع میثاق مدینہ میں شامل نہیں ہوئے، ان کی اکثریت اس وقت تک مسلمان نہیں تھی۔ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے۔

☆

کل آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ جب حضور ﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے تو کیا آپ کی روح مبارک موجود ہوتی ہے؟ میری ایک درخواست ہے کہ اس بات کی وضاحت فرمائیں۔ اس بات سے بہت سے لوگ بہت کی بدعات اور خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟

میری گزارش ہے کہ آپ فرقہ وارانہ بحثیں نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔ آپ کی روح مبارک کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ ہم جیسے لوگوں کی محفل میں موجود ہے یا ہر کس و ناکس کی مجلس میں آتی ہے، یہ شاید گستاخی ہو۔ لیکن ہمارا درود و سلام حضور تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے۔

☆

آج کل جو پولیس encounter ہوتے ہیں، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ کیا اس سے معاشرے کو مظالم سے نجات ملتی ہے۔

میرے خیال میں بغیر عدالتی تحقیق کے کوئی قتل نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت سے ثابت نہ ہو کہ مجرم مستوجب قتل ہے اس وقت تک اس کے خلاف کوئی یک طرفہ کارروائی کی اجازت کسی بھی قانون میں نہیں ہے۔ اسلام میں بھی نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں تین بڑے فرق ہیں۔ اسلامی جمہوریت شریعت کی بالادستی کی پابند ہے۔ شریعت کے احکام کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جبکہ مغربی جمہوریت کوئی بھی فیصلہ کر سکتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے بہترین لوگ مسلمانوں کے قائد ہوتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں یہ شرط نہیں ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ عامۃ الناس جب اعتماد کا اظہار کریں تو اس میں اخلاقی اور روحانی considerations کو پیش نظر رکھا جائے۔ مغربی جمہوریت میں اس کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

☆

کیا سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیے جاتے تھے؟

جی ہاں! سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیے جاتے تھے۔ سفیر حکومت کے مہمان ہوتے ہیں فرد کے نہیں۔ اس لئے سفیروں کو سرکاری خزانے سے تحائف دیے جانا شریعت کے مطابق ہے۔

☆

یہ ایک لمبا سوال ہے جس میں شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ اشعار پر اعتراض کیا گیا ہے کہ

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجهک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقه
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ان کی ذات کے بارے میں یہ کہنا کہ نعت پڑھنی چاہیے یا نہیں
حالانکہ نعت پڑھنا تو تعریف کا ایک طریقہ ہے۔ جس کا رب
اس ذات پر درود بھیجتا ہو . . . . .

یہ اشعار چونکہ شیخ سعدی کے ہیں یا شاہ عبد العزیز کے ہیں۔ دونوں سے منسوب ہیں۔ کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے یہ بالکل نہیں کہا کہ نعت نہیں پڑھنی چاہئے۔ نعت کہنا اور نعت پڑھنا تو بہت اچھی بات ہے۔ صحابہ کی سنت ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں آپ کی موجودگی میں صحابہ کرام نعت پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جو چیز شرعاً لازم اور واجب نہ ہو اس کو شریعت کی رو سے لازم اور واجب سمجھنا محل نظر ہے۔ اس لئے نعت خوانی کو کسی خاص صورت یا کسی خاص شکل میں متعین کر کے اس کو شرعی حیثیت دینا ناپسندیدہ ہے۔

☆

قرآن پاک کے تیس پاروں کی تقسیم صحابہ کرام کے دور میں ہوئی یا بعد میں ہوئی؟

قرآن کے تیس پاروں کی تقسیم بعد میں ہوئی ہے۔ شروع میں صحابہ کرام کی ترتیب یہ تھی کہ وہ تین یا سات دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا معمول یہ تھا کہ وہ سات دنوں میں پورے قرآن کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سات منزلیں بنیں جو آپ کی تجویز کردہ ہیں اور اکثر قرآن پاک کے نسخوں میں ان کی علامات موجود ہیں۔ بعد میں جب کچھ تساہل پیدا ہوا تو لوگ تیس دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرنے لگے۔ اس وقت لوگوں کی سہولت کی خاطر یہ تیس پارے تجویز کئے گئے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ محض تلاوت کی سہولت اس کا مقصد ہے اور قرآن پاک کے معانی و مطالب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆

بیعت اسلام اور بیعت جہاد تو مروی احادیث سے ثابت ہے۔ کیا صوفیاء کے ہاں مروجہ بیعت طریقت کا بھی کوئی ذکر قرآن وحدیث میں آتا ہے؟

قرآن وحدیث میں براہ راست تو ایسا کوئی تذکرہ نہیں۔ لیکن ایسا ذکر آتا ہے کہ صحابہ کرام

نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کے معنی کسی وعدے یا عہد نامے کے ہیں۔ آپ کسی نیک اور بزرگ انسان کے ساتھ یہ عہد کریں کہ آپ شریعت کے مطابق فلاں کام کریں گے۔ اس کو بیعت کہتے ہیں۔ بیعت کا یہ دستور اسلام، جہاد اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں ہوتا تھا۔ اگر کوئی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرے یہ کہے کہ میں شریعت کی پابندی کروں گا اور آپ جو نصیحت کریں گے اس کے مطابق اپنی زندگی سنواروں گا تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆

آپ نے رسول ﷺ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ قبائل سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے حکمران تم میں سے ہی ہوں گے۔ کیا آج ایسا کرنا ضروری نہیں؟

آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ حضور جن قبائل کو دعوت دیا کرتے تھے تو ان سے یہ کہا کرتے تھے۔ بلکہ بعض قبائل کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو چارٹر لکھ کر دیا تو اس میں یہ لکھا کہ تمہارے امیر تم میں سے ہوں گے۔ یہ سب کے ساتھ نہیں ہوا۔ جہاں یہ خیال ہوا کہ کسی خاص قبیلے میں اس پر عمل ہو گا یا وہ زیادہ حساس تھے تو آپ نے ان کو یہ یقین دہانی کر دی۔ جہاں ایسا نہیں تھا وہاں ایسا نہیں ہوا۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اختیار تھا۔

حضور ﷺ کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی قبیلے کے لوگ کسی معاملے میں حساس ہوں تو ان کے جائز احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ باہر والوں کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہوں وہاں باہر والوں کو نہیں بھیجنا چاہئے۔ یہ ان معاہدات سے ثابت ہو جاتا ہے۔

☆

رسول اللہ ﷺ اپنے سفیروں کو کس طرح کی ہدایات عطا فرماتے تھے؟

حضور ﷺ جو ہدایا دیتے تھے ان میں کپڑا بھی ہوتا تھا، کھجوریں بھی ہوتی تھیں، خوشبو بھی ہوتی تھی۔ اس میں جانور یا گھوڑے بھی ہوتے تھے۔ جس شخص کو جس طرح کا ہدیہ مناسب یا موزوں ہوا کرتا تھا وہ آپ دیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابی کا تعلق میری معلومات کے مطابق خزرج کے قبیلے سے تھا۔ میں نے تحقیق نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خزرج سے تھا۔

☆

گزارش یہ ہے کہ یہاں ہال میں داخل ہونے کے لئے خواتین کے لئے الگ راستہ مقرر کیا جائے۔

ڈاکٹر زوالن صاحب سے میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ خواتین کے لئے الگ راستہ مقرر کر دیں۔

☆

کیا مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر بھی ممکن ہے؟

بعض مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر ممکن ہے۔ بعض کا امکان تو ہے لیکن مشکل ہے۔ بعض کا ممکن نہیں ہے۔ شریعت اور ریاست لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ ریاست شریعت کی ضرورت ہے۔ کیا امریکہ میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ شریعت پر عمل نہیں کر رہے؟ کیا مکہ میں فتح مکہ سے پہلے رہنے والے مسلمان شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے؟ بالکل کرتے تھے۔ کیا حبشہ میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہاں شریعت پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ حالانکہ وہاں ریاست نہیں تھی۔ شریعت پر عمل ریاست کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ ریاست نہ ہو تو شریعت کی ریاستی ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکیں گی البتہ فرد اپنی ذمہ داریاں ریاست کے بغیر بھی انجام دے سکتا ہے۔

☆

غیر مسلموں کے بارے میں: فاقتلوھم حیث

واقتلوهم پر اس دور میں کیسے عمل ہوگا؟

اگر اس کا یہی مفہوم ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو بہت افسوس کی بات ہے۔

دیکھیں قرآن و حدیث کا مطالعہ اور تفسیر و تشریح بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اس طرح سے تھوڑی سی عربی سیکھ کر مفتی نہیں بن بیٹھنا چاہئے۔ فاقتلوهم حیث وجدتموهم کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس سیاق و سباق کو سامنے رکھیں جس میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ آیت آئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے تم پر حملہ کیا ہے، تمہیں گھروں سے نکال دیا ہے، تمہارے اوپر کئی سال سے مظالم کر رہے ہیں جب ان کے ساتھ میدان جنگ میں مقابلہ کی نوبت آئے تو پھر بزدلی مت دکھاؤ۔ جہاں پاؤ قتل کرو۔

یہ حکم تمام غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ بہت سے غیر مسلموں کے ساتھ تو حضور نے معاہدے کئے۔ مدینہ میں اور پورے جزیرہ عرب میں غیر مسلم رہتے تھے۔ یہ سارے معاہدات حدیث میں موجود ہیں۔ ان سارے ذخیرے کو نظر انداز کر کے آپ کہیں کہ فاقتلوهم حیث وجدتموهم کا حکم ہر غیر مسلم کے لئے ہے۔ یہ تفسیر کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یہ تو تحریف قرآن ہے۔

☆

ریاست مدینہ میں کھیل اور اس طرح کی دوسری ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا کوئی انتظام تھا یا نہیں؟

ریاست مدینہ میں تفریح اور کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔ صحابہ کرام کھیلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ گھڑ دوڑ، اونٹ دوڑ، تلوار بازی اور تیر اندازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ یہ مقابلے بچوں کے درمیان بھی ہوتے تھے اور جوانوں کے درمیان بھی۔ یہ چیزیں حضور کے زمانے میں رائج تھیں۔ آج بھی ہونی چاہئیں۔ اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

☆

ریاست مدینہ میں ابلاغ یا انفورمیشن کے ادارے تھے؟

خبر رسانی تو اس زمانے میں بھی ہوتی تھی۔ لیکن جو کام اس زمانے میں اخبار نویس کیا کرتے ہیں وہ اس زمانے میں شاعر کیا کرتے تھے۔ حضور نے شعر و شاعری کے ادارے سے کام لیا ہے۔ دربار رسالت میں شعراء موجود رہتے تھے۔ اسلام کے نقطہ نظر کو عرب میں عام کرنے کے لئے صحابہ کرام نے اس ذریعے سے کام لیا۔ اس لئے ہم ابلاغ کے ہر دستیاب جائز ذریعے سے جائز کام لے سکتے ہیں۔

☆

اگر ریاست میں مکمل اسلام نافذ کرنے کا موقع میسر آجائے تو نافذ کرنے کے لئے کیا اسلامی شریعت codified حالت میں موجود ہے؟

اس وقت تو موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ملک کے حالات مختلف ہیں۔ شریعت کے احکام ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ کوڈیفائی ہوں گے۔ بیشتر حصہ کوڈیفائیڈ شکل میں موجود ہے۔ بہت سے احکام تحریری اور کوڈیفائیڈ شکل میں موجود ہیں۔ جو کوڈیفائیڈ موجود ہیں ان کو پہلے نافذ کریں بعد میں بقیہ احکام کوڈیفائی بھی ہو جائیں گے اور نافذ بھی۔

☆

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ریاست میں نفاذ شریعت کا کام تدریجی انداز میں کرنا چاہئے۔ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

میں تدریجی نفاذ کا ہی قائل ہوں۔ دور نبوی میں بھی اسلامی شریعت کا نفاذ تدریجی انداز میں ہوا تھا۔ شراب ایک دن میں حرام نہیں ہوئی تھی۔ سود کی حرمت ایک دن میں نافذ نہیں

تدریجی تھی۔ یہ جو بہت سارے احکام ہیں یہ تقریباً سب ہی ایک ایک کر کے تدریجاً نافذ ہوتے تھے۔ قرآن پاک کا نزول تئیس سال میں ہوا خود اس بات کی دلیل ہے۔ اگر ساری شریعت یکدم سے نافذ ہونا ہوتا تو یہ سارے احکام ایک ہی دن میں نازل ہو جاتے۔ جب آخری دن تک قرآن پاک نازل ہوتا رہا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ کام تدریج کے ساتھ ہونا چاہیے۔

☆

آپ نے فرمایا۔ قیدیوں کو قتل کرنا منع تھا تو بدر سے واپسی پر
اسیر جاہلیت کے زمانے کے قتل کے بدلے میں قتل کر دیئے
گئے تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ جنگی مجرموں کا مسئلہ دوسرے قیدیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جنگی مجرموں کا قتل دنیا کے ہر قانون میں جائز ہے۔ حضور نے غزوہ بدر، فتح مکہ اور اسی طرح کے دوسرے مواقع پر کچھ لوگوں کو جنگی مجرم قرار دیا تھا۔ تین چار آدمی جو جنگی مجرم تھے ان کو قتل کیا گیا۔ عام قیدیوں کو حضور کے زمانے میں کبھی بھی قتل نہیں کیا گیا۔

☆

سوشل کنٹریکٹ یا معاہدہ عمرانی کی روشنی میں جو معاشرہ بنتا ہے
اس کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالیں۔

یہ تو بہت لمبی بات ہو جائے گی۔ سوشل کنٹریکٹ پر تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے صرف یہ حوالہ دیا تھا کہ مغرب میں سوشل کنٹریکٹ کی بات تو بہت ہوتی ہے لیکن اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ واقعی سوشل کنٹریکٹ ہوا ہو۔ یہ واحد مثال ریاست مدینہ کی ہے جہاں قبائل کے نمائندوں نے ایک معاہدہ کیا اور اس کے نتیجے میں ایک معاشرہ قائم ہوا اور ایک ریاست بنی۔ لہٰذا اگر سوشل کنٹریکٹ کی کوئی حقیقت ہے تو اس کا اطلاق مدینہ کی ریاست پر ہی ہو سکتا ہے۔ کسی اور ریاست پر اس کا اطلاق مشکل ہے۔

کئے جا سکتے ہیں؟

تعلیم و تبلیغ سے اور تربیت سے۔

☆

مزید برآں تلاوت آیات سے مراد صرف تلاوت تک محدود
ہے یا آیات قرآنی کے اوپر نظام زندگی کا قیام بھی مقصود ہے۔

تلاوت آیات سے قرآنی پیغام پہنچانا مقصود ہے۔ تزکیے سے اپنی اصلاح مقصود ہے۔
آپ پہلے حکومت کو چھوڑ کر اپنی اور لوگوں کی اصلاح کریں۔ حکومت کی اصلاح بعد میں کریں۔
جو لوگ حکومت کی اصلاح کرنے لگے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے
میں ایسی چیزیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں جس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پہلے ان کو
اپنے تزکیہ کی ضرورت ہے۔

☆

پاکستان کے خفیہ اداروں کو قرآن و سنت کے مطابق کیسے
بنایا جا سکتا ہے؟ جبکہ ملک بحران اور تحریک کی ذمہ داری ان پر
عائد ہوتی ہے۔

میرے علم میں تو نہیں کہ ملک میں بحران خفیہ اداروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر آپ کے
علم میں ایسی کوئی بات ہے تو اس پر توجہ دلائیے۔

☆

تجسس سے کیا مراد ہے؟ دوبارہ وضاحت فرمائیے۔

تجسس کسی ایسی سراغ رسانی کو کہتے ہیں جس کا مقصد معاشرہ میں امن و امان قائم
کرنا ہو۔ معاشرے میں مجرموں کا پتہ چلانا ہو۔ تجسس پولیس اور جاسوسی کو بھی کہتے ہیں۔

عسس وہ ادارہ تھا جو مجرموں پر قابو پانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

تحسس اگر ح سے ہو یعنی تحسس تو اس کا مطلب ہے کسی اچھی چیز کی تلاش یا اچھی چیز کے بارے میں معلومات جمع کرنا۔ اس میں مثبت جاسوسی شامل ہے یعنی اپنے دفاع کے لئے معلومات تلاش کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

تجسس کا مطلب ہے کسی منفی مقصد کی خاطر لوگوں کی برائیوں کی تلاش کرنا۔ جیسا کہ بعض حکومتوں میں مخالفین کی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں۔ مخالفین کے اخلاقی جرائم کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ تصویریں بنا کر پھر ان کو بلیک میل کرتے ہیں، یہ تجسس میں آتا ہے جس کی ممانعت ہے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر فراہم کرتا ہے اور برے حاکم کو برے وزیر فراہم کرتا ہے۔ آپ خود بھی وزیر رہ چکے ہیں۔ اس تجربہ کی روشنی میں آپ حاکم وقت کو کیسا سمجھتے ہیں؟

میں جب یہ بات کہہ رہا تھا تو میرے ذہن میں وسوسہ آیا تھا کہ یہ سوال کیا جائے گا۔ میرے خیال میں اس کا مکمل جواب تو خود اس حدیث کے الفاظ میں پنہاں ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو اچھے وزیر فراہم کر دیتا ہے۔ اور جب کسی حاکم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اس کو برے وزیر عطا کر دیتا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اپنے سوال کا جواب آپ خود ہی دے دیجئے۔ میں تو نیک نیت اور نیک عزائم سے گیا تھا اور نیک کام ہی کرنا چاہتا تھا۔ جب تک میں محسوس کرتا رہا کہ میں اچھے کام کر سکتا ہوں تو میں وابستہ رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ ایسا کرنا مشکل ہے تو میں الگ ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆

جدید مستشرقین سے مراد کون لوگ ہیں؟

کل پرسوں ان شاء اللہ قدیم و جدید کے عنوان کے تحت بات ہوگی۔ جدید مستشرقین سے مراد وہ

سب جانتے ہیں جو عہد محمدی کے زمانے سے تاریخ اسلام اور سیرت پر کام کرتے ہیں وہ سب جدید دور تک ہیں۔

☆

جس ریاست مدینہ کا آپ نے ذکر کیا وہ جمہوری تھی،
وہ پارلیمانی، صدارتی یا کوئی اور طرح کی؟

میرے خیال میں حضور ﷺ کے زمانے کی حد تک تو وہ ریاست نبوی تھی۔ اس کو صرف نبوی اور پیغمبرانہ ریاست کہنا چاہئے۔ جب حضور دنیا سے تشریف لے گئے اور صحابہ کرام نے ذمہ داریوں کو سنبھالا تو اس وقت سے وہ جمہوری اور شورائی ریاست تھی۔ حضرت صدیق اکبر نے صحابہ کرام کے مشورہ اور رضامندی سے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں کیا کہنا چاہئے، اس بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ میرے خیال میں اس کو صدارتی نظام کے قریب کہنا چاہئے۔

۔۔☆۔۔

ساتواں خطبہ

ریاستِ مدینہ

معاشرت و معیشت

ساتواں خطبہ

ریاست مدینہ
معاشرت و معیشت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

محترم جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب، صدر جلسہ،
جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
برادران مکرم،
خواہران محترم،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: ریاست مدینہ: معاشرت و معیشت۔ ریاست مدینہ پر یہ گفتگو گزشتہ ہفتے پیش کی جانے والی گفتگو کا ایک حصہ یا تتمہ ہے۔ وہ چیزیں جو پچھلی گفتگو میں اس موضوع پر عرض کی گئی تھیں ان کو آج دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ریاست مدینہ کے دو اہم پہلوؤں پر مختصر گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ میں معاشرت اور اس سے متعلق چند مسائل،

۲۔ مدینہ منورہ میں بعض انتظامی شعبہ جات، خاص طور سے وہ شعبہ جات جن کا تعلق معیشت سے تھا۔

کی لمبائی تقریباً بارہ سے چودہ میل تک اور چوڑائی آٹھ سے دس میل تک ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل تھا جن کی تعداد تئیس یا پچیس بتائی جاتی ہے۔ ہر بستی میں چھوٹے چھوٹے قلعے یا گڑھیاں موجود تھیں جن کا تذکرہ مدینہ منورہ کے تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے کیا ہے۔ ان گڑھیوں یا آطام کی تعداد کا اندازہ 55، 56 سے لے کر 72 اور 75 تک لگایا گیا ہے۔ جس مورخ نے سب سے زیادہ تعداد بتائی ہے انہوں نے 78 آطام یعنی قلعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان قلعوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے آثار اب بھی مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ خاص طور سے کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ مسجد نبوی سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر اب بھی موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان آطام کی نوعیت کیا تھی۔ یہ آطام جن کے اندر بستی کا سربراہ بھی رہتا تھا، قبیلے کے اور ذمہ دار بھی رہتے تھے۔ ایک خود کفیل یونٹ ہوتا تھا۔ بعض صورتوں میں اگر اطم بڑا ہوتا تھا تو پورا قبیلہ اسی میں رہتا تھا۔ اس کے باہر کی سرزمین جو اکثر و بیشتر باغات اور کھیتوں پر مشتمل ہوتی تھی، وہ اس قبیلہ یا اطم میں رہنے والوں کی ملکیت ہوتی تھی۔ اسی اطم میں اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا۔ ضرورت کی چیزیں محفوظ کرنے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں جو اس رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں، بعد میں ان سب کا نام مدینۃ النبی قرار پایا۔ تاہم یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں ایک گاؤں یثرب بھی کہلاتا تھا۔ یثرب جغرافیائی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور آبادی کے لحاظ سے بڑا بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج مدینہ کہلانے جانے والے پورے علاقے کو اس دور کی عام بول چال میں یثرب کہا جاتا تھا۔

جزیرہ عرب کے باشندوں کے بارے میں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں دو طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک طبقہ وہ تھا جس کو قدیم عربی ادب و شعر و نثر میں اہل المدر کہا گیا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے 'اینٹوں والے'۔ اس سے مراد وہ عرب لوگ ہیں جو settled بستیوں میں آباد تھے اور پختہ مکانات میں رہتے تھے۔ مثلاً مکہ مکرمہ، طائف، مدینہ منورہ، خیبر۔ یہ لوگ اہل المدر کہلاتے تھے۔ ان کی بستیوں کے الگ الگ مشہور نام تھے، یہ گویا باقاعدہ شہر تھے اور وہاں آبادی کے لحاظ سے زندگی کی ضروریات بھی میسر تھیں۔

اس کے علاوہ آبادی کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کو اہل الوبر کہا جاتا تھا۔ اس کا لفظی

ترجمہ: اون والے۔ اون والوں سے مراد خیموں میں رہنے والے وہ خانہ بدوش لوگ ہیں جو اونٹ کے بالوں سے خیمے بناتے تھے۔ یہ وہ خیمے ہوتے تھے جو موسمی شدت سے محفوظ رکھتے تھے۔ یہ اونٹ کی کھال اور بالوں میں گرمی اور سردی کو جذب کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہوتی ہے۔ گائے اور بھیڑ بکری کی کھال اور اون سے خیمے بنائے جاتے تھے۔ تہہ بہ تہہ کھال سے مختلف قسم کے خیمے بنائے جاتے تھے۔ خاص طور پر جب کسی بڑے معزز اور محترم انسان کے لئے خیمہ بنایا جاتا تھا اس کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے: قبة من ادم احمر کھال کا ایک خوبصورت خیمہ ان کے لئے لگایا گیا۔ یہ بھی اونٹ کی کھال سے بنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ اہل وبر کہلاتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یوں تو خانہ بدوش تھے لیکن ان کا علاقہ متعین تھا اور وہ اسی میں خانہ بدوشی کرتے تھے۔ جہاں پانی کے ذخائر موجود ہوتے تھے وہاں جا کر رہا کرتے تھے اور جب وہاں پانی کے ذخائر ختم ہو جاتے تھے تو کسی اور جگہ چلے جاتے تھے۔

کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی تھے جن کا علاقہ متعین نہیں تھا اور وہ پورے جزیرہ عرب میں پھرتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض قبائل وقتاً فوقتاً شام اور عراق میں بھی جاکر آباد ہوتے۔ چنانچہ شام اور عراق میں آج تک عربی نسل آبادیاں اور قبیلے موجود ہیں اور ان کے اثرات بھی موجود ہیں۔ یہ سب اہل وبر کہلاتے تھے۔

عرب کے پورے معاشرہ کی طرح مدینہ منورہ کا معاشرہ بھی قبائلی تھا۔ اگرچہ ہجرت کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے معاشرہ میں شہری اور تمدنی مظاہر بھی پائے جاتے تھے۔ قبائل اس انداز سے مل جل کر رہتے تھے کہ ان کے آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں اور تعلقات، لین دین اور تجارتی روابط بھی ہوتے تھے۔ لیکن وہ الگ الگ قبیلوں کے طور پر بھی منظم اور منفرد طور پر معروف اور متعین تھے۔ عربی زبان میں قبیلہ کے علاوہ اور گروہوں کے لئے بعض اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اردو میں ان کا کوئی الگ الگ ترجمہ نہیں ہے اس لئے اردو مترجمین ہر ایک کا ترجمہ قبیلہ ہی کر دیتے ہیں، جس سے بعض اوقات یہ سمجھنے میں دقت ہوتی ہے کہ قبیلہ اور قبیلہ کی ذیلی تقسیمات میں کیا فرق ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں قبیلہ بنو ہاشم بھی کہا جاتا ہے، قبیلہ قریش بھی کہا جاتا ہے، قبیلہ مضر بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سب قبیلے نہیں

کہلاتے تھے۔ قبیلہ سے مراد وہ بڑا گروپ تھا جو دو، پانچ، دس یا پندرہ ہزار کی آبادی پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ کسی بڑے جد امجد کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کے نام سے مشہور ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے تک قریش ایک معلوم اور متعین قبیلے کے طور پر معروف تھے۔ خاص طور پر عرب کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں قریش کا اپنا ایک الگ وجود، ایک الگ تشخص اور ایک الگ شناخت موجود تھی۔ یہ سب کے سب فہر بن مالک کی اولاد میں تھے اور فہر بن مالک ہی کا لقب قریش بتایا جاتا ہے۔ ان کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے یہ آپس میں مختلف ذیلی قبائل میں تقسیم ہونے کے باوجود باہر والوں کی حد تک ایک مشترک شناخت اور ایک نام رکھتے تھے۔

قبیلہ کے بعد اس کی دوسری تقسیم عشیرہ کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ عموماً ایک ہزار سے تین ہزار تک افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک بڑے قبیلہ کے مختلف خاندان جو کسی جد امجد کی اولاد میں ہوں، عشیرہ کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قریش کے وہ لوگ جو قصی کی اولاد میں تھے یا قصی کے بیٹوں کی اولاد میں تھے وہ الگ الگ عشیرہ کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ عشیرہ کے بعد ایک بطن ہوتا تھا جو بعض صورتوں میں ایک دادا یا ایک پردادا کی اولاد کو کہا جاتا تھا۔ بنی ہاشم ایک بطن تھا جو قریش کے بہت سے بطون میں سے ایک تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد جناب ہاشم بن عبد مناف اپنی غیر معمولی شخصیت اور غیر معمولی احترام کی وجہ سے ایک بطن کے جد امجد قرار پائے۔ اگرچہ وہ بہت کم سنی میں انتقال کر گئے۔ غالباً 27، 28 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود انہوں نے اپنی شہرت اور نیک نامی جزیرہ عرب کے اندر اور باہر اس طرح قائم کر دی تھی کہ ان کے نام سے آج تک رسول اللہ ﷺ کا بطن یعنی قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ بنی ہاشم کے نام سے مشہور ہے۔ پھر بطن میں چھوٹے چھوٹے خاندان یا اسرے ہوتے تھے جو ایک باپ کی اولاد یا ایک دادا کی اولاد پر مشتمل ہوتے تھے۔ بنی ہاشم میں آپ نے سنا ہوگا کہ بنی عبد المطلب، بنی المطلب اور یہ سارے کے سارے مختلف خاندان اور برادریاں تھیں جن میں آپس میں اسی طرح گرم و سرد تعلقات چلتے رہتے تھے جس طرح ہر انسانی معاشرہ میں چلتے ہیں۔ عرب کے قبائل میں ایک خاص بات تھی کہ ہر شخص میں قبیلہ سے وابستگی، اپنے بطن اور عشیرہ سے غیر معمولی محبت اور تعلق

اور غمی اور خوشی میں ان کا پوری طرح ساتھ دینا اور ہر مشکل مرحلہ میں ان کی پوری مدد کرنے کو غیر معمولی جوش و جذبات بیان میں جذبہ فخر پایا جاتا تھا۔

یہ بات کہ دو بھائیوں میں باہمی منافست ہو یا ایک دادا کی اولاد میں دو خاندانوں میں آپس میں مسابقت ہو، یہ کوئی انوکھی بات ہے نہ بڑی بات ہے نہ اس میں کوئی قباحت ہے۔ اسی طرح کی بعض منافستیں خاندان بنی ہاشم میں بھی اور بطون بنی ہاشم میں اور دوسرے بطون اور عشیروں میں بھی پائی جاتی تھیں۔ اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے۔ بعض مغربی مستشرقین نے اسلام کے بعد کی تاریخ کو ایک مخصوص اور خود ساختہ فلسفہ کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تاریخ کے بہت سے واقعات کی غلط اور بے بنیاد تاویلیں کر دی ہیں۔ اس لئے یہ بات پہلے دن سے واضح رہنی چاہئے کہ اگر کسی مرحلہ پر دو بھائیوں میں مسابقت رہی ہو یا دو خاندانوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ رہا ہو تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر بھلائی کے کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ہو، کسی نیک کام میں مسابقت ہو تو یہ قرآن پاک کی نظر میں بھی ایک پسندیدہ چیز ہے اور قرآن پاک کی نظر میں مطلوب ہے۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ اچھے اور نیک کاموں میں مقابلہ کرنے والوں کو ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

مدینہ منورہ کی آبادیوں میں بھی اسی طرح کے عشائر، قبائل، خاندان اور بطون موجود تھے۔ جن کو ہم اوس اور خزرج کہتے ہیں ان کی نوعیت وہی تھی جو مکہ مکرمہ کے خاندان قریش کی تھی۔ اوس چند بہت بڑے قبائل کا مجموعہ تھا جن کے نام تذکرہ نگاروں نے محفوظ رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام میثاق مدینہ میں بھی آئے ہیں۔ وہاں کے بہت سے قبائل اور عشائر اور بطون پہلے دن سے ہی میثاق مدینہ میں شامل تھے۔ کچھ قبائل اور بطون جن کی تعداد غالباً تھوڑی تھی پہلے مرحلہ میں میثاق مدینہ میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ کئی سال کے بعد جا کر میثاق مدینہ میں شریک ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس کو اوس کہتے ہیں وہ چند بڑے قبائل کا مجموعہ تھا جن میں عشائر بھی تھے، بطون بھی تھے اور خاندان بھی تھے۔ سیرت کی کتابوں میں سب کے نام ملتے ہیں اور یہ سمجھنے اور جاننے میں بہت وقت لگانا پڑتا ہے کہ کس خاندان کا تعلق کس بطن سے، کس بطن کا تعلق کس عشیرہ سے اور کس عشیرہ کا تعلق کس قبیلہ سے تھا۔

علامہ نورالدین سمہودی نے وفاء الوفاء میں بہت قیمتی معلومات ان سب باتوں کے بارے میں دی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مدینہ میں کون کون سی آبادیاں قیام پذیر تھیں۔ بستیوں کے نام کیا تھے۔ کھیتوں اور باغات کے حدود کیا تھے۔ ان کے باغات میں کیا چیز کاشت ہوتی تھی۔ کھجوریں کس قسم اور کس سطح کی تھیں۔ کون شخص اپنی کھجوروں کو کس بازار میں فروخت کرتا تھا۔ اس طرح کی بہت سی اہم اور دلچسپ معلومات انہوں نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہجرت کے وقت مدینہ منورہ میں جو 70 یا 78 یا 72 آطام تھے ان میں سے جن جن کی تفصیلات علامہ سمہودی کو مل سکیں وہ انہوں نے بیان کر دی ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو ہر بستی میں، ہر قبیلے اور ہر عشیرے میں اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل میں کوئی بطن ایسا نہیں تھا جس میں کافی تعداد میں خاندان اور افراد مسلمان نہ ہو گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو مسجدیں قائم ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے کا فاصلہ بارہ چودہ میل ہو اور چوڑائی آٹھ دس میل ہو تو وہاں کے سب رہنے والوں کے لئے مسجد نبوی میں پانچ وقت حاضری ممکن نہیں تھی۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ کا آخری وقت تھا اور طبیعت مبارک چند لمحوں کے لئے بہتر ہو گئی اور آپ نے پردہ اٹھا کر مسجد نبوی میں بھی دیکھا اور صحابہ خوش ہوئے تو عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب صحت مبارک اچھی ہو رہی ہے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور سے گھر جانے کی اجازت مانگی کیونکہ وہ کئی دن سے گھر نہیں گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہجرت کے بعد ایک انصاری خاتون خارجہ بنت زید سے شادی کی تھی۔ ان کا مکان مسجد نبوی سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ قبا کے قریب عوالی نامی ایک بستی تھی جس میں ایک چھوٹا سا گاؤں سنح تھا جہاں وہ رہتے تھے اور جہاں جانے کی آپ سے اجازت مانگی۔ یہ جگہ مسجد نبوی سے ساڑھے تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اسی طرح سے مختلف صحابہ کرام مختلف جگہوں پر قیام پذیر تھے اور ہر جگہ ایک نہ ایک مسجد موجود تھی۔ ان نو مسجدوں کی تعداد میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آٹھ سالہ مدنی زندگی میں غزوہ بدر کے بعد سے لے کر دنیا سے تشریف لے جانے تک اضافہ ہوتا رہا اور جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے

تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں چالیس مساجد قائم ہو چکی تھیں، جن کا تذکرہ محدثین اور سیرت نگاروں نے کیا ہے۔

مدینہ منورہ کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا، اس کا ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ مکہ مکرمہ سے کئی سو مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جو صحابہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے ان کی تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا تو بڑا دشوار ہے لیکن ان کی تعداد کم از کم چھ سات سو کے لگ بھگ ضرور تھی۔ مدینہ کی آبادی میں تیزی سے ہونے والے اس اضافہ کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ آس پاس قبائل میں جو لوگ اکا دکا مسلمان ہوتے تھے، ان کے بارے میں ہدایت تھی کہ وہ مدینہ منورہ ہجرت کر کے آجائیں۔ فتح مکہ سے پہلے تک ہجرت لازمی تھی اور ہر نئے مسلمان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائے۔ اس دور کی کئی آیات میں الذین امنوا وھاجروا، الذین امنوا وجاھدوا وھاجروا، وھاجروا وجاھدوا یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد تینوں کا تذکرہ ایک ساتھ ملتا ہے۔ جہاد میں تو ہر مسلمان حصہ لیتا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں جہاد جیسی فضیلت حاصل کرنے کا موقع ہو اور کوئی مسلمان پیچھے رہے۔ لیکن ہجرت میں کچھ حضرات ایسے تھے جن کو شرکت کا موقع نہیں مل سکا۔ یا تو ان کو حالات اور مسائل ایسے درپیش تھے کہ وہ ہجرت نہیں کر سکتے تھے یا کسی اور وجہ سے ان کو ہجرت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جن جن کو موقع ملتا گیا وہ ہجرت کرتے گئے۔ اور مدینہ آتے گئے۔ یوں مدینہ منورہ کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔

علامہ سمہودی نے مدینہ منورہ کے جغرافیہ سے بھی بحث کی ہے اور کون سا خاندان یا عشیرہ کس علاقہ میں رہتا تھا اس علاقہ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان علاقوں کو خطہ کہا جاتا تھا۔ خطہ کی جمع خطط ہے۔ ہر عشیرہ کے خطط جہاں جہاں واقع تھے اس کی بھی نشاندہی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ بعض عشائر مختلف اسباب کی بنا پر اپنے خطے تبدیل کرتے رہتے تھے۔ کسی ایک خطہ کے باشندے کی زمین ایک جگہ ہے، اس نے اس زمین کو فروخت کر کے دوسری جگہ زیادہ بہتر زمین خرید لی۔ تو وہ پورا عشیرہ وہاں منتقل ہو گیا۔ دیکھ لیجئے کسی وجہ سے خالی ہو گیا اور کسی دوسرے قبیلے نے خرید لیا تو اس قبیلہ کا ایک بطن یا عشیرہ وہاں منتقل ہو گیا۔ ان اسباب کی وجہ سے عشیروں

کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے تھے اور رقبے آپس میں تبدیل کرنے کی روایت بھی مدینہ منورہ میں موجود تھی۔

عشائر کے بارے میں بہت سے لوگوں نے معلومات جمع کی ہیں۔ ان میں ابن سعد کا نام بڑا نمایاں ہے۔ ابن سعد نے عشائر کے بارے میں جو معلومات جمع کی ہیں وہ دوسرے سیرت نگاروں کی بہ نسبت زیادہ مستند قرار دی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ابن سعد اور ان کے استاد واقدی نے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ کے مرتب کردہ دیوان کی دستاویزات کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ دیوان میں لوگوں کی تنخواہیں قبائل اور عشائر کی بنیاد پر مقرر ہوتی تھیں۔ پہلے قبیلہ یا عشیرہ بنی ہاشم، پھر ایک ایک کر کے بقیہ خاندان اور قبائل۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قربت اور رشتہ داری کی ترتیب کے لحاظ سے ان کے نام لکھے گئے۔ اس لئے وہ نام انتہائی مستند ترین تھے اور اس میں عشائر اور قبائل کے بارے میں جو معلومات دی گئی تھیں وہ بہت صحت کے ساتھ مرتب کی گئی تھیں۔ چونکہ یہ معلومات ابن سعد اور واقدی کو حاصل تھیں اس لئے انہوں نے جو معلومات دی ہیں وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مستند مانی جاتی ہیں۔

ابن سعد نے اس موضوع پر بھی تفصیل سے معلومات جمع کی ہیں کہ جو عشائر بعد میں ختم ہو گئے وہ کون کون سے تھے اور ان کے ختم ہونے کے اسباب کیا تھے۔ اگرچہ یہ تفصیل براہ راست ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے، تاہم ایک حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ معلومات کارآمد ہیں۔ مدینہ منورہ کے بہت سے عشائر خاص طور پر انصاری عشائر مدینہ منورہ چھوڑ کر چلے گئے اور ان کی آبادیاں مدینہ منورہ میں تقریباً ختم ہو گئیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک حدیث میں اشارہ فرمایا تھا۔ اس کو پیشین گوئی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ نے اپنے آخری ایام میں مہاجرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں انصار کے بارے میں تمہیں نیک سلوک اور احسان کی وصیت کرتا ہوں۔ لوگوں کی آبادیاں بڑھتی جائیں گی، انصار کی آبادی کم ہوتی جائے گی، اس لئے انصار کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا اور میرے ساتھ انہوں نے جو نیکی کی ہے اس کا پورا پورا اجر دینے کی کوشش کرنا۔ غالباً اس پیشین گوئی کی وجہ سے، بلکہ یقیناً اس پیشین گوئی کی وجہ سے انصار کے بہت سے عشائر ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ یا تو ان میں سے بہت سے لوگ نوجوانی میں جہاد

ان کے بت کو، جس کو وہ بہت صاف ستھرا رکھتے تھے، گندا کر دیتے تھے۔ جب وہ آکر دیکھتے تھے تو غصہ ہو کر تے تھے اور دھو دھلا کر صاف کرتے اور خوشبو لگا دیتے۔ وہ نوجوان پھر آ کر اس کو گندا کر دیتے تھے۔ یہ پھر اس کو صاف کر دیتے تھے اور پوچھتے تھے یہ حرکت کس نے کی ہے۔ جب چار پانچ مرتبہ ایسا ہوا تو انہوں نے اپنی تلوار اس بت کے قریب رکھ کر کہا کہ تجھ میں اگر اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت ہے تو لے یہ تلوار اور اب اپنا دفاع خود کر۔ اس رات کو وہ نوجوان صحابی پھر آئے اور بت کو اٹھا کر مدینہ سے باہر کسی گندگی میں پھینک آئے۔ جب اگلی صبح حضرت عمرو بن الجموح اپنا بت تلاش کرنے نکلے تو اس نے ان کو ذہن کھول دیا اور جو بات پہلے ان کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی اب آگئی کہ یہ بت اپنا دفاع نہیں کر سکتا تو ہمارا دفاع کیسے کرے گا۔ وہ سیدھے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے بھیجے گئے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر کے پاس گئے اور اسلام قبول کر لیا۔

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ منات، جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے، قبائل مدینہ منورہ کی دیوی تھی۔ اسی کے بت مدینہ منورہ کے مختلف خاندانوں اور گھروں میں پائے جاتے تھے۔ لیکن بت پرستی کے ساتھ جس طرح مکہ مکرمہ میں حنفاء تھے، توحید پر عقیدہ رکھنے والے، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وابستگی کا دعویٰ کرنے والے، شرک سے بیزار اور حق پر کاربند رہنے کے خواہاں، ایسے حنفاء مدینہ منورہ میں بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں کئی لوگ ایسے تھے جو حنفاء کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں ایک بڑا نام تو انہی سوید بن صامت کا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مکہ مکرمہ میں ملے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کے جواب میں حکمت لقمان کا ایک صحیفہ پڑھ کر سنایا۔ وہ بھی حنفاء میں سے تھے۔ جو حضرات بیعت عقبہ میں شریک تھے، ان میں سے دو حضرات ایسے تھے جو پہلے سے بت پرستی سے تائب تھے اور حنیف کہلاتے تھے۔ اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم بن تیہان۔ یہ دونوں حضرات بیعت عقبہ میں بھی شامل تھے اور مدینہ منورہ میں پہلے سے ہی بت پرستی سے اجتناب کی شہرت رکھتے تھے۔ یہ دونوں حضرات اسلام لائے اور مسلمانوں میں صف اول کی شخصیات قرار پائے۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سب سے پہلا کام جس کا آپؐ نے اہتمام فرمایا وہ مسجد نبوی کی تعمیر کا تھا۔ مواخاۃ کے ذریعے

مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے سے وابستہ قرار دیا اور معمورۂ مدینہ منورہ مرتب فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مدینہ منورہ کے شہری انفراسٹرکچر پر بھی توجہ دی۔ ٹاؤن پلاننگ کے بارے میں بعض ہدایات دیں۔ مدینہ منورہ کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تعمیرات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ مکہ مکرمہ سے آنے والے بہت سے حضرات نے وہاں زمینیں خریدیں اور اپنے مکانات بنائے۔ چھوٹے مکان بھی بنائے گئے۔ بڑے مکان بھی بنائے گئے اور بعض صورتوں میں یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ مکانات کے قطعے اس طرح سے بنائے جائیں کہ مدینہ منورہ کی آبادی کے لئے کسی مشکل کا ذریعہ نہ ہوں۔ چنانچہ گلیاں کیسے بنائی جائیں اور مکانوں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ہدایات جاری فرمائیں۔

ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ گلی میں کم از کم سات ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہئے۔ گلی میں ایک طرف کے مکان اور دوسری طرف کے مکان کے درمیان فاصلہ کو ہاتھ کی لمبائی سے ناپا جاتا تھا۔ اگر ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے تو سات ہاتھ سے مراد ہے کہ ساڑھے دس فٹ کے قریب چوڑی گلیاں ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں، راستے بھی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے۔ اس لئے اتنے فاصلے میں دو سواریوں کا آسانی سے گزرنا ممکن ہے۔ اگر وہاں سے کوئی سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ گلیوں اور سڑکوں میں اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ آنے اور جانے والی دو گاڑیاں ایک وقت گزر سکیں۔

مہاجرین کی آمد کا سلسلہ فتح مکہ تک جاری رہا۔ ان کی آبادکاری بھی ہوتی رہی۔ اس مقصد کے لئے مکانات بنانے کی ضرورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے بڑی بڑی اور عالیشان عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ بعض صحابہ جو بڑے اصحاب ثروت میں سے تھے، انہوں نے اپنے لئے زیادہ بڑے مکان بنانے کی خواہش ظاہر کی تو حضور علیہ السلام نے اس کو ناپسند فرمایا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص جو رشتہ میں حضور کے ماموں بھی ہوتے تھے، مکہ مکرمہ کے سرداروں میں سے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا مکان بنانا چاہا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو ناپسند فرمایا۔ جب ان کو حضور کی ناپسندیدگی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مکان کا وہ حصہ گرا دیا جس کو دیکھ کر حضور نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یا اس

باری آئی تو ان انصاری صحابی نے یہ تو خیال نہیں کیا یا کوئی وجہ ہوئی، لیکن وہ آگے بڑھے اور ڈول کی رسی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ملازم بھی حضرت عمر فاروقؓ کا ملازم تھا۔ اس نے سختی سے ان انصاری صحابی کو پیچھے کیا اور کہا کہ یہ رسی میری ہے اور رسی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ بزرگ انصاری صحابی شاید اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے جب مہاجر نے ان کو اچانک سختی سے ہٹایا تو وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ اس پر کچھ انصاری نوجوانوں نے خفگی کا اظہار کیا کہ ہمارے سردار کے ساتھ ایسا سلوک ہوا ہے۔ اس موقع پر کہیں قریب ہی عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین بھی کھڑا تھا۔ اس نے کہا اور کھل کر کہا کہ میں نہیں کہتا تھا کہ تمہارا کھائیں گے اور تمہیں پر غرائیں گے۔ اسی طرح کی کوئی بات اس نے کہی۔ اس بات پر کچھ لوگ انصاری صحابی کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور کچھ مہاجرین حضرت عمر فاروقؓ کے ملازم کی حمایت میں کھڑے ہو گئے کہ ہمارے آدمی کو کمزور دیکھ کر اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ اس طرح کے مواقع پر ایسا ہو جانا فطری سی بات ہے۔ ایسا ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ گرمی بھی تھی، پیاس بھی تھی اور سفر کی تھکان بھی تھی۔ ایسے موقع پر انسان کو جلدی غصہ آجاتا ہے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ عبداللہ بن ابی نے اس منظر کو دیکھا اور خوش ہوا کہ اب فساد پھیلانے کا ایک نیا موقع ہاتھ آیا ہے۔ وہ انصاری حضرات سے مخاطب ہو کر بولا کہ یہ موقع تو نہیں ہے۔ جب مدینہ جائیں گے تو ان سے بدلہ لیں گے اور ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ ایک ننھے سے صحابی تھے جو یہ بات سن رہے تھے۔ غالباً زید بن ارقمؓ ان کا نام تھا۔ انہوں نے یہ بات رسول اللہ کو جا کر بتائی۔ حضور نے بعض انصاری صحابہ کو بلا کر فرمایا کہ ایسی بات کیوں ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سی بات تھی، وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ آپ بچے کی بات پر نہ جائیں۔ انصاری صحابہ میں سے بعض نے کہا کہ عبداللہ بن ابی اسلام سے پہلے بڑا سردار تھا اور اس کی بادشاہت کی تیاری ہو رہی تھی۔ تو اگر اس کی زبان سے ایسی کوئی بات نکل گئی ہو تو آپ محسوس نہ فرمائیں، یہ معاملہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے عبداللہ بن ابی کو بتایا کہ تمہاری یہ بات حضور ﷺ تک پہنچ گئی ہے۔ وہ بہت غصہ کے عالم میں حضور ﷺ کی محفل میں پہنچا اور حضور سے کہنے لگا کہ آپ کو میرا کوئی لحاظ نہیں اور بچوں کے کہنے میں آکر میرے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے سختی اور سخت

نکالی ہے۔ ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ حضور ﷺ سن کر خاموش رہے۔ صرف اتنا فرمایا کہ کوئی بات نہیں۔

تھوڑی دیر میں حضور نے محسوس فرمایا کہ اس واقعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں ایک شدید اختلاف کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے فوراً روانہ ہو جانا چاہئے اور یہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ آپ نے جلدی روانگی اور کوچ کا اعلان کر دیا۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ لوگ سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو جائیں گے اور اختلاف اور جھگڑے سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سب روانہ ہو گئے۔ عام طور سے یہ وقت حضور علیہ السلام کے کوچ کرنے کا نہیں تھا۔ کئی صحابہ نے پوچھا بھی کہ عام طور پر تو آپ اس وقت کوچ کا حکم نہیں دیتے؟ لیکن آپ نے حکم دیا کہ روانہ ہو جائیں۔ خلاف معمول۔ بغیر زیادہ ٹھہرے سفر کے بعد جب اگلی منزل پر رکے تو سب لوگ تھکان سے اتنے چور تھے کہ سب جلدی سو گئے اور اس واقعہ کو بھول گئے۔ جن نو عمر صحابی نے حضور ﷺ سے یہ بات کہی تھی ان کو اس پورے واقعہ کا بہت دکھ ہوا اور اس بات سے خاص طور پر شدید تکلیف ہوئی کہ شاید میری بات حضور ﷺ نے جھوٹ سمجھا ہو اور میرے بارے میں یہ خیال فرمایا ہو کہ میں نے غلط بیانی کی ہے۔ ابھی اس اگلی منزل سے کوچ نہیں ہوا تھا کہ سورۃ منافقون نازل ہوئی۔ اس سورت میں یہ سارا واقعہ بیان کر دیا گیا۔ وہی بات کہ منافقین یہ کہتے ہیں کہ ہم میں عزت والا ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان انصاری نوجوان کو بلایا۔ ان کا کان پکڑ کر ان سے فرمایا کہ بچے کے کان نے ٹھیک سنا تھا۔ بچے کے کان نے ٹھیک سنا تھا۔ بچے کے کان نے ٹھیک سنا تھا۔ اس کے بعد وہ صحابی جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تھے تو اپنا کان یا کسی بچے کا کان پکڑ کر کہتے کہ حضور نے کہا تھا کہ بچے کے کان نے ٹھیک سنا تھا۔

یہ محض ایک کوشش کی مثال ہے۔ منافقین کی طرف سے اس طرح اختلاف اور جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش ہمیشہ رہتی تھی۔ مدینہ منورہ میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ اس طرح کی کوئی بات، کوئی سازش، کوئی کاوش منافقین اور دشمنان اسلام کی طرف سے نہ ہوتی ہو۔ اس کے برعکس جو معاملات دو قبیلوں کے درمیان دوستی اور تعلق سے متعلق تھے۔ یا کوئی برادری یا حلف کا معاملہ تھا جس میں دو قبیلوں کے درمیان اتحاد کا معاملہ تھا، اس کو رسول اللہ ﷺ نے مزید تقویت

کاروں کو دیا جائے گا اور آدھا حصہ سرکاری خزانے میں بھیجا جائے گا۔

اس فارمولے پر جس کے لئے مخابرہ، مساقات، مزارعت کی اصطلاحات محدثین نے استعمال کی ہیں۔ فدک کی اراضی کا بندوبست ہوا۔ یہی انتظام خیبر کے بعض علاقوں کے لئے بھی کیا گیا۔ یہی انتظام وادی القری کے بعض علاقوں کے لئے بھی کیا گیا۔ جب ایک سال کے بعد فدک میں پیداوار کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ نے مشہور انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ کو بھیجا۔ یہودیوں نے حسب عادت اور حسب روایت ان کو رشوت دینے کی کوشش کی اور ان کو ورغلانا چاہا کہ پیداوار کا اندازہ کم قرار دیں اور جو فرق ہو اس میں سے آدھا حصہ یہودی لے لیں اور آدھا عبداللہ بن رواحہ لے لیں۔ جلد ہی ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ ان کو اس طرح ورغلانا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے تمام پیداوار کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا۔ درختوں کی مختلف قسمیں مقرر کیں۔ اچھی پیداوار کے درخت الگ، درمیانی پیداوار کے درخت الگ، ردی پیداوار کے الگ، پکی پیداوار کے الگ، کچی اور کچی پیداوار کے الگ۔ غرض اس طرح الگ الگ قسمیں مقرر کیں۔ تمام پیداوار کی چیزیں جو تیار تھیں ان کو برابر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اچھی کھجوریں برابر برابر ایک حصے میں، کچھ دوسرے حصے میں۔ ردی اور کچی کھجوروں کا آدھا حصہ ایک طرف آدھا دوسری طرف۔ گویا تول تول کر دونوں میں پیداوار کے دو حصے تیار کئے۔ پھر یہودیوں سے کہا کہ پیداوار کا آدھا آدھا حصہ الگ الگ ہو گیا ہے۔ اب تم اس میں سے منتخب کر لو کہ تم کون سا حصہ لینا چاہتے ہو۔ حصے میں نے بنا دیئے انتخاب تم کر دو کہ کون سا حصہ تمہیں لینا ہے اور کون سا حکومت کو دینا ہے۔ یہودیوں نے یہ صورت حال دیکھ کر کہا بھذا قامت السموات والارض۔ اسی عدل و انصاف کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ اس سے بڑھ کر عدل و انصاف ہم نے نہیں دیکھا۔ یہ الفاظ ان کے آفرین کے کہے۔

یہ جو بندوبست یہودیوں کی اس پیداوار کے ساتھ ہوا تھا وہی فدک کے ساتھ چلتا رہا۔ وادی القری جو ایک سرسبز وادی تھی۔ وہاں باغ بھی تھے، کھیت بھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ خیبر کے لوگوں نے چونکہ مقابلہ کیا تھا اور وہ علاقہ مفتوح علاقہ تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا اور وہ زمینیں مفتوح قرار دے کر یہودیوں

اور صحابہ میں تقسیم کر دیا۔

اس تقسیم کے نتیجے میں ایک زمین حضرت عمر فاروق کے حصہ میں آئی۔ حضرت عمر فاروق نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اس زمین کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب مہاجرین اور سب ساتھیوں کو اس زمین میں سے حصہ ملا ہے تم بھی لے لو۔ حضور کے ارشاد پر انہوں نے وہ زمین لے لی۔ اگلے دن آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ زمین میرے پاس اب تک آنے والے مال و دولت میں سے بہترین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو اللہ کے واسطے میں خرچ کر دوں۔ آپ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اس کو وقف کر دو۔ اس طرح وقف کر دو کہ اس کی اصل ملکیت موجود رہے۔ وہ خرچ نہ ہو اور آمدنی یتیموں، بیواؤں اور مسافروں پر خرچ ہوتی رہے۔ یہ اسلام میں پہلا وقف تھا جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور نے قائم کیا۔ پہلا وقف خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

بنی نضیر کے یہودیوں میں ایک صاحب تھے جن کا نام تھا مخیریق۔ مخیریق کے بارہ میں عام خیال یہی ہے کہ انہوں نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا جس کا اعلان انہوں نے بعد میں کیا تھا۔ وہ بنو نضیر کے یہودیوں میں بہت صاحب جائداد اور صاحب دولت آدمی تھے۔ وہ انتقال سے پہلے بیمار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے اپنی بہت سی زمینوں اور باغات کے بارے میں وصیت کر دی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دے دی جائیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثہ نے آپؐ کو بتایا کہ یہ باغات مخیریق نے آپ کے لئے وصیت کر دیئے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہ سارے باغات اور زمینیں نے کر اپنی طرف سے وقف کر دی تھیں اور اسلامی ریاست کے کئی قسم کے ضروری اخراجات اس سے ادا ہوتے تھے۔ غریبوں اور ناداروں اور اسی سب وقف کی ضروریات بھی اس سے پوری ہوتی تھیں۔ یہ پہلا وقف تھا جو اسلام میں خود سرکار دو عالم ﷺ نے قائم فرمایا۔ دوسرا وقف حضرت عمر فاروق نے فرمایا۔ یہ اس آمدنی کی بنیاد پر تھا جو حضرت عمر فاروق کو خیبر کی فتح کے نتیجے میں مال غنیمت میں حاصل ہوئی۔

مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ کے خدوخال میں سے بہت سے پہلوؤں کا ذکر قرآن

پاک میں ہوا ہے۔ قرآن پاک میں جو صحابہ کرام کی خوبیاں اور اوصاف بیان ہوئے ہیں، مہاجرین اور انصار کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کا وہ حصہ جو مدینہ منورہ میں نازل ہوا۔ اس میں سینکڑوں آیات ہیں جن میں اشارۃً، کنایۃً یا صراحۃً مدینہ منورہ کے معاشرہ کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔ صحابہ کرام نے کس طرح قربانیاں دیں۔ کس طرح مال و دولت میں دوسروں کو شریک کیا۔ کس طرح ان میں معاشرتی تبدیلی آئی اور کس طرح ان کی تربیت کی گئی۔ ان سب سوالوں کے اشارات قرآن پاک میں موجود ہیں۔

مواخاۃ کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ مواخاۃ مکہ مکرمہ میں بھی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان تمام صحابہ کرام کو جو مکہ میں اسلام لائے تھے، ان کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ تاکہ عرب کے اس قبائلی معاشرہ میں ایک متبادل برادری قائم کی جا سکے جو ایک دوسرے کی مددگار ہو۔ اگر قبائل اپنے کسی مسلمان بھائی کی مدد نہ کریں تو مسلمان برادری ان کی مدد کے لئے موجود ہو۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بھی آپ نے مواخاۃ قائم فرمائی تھی۔ مسجد نبوی کی تکمیل سے پہلے یہ کام ہو گیا تھا۔ یہ گویا ایک نئے معاشرہ کی طرف ایک قدم تھا۔ وہ معاشرہ جس کو ایک غیر قبائلی بنیاد کا معاشرہ بننا تھا۔ اس سے پہلے تک مدینہ منورہ میں قبائلی نظام سے ہٹ کر کوئی بنیاد نہیں تھی۔ یہ پہلا معاشرتی نمونہ تھا جس میں غیر قبائلی بنیاد پر مختلف اور متنوع قبائل کے افراد کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا اور ان میں جو اخوت قائم کی گئی وہ بعض صورتوں میں حقیقی اخوتوں سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ اسی بنیاد پر پھر میثاق مدینہ کی تشکیل ہوئی۔ میثاق مدینہ میں ایک اور قدم آگے بڑھ کر غیر قبائلی معاشرہ کی بنیادوں کو مزید گہرا کیا گیا۔

ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کی آبادی کتنی تھی؟ اس کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ بعض محققین نے اس کا اندازہ دس اور چودہ ہزار کے درمیان کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے دس ایک ہزار۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دس گیارہ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ بعض حضرات نے چودہ ہزار لکھا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قبائل کی وہ تفصیل جو سمہودی کے ہاں ملتی ہے اس میں جہاں قبیلہ اور عشیرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس یا چودہ ہزار سے کم آبادی نہیں رہی ہوگی۔ یہودی قبائل کی تعداد اس وقت عرب قبائل کی تعداد سے دوگنی تھی۔ یہ وہ قبائل تھے جو مدینہ منورہ میں پہلے سے

آباد تھے۔ جن کی تعداد بائیس سے کم نہیں تھی اور چوبیس سے زیادہ نہیں تھی۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد آپ (ﷺ) نے مردم شماری بھی کروائی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ آپ نے فرمایا: 'اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام' میرے لئے ان تمام لوگوں کی ایک فہرست تیار کرو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ گویا مسلمان باشندوں کی پہلی مردم شماری ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس کی تاریخ کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے فوراً بعد اور دوسری مرتبہ بعد میں۔ ممکن ہے یہ واقعہ دو مرتبہ ہوا ہو۔ ممکن ہے تین مرتبہ ہوا ہو۔ لیکن مدینہ منورہ آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مردم شماری کرائی۔ اور صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کا پہلی مرتبہ ریکارڈ مرتب کیا گیا۔

یہودیوں کے جو تین بڑے قبائل تھے ان میں مسجد نبوی سے قریب ترین تو بنو قینقاع تھے جو مسجد نبوی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر بنو نضیر تھے۔ بنو قریظہ نسبتاً زیادہ فاصلہ پر آباد تھے۔ بنو قریظہ کے ساتھ سب سے اخیر میں جنگ کی نوبت آئی۔ انہوں نے غزوہ خندق میں غداری کی تھی۔ جبرئیل امین کے حکم پر ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ وہ تمام صحابہ جو غزوہ خندق میں شریک تھے وہ سب کے سب بنو قریظہ کے محاصرہ میں بھی شریک رہے۔ پندرہ روز کے محاصرہ کے بعد یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان کے بارے میں اسی فیصلہ پر عمل کیا گیا جو سعد بن معاذ نے ان کے بارے میں کیا تھا۔

بنی قریظہ کے بارے میں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ وہ یہ کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر دونوں نے پیشکش کی کہ وہ مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہونے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں قبائل اپنا ساز و سامان لے کر خیبر چلے گئے اور وہاں پر بقیہ یہودیوں کے ساتھ آباد ہو گئے۔ بنو قریظہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی یہ پیشکش کی لیکن قبول نہیں کی گئی۔ بعد میں ان کے اپنے مطالبہ پر حضرت سعد بن معاذؓ ان کے معاملہ کو فیصلہ کرنے کے لئے ثالث مقرر ہوئے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تورات کے حکم کے مطابق ان کے سپاہیوں کو قتل کیا جائے۔ مال و جائیداد کو غنیمت قرار دیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو غلام قرار دیا جائے۔ تورات میں آج بھی لکھا ہوا ہے کہ مفتوحین کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ چنانچہ

یہودیوں کے ساتھ ان کے اپنے مذہبی قانون کے مطابق عمل کیا گیا۔ یہودیوں نے خود حضرت سعد بن معاذ کو حکم تسلیم کیا تھا۔

اس واقعہ کا یہ بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ حضرت سعد بن معاذ بیمار تھے۔ غزوہ خندق میں زخمی ہو گئے تھے اور اس وقت تک ان کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے۔ جب غزوہ خندق کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا تو ان کو ایک سواری پر سوار کر کے وہاں لایا گیا جہاں رسول اللہ ﷺ اور بنو قریظہ کے سرداروں کے درمیان یہ بات چیت ہو رہی تھی۔ سعد بن معاذ کو جب یہودیوں نے حکم بنانا تجویز کیا تو وہ کھڑے ہو گئے اور پوچھا کہ کیا سب لوگ مجھے حکم بنانے پر راضی ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ کیا آپ بھی مجھے حکم مانتے ہیں۔ دو تین مرتبہ کہا کہ کیا آپ سب لوگ مجھے حکم مانتے ہیں؟ انہیں یہ توقع تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنی زبان مبارک سے فرما دیں کہ ہاں تو پھر میں آگے بات کروں۔ جب حضور نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تو جس طرف حضور تشریف فرما تھے، حضرت سعد نے اس کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ کیا اس طرف کے لوگ بھی مجھے حکم مانتے ہیں؟ جب انہوں نے کہا ہاں تو پھر حضور کی طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ کیا اس طرف کے لوگ بھی مجھے حکم مانتے ہیں؟ تو حضور نے فرمایا کہ ہاں، اس طرف کے لوگ بھی آپ کو حکم مانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت سعد نے فیصلہ کیا جس پر ان لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔

ماضی قریب کے بعض مسلمان اور بعض غیر مسلم مؤرخین اور سیرت نگاروں نے بنو قریظہ کے اس انجام کو بیان کرنے والی روایات کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں ان روایات میں بنو قریظہ کے مقتولین کی تعداد کے بارے میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس رائے کی تائید میں کئی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں جس طرح سیرت کے واقعات پر بہت تفصیلی تبصرے ہیں اور جزئیات کی طرف بھی اشارے ہیں، اس طرح کے تفصیلی اشارے بنو قریظہ کے بارے میں نہیں ہیں۔ سورۃ احزاب میں جزوی اشارہ ملتا ہے فریقاً تقتلون و تأسرون فریقاً، کہ تم ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو گرفتار کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ کوئی واضح یا اشارہ کوئی نہیں ملتا۔ دوسری وجہ یہ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں بنو قریظہ کے اس واقعہ کے بعد بھی بہت سے یہودی رہتے

رہے۔ ان کا تذکرہ ملتا ہے کہ بنی قریظہ کے فلاں یہودی نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ۔ تو اگر وہ
سارے کے سارے قتل کر دیے گئے ہوتے تو مدینہ منورہ میں بنو قریظہ کے یہ یہودی کہاں سے
آئے۔ اس طرح کے بہت سے اور شواہد کچھ لوگوں نے بیان کیے ہیں اور اس رائے کا اظہار کیا
ہے کہ بنو قریظہ کے صرف سردار اور جنگی مجرمین جن کی تعداد پندرہ بیس یا پچیس کے قریب تھی،
صرف ان کو قتل کیا گیا اور باقی لوگوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا گیا۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو
اس رائے کا اظہار کچھ لوگوں نے کیا ہے۔ بعض قدیم مورخین نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی
ہے۔ مجھے اس وقت نام یاد نہیں آرہا۔ کسی مستشرق کی رائے میں نے پڑھی ہے جس میں
انہوں نے کہا ہے کہ بنو قریظہ کے 43 آدمی قتل کیے گئے۔ بعض نے کہا کہ 400 قتل کیے
گئے۔ بعض نے کوئی تعداد اور مختلف بتائی ہے۔ لیکن یہ بحث ابھی پچھلے تیس چالیس سال
دوبارہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان کے ایک مصنف تھے۔ مسلمان تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔
برکات احمد قادیانی۔ ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔ ان کی کتاب Muhammad and the Jews of Madinah بہت اچھی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بنو قریظہ پر
بہت تفصیل سے لکھ کر یہ سارے دلائل اور شواہد بیان کیے ہیں۔ شاید ان کی کتاب سے متاثر
ہو کر یا از خود کی تحقیق کے نتیجہ میں بعض مسلمان محققین نے بھی اس پر مزید اظہارِ خیال کیا ہے
اور اس رائے کی تائید کی ہے۔ لیکن یہ بات کہ بنو قریظہ کے سارے مردان جنگی قتل کیے گئے یا
نہیں، اس پر سیرت نگار ایک سے زائد آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مفسر نے
43، ایک نے 400، ایک نے 600 آدمیوں کے قتل کی بات کی ہے۔ تعداد تو اس کی زیادہ
ہو گی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مرد یعنی بالغ مرد قابل جنگ افراد کو قتل نہیں کیا گیا۔

بنو نضیر قبا کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ ان کے بھی متعدد آطام تھے۔ ان کی آبادی
چند ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ زرعی زمینیں زیادہ تر انہی کی تھیں۔ مدینہ منورہ کی زراعت کے
بڑے حصے پر انہی کا قبضہ تھا۔ یہودیوں کا طریقہ شروع سے یہی رہا ہے۔ مدینہ میں بھی یہی
طریقہ رہا کہ تجارت اور کاروبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے پاس وسائل کی
کثرت اور بہتات تھی۔ اس دولت کی مدد سے وہ ضرورت مندوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ اس
پر سود عائد کرتے تھے۔ سود در سود کی وجہ سے مقروض پھنس جاتا تھا تو قرض دار ان کی زمینیں

رہن رکھ لیتا تھا۔ زمینیں رہن رکھنے کے باوجود جب مقروض قرض ادا نہ کر پاتا تو اس کی زمین چھیاں جاتی۔ اس طرح ایک ایک کر کے عربوں اور دوسرے مسلمانوں اور انصاریوں کی بہت سی زمینیں یہودیوں نے ہتھیا رکھی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ان میں سے بہت سے عرب قبائل کی زمینیں یا تو یہودیوں کے پاس رہن تھیں یا وہ ان کو پہلے ہی اپنی ملکیت قرار دے کر قبضہ کر چکے تھے۔

یہودی قبیلہ جو قینقاع مسجد نبوی کے قریب ترین خطہ میں رہنے والا قبیلہ تھا۔ یہ لوگ تاجر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دستکاری یعنی ہنڈی کرافٹ کے بھی ماہر تھے۔ سونے، لوہے اور بڑھئی کا کاروبار سب بنو قینقاع ہی کے یہودی کرتے تھے۔ اس طرح سے مدینہ منورہ کے بڑے بازار اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ مدینہ منورہ کا سب سے بڑا بازار بھی انہی کا تھا۔ یہ لوگ تعداد میں ساڑھے تین چار ہزار کے قریب تھے۔ ان میں سات سو قابل جنگ مرد اور باقی بوڑھے، عورتیں اور بچے تھے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بازار لگتے تھے وہاں بھی انہی کا سازوسامان آیا کرتا تھا۔ بنو قینقاع کا ایک قبیلہ ایک الگ گاؤں میں آباد تھا۔ یہ سارا قبیلہ پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا۔ اس بستی میں تین سو سنار تھے جو نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ قرب وجوار میں بھی اپنی مصنوعات کو فروخت کیا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ کی اس آبادی کے علاوہ قرب وجوار کے لوگ بھی ایک ایک کر کے اسلام قبول کر رہے تھے اور مدینہ منورہ میں آ آ کر آباد ہو رہے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد اور مدینہ منورہ کی آبادی میں کثرت سے اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ قبائل چونکہ ہجرت کر کے آ رہے تھے اس لئے ان کا واسطہ مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس اخوت کے واسطے سے تھا جو میثاق مدینہ کی شکل میں قائم ہوئی تھی۔ اس لئے ان کو مدینہ منورہ میں آباد ہونے میں اور وہاں کے ماحول میں گھل مل جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

مدینہ منورہ میں سب سے پہلا انتظامی معاملہ جو حضور کے سامنے پیش تھا، وہ امن وامان کا مسئلہ تھا کہ ان متنوع قبائل کی موجودگی میں، جن میں الگ الگ آدھے دشمن قبائل تھے، شروع میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، ان سب میں امن وامان کیسے قائم کیا جائے۔ خاص طور پر باہر سے آنے والے مسلمانوں کو سیکیورٹی کیسے فراہم کی جائے۔ مدینہ منورہ میں جرائم

کے واقعات پہلے کثرت سے ہوتے رہتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد کے بعد جرائم میں بہت کمی آگئی۔ لیکن پھر بھی قتل، چوری، بدکاری، شراب خوری، ڈاکہ اور اغوا وغیرہ کے اکا دکا واقعات کبھی کبھی ہوتے رہتے تھے۔ ایک ایک کر کے رسول اللہ ﷺ نے ان واقعات کا سد باب کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ میں پہرے کا انتظام بھی کیا۔ بعض افسران کا تقرر بھی کیا جن کو ہم پولیس افسران کہہ سکتے ہیں۔

تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ، جو ایک نمایاں انصاری سردار تھے، ان کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے امن وامان کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس طرح ان کو ہم مدینہ کا پہلا پولیس افسر کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مقرر کردہ کارندے ہوتے تھے جو شہر کے مختلف علاقوں اور قریب کے دیہاتوں میں جا کر امن وامان کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان علاقوں میں امن وامان کا فریضہ انجام دیتے تھے جہاں مسلمان آبادیاں زیادہ تھیں۔ جیسے جیسے مسلمان آبادیاں بڑھتی گئیں، امن وامان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غیر مسلم آبادیاں جیسے جیسے کم ہوتی چلی گئیں، خاص طور پر تین بڑے یہودی قبائل کو نکالنے کے بعد جرائم میں بڑی نمایاں کمی آگئی۔ جرائم اور اس طرح کے واقعات کی بیشتر مثالیں ہجرت کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ بعد میں اس طرح کی مثالیں نسبتاً کم ہیں۔

ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ مدینہ منورہ میں شروع میں نو مساجد اور بعد میں چالیس مساجد قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مساجد میں درس وتدریس کا انتظام بھی تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت اس پورے درسی نظام کے سربراہ تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اس ریاست کے پہلے وزیر تعلیم تھے تو شاید درست ہوگا۔ وہ تمام مساجد میں خود تشریف لے جاتے تھے۔ جہاں جہاں قرآن پاک کی تعلیم ہوتی تھی، اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ خود براہ راست صفہ میں جو صحابہ زیر تعلیم تھے، ان کی نگرانی بھی فرمایا کرتے تھے۔ صفہ مسجد نبوی میں ایک حصہ تھا جہاں صحابہ کرام بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ باہر سے آنے والے صحابہ کرام اکثر و بیشتر صفہ میں ٹھہرتے تھے جہاں ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ یہ صحابہ کرام وہ تھے جو بعد میں بڑے بڑے فاتحین اور سردار بنے۔ فاتح شام حضرت عبیدہ بن الجراح بھی صفہ میں مقیم رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی بھی ایک زمانے میں صفہ میں مقیم رہے۔ مشہور راوی حدیث

حضرت ابو ہریرہ بھی صفہ میں مقیم رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفہ میں ملنے والی تربیت کس انداز کی تھی۔

مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج پہلے سے تھا۔ سوید بن صامت کا تذکرہ ہو چکا ہے جو حضرت لقمان حکیم کے حکمت نامے سے واقف تھے اور اس کو پڑھتے بھی تھے۔ مدینہ منورہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کئی حضرات ایسے تھے جو کام بھی چلاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بندوبست اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہجرت کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ غزوہ میں جو قیدی جنگ بدر میں ہاتھ آئے تھے ان میں سے بہت سوں نے مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ یہ ان کا فدیہ تھا جس کے بدلے میں ان کو رہا کر دیا گیا۔

جو حضرات مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے ان میں ایک نمایاں نام حضرت معاذ بن جبل کا بھی ہے۔ جیسے جیسے دوسرے علاقے فتح ہوتے گئے رسول اللہ ﷺ وہاں تعلیم کے لئے لوگوں کو بھیجتے رہے۔ عمرو بن حزم کو سترہ سال کی عمر میں یمن بھیجا تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ یفقہہم فی الدین و یعلمہم القرآن، تاکہ ان کو دین کی سمجھ سکھائیں اور قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ حضرت معاذ بن جبل کو فتح مکہ کے بعد کچھ دن کے لئے مکہ میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر کو ہجرت سے پہلے ہی مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ تعلیم قرآن کے کئی معلمین حضور نے مکہ میں بھی مقرر فرمائے اور مدینہ میں بھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو تعلیم قرآن کے لئے عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں میں بھیجا گیا تھا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مدینہ منورہ کی مساجد اور تعلیمی مراکز میں جو صحابہ تعلیم دیا کرتے تھے ان میں زید بن ثابت، ابی بن کعب، حضرت ابو درداء، اسید بن حضیر، خالد بن سعید بن العاص، حضرت ابو عبیدہ، عمرو بن حزم اور معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کے نام بڑے نمایاں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص جو ایک مہاجر صحابی تھے، کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ان کے بارے میں لکھا ہے "وکان کاتباً محسناً" وہ بہت اچھے کاتب تھے۔ وہ بچوں کو کتابت سکھایا کرتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت بھی خوش نویسی کے استاد

تھے اور خوش نویسی سکھایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے غیر مسلموں سے فنی اور تجربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کے لئے یہودیوں کے مدارس میں بھیجا۔ منجنیق میں مہارت حاصل کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ کو یمن بھیجا۔ مدینہ منورہ میں دارالقراء کے نام سے ایک بڑا مکان تھا جہاں بڑی تعداد میں قرآن پاک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ وہاں بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ ٹھہرا کرتے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بارے میں ملتا ہے کہ جب مدینہ آئے تو اس مکان میں ٹھہرے جس کو بعد میں دارالقراء کہا گیا۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ بھی اسی مکان میں ٹھہرے۔

قرآن پاک، دین اور فقہ کے ساتھ ساتھ جن دوسری چیزوں کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی فہرست التراتیب الاداریہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ چیزیں شامل ہیں: فلکیات، تیر اندازی، تیراکی، عربی زبان و ادب، طب، قیافہ، طریقہ حرب، تجارت، ترجمہ اور مختلف زبانیں۔

مدینہ منورہ میں حضورؐ نے اپنے زمانے میں مفتی اور قاضی بھی مقرر فرمائے تھے۔ اس زمانے میں مفتی اور قاضی کا منصب ایک ہی ہوتا تھا۔ خلفائے اربعہ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، معاذ بن جبل اور عمار بن یاسر مدینہ منورہ کے مفتی اور قاضی بھی تھے۔ ان میں حضرت ابوہریرہ، ابوالدرداء، حذیفہ بن الیمان، ابوموسیٰ اشعری اور سلمان فارسی کے اسمائے گرامی بھی نمایاں ہیں۔

دستاویزات کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے دستاویزات کا شعبہ قائم فرمایا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو اس پر مقرر کیا۔ یہ سب حضرات بلا معاوضہ کام کیا کرتے تھے۔ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن الارقم الزہریؓ حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے اور تنخواہ نہیں لی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے کام کا اندازہ لگا کر ایک تخمینہ لگایا اور ان کو تیس ہزار درہم تنخواہ بقایاجات سمیت دینی چاہی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا: انما عملت لله انما اجری علی الله میں نے تو یہ سب کام اللہ کے لئے کئے ہیں اور اللہ ہی سے اس کا اجر لوں گا۔

تعلیم اور انتظامی امور کی باقی تفصیلات کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

مدینہ منورہ اس اعتبار سے پورے جزیرہ عرب میں نمایاں تھا کہ وہاں تجارت اور زراعت دونوں کے مراکز تھے۔ طائف میں زیادہ تر زراعت ہوتی تھی تجارت کم تھی۔ مکہ مکرمہ میں صرف تجارت ہوتی تھی زراعت نہیں تھی۔ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت دونوں ہوتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے باغات اور کھیت تھے۔ کھجور اور انگور کے علاوہ بھی بہت سی دوسری پیداوار ہوتی تھی۔ تجارت میں اگرچہ اب مسلمان بھی شریک تھے۔ لیکن زیادہ تر تجارت اب بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لائے تو آپ نے ایک ایک کرکے ان میں سے ہر چیز کا جائزہ لیا۔ جو چیز اسلام کے نقطہ نظر سے قابل قبول تھی یا غلط نہیں تھی، اس کو حضور نے جاری رہنے دیا اور اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

یہ اسلام کی حکمت تشریع کا ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات اور تجارت کے ابواب میں اصل چیز حلت ہے، حرمت نہیں۔ بالفاظ دیگر اصول یہ ہے کہ لوگ جو کاروبار لوگ کررہے ہیں اگر وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہیں ہے تو وہ کاروبار جائز ہے۔ شریعت نے بعض احکام مثبت طور پر دیے۔ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ میں جو ہجرت کے ایک دو سال بعد نازل ہوئی اس میں تجارت کے بارے میں بعض بنیادی احکام دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ تجارت وہ ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو۔ جائز معاملات میں ہو۔ اس میں کسی کو دھوکہ نہ دیا گیا ہو۔ تراضی سے ہو۔ ایک دوسرے کے طیب نفس سے ایک دوسرے کے مال کا تبادلہ کیا گیا ہو۔ جو تجارت ان ہدایات کے مطابق تھی وہ جائز قرار پائی اور جو ان ہدایات کے خلاف تھی یا ان میں ان ہدایت کی خلاف ورزی کا امکان تھا وہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمادی۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ متعین چیزوں کی صراحت کردی گئی کہ یہ چیزیں ناجائز ہیں اور تجارت اور کاروبار سے ان کو ایک ایک کرکے ختم کیا جائے۔ اس لئے عرب میں تجارت کی جتنی شکلیں تھیں ان میں سے ایک ایک کرکے کچھ شکلیں جو خالص حقی اور غیر منصفانہ تھیں وہ ناجائز قرار پائیں اور بہت سی رائج الوقت شکلوں کو جزوی اصلاحات کے ساتھ جائز قرار دے دیا گیا۔

مدینہ منورہ کی بڑی بڑی پیداوار کھجور، جو، انگور اور انجیر کی تھی اور کچھ پھل جن میں انار اور کیلا بہت نمایاں ہیں، کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ گندم پیدا ہوتا تھا لیکن تھوڑا تھا۔ عام طور پر

لوگوں کی غذا جو ہوا کرتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی جو مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اہل خاندان نے کبھی مسلسل کئی دن تک گندم استعمال نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ گندم مدینہ منورہ کی بڑی پیداوار نہیں تھا۔ گندم کا بیشتر حصہ خیبر سے لایا جاتا تھا۔ یہ دور سے لانے کی وجہ سے مہنگا بھی تھا اور کم بھی تھا۔ مصنوعات میں زیادہ تر کپڑا، ہتھیار، لکڑی کا سامان شامل تھا۔ انگور کی پیداوار کی وجہ سے شراب کی پیداوار بھی تھی۔ اکثر شراب خانے یہودیوں کے تھے۔ وہ خود بھی شراب کا کاروبار کرتے تھے اور ان سے لے کر دوسرے لوگ بھی قرب وجوار میں شراب کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ جب شراب حرام قرار پائی تو مہاجرین اور انصار دونوں میں شراب کا کاروبار کرنے والوں نے شراب کے کاروبار سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ چونکہ مدینہ منورہ میں مارکیٹ ختم ہوگئی اس لئے غیر مسلموں نے بھی ایک ایک کرکے شراب کا کاروبار ختم کر دیا۔

مدینہ منورہ میں جو افراد زمینوں کے مالکان تھے ان میں سے کچھ لوگ بڑے بڑے قطعوں کے اور بعض چھوٹے چھوٹے قطعوں کے مالکان تھے۔ چھوٹے قطعوں کے مالکان اپنی زمینوں پر خود کام کرتے تھے۔ بڑی زمینوں کے مالکان مختلف طریقوں سے اپنی زمینوں پر کام کرایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مزدوری دے کر کام کراتے تھے۔ کچھ لوگ مزارعت اور مساقاۃ کی بنیاد پر کام کراتے تھے۔ یہ مختلف طریقے عرب میں رائج تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مزارعت کی بعض شکلوں کو ناجائز قرار دیا اور بعض کی اجازت دی۔ جن شکلوں میں سود، دھوکہ، استحصال یا اس طرح کی کوئی اور خرابی پائی جاتی تھی ان شکلوں کو آپؐ نے ناجائز قرار دیا اور جن شکلوں میں استحصال یا سود نہیں پایا جاتا تھا ان کی آپ نے اجازت دے دی۔ مدینہ منورہ کی زمین اکثر بارانی تھی اس لئے سال میں ایک ہی فصل ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں کنویں بھی تھے جن سے رہٹ اور اونٹ کے ذریعے پانی نکالا جاتا تھا۔ جن باغات میں کنویں تھے ان میں سال میں دو فصلیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ زیادہ تر باغات میں سال میں ایک ہی فصل ہوتی تھی۔

دستکاری میں گھریلو دستکاری بھی تھی اور اجتماعی دستکاری بھی تھی۔ گھریلو دستکاری میں کپڑے بُننا، سوت کاتنا، دھاگہ بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ جو بڑے کاروبار تھے اور جس میں ایک سے زائد لوگ کام کرتے تھے جس کو آپ فیکٹری یا کارخانہ کہہ سکتے ہیں۔ ان میں

زراعت، نجاری اور لوہاری کے آلات بنائے جاتے تھے۔ یہ سرگرمی گویا بنو قینقاع کے ہاتھ میں تھی۔ قرب و جوار کی آبادیاں زرعی آبادیاں تھیں اس لئے وہاں آلات زراعت کے کام کی خاصی گنجائش تھی۔ مدینہ منورہ کے تاجر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتے تھے۔ شام سے کپڑا اور استعمال کی دیگر اشیاء منگوایا کرتے تھے۔ گندم کا بیشتر حصہ اردن سے آیا کرتا تھا۔ کاروبار میں یہودی بھی پیش پیش رہتے تھے اور شام کے مختلف علاقوں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں اور مراکز تھے جہاں سے وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ بنو نضیر کے یہودی اس کام میں بڑے نمایاں تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا اور یہ ہجرت کے فوراً بعد کی بات ہے۔ ہجرت کے چند مہینے یا ایک ڈیڑھ سال کے بعد۔ کہ مسلمان بڑی تنگ دستی کے عالم میں تھے۔ یہودیوں کا ایک بڑا تجارتی قافلہ آیا۔ اس میں خوشبوئیں، جواہرات اور سمندری سامان غالباً موتی وغیرہ مدینے کے بازار میں آکر اترا۔ مسلمان خواتین اور نوجوانوں نے حسرت کی ایک نظر سے ان سب چیزوں کو دیکھا اور دل میں محسوس کیا کہ تمام مال و دولت یہودیوں کے پاس ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی تسلی کے لئے قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی: **ولقد اتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم لا تمدن عینیک الی ما متعنا به ازواجا منهم** "ہم نے آپ کو قرآن اور سات مثانی عطا کئے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کی اس عارضی نعمت پر آپ زیادہ دل میلا نہ کریں۔ یہ ایک وقتی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر ان کو دی ہے۔

غرض یہ تجارت بیشتر یہودیوں کی تجارت تھی۔ جس پر ان کا قبضہ تھا۔ انصار یعنی اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ان کے مقروض تھے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان کی زمینیں ایک ایک کرکے یہودیوں کے قبضے میں جا رہی تھیں۔ اس صورت حال پر مہاجرین کے آنے سے بہت فرق پڑا۔ مہاجرین تجارت کے بڑے ماہر تھے۔ مکہ مکرمہ میں اصل کام تجارت تھا۔ مہاجرین میں بڑے بڑے نامی گرامی تاجر تھے۔ سیدنا عثمان غنیؓ، سیدنا عبدالرحمن بن عوف، حضرت زبیر بن العوام، یہ بڑے بڑے صحابہ تھے اور تجارت کے فن میں طاق تھے۔ جب انہوں نے مدینہ منورہ کے بازاروں میں تجارت شروع کی تو یہودیوں کا زور بتدریج کم

ہوتا چلا گیا اور ان کی اجارہ داری متاثر ہوئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بنو قینقاع کے بازار میں ہی کاروبار شروع کیا تھا۔ وہاں کے تاجروں نے بازار پر اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی تھی۔ ایک شخص ابو رافع تھا، وہ تاجر حجاز کہلاتا تھا۔ پورے حجاز کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ بنو قینقاع کے پورے بازار بلکہ مدینہ منورہ کے بازار پر اس کا کنٹرول تھا۔ جو قیمت وہ قرار دیتا تھا وہی قیمت بازار کی ہوتی تھی۔ سب یہودی تاجر متحد ہو کر اس کے فیصلوں کی پابندی کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ایکا کر کے کسی غیر یہودی تاجر کو بازار میں پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے دو پیمانے بنا رکھے تھے۔ ایک چیز دینے کے لئے اور ایک لینے کے لئے ہوتا تھا۔ اسلام نے بعد میں دو پیمانے رکھنے کی ممانعت کر دی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پہلے تاجر تھے جنہوں نے ابو رافع تاجر حجاز کی اس اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ اور ایک ایک کر کے اس کے غلط تجارتی طریقوں کو ختم کیا اور اس کے کنٹرول کو کمزور کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بڑا اہم فیصلہ یہ کیا کہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ایک نیا بازار قائم کیا جو مسجد نبوی کے قریب ہی تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لئے ایک متبادل بازار قائم ہو جائے اور یہودیوں کی شرارتوں اور اجارہ داری سے مسلمانوں کو نجات مل جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو دنیاوی اعتبار سے بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ بڑی محترم شخصیت تھے۔ اللہ نے وسائل بھی دیئے تھے اور تجارت کی مہارت بھی دی تھی۔ ان کو شکست دینا اور ان کے کاروبار کو خراب کرنا تو یہودیوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔ لیکن چھوٹے مسلمان تاجروں کو یا ایسے لوگوں کو، جن کا رسوخ کم تھا، ان کو یہودی تاجر تنگ کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اپنے مسلمان خریداروں کو بھی یہودی دکاندار تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کا مشہور واقعہ بھی اسی پس منظر میں ہوا جس کی وجہ سے غزوہ بنو قینقاع ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

ان ساری چیزوں کا سدباب کرنے کے لئے اور ایک متبادل تجارتی پلیٹ فارم قائم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بازار قائم کیا جس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارا اپنا بازار ہے۔ اس میں کوئی بھی تمہارے ساتھ زیادتی یا کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تم سے کوئی ناجائز ٹیکس نہیں لے گا۔ یہودی اپنے بازار میں بیٹھنے والے مسلمانوں سے غیر ضروری

ٹیکس بھی لیا کرتے تھے اور ان پر طرح طرح سے ناجائز بوجھ ڈالا کرتے تھے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گویا رسول اللہ ﷺ نے مدینہ بازار میں کاروبار کرنے والے مسلمان تاجروں کے لئے ٹیکس رعایت کا اعلان کیا کہ کوئی اضافی بوجھ تم پر نہیں ڈالا جائے گا۔ مزید فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس بازار میں مال لا کر بیچے گا وہ اسی اجر کا مستحق ہوگا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے۔ الجالب الی سوقنا کالمجاہد فی سبیل اللہ، جو ہمارے اس بازار میں مال لے کر آئے گا وہ اسی طرح کے اجر کا مستحق ہوگا جس طرح کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کے بازار کو کامیاب بناتا ہے وہ مسلمانوں کی معاشی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ مسلمانوں اور امت مسلمہ کی آزادی کو یقینی بنانے والا کوئی بھی عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ نے فرمایا کہ ہمارے اس بازار میں کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے گا تو اس کو اتنا ہی مجرم سمجھا جائے گا جس طرح کہ کتاب اللہ میں الحاد کرنے والا، کتاب اللہ کی معانی میں تحریف کرنے والا، کتاب اللہ کے معانی کو غلط بیان کرنے والا۔

جب بنو قینقاع اور بنو النضیر کے خلاف کارروائی کا فیصلہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ ان کو خیبر جلاوطن کر دیا جائے۔ اس وقت یہودیوں کے بہت سے سودی قرضے اور رقوم انصاری صحابہ پر واجب الادا تھیں۔ اس وقت سود مکمل طور پر حرام نہیں ہوا تھا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر یہودی خیبر چلے جاتے ہیں تو ان کی رقوم اور قرضوں کا کیا ہوگا۔ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حکم دیا جس پر فقہا نے بڑی بحثیں کی ہیں۔ آپ نے دست مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ضعوا وتعجلوا، یعنی اصل رقم میں تھوڑی سی کمی کر کے جلد لے لو۔ یعنی اگر رقم ایک سال کے بعد واجب الادا ہے اور اس کی مالیت ایک لاکھ ہے تو پچانوے ہزار لے لو اور آج وصول کر لو۔ اس حکم کے بارے میں فقہا کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم ربا کی مکمل حرمت سے پہلے کا ہے۔ اس لئے ربا کی حرمت کے بعد یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا جو آپ نے ایک مسئلہ کے حل کے لئے فرمایا۔ اکثریت کی یہی رائے ہے۔ اس میں بھی ایک نوعیت کا مخفی سود ہے۔ وقت کی قیمت ہے۔ قیمت میں وقت کی کمی کے مطابق کمی کرنا مخفی سود ہی کے مترادف ہوگا۔ اس لئے اب حرمت سود کی آیت کے بعد فقہائے اسلام کی غالب

ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ضعوا و تعجلوا، پر عمل کرنا اب جائز نہیں ہے۔ بعض حضرات جو اقلیت میں ہیں، ان کی اب بھی یہ رائے ہے کہ ضعوا و تعجلوا، کے حکم پر آپس کی آزادانہ رضامندی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً اس کی ممانعت بعد میں نہیں فرمائی۔

اسی طرح سے کچھ یہودی ایسے تھے جن کی زمینیں دوسری آبادیوں اور دوسری بستیوں میں واقع تھیں۔ جب یہودی مدینہ منورہ سے نکلنے لگے تو انہوں نے شور مچایا کہ اب مختلف گاؤں میں واقع ہماری زمینوں کا کیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا اور دوسرے فریقوں کا موقف سننے کے بعد فیصلہ فرمایا کہ ان زمینوں کو جبری طور پر فروخت کروا دیا جائے۔ اور جو شخص زمین کی قیمت یہودیوں کو دے دے وہ اس زمین کا مالک بن جائے۔ یہودیوں کو یہاں زمین رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ یہودیوں نے وہ زمینیں ناجائز طور پر ہتھیائی تھیں۔ سودی کاروبار کے ذریعے قبضہ میں لی تھیں۔ دوسرے عملاً اس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ ایک یہودی تاجر جو خیبر میں بیٹھا ہوا ور مدینہ میں اس کی زمین ہو تو اس کو سازشیں کرنے کا بڑا موقع ملے گا، اس لئے بہتر یہی تھا یہودیوں کو مدینے سے لاتعلق کر دیا جائے۔

مدینہ میں اس زمانے کے بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح بارٹر کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ لوگ ایک چیز دے کر دوسری چیز لے لیا کرتے تھے۔ ابتدائی معیشت میں یہ بجھ بارٹر کا سسٹم ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں بھی تھا۔ یہودیوں نے اس بارٹر سسٹم کو بھی اپنی بالادستی کا اور اپنے معاشی کنٹرول کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ زرعی پیداوار پر قبضہ اور کنٹرول عموماً یہودیوں ہی کا ہوتا تھا۔ صنعت اور تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے جب فصل کٹنے میں ابھی کافی وقت ہوتا تھا تو لوگوں کو چیز دیتے وقت کہتے تھے کہ یہ اچھی چیز ہے اور جب لوگوں کی پیداوار وصول ہو جاتی تھی اور وہ قرض وصول کرنے آتے تو کہتے کہ تمہاری پیداوار گھٹیا ہے اس لئے تمہیں زیادہ دینا پڑے گا۔ اپنی پیداوار کو اعلیٰ اور دوسروں کی پیداوار کو گھٹیا قرار دیتے تھے، اور مثلاً ایک کلو کے بدلے میں دو کلو لے لیا کرتے تھے۔ یہ بھی استحصال کا ایک طریقہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ربا کے احکام کے تحت کاروبار کی بہت سی

شکلوں کو ناجائز قرار دیا تو آپ نے اس شکل کو بھی ناجائز قرار دیا۔ اس کو ربا الفضل کہا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں چھ چیزوں کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ "الذھب بالذھب والفضة بالفضة والشعر بالشعیر والملح بالملح والتمر بالتمر والحنطة بالحنطة مثلاً بمثل یداً بید والفضل ربوا"۔ یعنی سونا اور چاندی، جو، کھجور، گندم اور نمک کا جب باہمی لین دین کیا جائے تو دست بدست کیا جائے، فوراً دیں اور فوراً لیں اور برابر سرابر کی بنیاد پر لین دین کیا جائے۔ زیادتی ہوگی تو اس کو ربا سمجھا جائے گا۔ اس حکم نے دو اچھے نتائج پیدا کئے۔ ایک تو یہ کہ اس کے نتیجہ میں بارٹر کے کاروبار میں خود بخود کمی آئی اور زری معیشت یعنی مانیٹری اکانومی کو فروغ ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے استحصال کا ایک بہت بڑا طریقہ ختم ہوگیا۔ اور وہ جس انداز سے مسلمان تاجروں اور ساہوکاروں کو نقصان پہنچا رہے تھے وہ سلسلہ رک گیا۔ یہ ربا کی وہ قسم ہے جس کو فقہا نے ربا البیع یا ربا الفضل یا ربا الحدیث کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس پر فقہائے کرام کے ہاں بڑی بحث ہوتی رہی ہے کہ یہ ان چھ چیزوں تک محدود ہے یا ان کے علاوہ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں سب کی رائے یہ ہے کہ یہ حرمت ان چھ چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔ کس اصول کی بنیاد پر ہوگا، اس پر ائمہ اربعہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ صرف ایک رائے ابن حزم کی ائمہ اربعہ سے مختلف ہے، جن کا موقف یہ ہے کہ نصوص کی لفظی تعبیر ہونی چاہئے اور قیاس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اس ممانعت کو ان چھ چیزوں تک محدود سمجھتے ہیں اور باقی چیزوں کے لین دین میں ربا الفضل کو وہ داخل نہیں کہتے۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا الگ بازار قائم فرمایا تو اس کا اور آئندہ کی معاشیات کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لئے آپ نے بعض ہدایات دیں جو ابھی تک اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا کہ بازار میں جو لوگ کاروبار کریں، وہ آزادانہ رضامندی کے ساتھ کاروبار کریں اور کوئی بیرونی قوت ان کو کسی خاص انداز پر چلنے کے لئے مجبور نہ کرے۔ یعنی مصنوعی طور پر قیمتوں میں کمی بیشی نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی نہ ہو اور کسی کو اپنا سامان بازار میں لانے سے روکا نہ جائے۔ اس زمانے میں

کے جواب میں اس کے گھوڑے کو قتل کر دیا گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اس جنگ کی داستان عربی زبان کے ادب میں تفصیل سے ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہر حمیٰ کو ختم کر کے حکم دے دیا کہ لا حمی الا للہ و رسولہ ۔ حمیٰ قائم کرنے کا اختیار صرف حکومت یا ریاست کو ہے۔ حکومت اپنے سرکاری جانوروں، صدقہ کے جانوروں کے لئے یا فوجی جانوروں کے لئے حمیٰ یعنی سرکاری چراگاہ مقرر کر سکتی ہے۔ باقی کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ پبلک کی زمین کو اپنے لئے خاص کرے اور اس کو عام انسانوں کے لئے ممنوعہ علاقہ قرار دے دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ کے قریب بعض چراگاہوں کو حمیٰ قرار دے دیا جہاں صدقے کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ ان میں ایک چراگاہ وہ تھی جہاں بنی عرینہ کے بعض لوگ بھیجے گئے تھے جنہوں نے حضور کے کارندے کو شہید کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ قبیلہ عرینہ کے غالباً آٹھ دس آدمیوں کا ایک گروہ مدینہ منورہ آیا۔ اسلام قبول کیا۔ لیکن مدینہ منورہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی اور وہ سب یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہماری ایک چراگاہ ہے تم وہاں جا کر رہو بھی اور اپنا علاج بھی کر لو۔ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کارندے کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھوں میں گرم سلائیاں ڈال کر اندھا کر دیا اور تپتی ہوئی ریت میں چھوڑ کر سرکاری اونٹوں کے ساتھ فرار ہو گئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پتہ چلا تو آپ نے ایک دستہ بھیج کر ان کو گرفتار کرایا اور ان کو سزائے موت دے دی گئی۔ یہ واقعہ عرنیین کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے اور محدثین نے بہت تفصیل سے اس کو بیان کیا ہے۔

بازار کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بازار میں اوزان اور پیمانے متعین ہوں۔ اگر ہر شخص الگ الگ اپنے اوزان اور پیمانے رکھے گا تو بازار میں سٹینڈرڈائزیشن اور معیار بندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسٹینڈرڈائزیشن کی حوصلہ افزائی کر کے بازار اور تجارت میں اسٹینڈرڈائزیشن کو بہتر اور مقبول قرار دیا۔ معیار بندی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ پیمانوں اور اوزان کو متعین کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ بھی تھا کہ مختلف علاقوں میں مختلف

پیمانے اور اوزان مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ کا پیمانہ اور تھا مدینہ منورہ کا پیمانہ اور تھا۔ اب مکہ کے لوگ چونکہ تجارت میں نمایاں تھے۔ وہ دور دراز کی تجارت میں نقد رقم لے کر جایا کرتے تھے۔ سونا اور چاندی کی صورت میں ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں ہوتی تھیں۔ اس لئے سونے اور چاندی کی پرکھ کا معیار مکہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھا۔ مدینہ میں زراعت زیادہ تھی اس لئے چیزوں کو ناپنے کے پیمانے مدینہ میں زیادہ اسٹینڈرائزڈ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ المکیال مکیال اہل المدینہ، ناپنے کے پیمانے مدینہ کے معیاری مانے جائیں گے اور "والوزن وزن اہل مکہ" اور سونے چاندی کو تولنے یا گننے کے پیمانے اہل مکہ کے معیاری مانے جائیں گے۔ یعنی سکوں اور سونے چاندی کا معیار مکہ کے معیار کے مطابق ہوگا اس لئے کہ وہ تجارت کا مرکز ہے۔ زرعی پیمانے مدینہ کے ہوں گے کیونکہ وہاں زرعی کاروبار زیادہ تھا۔

یہ بات کہ مکہ مکرمہ میں رائج پیمانوں اور اوزان کی موجودہ پیمائش کیا تھی۔ اس کی کتنی قسمیں رائج تھیں۔ مدینہ منورہ میں ناپنے کے کیا پیمانے رائج تھے۔ یہ موضوع بڑی تحقیق کا ہے۔ یہ محض زرعی دلچسپی کا مضمون نہیں ہے بلکہ یہ فقہیات سیرت کا مضمون بھی ہے۔ فقہیات سیرت کا مضمون اس لئے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قسم کی لازمی ادائیگیوں کے لئے بعض احکام بیان فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر صدقہ فطر کے بارے میں ایک پیمانے کا ذکر ہے۔ اسی طرح سے بعض چیزوں کے پیمانے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ متعین نہ ہو کہ حضور نے اپنے زمانے کے پیمانے کے لحاظ سے جو حکم دیا تھا آج کے وقت میں وہ کتنا بنتا ہے۔ اس وقت تک ان احکام پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ بہت سے حضرات نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ ایک مغربی فقیہ نے کتاب لکھی ہے جس کا نام بڑا دلچسپ ہے: "اثبات ما ليس منه بد لمن اراد الوقوف على حقيقة الدينار والدرهم والصاع والمد" کہ حضور کے زمانے میں جو صاع، مد اور دینار رائج تھے ان کو کیسے ثابت کیا جائے۔ ہمارے پاکستان میں بھی مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی موضوع پر ایک رسالہ لکھا تھا "رسالہ اوزان شرعیہ"۔ اس میں انہوں نے اپنی تحقیق سے ان تمام اوزان کا آج کل کے رائج الوقت پیمانوں سے الگ الگ وزن مقرر کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بازار میں نگران اور انسپکٹروں کے علاوہ بہت سے اور افراد بھی

مقرر فرمائے۔ ایک صاحب الاعشار ہوتا تھا۔ یہ تاجروں کے سرمائے کا اندازہ کرکے ان سے عشر لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب الخراج مقرر فرمایا۔ یہ زمین کی پیداوار سے حصہ وصول کرتا تھا۔ ایک صاحب الجزیہ مقرر فرمایا۔ یہ غیر مسلموں سے ٹیکس لیا کرتا تھا۔ ایک صاحب المساحہ مقرر فرمایا تھا جو زمین کی جانچ اور پیداوار کا اندازہ یعنی assessment کرتا تھا۔ کئی صوبوں میں الگ الگ عامل زکوٰۃ مقرر فرمائے۔ کاتب صدقات الگ مقرر فرمائے۔ عبداللہ بن رواحہ کی مثال دی جاچکی ہے جو زمینوں اور زرعی پیداوار کا تخمینہ اور assesment کرنے کے لئے خیبر بھیجے گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل سے معاہدات فرمائے تھے۔ حرمت سود کے بعد سے جتنے معاہدات فرمائے ان میں یہ بھی فرمایا کہ تم سودی کاروبار نہیں کروگے۔ اور بعض غیر مسلم قبائل سے کئے جانے والے معاہدہ میں یہ بھی لکھا کہ تم میں سے جو سودی کاروبار کرے گا تو اس کے ساتھ معاہدہ منسوخ ہوجائے گا۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدہ کیا گیا اس میں ان کو بہت سی مراعات اور حقوق دیئے گئے۔ آج مذہبی آزادی کے جتنے حقوق کی بات ہوتی ہے اس معاہدہ میں ان تمام حقوق کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس میں یہ بھی لکھا کہ "ومن اربی منکم فذمة الله بريئة" تم میں سے جو کوئی ربو کا کاروبار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ یعنی یہ معاہدہ منسوخ کردیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں اطلاع ملی کہ نجران کے عیسائی ربو کا کاروبار کررہے ہیں۔ وہ سود میں ملوث ہیں۔ یہ اطلاع صحیح ثابت ہونے پر حضرت عمر فاروق نے اس معاہدہ کو منسوخ کردیا اور انہیں جلاوطن کرکے شام بھیج دیا۔

۔☆۔

سوال و جواب

موجودہ دور میں اگر کسی دور کے مضافات میں تیار ہونے والی چیز اگر اس وجہ سے سستے داموں بیچی جائے کہ مارکیٹ تک پہنچانے میں انفرادی طور پر خرچہ زیادہ آتا ہو تو اس کا لینا کیا حرام ہو سکتا ہے جبکہ بیچنے والے کو مارکیٹ کی اصل قیمت اندازہ ہو؟

ظاہر ہے کہ حدیث میں جس چیز کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جہاں کسی شخص کو مارکیٹ کی اصل قیمتوں کا اندازہ نہ ہو اور اس کی ناواقفیت کا استحصال کرتے ہوئے اس کو جائز منافع سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جہاں یہ بات نہ ہو تو وہاں ایسا کرنا جائز ہوگا۔

☆

بعض اسلامی رسالے جو کہ نقد قیمت پر کم اور قسطوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا اسلام میں کیا حکم ہے؟

آج کے علما اور فقہا کی بڑی تعداد اس کو جائز قرار دیتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی نقد قیمت الگ سے متعین ہو اور وہ کم ہو۔ اور بالاقساط قیمت الگ سے متعین ہو اور وہ زیادہ ہو تو یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ خریدار پہلے سے طے کرے کہ وہ بالاقساط قیمت پر خرید رہا ہے یا نقد قیمت پر خرید رہا ہے۔ اس صورت میں اس کی ممانعت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر معاملہ ایسا ہو کہ متعین طور پر یہ طے نہ ہو کہ وہ کس انداز کی قیمت اور کس انداز کی ادائیگی کی بنیاد پر معاملہ کر رہا ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اسٹاک ایکسچینج کا شرعی متبادل کیا ہو سکتا ہے؟

اسٹاک ایکسچینج کے شرعی متبادل کی بات تب ہوگی جب اسٹاک ایکسچینج کے سارے کاروبار کو آپ ناجائز قرار دیں گے۔ میرے خیال میں اسٹاک ایکسچینج کا سارا کاروبار ناجائز نہیں ہے۔ سٹاک ایکسچینج تجارتی کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت کے لئے ایک سہولت ہے۔ حکومت نے اس کو ریگولیٹ کیا ہے۔ اگر اس میں ایسے حصص فروخت ہو رہے ہوں (۱) جو کسی ناجائز کاروبار کے نہ ہوں۔ (۲) ان حصص میں بیع الدین بالدین کی ممانعت کے اصول کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ (۳) زرکی فروخت زر کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ نہ ہو رہی ہو۔ اور (۴) جس میں قمار اور سٹہ نہ ہو۔ اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو یہ کاروبار جائز ہے۔ قواعد و ضوابط کی رو سے ان خرابیوں کو ختم کرنا چاہئے۔ اگر یہ خرابیاں اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں نہ ہوں تو اس کی موجودہ شکل کے برقرار رہنے میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆

کیا مدینہ کے یہودی مسلمانوں کا مال و متاع خریدا کرتے تھے یا نہیں؟

یہودی مسلمانوں کے بازاروں میں اپنا مال و متاع لایا کرتے تھے۔ اس کی ممانعت نہیں تھی۔ کسی بھی شخص کو کبھی مسلمانوں کے ساتھ کاروبار کرنے یا ان کے بازار میں بیٹھنے سے نہیں روکا گیا۔ ہر دور میں غیر مسلم تاجر مسلمانوں کے بازاروں میں تجارت کرتے رہے ہیں۔ یہ چیز شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہے تو اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب کا قول ہے کہ لھم مالنا وعلیھم ما علینا 'جو ہمارے حقوق ہیں وہ ان کے بھی ہیں اور جو ہماری ذمہ داریاں ہیں وہ ان کی بھی ہیں۔

☆

آپ نے فرمایا تھا کہ قادیانی جوائنٹ مسلک ہے۔ کیا یہ حقیقی

چیز حرام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بڑے پیمانے پر فرنیچر بنانے والا ہے۔ آپ اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ کسی اور شہر میں دکان کھول لیتے ہیں۔ وہ قیمت مقرر کر کے آپ کو دس فیصد نفع لینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ آپ اپنا خرچہ نکالنے اور نفع کے حصول کے لئے یہ خرید و فروخت کریں تو یہ بالکل جائز ہے۔

بیع کی یہ شکلیں بھی ہیں۔ ہول سیل کا کاروبار بھی جائز ہے۔ ہول سیل میں صرف یہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر ایک تاجر سامان خریدتا ہے اور چھوٹے تاجروں کو فراہم کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ بڑے پیمانے پر خریدتا ہے اس لئے اس کے نفع کا تناسب کم ہوتا ہے۔ اور چھوٹا تاجر چھوٹے پیمانے پر بیچتا ہے اس لئے نفع کا تناسب زیادہ رکھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ ریٹیلر اور ہول سیلر کے درمیان نفع کا سبب بنتا ہے۔

☆

مزارعہ، مضاربت، مساقاۃ اور مزارعت کی وضاحت فرمائیں۔

یہ موضوعات بڑی لمبی بحث کے متقاضی ہیں۔ یہ زمانے کے سارے نظام میں شراکت کی بنیاد پر ہونے والے کاروبار ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مالک زمین کسی شخص کو مزارعت پر زمین دے دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ طے ہوتا تھا کہ جو پیداوار ہوگی اس کا آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا، یا ایک تہائی تمہارا وغیرہ۔ اس بنیاد پر سودا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ کچھ قسموں کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اجازت دے دی۔ بعض لوگ یہ کرتے تھے کہ وہ یہ طے کرتے تھے کہ جو پیداوار ہوگی اس میں سے ایک ہزار من ہمارا ہوگا باقی تمہارا ہوگا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ تمام پیداوار ہی ایک ہزار من ہو۔ متعین مقدار کے ساتھ کسی ایک فریق کے حق میں شرط رکھنا جائز نہیں ہے۔ فیصد کے حساب سے جائز ہے۔ اسی طرح سے اگر زمین مزارعت پر دی ہے اور آپ کہیں کہ زمین کے اس حصہ کی ساری پیداوار فلاں فریق کی ہوگی۔ اور دوسرے حصہ کی دوسرے فریق کی ہوگی۔ یہ بھی جائز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی حصہ میں پیداوار ہو اور دوسرے حصہ میں پیداوار نہ ہو۔ فیصد کے حساب سے بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اس کی تفصیلات کی مختلف قسموں کے نام ہیں۔ یہ طے

مزارعہ و مساقاۃ۔

مساقاۃ کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی شخص کو مقرر کریں کہ وہ آپ کی زمین کو پانی دے دیا کرے اور اس کے معاوضہ میں آپ اس کے لئے پیداوار کی ایک پرسینٹیج مقرر کر دیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

☆

ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ غربت کی چکی میں پس رہے ہوں، خودسوزی پر آمادہ ہوں اور فحاشی کا پرچار ایک بڑے پیمانے پر ہو۔ آپ کے خیال میں ایک ایسے معاشرہ میں بڑے پیمانے پر حدود اللہ کو نافذ کرنا اسلامی قانون کی روح سے متصادم نہیں ہے؟

میرے خیال میں ایسے ہی معاشرہ میں حدود اللہ کو نافذ ہونا چاہئے۔ یہ تو ایک عجیب سا سوال ہے کہ پہلے معاشرہ اسلامی ہو پھر حدود نافذ ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے انڈہ پہلے یا مرغی پہلے۔

آپ دونوں کام ایک ساتھ شروع کریں۔ معاشرہ کی اصلاح بھی کریں اور قوانین بھی نافذ کریں۔ اسلامی قوانین معاشرہ کو بہتر بنانے میں مدد دیں گے۔ اور جب معاشرہ اسلامی قوانین کو موثر ہونے میں مدد فراہم کرے گا۔ دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیں گے۔

☆

جبرئیل امین جب غار حرا میں آپ کے پاس آئے اور کہا کہ پڑھو اس کے نام سے جس نے تخلیق کی۔ ہمارے علم کے مطابق تو آپؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ پھر اس جملے سے کیا مراد ہے؟

اس جملہ کی وضاحت کے بارے میں ایک دلچسپ لیکن نسبتاً کم مستند روایت آئی ہے۔

یہ علامہ واقدی کی روایت ہے۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ جب جبرئیل امین غارِ حرا میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی کپڑے پر لکھی ہوئی عبارت دیتے ہوئے کہا کہ پڑھو۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ما انا بقاری۔ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر جبرئیل امین نے دوبارہ یہی کہا تو آپ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ چوتھی مرتبہ جبرئیل امین نے پڑھنا شروع کیا تو آپ نے بھی ساتھ ساتھ پڑھا۔ بظاہر اس روایت کو ماننے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ حضور نے جو جواب ارشاد فرمایا تھا وہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی تحریر سامنے رکھی گئی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی شخص کسی ایسی زبان کی تحریر لے آئے جو آپ نہیں جانتے تو آپ کہیں گے کہ یہ زبان تو میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، یا یہ تحریر تو میں نہیں جانتا۔ لیکن کوئی آپ کے سامنے یہی الفاظ دہرا کر کہے کہ ان کو پڑھو تو شاید آپ یہ جواب نہیں دیں گے، بلکہ آپ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

☆

اسلامی معیشت میں منافع خوری کس حد تک جائز ہے؟

منافع خوری ایک ایسا لفظ ہے جو اردو میں منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تجارت کرنے کا مقصد ہی منافع کمانا ہوتا ہے۔ ہر دکاندار نفع لیتا ہے۔ اگر کمایا جانے والا نفع جائز حدود میں ہو۔ مارکیٹ کے نرخوں کے مطابق ہو۔ بازار میں رائج نفع کی سطح کے مطابق ہو۔ اس میں دھوکہ اور ظلم نہ ہو، کسی کا استحصال نہ ہو تو یہ جائز ہے۔ اس کو اردو میں منافع خوری نہیں کہتے۔ منافع خوری بازاری سطح سے زیادہ قیمت لے کر ناجائز نفع کمانے کو کہتے ہیں۔ یا ذخیرہ اندوزی کرکے زبردستی زیادہ نفع وصول کرنے کو منافع خوری کہتے ہیں۔ یا لوگوں کو دھوکہ دے کر زیادہ نفع کمانے کو منافع خوری کہتے ہیں۔

☆

اسلام کے معاشی نظام کی روشنی میں اسلامی بینکاری کا مختصر خاکہ بیان کیجئے۔ چونکہ بینک کے اخراجات، تنخواہیں، مشینری، کمپیوٹر، ارکنڈیشنر وغیرہ کے اخراجات بہت کم

ہوتے ہیں۔

اس پر تو الگ سے ایک مسلسل خطبات کی ضرورت ہے۔ یہ خاکہ ایک آدھ لیکچر میں بھی بیان نہیں ہو سکتا۔ اسلامی بینکاری کے خاکے بارہا بیان ہو گئے ہیں۔ اس پر بہت سا کام ہوا ہے۔ اس پر بہت سی دستاویزات تیار ہوئی ہیں۔ اب تو بات خاکے سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ خاکہ کا سوال آج سے تیس سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اب تو اسلامی بینکاری کے میدان میں عملاً کام ہو رہا ہے۔ دنیا میں ساڑھے تین چار سو اسلامی بینک کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں 14 اسلامی بینک موجود ہیں جو اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات، دستاویزات اور مصنوعات بھی تیار ہو گئی ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے فنانسنگ کے تمام essential modes کے بنیادی عناصر واضح کر دیے ہیں۔ اسٹیٹ بینک نے اہم فنانشل پروڈکٹس کے بنیادی فیچرز بھی ڈیفائن کر دیے ہیں۔ اس پر بہت کام ہو رہا ہے۔ وہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ خاکے وغیرہ کی بات تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔

☆

آج کل کا یہ گندا معاشی نظام جس کے نتیجے میں غریب غریب سے غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا حضور کے زمانے میں بھی یہ نظام موجود تھا؟

جی ہاں حضور کے زمانے میں بھی یہ ظالمانہ نظام موجود تھا۔ اور اسی کی اصلاح کرنے کے لیے حضور ﷺ تشریف لائے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفع خور سرمایہ دار ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ یہودی اس زمانے میں بھی تھے۔ اس زمانے میں بھی یہودیوں نے سود کے ذریعے دنیا کے معاشی نظام کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ آج بھی دنیا کا مالیاتی نظام اور معاشی زندگی یہودیوں کے کنٹرول میں ہے۔ اس وقت بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ آج بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جو اصلاحات حضور ﷺ نے اس وقت فرمائی تھیں وہ آج

دوبارہ منعقد ہونی چاہئیں۔

☆

غزوہ بدر کے اسباب میں کچھ مورخین نے اہل مکہ کے تجارتی
قافلہ میں رکاوٹ ڈالنے کی بات کی ہے۔ یہ بات کہاں تک
مستند ہے؟

آپ غزوہ بدر پر چلے گئے۔ میں نے تو آج غزوہ بدر کی بات نہیں کی۔ لیکن یہ بات بالکل مستند ہے۔ غزوہ بدر سے پہلے کفار مکہ نے حضور کے خلاف جنگی تیاریوں کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے لشکر کی تیاری کر رہے تھے۔ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالنا دنیا کے ہر بین الاقوامی قانون کے مطابق جائز ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ قریش پر معاشی دباؤ ڈالا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دنیا کے ہر قانون کے مطابق آپ کو یہ حق حاصل تھا۔ اس لئے اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ بعض مصنفین نے اگر اس کو ماننے میں کسی تامل کا اظہار کیا ہے تو میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

☆

جناب مولانا تقی عثمانی صاحب نے شیئرز کے کاروبار کے
حوالے سے بیان کردہ نکات میں .... (سوال پڑھا نہیں
جا سکا)۔

نہیں پتہ کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ میں نے تو کبھی یہ لفظ نہیں پڑھا۔ اگر انہوں نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے تو آپ انہی سے پوچھئے۔ مولانا کو خط لکھیں۔ ممکن ہے کوئی نامانوس لفظ ہو یا پرنٹنگ مسٹیک ہو۔ اگر پرنٹنگ مسٹیک نہ ہو تو میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے یہ لفظ نہیں پڑھا۔

☆

ان کا آپس میں لین دین نقد بنیادوں پر کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ سونے کا چاندی کے ساتھ۔ ایک کرنسی کا دوسری کرنسی کے ساتھ یہ اسی حدیث میں اجازت دی گئی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں 'فاذا اختلفت الاصناف فبیعوا کیف شئتم'، جب یہ قسمیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو۔ 'اذا کانت یدا بید' اگر وہ ہاتھوں ہاتھ ہوں۔

☆

آپ نے ایک حدیث کا تذکرہ فرمایا جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آٹھ لوگوں کو مدینہ سے باہر کسی جگہ ٹھہرنے کو کہا گیا تھا۔ روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ انہیں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اونٹ کا پیشاب دوا کے طور پر استعمال کریں۔ پچھلے مہینے طلوع اسلام رسالہ نظروں سے گزرا۔ اس میں اس واقعہ پر شدید تنقید کی گئی ہے۔

طلوع اسلام منکر حدیث لوگوں کا رسالہ ہے۔ اس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ اس کے پیچھے زیادہ نہ جائیں۔ اسلامی علوم اور بالخصوص علم حدیث سے ناواقف لوگ ہیں اور منکرین حدیث ہونے کے ناطے حدیث کے بارے میں غلط بیانی کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس کے مستحق نہیں کہ ان کو جواب دیا جائے۔

☆

خیبر کے یہودی حضرت عمر کے زمانے میں جلاوطن ہوئے تھے کہ رسول اکرم کے زمانے میں۔ اس حدیث کی بنیاد پر کہ عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے۔

خیبر کے یہودیوں میں سے کچھ یہودی جلاوطن ہو گئے تھے۔ کچھ یہودی اپنی زمینوں پر رہے۔ جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے مزارعت کی بنیاد پر معاملہ کر لیا۔ فدک کے بھی کچھ لوگ

جلاوطن ہو گئے اور کچھ موجود رہے۔ بالآخر جو بچ گئے تھے ان کو حضرت عمر فاروقؓ نے جلاوطن کر دیا تھا۔

☆

حلف الفضول کی بنیادی باتیں کیا تھیں؟

حلف الفضول کے دو بنیادی امور یہ تھے کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد کی جائے گی۔ اس حلف کو آپ نے برابر قائم رکھا۔

☆

فتح خیبر میں صرف مہاجرین میں 1800 برابر حصے تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد شاید مواخات ختم کر دی گئی، کیونکہ مہاجرین کو کوئی حصہ مل گیا۔ تو وراثت مواخات سے ختم ہوئی۔ ہاں وصیت میں ثلث کی گنجائش رکھی گئی تاکہ مہاجرین اور لے پالک اولاد کو وصیت سے حصہ مل سکے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ربا کو ختم کرنے میں اصل مقصد معیشت میں مساوات کو قائم رکھنا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔

میرے خیال میں آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ربا کا مقصد یہ ہے کہ معیشت میں لوگوں کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ کسی شخص کو وسائل کی بنیاد پر دوسروں کو محروم کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہر شخص کو کاروبار اور تجارت کی آزادی ہو۔ اس حد تک حرمت ربا کا نظام آزادی دیتا ہے۔

☆

سرکار دو عالم ﷺ کی انفرادی معیشت کا سوال جو گزشتہ نشست میں اٹھایا گیا تھا۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی معاشی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ بلکہ زیادہ بہتر الفاظ میں تین دور ہیں۔ ایک وہ دور جو نبوت سے پہلے یعنی آپ کی عمر مبارک کے چالیس سال ہونے تک تھا۔ دوسرا دور وہ تھا جب آپ نبوت ملنے کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام فرما تھے۔ تیسرا دور وہ تھا جب آپ مدینہ تشریف لے آئے۔

حضور ﷺ اپنی نوجوانی میں مکہ مکرمہ کے ایک نہایت دیانت دار تاجر کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ الصادق الامین آپ کا لقب تھا۔ لوگ حضورؐ کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا پسند کرتے تھے۔ بہت سے صحابہ اور دوسرے لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ وہ حضور ﷺ کے کاروبار میں شریک تھے۔ کئی لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد گواہی دی کہ ہم حضور کے کاروبار میں شریک تھے۔ اور جو دیانتداری انہوں نے آپ میں دیکھی وہ بے مثال تھی۔

تجارت اور کاروبار کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے عرب کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ تجارت اور کاروبار کے لئے مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔ حضرت خدیجہ کے سامان تجارت کے ساتھ بھی حضور نے مضاربت فرمائی۔ حضرت خدیجہ اپنا سامان لوگوں کو تجارت کے لئے دیا کرتی تھی۔ ان کا پیسہ لے لوگ تجارت کے لئے جایا کرتے تھے اور نفع میں شامل ہوتے تھے۔

حضرت خدیجہ نے جب حضور کی دیانت داری اور مہارت کا شہرہ سنا تو خود درخواست کی کہ میرا سامان بھی آپ لے جائیں۔ اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ بھیجا۔ میسرہ نے جب حضور کی عجیب خوبیاں بیان کیں تو سیدہ خدیجہ الکبریٰ نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شادی کی یہ تجویز ان ہی کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے بعد حضور ان کے کاروبار کی بھی نگرانی کرتے اور اپنے کاروبار کی بھی۔ حضور نے کپڑے کا کاروبار بھی کیا ہے۔ حضور کے چچا ابوطالب کی مکہ مکرمہ میں دکان تھی جس میں کپڑا اور عطر وغیرہ بیچی جاتی تھیں۔ حضور نے ان کی دکان کی نگرانی بھی کی۔ یہ سارا سلسلہ نبوت تک جاری رہا۔ نبوت کے بعد حضور نے کاروبار کی اکثر ذمہ داری حضرت زید بن حارثہ اور اپنے دوا اور ملازمین یا غلاموں کے سپرد کر دی۔ حضور کا بیشتر وقت دعوت و تبلیغ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا اور وہ لوگ حضور کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کو اس کاروبار کی بھی کبھی

نگرانی کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ یہ حضرات انتہائی دیانت داری کے ساتھ حضورﷺ کے اس کام کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ جب حضور مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اپنا سارا گھر وہاں مکان گھر اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مکان ساری چیزیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چونکہ مکہ مکرمہ میں لوگوں نے قبضہ میں لے لیں۔ حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کے بارہ میں وضاحت ملتی ہے کہ انہوں نے حضورﷺ کی ساری جائیداد اور مکانات پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ چیزیں دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب رسول اللہﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ، آپ اپنے مکان میں ٹھہریں گے یا فوج کے ساتھ خیمے میں ٹھہریں گے۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لئے مکان چھوڑا کہاں ہے جو ہم وہاں جا کر ٹھہریں۔ تو حضور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمے میں ہی قیام فرما رہے۔ کبھی کبھی اپنے چچا کے گھر والوں سے ملنے ان کے مکان میں تشریف لے جاتے۔ ایک آدھ مرتبہ دوپہر کے وقت وہاں آرام بھی فرمایا۔ لیکن عام طور پر حضور کا قیام خیمہ ہی میں رہا۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ابتدائی ایک دو سال تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی مستقل بالذات کاروبار نہیں تھا۔ غالباً مکہ مکرمہ سے سیدنا علی بن ابی طالبؓ آتے وقت کچھ نقد رقم ساتھ لائے تھے، جو حضورؐ نے ان کے سپرد کی تھی اور فرمایا تھا کہ امانتداروں کی امانتیں ادا کر کے بقیہ رقم ساتھ لے آئیں۔ اس کے باوجود یہ ایک دو سال نسبتاً مشکل اور مشقت کے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہﷺ کے پاس مناسب بندوبست ہو گیا۔ جس میں سب سے پہلے بنو نضیر کی جو زمین فتح ہوئی تھی قرآن پاک کی سورۃ حشر میں اس کے احکام دیئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ اس زمین کا پانچواں حصہ سربراہ ریاست کے طور پر رسول اللہﷺ کے تصرف میں آئے گا۔ چنانچہ حضور نے اس جائداد کے پانچ حصے کر کے چار حصے بیت المال کے قرار دیے۔ پانچواں حصہ حضور کے ذاتی استعمال کا حصہ قرار پایا جس سے رسول اللہﷺ کے ذاتی مصارف پورے ہوتے رہے۔

اس کے بعد رسول اللہﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ ازواج مطہرات اور اپنے خاندان کے لوگوں کو اس کی آمدنی سے پورے سال کے اخراجات دے دیا کرتے تھے اور وہ اخراجات ازواج مطہرات اپنی صوابدید سے خرچ کیا کرتی تھیں۔ بعض ازواج مطہرات کا ہاتھ کھلا تھا وہ

تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا کہ دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں نے انسانیت کو مصائب اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو زندہ کیا جائے اور اسلام کی بنیاد پر معیشت اور بینکاری کا ایک نیا نظام قائم کیا جائے تاکہ دنیا کو ان مصائب سے نجات دلائی جاسکے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی یہ وصیت پوری قوم کے لئے ہے۔ ہم سب کو اس کام کے لئے آگے آنا چاہئے۔ میرا اور آپ سب کا فریضہ ہے کہ ہم سب مل کر اس کام کو کریں۔

☆

کیا سودی بینک میں انٹرن شپ جائز ہے؟

میرے خیال میں اگر کسی بینک کے ایسے شعبہ میں آپ کام کریں جو براہ راست سودی معاملات سے وابستہ نہ ہو تو شاید اس کی گنجائش ہے۔ بینک بہت سے کام ایسے کرتے ہیں جو سودی نہیں ہوتے۔ مثلاً بینک ایل سی کھولنے میں مدد کرتا ہے۔ آپ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کررہے ہوں تو آپ کو ایل سی کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایل سی کھولنا جائز ہے۔ بینک consultancy کرتا ہے اور لوگوں کو مشورے دیتا ہے۔ کاروباروں کی assesment کرتا ہے۔ feasability report تیار کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں حصہ لینا میرے خیال میں درست ہوگا۔ جو معاملات ناجائز ہیں ان میں حصہ لینا بھی ناجائز ہوگا۔

☆

جو لوگ ہماری مقدس ہستیوں کی تذلیل کر یا پامال کرتے ہیں ان کے ساتھ کم از کم بائیکاٹ تو کرنا چاہئے۔ لیکن آپ کی میز پر جیسے کی بوتل میں پانی رکھا ہوا ہے۔ اس کا بھی بائیکاٹ ہونا چاہئے کیونکہ یہ بوتل ڈنمارک کی ایک کمپنی نے بنائی ہے۔

یہ پانی جو اس وقت بوتل میں ہے کم از کم یہ جیسے کا نہیں ہے۔ بوتل کا عام پانی جیسے کی

ہماری پولیس میں پکڑا گیا ہے۔ یہ فیصلے کا نہیں اعتراف کا پانی ہے۔ مزید برآں پانی کا یہ معاوضہ
تک نہیں کیا۔

☆

جب ہم اسلامی معاشی نظام کی بات کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں
کہ اسلام کا نظام نافذ ہونا چاہئے تو کیا تمام مسائل کے حل
کے لئے قرآن و حدیث میں مختلف جگہوں پر جو احکام دیئے
گئے ہیں، کسی نے ان کو جمع کیا ہے کہ ہم دیکھ سکیں۔

یہ احکام باقاعدہ جمع کئے گئے ہیں۔ ان پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسلامی ریاست کے معاشی تقاضوں پر لوگوں نے تحقیقات کر کے کتب خانے تیار کر دیئے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے نفاذ کے لئے قوانین بھی تیار کئے جا چکے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ تو خوئے بد را بہانہ بسیار والا معاملہ ہے۔ جو نہ کرنا چاہے اس کے لئے کچھ بھی تیار نہیں ہے اور جو کرنا چاہیں ان کے لئے سب کچھ تیار ہے۔

☆

اسلام اور اشتراکیت دونوں مساوات فراہم کرتے ہیں۔
بنیادی فرق بتا دیجئے۔ علامہ اقبال نے بھی مساوات کی بات
کی ہے۔

اشتراکیت وہ مساوات فراہم کرتی ہے جو جیل خانہ میں تمام قیدیوں کو میسر ہوتی ہے۔ جیل خانہ میں سارے قیدی برابر ہوتے ہیں۔ سب کو دو وقت کی دال روٹی ملتی ہے۔ سب کو کوٹھے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اسلام جس مساوات کا درس دیتا ہے وہ آزادی، تحفظ اور عزت کے ساتھ ہے۔ جو مساوات آزادی اور عزت کے ساتھ نہ ہو وہ مساوات نہیں ہے۔ پھر مساوات میں آپ نے علامہ اقبال کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ اقبال اشتراکیت سے متاثر نہیں تھے۔ کسی نے غلط کہا ہے۔ علامہ اقبال نے تو اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ کارل

مارکس مساوات بطون پر مساوات قلوب و اذہان کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو غلط ہے۔

☆

نبی علیہ السلام نے مسلمانوں کے لئے الگ بازار بنایا لیکن
آج کے دور میں مسلمانوں کے لئے الگ بازار بنانا چاہیے یا
اصل مارکیٹ میں کاروبار کرنا چاہیے؟

حضور نے مسلمانوں کے لئے اس وجہ سے علیحدہ بازار بنایا تھا کہ یہودی اپنے بازار میں مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیتے تھے۔ آج کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی یہی حال ہے۔ مسلمان ممالک کو اپنی انٹرنیشنل مارکیٹ الگ بنانی چاہیے اور مسلمانوں کو انٹرنیشنل مارکیٹ کی غلامی سے آزاد کرانا چاہیے۔ یہ آزاد مسلم ممالک اور خاص طور پر بڑے وسیلہ مسلم ممالک کا فرض ہے کہ وہ یہ کام کریں۔

☆

اگر کوئی شخص دوسرے کو قرض دیتا ہے اور وہ سود نہیں لیتا
تو time value of money کے تصور کے مطابق
اس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ تو قرض دینے والے کے نقصان
کی تلافی کیا ہے؟

دیکھئے اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی تو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ اسلام نے اس کمی بیشی کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ جب لوگ جو اور کھجوریں قرض دیا کرتے تھے تو جس زمانے میں کھجوروں کی فصل آنے میں دیر ہوتی تھی تو کھجوریں مہنگی ہو جاتی تھیں اور فصل پہنچنے کے بعد سستی ہو جاتی تھیں۔ لیکن کھجور کی قیمتوں میں کمی بیشی سے قطع نظر آپ نے اس کی مقدار کو برابر رکھنے کا حکم دیا کہ جتنا لیا ہے اتنا ہی دو۔ جتنا لیا ہوا اس سے زیادہ دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ قیمتوں میں کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے۔

ایک اور بات یاد رکھئے کہ قرآن مجید کا ایک اصول ہے لا تزر وازرۃ وزر اخری "

کوئی شخص دوسرے کی غلطی کا بوجھ اٹھانے کا مکلف نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی چیز یا کرنسی کی قیمت کم ہو رہی ہے تو کیا وہ قرض لینے والے کی کسی کمزوری یا غلطی سے کم ہو رہی ہے؟ اگر وہ قرض نہ لیتا تو کیا قیمت کم نہ ہوتی۔ جب قیمت کم ہونے میں قرض لینے والے کی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو وہ کیوں اس کا تاوان دے۔ اگر آپ کے پاس آج سو روپے ہیں اور اس سال کے بعد اس سو روپے کی قیمت پچاس روپے رہ جائے گی تو اگر یہ سو روپے آپ کے گھر میں ہوتے تو تب بھی قیمت میں کمی ہوتی اور اگر آپ نے کسی کو قرض دے دیے تو تب بھی اس میں کمی ہوتی تھی۔ اس میں قرض لینے والے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ چونکہ قیمت قرض لینے سے کم نہیں ہوئی اس لئے قرض دار پر کیوں تاوان ڈالا جائے۔ یہ قرآن پاک کے اصول کے خلاف ہے۔

پھر اس کا ایک اصول ہے الخراج بالضمان۔ جس چیز کا آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس چیز کا نقصان بھی آپ کو اٹھانا چاہیے۔ تو اگر inflation کی بجائے deflation ہو جائے تو کیا قرضدار اصل رقم سے کم دینے کو تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ جس طرح پونڈ اسٹرلنگ میں deflation ہوئی ہے۔ 1984 میں پونڈ اسٹرلنگ 17 روپے کا تھا آج 117 روپے کا ہے۔ تو اگر اس زمانے میں کسی نے پونڈ اسٹرلنگ میں قرض لیا ہوتا تو کیا قرض دینے والا اس کے لئے تیار تھا کہ وہ سترہ روپے کے حساب سے آج اپنا قرض وصول کر لے۔ کیا جس نے اس وقت ایک ہزار روپے کی مالیت کے اٹھاون پونڈ دیئے تھے وہ آج کے ماحول میں تھوڑے سے پونڈ لینے پر تیار ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی قرض دینے والا اس کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ تو اگر تفریط زر کی شکل میں ہونے والا کوئی نقصان وہ اٹھانے کو تیار نہیں ہے تو افراط زر کی صورت میں فائدہ اٹھانے پر کیوں مصر ہے؟

یہ معاملہ شریعت کے بہت سارے اصولوں سے ٹکراتا ہے۔ پھر اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ افراط زر کو دور کرنے کے بجائے اس کے نام پر سود کا راستہ کھول دیں۔ آپ افراط زر کو روکیں۔ بعض ممالک نے یہ کام کامیابی سے کیا ہے۔ ان کے معاشی طریقے ہیں۔ برازیل، ارجنٹینا اور سعودی عرب میں کامیابی سے روکا گیا ہے۔ سعودی عرب میں روپے پیسے کی اتنی ریل پیل اور بہتات کے باوجود میں پچھلے تیس سال کا ذاتی تجربہ بتاتا ہوں۔ میں گزشتہ تیس سال سے تقریباً ہر سال دو تین مرتبہ سعودی عرب جاتا ہوں۔ تیس سال پہلے چائے کی ایک

بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں میں جن سے آپ لاتعلق رہ سکتے ہیں ان سے لاتعلق رہنا چاہیے۔ ان کے بجائے مسلمانوں کی اپنی کمپنیوں کو موقع دینا چاہیے۔ مسلمان تاجر اور ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیں گے تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کردار اسلامی ممالک میں کم ہو جائے گا۔

☆

کیا یہ صحیح ہے کہ یہودی صرف وہ ہوتا ہے جس کو یہودی ماں نے جنم دیا ہو؟

جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔ لیکن یہودیت کی تاریخ میں بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جنہوں نے یہودیت اختیار کی۔ عربوں میں کئی قبائل نے یہودیت اختیار کی۔ عرب کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے یہودیت اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہودی سمجھے جانے لگے۔ آج یہ تعین کرنا کہ اسرائیل سے لے کر امریکہ تک جتنے یہودی ہیں وہ سب یہودی ماؤں کی اولاد ہیں، یہ بڑا مشکل ہے۔

☆

محترم نعیم صدیقی نے احابیش کا ذکر کیا ہے۔ یہ کون تھے اور اس سے کیا مراد ہے؟

احابیش سے مراد بعض غیر قریشی قبائل کا ایک مجموعہ تھا جو مکہ مکرمہ کے باہر آباد تھا۔ قبیلہ قریش سے ان کا معاہدہ تھا۔ ان کا سردار ابن الدغنہ قبیلۂ قارہ میں بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ یہ لوگ احابیش کہلاتے تھے۔ مکہ کے باشندے تھے لیکن قریش میں شامل نہیں تھے۔

☆

کیا بینک کی کمائی حلال ہے؟

بینک کے ان شعبوں کی کمائی جہاں براہ راست سودی کاروبار نہیں ہوتا، قابل اعتراض

برکات احمد قادیانی کی کتاب کا نام بتا رہیں۔

Muhammad and the Jews of Madina

☆

کیا نبی ﷺ نے یہ وصیت کی تھی کہ مدینہ کی آبادی بڑھ جائے تو اس کے قریب نئے شہر بسانا؟

یہ میں نے سنا ہے لیکن حدیث کی کسی کتاب میں یہ حوالہ نہیں پڑھا۔ یہی بات سچی ہے کہ یہ حوالہ میں نے علامہ اقبال کی سوانح عمری میں پڑھا ہے جس میں لکھا ہے کہ جب علامہ اقبال مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے تو گفتگو کے دوران انہوں نے مسولینی سے یہ حدیث بیان کی اور کہا کہ جب آبادی ایک حد سے بڑھ جائے مثلاً 25 ہزار ہو تو نیا شہر بسانا۔ مسولینی یہ سن کر اچھل پڑا تھا اور علامہ اقبال سے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے۔

علامہ اقبال نے اس بات کو بطور حدیث کہیں پڑھا ہوگا۔ میرے علم میں نہیں۔ میں نے حضرت عمر فاروق کے حوالہ سے پڑھا ہے۔ جب کوفہ اور بصرہ نئے شہر آباد کئے گئے تو انہوں نے کہا تھا کہ جب یہ آبادی 25 ہزار سے بڑھ جائے تو پھر مزید لوگوں کو وہاں نہ بسایا جائے بلکہ نیا شہر آباد کیا جائے۔

☆

جب سود کو حرام قرار دیا گیا تو سودی رقمیں جو کفار کی تھیں اور مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھیں تو ان کا کیا معاملہ ہوا؟

سود کو تین مراحل میں حرام قرار دیا گیا تھا۔ پہلے مرحلہ میں سابقہ جو واجب الادا رقوم تھیں وہ ادا کئے جاتے تھے اور وصول بھی کئے جاتے تھے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کیا تھا کہ آج سے تمام سابقہ سودی دعاوی کالعدم ہیں اور سب سے پہلے جس سود کو میں کالعدم قرار دیتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ اس وقت

کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ لیکن جب آپ کوئی چیز کرائے پر دیتے ہیں۔ آپ کار، ٹرک یا ٹیکسی کے طور پر کرائے پر دے دیں تو اس کا جو ویئر اینڈ ٹیئر ہوگا، حادثہ ہوگا، خرابی ہوگی اور مسائل پیدا ہوں گے وہ سارے کے سارے آپ کے ذمہ آئیں گے۔ آپ اس کے نقصانات کے ذمہ دار ہیں اس لئے آپ اس کا فائدہ کرائے کی صورت میں لے سکتے ہیں۔

مکان جب آپ کرائے پر دیتے ہیں تو استعمال سے وہ پرانا بھی ہوگا۔ اس کی چیزیں بھی استعمال ہوں گی۔ اس میں خرابی بھی پیدا ہوگی۔ آپ کو اس میں وقتاً فوقتاً کام بھی کرنا پڑسکتا ہے۔ مرمت بھی ہوگی۔ مکان کا ٹیکس بھی ادا کرنا ہوگا۔ زلزلے میں گر گیا تو نقصان بھی ہوگا۔ یہ سارا نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے آپ اس کے فائدے کے بھی حقدار ہیں۔

☆

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں بلند و بالا گھر بنانے کی
جو ممانعت فرمائی کیا اس میں دوسری عمارتیں بھی شامل ہیں؟

اس زمانے میں دوسری عمارتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ گھر ہی بناتے تھے اور گھروں کے علاوہ کوئی اور تجارتی دفتری عمارتیں بنانے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے ہدایات گھروں ہی کے بارہ میں دی گئیں کہ رہائش سادہ ہونی چاہئے۔ سادگی کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق ہوگا۔ سادگی کا ایک تصور، معیار آج بھی ہے۔ ایک تصور ان گھروں میں تھا جو آج سے پانچ سو سال پہلے یہاں آباد تھے۔ جس زمانے اور علاقے میں آپ ہیں اس کے لحاظ سے سادہ عمارتیں ہونی چاہئیں۔ پیسے اور دولت کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ یہی اس پابندی کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔

☆

شراب پر پابندی کے باعث لوگ اس کو ترک کر دیتے تھے اور
یہودیوں کو خسارہ کے باعث اس کاروبار کو ترک کرنا پڑ گیا۔ کیا
حضور نے شراب کشید کرنے والوں کو زبردستی نہیں روکا؟

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو شراب رکھنے اور پینے کی اجازت ہے۔ وہ شراب بنا بھی سکتے ہیں۔ آپس میں اس کا لین دین بھی کر سکتے ہیں۔ اسلام اس کی ممانعت نہیں کرتا۔ اس لئے رسول ﷺ نے یہودیوں کو، جن میں شراب بنانے والے کم تھے، لیکن آپ نے ان کو بھی شراب بنانے سے نہیں روکا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مارکیٹ ختم ہو گئی تو ان کا کاروبار بھی ختم ہو گیا۔ لیکن مدینہ منورہ سے باہر جہاں یہودی اور عیسائی آبادیاں تھیں، عیسائیوں میں زیادہ اور یہودیوں میں کم شراب کا کاروبار جاری تھا۔ وہ شراب رکھ سکتے تھے، پی سکتے تھے اور بیچ بھی سکتے تھے۔ آج بھی رکھ سکتے ہیں۔

☆

موجودہ دور میں بعض حضرات خواہشمند کاروباری حضرات کو نقد رقم دیتے ہیں جس پر انہیں پہلے سے طے شدہ منافع دیا جاتا ہے۔

یہ جائز نہیں ہے۔ طے شدہ منافع ہی تو سود ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہے کہ اس وقت میں ایک یا دو ہزار روپے ماہوار دوں گا اور سال کے ختم ہونے پر جب کاروبار کا سالانہ حساب کریں گے تو اس وقت یہ معاملہ بھی طے کر کے حساب برابر کر دیں گے۔ یہ جائز ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ پورا سال نفع کا انتظار کریں اگر پہلے سے کوئی رقم بطور ایڈوانس کے ملتی رہے۔ یہ دو متعین رقم بھی ہو سکتی ہے اور سال کے آخر میں فی صد کے حساب اس کا حساب صاف کر لیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن متعین رقم لینا سود ہے۔

☆

ربا الفضل میں، جو حدیث میں آیا ہے، جس میں چھ چیزوں کا ذکر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ ان چیزوں کی کوالٹی برابر ہو؟

معیار ایک جیسا ہو یا نہ ہو لیکن مقدار ایک ہونی چاہئے۔ کوالٹی تو برابر نہیں ہوتی تھی۔ جب کمی بیشی ہوتی تھی تو چیزوں کی کوالٹی ہی کے فرق کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ اس کی حضور نے

ممانعت فرمادی۔

☆

موجودہ بینکاری کے ہوتے ہوئے سود سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

بالکل بچا جا سکتا ہے۔ سود سے بچنے کی شکل یہی ہے کہ آپ سودی کاروبار میں پیسہ نہ لگائیں۔ حتی الامکان سود میں ملوث نہ ہوں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جو سود سے بچنا چاہے وہ بھی سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ تو آج کل یہی زمانہ ہے۔ سود کے غبار سے بچنا مشکل ہے۔ اس کے لئے وہ کام کریں جو امام مالک نے کیا تھا۔

امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ آپ بڑے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ حالانکہ اہل اللہ تو بہت سادہ ہوتے ہیں۔ (لوگ بھی طرح طرح کے سوال پوچھ لیتے ہیں۔ امام مالک جیسی بزرگ شخصیت کو بھی نہیں چھوڑا۔) انہوں نے کہا: نفعل و نستغفر۔ کہ ہم غلطی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتے ہیں۔ تو اگر غبار آپ تک پہنچتا ہو تو نفعل و نستغفر پر عمل کریں۔

☆

حضرت عمرؓ کے دور میں حالات اتنے اچھے ہو گئے کہ کوئی زکوۃ لینے والا نہ رہا۔ تو انہوں نے کیا طریقہ معیشت اختیار کیا تھا؟ اور ایسی اچھی حالت حضور اکرمؐ اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں کیوں نہیں آئی؟

بڑے کاموں کے اثرات کو ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پورا دس سالہ مدنی دور، اصلاحات کا دور ہے۔ آپؐ نے ایک ایک کر کے تدریجی اصلاحات فرمائیں۔ آخری اصلاح ربا کے (سود کو) کالعدم قرار دینے کا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد ان کے ثمرات ایک ایک کر کے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تو دو سال کا زمانہ ہے۔ حضرت عمر

کے زمانہ میں۔ یعنی حضورؐ کی ان اصلاحات کے آٹھ دس سال بعد ان کی برکات اور ثمرات آنا شروع ہو گئیں۔ آج بھی جب آپ یہ اصلاحات مکمل کر لیں گے تو اس کے ثمرات سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔

☆

کیا اسٹاک ایکسچینج کا تصور نبی کریم ﷺ کے دور میں تھا؟

میرے خیال میں تو نہیں تھا۔ اسٹاک ایکسچینج تو کارپوریٹ فنانسنگ کی ایک شکل ہوتی ہے۔ کارپوریٹ فنانسنگ کا یہ تصور اس زمانے میں نہیں تھا۔ collective financing البتہ ہوتی تھی۔ لیکن کارپوریٹ فنانسنگ کا تصور نیا ہے۔ اس میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ تین چار قواعد کی پابندی کی جائے تو اس کو شریعت کے مطابق چلایا جا سکتا ہے۔

☆

حضورؐ کے دور کے یہودیوں کا موجودہ دور کے یہودیوں سے موازنہ کیا جائے تو کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟

یہی مماثلت اور موافقت پائی جاتی ہے کہ جو حرکتیں وہ حضور ﷺ کے دور میں کرتے تھے آج بھی کرتے ہیں۔ مسلمانوں سے دشمنی اور ان کے خلاف منفی عزائم اس وقت بھی رکھتے تھے، اور آج بھی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے تسلط میں رکھنا چاہتے ہیں۔ سازشی لوگ ہیں۔ یہ ہر زمانے میں کرتے آئے ہیں۔ آج بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

☆

مسلمانوں کو یہودیوں کے معاشی تسلط سے آزادی کے لئے کیا راہ اختیار کرنی چاہیے؟

وہی راہ جو حضور علیہ السلام نے اختیار کی۔ امام مالک نے فرمایا تھا کہ 'لا یصلح آخر

معلوم ہوا کہ اصل صحیح طریقہ یہ ہے، جس طریقہ کار سے اس امت کے آغاز میں اصلاح ہوئی تھی اسی طریقہ کار سے آج بھی اصلاح ہوگی۔ اس لئے وہی طریقہ اختیار کریں۔

☆

مدینہ منورہ میں کرنسی کا نظام کیسا تھا؟

مدینہ منورہ میں جو کرنسی تھی وہ سونے چاندی اور درہم و دینار کا رواج تھا۔ دینار کے پیمانے حضور نے مقرر کر دیئے تھے کہ مدینہ کے معیار کے مطابق قبول کئے جائیں گے۔

☆

غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب کیا تھے؟

غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب یہ تھے کہ خیبر کے یہودیوں نے کفار مکہ کا ساتھ دیا تھا۔ غزوہ احزاب کے بڑے حصے کے اخراجات برداشت کئے تھے۔ اس لئے ان کے معاشی زور کو توڑنا ضروری تھا۔

☆

حضور کے زمانے میں کونسی زبان بولی جاتی تھی؟

حضور کے زمانے میں عربی بولی جاتی تھی۔ وہی زبان جس میں ابھی آپ بچے نے سوال کیا ہے، بالکل یہی زبان بولی جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں بھی عربی بولی جاتی تھی۔ حضور کے زمانے سے تقریباً ساڑھے تین چار سو سال پہلے سے وہاں عربی زبان بولی جاتی تھی۔ حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ سے ساڑھے تین سو سال پہلے تک کے اشعار محفوظ ہیں۔ لبنان کے ایک صاحب علم نے آج سے دس بارہ سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے قدیم ترین عربی اشعار کا نمونہ جمع کیا تھا۔ ان میں قدیم ترین اشعار حضور کی ولادت مبارکہ سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کے ہیں۔ غالباً 240 عیسوی کے اشعار ہیں۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

آٹھواں خطبہ

کاملیات سیرت

آٹھواں خطبہ

کلامیات سیرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

قابل احترام جناب ڈاکٹر خالد مسعود
محترم جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی
برادران محترم
اور خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا عنوان ہے کلامیات سیرت۔ کلامیات سیرت سے مراد وہ موضوعات ہیں جو اصلاً علم کلام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سیرت کے واقعات یا سیرت کے حقائق سے ان کا گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ اسی طرح کلامیات سیرت میں وہ واقعات بھی شامل ہیں جو اصلاً سیرت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے معانی اور مطالب کو سمجھنے کے لئے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیرت کے بعض اہم واقعات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو علم کلام سے تعلق رکھتے ہیں اور علم کلام کے ان مباحث میں گئے بغیر ان سے واقفیت دشوار ہے۔ یہ مشترک موضوعات جو علم کلام اور سیرت دونوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو کلامیات سیرت کے عنوان سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

اس موضوع پر مفصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان اہم مسائل کی

نشاندہی کر دی جائے جو سیرت نبوی کے سیاق و سباق میں زیر بحث آتے ہیں اور ان کی نوعیت کلامی مسائل کی سی یا ب ہوتی ہے۔ وہ اہم مسائل اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں:

۱۔ نبوت و رسالت کی حقیقت اور ضرورت

۲۔ نبی اور رسول کے فرائض و ذمہ داریاں

۳۔ وحی کی حقیقت، ضرورت اور اقسام

۴۔ دیگر ذرائع علم

۵۔ ختم نبوت اور حقیقت محمدیہ

۶۔ خصائص نبوی و فضائل نبوی

۷۔ کلام الٰہی کی حقیقت اور مسئلہ خلق قرآن

۸۔ معجزات رسول

۹۔ معراج رسول

۱۰۔ معراج اور اسراء

۱۱۔ مسئلہ عصمت انبیاء

۱۲۔ بشریت انبیاء یا شواہد نبوت

آج کی مختصر مجلس اور محدود وقت میں ان سب موضوعات پر مفصل گفتگو ممکن نہیں۔ البتہ ان میں سے ایک دو اہم موضوعات کا مختصر تعارف کرایا جا سکتا ہے۔

جب سیرت نگاروں نے سیرت کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا اور اس کا ایک ابتدائی مرحلہ مکمل ہو گیا جس کا ہم گزشتہ ایک گفتگو میں جائزہ لے چکے ہیں، تو تقریباً ڈیڑھ سو سال کے مسلسل تحقیق و تالیف کے بعد، دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مطالعہ سیرت کی ایک نئی جہت سامنے آئی، یعنی سیرت کے واقعات اور موضوعات کا کلامی اور عقلی انداز سے مطالعہ کیا جانے لگا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ ان دنوں یونانی علوم و فنون کا بڑے پیمانے پر عربی زبان میں ترجمہ شروع ہوا۔ مسلمان اہل علم نے یونانی منطق اور فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کا مطالعہ کیا اور بہت سے معاملات پر یونانی نقطہ نظر سے، یونانی اسلوب تفکیر اور یونانی انداز استدلال سے غور و خوض کرنا

شروع کیا۔ اسی وجہ سے جہاں غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ ساتھ مسلمان دانشوروں کا ایک خاص بڑا طبقہ بھی یونانی منطق اور یونانی علوم وفنون سے متاثر ہوا۔

اس طبقہ کی طرف سے جس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، بہت سے ایسے سوالات اسلام کے عقائد کے بارے میں اٹھائے گئے جن کا جواب یونانی اسلوب استدلال کو اختیار کئے بغیر دینا مشکل تھا۔ اس لئے علمائے اسلام نے یونانی منطق اور علوم وفنون سے واقفیت پیدا کی اور یونانیوں کے اسلوب استدلال کے مطابق اسلامی عقائد کو بیان کرنے اور اسلامی عقائد پر کئے جانے والے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی۔ ان حالات میں ان حضرات نے جو سیرت نگاری کی مقدس مہم سے وابستہ تھے یہ محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ سیرت کے عام تاریخی، فقہی اور قانونی پہلوؤں کے علاوہ سیرت کے ان پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے جن کا تعلق عقائد اور علم کلام کے مسائل سے ہے۔

اس کام کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت کے دلائل اور شواہد پر جب غور وخوض اور تصنیف وتالیف کا آغاز ہوا، اور دوسرے انبیائے کرام کے معجزات اور ان کے لائے ہوئے شواہد ودلائل سے حضور کے شواہد ودلائل کا مقابلہ کیا گیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس مضمون کو زیادہ موثر اور زیادہ واضح انداز میں بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نبوت، رسالت اور وحی والہام پر خالص عقلی نقطہ نظر سے بھی غور کیا جائے اور ان لوگوں کے اطمینان قلب کے لئے عقلی دلائل بھی مرتب کئے جائیں جو محض قرآن وسنت کے دلائل کی بنیاد پر شرح صدر یا اطمینان قلب محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر آئندہ ایک طویل عرصہ تک کے لئے یہ موضوعات سیرت کا ایک جزولاینفک رہے اور اب بھی سیرت کا ایک اہم باب ہیں اور تقریباً ہر بڑے سیرت نگار نے ان مسائل پر گفتگو کی ہے۔

نبوت اور رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ نبی اور رسول میں فرق کیا ہے؟ نبی کس کو کہتے ہیں؟ رسول کس کو کہتے ہیں؟ پھر نبی اور رسول کا ذریعہ علم کیا ہے؟ پھر ذرائع علم کی کتنی قسمیں ہیں؟ وحی اور الہام میں کیا فرق ہے؟ وحی کا ماخذ علم کیا ہے؟ پھر چونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام خاتم النبیین ہیں، اس لئے ختم نبوت کیا ہے؟ ختم نبوت کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے؟ حضور علیہ

کا ایک ثمرہ یا محاضرات سیرت کی برکات میں سے ایک برکت ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص پر جب صوفیائے کرام نے غور وخوض شروع کیا تو انہوں نے روحانیات سیرت کے موضوعات پر بھی گفتگو کی، اور یوں روحانیات سیرت کے موضوع پر وقیع مباحث کے دفتر تیار کئے۔ اس ضمن میں انہوں نے حقیقت محمدیہ اور نور محمدی کی حقیقت پر گفتگو کی، پھر مختلف انبیاء علیہم السلام کے انوار اور نسبتوں پر اظہار خیال کیا۔ اپنے غور وفکر اور اپنے ذوق علم سے کام لے کر مختلف انبیاء علیہم السلام کی مختلف نسبتیں متعین کیں۔ ان نسبتوں کا رسول ﷺ سے کیا واسطہ تھا۔ آپ کی ذات مبارک کا بقیہ انبیاء علیہم السلام سے کیا رابطہ تھا۔ اس پر بہت سے صوفیائے کرام نے غور وخوض کیا۔ اس موضوع پر بڑی فاضلانہ تحریریں لکھی گئیں۔ اس میں بھی ہمارے برصغیر کا حصہ کم نہیں ہے۔ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات میں جا بجا ان موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور صوفیانہ زبان میں روحانی تجربات کے پس منظر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اخلاقی برتری کو نہایت نفیس اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت اور متعلقات نبوت پر شروع سے غور وخوض جاری ہے۔ کچھ حضرات نے نبوت کے مسئلہ پر خالص عقلی انداز سے غور کیا اور فلسفہ اور عقلیات کے میدان میں ایک نیا مضمون اور ایک نیا انداز متعارف کرایا۔ ابو نصر فارابی جو مسلمان فلاسفہ اور مفکرین میں اتنا اونچا مقام رکھتا ہے کہ مسلم فلسفیوں اور مفکرین نے اس کو معلم ثانی کا لقب دیا۔ ارسطاطالیس کو پہلا معلم تسلیم کرتے ہوئے فارابی کو دوسرا بڑا معلم عقلیات تسلیم کیا ہے۔ فارابی نے پہلی بار اس بات کی کوشش کی کہ یونانی منطق اور فلسفہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اسلامی عقائد اور تصورات سے متعارض نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فلسفہ اور عقلیات پر جو تحریریں چھوڑی ہیں ان میں اس نے نبوت، مقام نبوت، منصب نبوت پر فلسفیانہ اور عقلی انداز سے غور وخوض کیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان فلاسفہ نے صرف یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے پر اکتفا کیا۔ یقیناً یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ یقیناً یونانیوں اور نو افلاطونیوں کے علوم وفنون سے مسلمان قارئین اور دانشوروں کو آگاہ کیا گیا۔ لیکن یہ محض ترجمہ اور نقل نہیں تھا۔ یہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ نظر ثانی اور تدوین نو بلکہ تعبیر نو کا کام تھا۔ اس کام میں مسلمان فلاسفہ نے اسلامی

تصورات کی روشنی میں یونانی افکار کا جائزہ لینے کی بھی کوشش کی۔ مثال کے طور پر یونانیوں کے علوم وفنون میں نبوت، رسالت اور وحی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یہ مضامین افلاطون اور ارسطاطالیس کے ہاں نہیں ملتے۔ یہ فلسفہ اور عقلیات کے میدان میں، کم از کم مسلمانوں میں، پہلی مرتبہ ابونصر فارابی نے متعارف کرائے ہیں۔ اسی طرح سے نبوت اور وحی والہام کے موضوع اور ذریعہ علم کے سوال پر خالص عقلی اور فلسفیانہ انداز میں جس شخص نے غور وخوض کی طرح ڈالی وہ بھی ابونصر فارابی ہے۔ اس عمل کو پھر شیخ ابن سینا نے مزید گہرائی اور گیرائی بخشی اور خاص نبوت کے ماخذ علم ہونے کا تصور ابن سینا کے اہم مسائل اور مضامین میں سے ایک ہے۔ پھر آگے چل کر حکیم ابن رشد نے جو منطقی، فلسفی اور حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ نامور اصولی، فقیہ اور متکلم بھی تھے، انہوں نے اس کو شریعت سے زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ شریعت کے موقف کو اس طرح خالص عقلی انداز میں مرتب کیا جائے کہ عقلیات کے نمائندے اس پر عقلی نقطۂ نظر سے کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔ یہ کلامیات سیرت کا خالص عقلی اور فلسفیانہ پہلو ہے۔ جو ایک دوسری روایت علم میں بڑی کثرت اور تسلسل کے ساتھ زیر بحث رہا ہے۔

کچھ اور حضرات نے روز اول سے یہ کوشش کی کہ خالص عقلی دلائل سے کام لے کر اسلامی نقطۂ نظر کو ٹھیک ٹھیک انداز میں بیان کیا جائے جس میں بنیادی حوالہ قرآن مجید، سنت رسول اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ ہو۔ دلائل کا انداز عقلی اور اسلوب منطقی ہو اور مخاطبین فلسفہ اور عقلیات کے طلبہ ہوں۔ یہ اسلوب بہت کامیابی کے ساتھ اور نہایت بھرپور انداز میں امام غزالی کے ہاں ملتا ہے جنہوں نے اس میں روحانیات اور اخلاقیات کی جہت بھی پیدا کی اور خالص دینی مصادر سے کام لے کر عقلی دلائل اور اسلوب، یونانیوں کا طرز استدلال، روحانیات اور اخلاقیات، غرض سب کو ملا کر کوشش کی کہ اسلامی نقطۂ نظر کو ایک جامع انداز میں پیش کر دیا جائے۔ ان کی کتاب معارج القدس میں نبوت، فلسفہ نبوت اور وحی والہام کے بارے میں انتہائی وقیع اور عالمانہ بحثیں موجود ہیں۔

کچھ اور حضرات نے خالص روحانی انداز میں ان مضامین کو بیان کیا، اور قرآن مجید اور سنت کی تعلیم کو روحانیات سے ہم آہنگ کرکے ایک نیا انداز اپنایا۔ اس کی ایک بڑی مثال

مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عقلیات کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب
میں یونانی علوم و فنون کے اس بڑھتے ہوئے اثرات کے ساتھ ساتھ خالص روحانی اور اخلاقی
نقطۂ نظر کو مسلمانوں میں فروغ دیا جانا چاہئے۔ بجائے انسانوں کی عقل کو اپیل کرنے کے
انسانوں کے قلب کو اپیل کیا جائے۔ یوں مسلمانوں کے فکر میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی۔ جس طرح
سے ادبیات سیرت کے دو اہم نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک دوسرا نمونہ جس کے نمائندہ
مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ ان کی کتابوں میں خاص طور پر مثنوی میں سیرت کے واقعات کو
اتنی کثرت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ خود مثنوی مولانا روم سے اگر سیرت کے واقعات
نکالے جائیں تو سیرت کی ایک مختصر کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ پھر نہ صرف سیرت کے واقعات کی
بلکہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور حالات کا تذکرہ کر کے ان کے روحانی پہلو اور پیغام
کا اخلاقی تجزیہ مولانا روم کے ہاں ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔

امت مسلمہ نے سب سے زیادہ جن اثرات کو قبول کیا وہ اثرات تھے جن کے نمائندہ
امام غزالی ہیں۔ امام غزالی بیک وقت اخلاقیات، روحانیات، فقہ اور اصول فقہ، عقلیات،
منطق اور فلسفہ سب کا ایک مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ان سارے علوم و فنون
کے دلائل سے کام لے کر اسلامی عقائد کی توضیح اور ان پر اعتراضات کا دفاع کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔

ایک طرف یونانیوں کے زیر اثر عقلیت کا بڑھتا ہوا رجحان کارفرما تھا، دوسری طرف خود
محدثین اور خالص سیرت نگاروں کے حلقے میں بعض ایسے مسائل اور سوالات پیدا ہو رہے تھے
جن کو جواب وہ حدیث کی روشنی میں دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے
کہ بہت سے خالص کلامی مسائل اول اول محدثین کے حلقوں میں پیدا ہوئے اور سب سے
پہلے محدثین نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق، یہ
خالصتاً عقلی اور کلامی مسئلہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خلق قرآن کا مسئلہ بنیادی طور پر فلسفہ کا مسئلہ تھا،
لیکن محدثین کے حلقے میں پیدا ہوا۔ جب قرآن مجید کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا
ہوا تو پہلا اہم مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ خود کلام الٰہی کیا ہے؟ ذات باری سے اس کے تعلق کی نوعیت
کیا ہے؟ پھر خود کلام الٰہی کی حقیقت کیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ صفات الٰہی کی حیثیت

کرتا ہے جس کے لئے مولانا رومی نے علم حضوری کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں جابجا ان دونوں کے درمیان مقابلہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

کہ عقل کی بنیاد پر راستہ چلنے اور صحیح راستہ اختیار کرکے منزل مقصود تک پہنچنے کی کیفیت وہی ہے جو کسی لنگڑے کے پاؤں کی ہوتی ہے جو لکڑی کی بیساکھیوں پر چلتا ہے۔ جیسے تیسے لنگڑے کی وقتی اور فوری ضرورت تو پوری ہو جاتی ہے، وقتی تقاضا تو پورا ہو جاتا ہے، لیکن طویل اور کٹھن منزل مقصود لکڑی کے پاؤں کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہی بات علامہ اقبال نے بھی کہی ہے اور غالباً ان تمام مباحث کے پیش نظر جو متکلمین اسلام اور صوفیہ کرام شروع سے بیان کرتے چلے آ رہے تھے، انہوں نے اس کا ایک خلاصہ اپنے ایک قطعہ میں بیان کیا ہے۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

یہ بات صوفیائے کرام مولانا رومی کے زمانے سے لکھتے چلے آ رہے تھے کہ انسانی عقل کی ذمہ داریاں محدود ہیں۔ ایک جگہ مولانا روم نے لکھا ہے کہ جس ترازو سے سونا اور ہیرے تولے جاتے ہیں اس سے پہاڑ نہیں تولے جا سکتے۔ عقل بلاشبہ ایک ترازو ہے، لیکن وہ چند خاص قسم کی چیزوں کو تولنے کے لئے انسان کو دی گئی ہے۔ اگر اس سے وہ چیزیں تولنے کی کوشش کی جائے جو اس کی دائرہ کار سے باہر ہیں تو یہ عقل کا صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ یہ مضمون مولانا روم کے ہاں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کو جس مرحلہ کو طے کرنے اور جس مشکل کو حل کرنے کے لئے امامت اور رہنمائی درکار ہے وہ محض عقل کی بنیاد پر حل نہیں ہو سکتی۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عقل کی بنیاد تو اس کے اپنے اندازے اور استدلال پر ہوتی ہے۔ عقل کا اندازہ اور استدلال ان معلومات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو کسی انسان کے پاس موجود ہوتی ہیں۔ معلومات

غلط ہوں گی تو اندازہ غلط ہوگا۔ معلومات درست ہوں گی تو اندازہ درست ہوگا۔ معلومات مکمل ہوں گی تو اندازہ مکمل ہوگا اور معلومات نامکمل ہوں گی تو اندازہ نامکمل ہوگا۔ عقل کا سارا سرمایہ ظن و تخمین سے زیادہ نہیں ہے۔ جن معاملات میں قطعیت اور یقینیات درکار ہیں۔ ان میں بھی عقل کا سرمایہ محض ظن و تخمین اور اندازے ہیں۔

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

لیکن یہ بات کہ انسان کے اعمال اور اس کی سرگرمیوں میں حق و باطل اور حسن و قبح کا معیار کیا ہونا چاہیے، وہ خالص عقل ہو یا شریعت ہو۔ اللہ کے رسول کا ارشاد ہو یا انسان کا اپنا تجربہ ہو، یہ بات روزِ اول سے ہی زیرِ بحث رہی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے منسوب کتاب الفقہ الاکبر میں بھی یہ مضمون بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہر متکلم، ہر فقیہ اور ہر صوفی نے اس مضمون کو اٹھایا ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز اس روئے زمین پر موجود ہے۔ انسانی زندگی کو جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ سب کی سب روئے زمین پر فراہم کر دی گئی ہیں۔ اب اگر انسان کے لئے کھانے پینے سمیت تمام ضروریات یہاں دستیاب ہیں اور موجود ہیں۔ انسان ان کو استعمال کر سکتا ہے تو انسان کی عقلی، روحانی ضرورتوں کا سامان کیوں موجود نہیں ہوگا۔ لہٰذا نبوت اس سوال کا جواب ہے جو ہر انسان کے ذہن میں آتا ہے اور عقل سے اس کا قطعی اور حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان کبھی نہ کبھی اپنے مقصدِ وجود کے بارے میں سوالات پوچھتا ہے۔ ان سوالات کا جواب نبوت ہی سے مل سکتا ہے۔

علامہ اقبال کو اس موضوع سے طویل دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے اپنے منظوم اور منثور دونوں کلاموں میں اور انگریزی خطبات اور تحریروں میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کو بیان کرنے کا وقت نہیں۔ ایک چھوٹی سی لیکن انتہائی وقیع تحریر ہے اور متکلمین کے تمام مباحث اور کاوشوں کا خلاصہ ہے۔ انہوں نے 1934-35 میں سید حسن اختر کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ نبوت کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ پہلا بنیادی عنصر یہ ہے کہ اس کو مابعد الطبیعی ذرائع سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ان ذرائع سے علم ہوتا ہے جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہیں ہیں۔ جس شخص کو علم کا ایسا ذریعہ حاصل ہو جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہ ہو تو یہ نبوت کا پہلا عنصر

ہے۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ جس علم کو وہ حاصل کرتا ہے وہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔ تیسرا عنصر یہ کہ وہ اس علم کو اپنے اور دوسروں کے لئے واجب التعمیل سمجھتے ہوں۔ انہوں نے لکھا کہ جو شخص ان تینوں چیزوں کا مدعی ہے، چاہے وہ نبوت کا لفظ استعمال نہ بھی کرے تب بھی وہ مدعی نبوت ہے اور حضور علیہ السلام کے بعد ایسا دعویٰ کرنے والا ہر شخص دائرہ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے۔ یہ علامہ اقبال کی تحریر ہے۔ اس میں متکلمین کی بحث کا کوئی نقطہ باقی نہیں رہتا اور نبوت کی حقیقت کے خلاف اس میں کوئی چیز نہیں آئی۔ یہی تینوں چیزیں یکجا ہوں تو نبوت کہلاتی ہے۔ یعنی علم ایسے ذریعے سے حاصل ہو جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے۔ وہ علم قطعی اور یقینی ہو اور حاصل کرنے والے کے لئے یا دوسرے انسانوں کے واجب التعمیل ہو۔

نبوت اور تصور نبوت کا سیرت سے ایک اور تعلق بھی ہے۔ اس کو تمام سیرت نگاروں نے سمجھا اور اس کو سیرت کی کتابوں میں ظاہر بھی کیا۔ وہ یہ کہ سابقہ انبیاء کا سلسلہ نبوت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی تمہید ہے۔ آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں، جن کے بارے میں میں نے عرض کیا کہ They were all Muhammad in the making. وہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے اسٹیج تیار کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ مختلف اقوام کو اس دینی، فکری، ذہنی اور روحانی سطح پر لانے کے لئے بھیجے گئے تھے جس سطح پر رسول اللہ ﷺ کو بھیجا جانا تھا۔ اسی لئے تمام بڑے اور قدیم سیرت نگاروں نے پچھلے انبیاء اور نبوتوں کے تذکرے سے سیرت کا بیان شروع کیا ہے۔ کسی نے حضرت آدم سے شروع کیا۔ کسی نے حضرت ابراہیم سے شروع کیا۔ کسی نے حضرت اسماعیل سے شروع کیا۔ سابقہ انبیاء کا تذکرہ تمام سیرت نگار عروہ ابن زبیر کے زمانے سے لے کر ہمارے دور کے سیرت نگاروں تک سب کرتے چلے آرہے ہیں۔ ماضی قریب کے بھی ہر قابل ذکر سیرت نگار نے سلسلۂ نبوت کو سیرت کا مقدمہ اور تمہید ہی سمجھا ہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سلسلہ نبوت، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین سیرت النبی کا مقدمہ اور تمہید تھے اور اس ضروری مقدمہ اور تمہید کو سمجھے بغیر سیرت النبی کو سمجھنے کی کوشش کرنا مقام نبوت کی فہم میں مدد و معاون نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل نبوت اور کلامیات سیرت علم سیرت کا ایک لازمی حصہ قرار پائے۔

بعض حضرات کے پیش نظر سیرت کے صرف تاریخی واقعات تھے۔ مثلاً ابن ہشام،

ابن قیم کی کتاب زاد المعاد ادبیات سیرت کی منفرد کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں انھوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو اکثر سیرت نگاروں نے بیان نہیں کیے۔ سیرت کی عملی رہنمائی، سیرت کی فقہیات، سیرت کی روحانیات اور سیرت کی قانونیات ان کی خاص دلچسپی کے موضوعات ہیں۔ لیکن اس کتاب میں انھوں نے کلامیات سیرت کے بہت سے مسائل بھی اٹھائے ہیں۔ بعض خاص مسائل جو سیرت نگاروں کے یہاں زیر بحث رہے ہیں ان پر ابن قیم نے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ حضورؐ کے معجزات اور خاص طور پر حضورؐ کے سب سے بڑے معجزے یعنی معراج اور اسرا کا اور معراج کی نوعیت اور کیفیت کا ہے۔

اس پر ابھی ہم تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا مسئلہ جو ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے وہ پہلے دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ رسول اللہ ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو یہ معراج جسمانی تھی یا روحانی۔ معراج کے روحانی یا جسمانی ہونے کا سوال شروع سے زیر بحث رہا ہے۔ صحابہ کے زمانے سے ہی اس پر بات ہوتی رہی ہے کہ معراج کی نوعیت کیا تھی۔ صحابہ کرام سے جو کچھ منقول ہے اور محققین نے اس پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی پچھلے چودہ سو سال سے ایک خاص انداز سے تعبیر ہوتی گئی ہے۔ برصغیر میں ایک خاص رجحان ایک خاص حلقے میں یہ پیدا ہوا چلا ہے اور برصغیر سے باہر بھی یہ رجحان موجود ہے کہ معراج کی نوعیت بس ایک خواب کی سی تھی۔ یہ ایک خواب تھا جس میں حضورؐ نے بہت سے مناظر مشاہدہ فرمائے۔ جس طرح ہم لوگ خواب دیکھتے ہیں اسی طرح حضورؐ نے بھی خواب دیکھا اور آپ کو وہ سارے مناظر دکھا دیے گئے۔

یہ بات بعض اہل علم نے اس بنیاد پر کہی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو "ما فقد جسدہ" آپ کا جسم مبارک یہیں موجود رہا اور مفقود نہیں رہا۔ اس کی ایک تعبیر تو یہ ہو سکتی تھی جو بعض لوگوں نے کی کہ یہ سارا معاملہ ایک خواب تھا۔ لیکن علمائے امت کی غالب ترین اکثریت صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک اس بات کی قائل رہی ہے کہ معراج کا واقعہ یا تجربہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اس لیے کہ معراج اور اسرا کی حیثیت حضورؐ کے ایک نمایاں ترین معجزہ کی ہے۔ اگر یہ محض کوئی خواب تھا تو محض کسی خواب کو کوئی خاص اہمیت یا معجزہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خواب میں ہر کوئی ہر

بدل ہوجاتے۔ پھر انسانوں کی اجتماعیات یا خصوصی دو بقیہ انسانوں کا اجتماعی نظام کیوں
اور کیسے قائم ہوتا ہے اور اس کی کیا ضرورت ہے اور ختم نبوت نے اس نظام کے قائم ہونے
میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس طرح شاہ ولی اللہ نے ختم نبوت کی جو بحث کی ہے وہ ایک حصہ
میں پوری معاشرتی، سماجی اور انسانی کامیابی کی ایک بنیادی اور لازمی شرط قرار دیا ہے۔

پھر حجۃ اللہ البالغہ کے دوسرے حصے میں جس میں شاہ صاحب نے اسرار نبوت
و شریعت بیان کئے ہیں، وہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کے بنیادی مقاصد میں سے جو چیز
پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو کس طرح نمایاں اور واضح کر کے سامنے
لایا جائے کہ حضور کی لائی ہوئی شریعت اور اس کا اصل کارنامہ لوگوں کے سامنے آجائے۔ یعنی
اعلائے شریعت کا کمال، متکلمین کی تردید اور علم بیان کے لئے انھیں جس چیز سے حاصل
ہوجائے وہ بھی ان کے سامنے رکھ دوں۔ یوں یہ کتاب کلامیات سیرت کی ایک اہم اساسی
کتاب کے طور پر سامنے آتی ہے جو اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے اور اسلامی تاریخ
میں اس انداز اور نوعیت کی کوئی اور کتاب موجود نہیں ہے۔

نبوت کی ضرورت و اہمیت واضح کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ یہ بیان کرتے ہیں کہ
انسان کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے لئے ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو حقیقی تدبر کر سکیں اور جن
کی تعلیم کی بنیاد پر امت کی تشکیل کی جاسکے اور وہ لیڈر وائی اور حقیقی پائیدار نظام امت کو دے سکیں جو
امت کے لئے حقیقی سعادت اور کامرانی کا ذریعہ اور ضامن ہو۔ اس کے لئے انھوں نے تاریخی،
معاشرتی اور فلسفیانہ دلائل دیئے ہیں۔ ایک دلیل اس ضمن میں شاہ صاحب نے یہ دی ہے کہ
ہر معاملہ میں ماہرین اور متخصصین کی ضرورت انسانوں نے ہر دور میں محسوس کی ہے۔ ہر دور میں
انسان متخصصین سے رجوع کرتا ہے اور زندگی کے تمام گوشوں میں ان لوگوں سے رہنمائی
لیتا ہے جو کسی خاص فن میں مہارت اور علم کا معیار رکھتے ہیں جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا
ہو۔ یہ ضرورت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی ہے۔ ان کو ایک ایسے علم تک رسائی حاصل
ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے اور اس علم کی بنیاد پر ہی امت کی تشکیل اور شریعت کی
تکمیل کی جاسکتی ہے۔

پھر شاہ ولی اللہ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں جو فرق ہوا ہے اس کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ آخر میں کہا ہے کہ جب انسانیت ایک ایسے مرحلے پر آگئی جب ایک بین
الاقوامیت اور عالمگیریت کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ایک نیا دین بھیجا
جائے جو تمام ادیان کا ناسخ ہو۔ ایک ایسی شریعت اتاری جائے جو تمام شریعتوں کو مکمل کرنے والی
ہو اور عدل و انصاف کے جتنے پہلو پیچھے نامکمل رہ گئے تھے، ان کو مکمل کر دے۔ اور عدل
و انصاف کے سب پہلوؤں کی تکمیل کر دے اور لیظہرہ علی الدین کلہ کی کیفیت پیدا کر دی
جائے۔ یہ ختم نبوت کا وہ تصور ہے جو شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

جس چیز کو شاہ ولی اللہ صاحب تکمیل کا نام دے رہے ہیں یا جس کو لیظہرہ علی الدین کلہ
کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی وضاحت کرنے کی اجازت دی
جائے تو میں عرض کروں گا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم عطا فرمائی اس کے دو پہلو بہت
اہم ہیں:

ایک تو یہ کہ حضور ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے بعض ایسے مسائل اور مشکلات
انسانوں کو درپیش تھیں جن کا جواب انسانوں کے پاس نہیں تھا۔ انسان ایسی مشکلات کا شکار تھا
جس کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان مشکلات کو دور فرمایا
اور ان مسائل کا قابل عمل، عادلانہ، متوازن، فطری اور دائمی حل پیش کیا۔ ان مسائل اور
مشکلات میں ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ علوم اور بالخصوص مذہبی علوم مختلف اقوام اور طبقات کی
اجارہ داری میں محصور اور مقید تھے۔ دینی علوم تک عام انسان کی رسائی نہیں تھی۔ حضور علیہ
الصلوۃ والسلام نے اس اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کے درمیان ایک
بعد تھا۔ کچھ گروہ مذہبی تعلیم کے اور کچھ غیر مذہبی تعلیم کے علمبردار تھے۔ ان دونوں کے ہاں اس
علم کی بنیاد پر الگ الگ بنیادوں پر تہذیب و تمدن پروان پا رہی تھی۔ ایک تہذیب و تمدن
خالص مذہبی بنیادوں پر اور دوسرا خالص غیر مذہبی بنیادوں پر پروان پا رہا تھا۔ ایسی تہذیب
جس میں دونوں پہلوؤں کو یکجا کیا گیا ہو، انسانیت کی شدید ضرورت تھی۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم
میں یکجائی اور یکسانیت پیدا کرنے کا کام حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے پہلے نہیں تھا۔

مختلف اقوام میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے پہلے اوہام پرستی موجود تھی۔ اس کے
نتیجے میں انسان کے لئے تحقیق میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ انسان کا کائنات کے

حقائق پر اسی وقت غور کر سکتا ہے جب وہ اوہام پرستی سے نجات پا چکا ہو۔ توہم پرستی اور مظاہر
پرستی کے ساتھ کائنات کے حقائق پر آزادانہ غور و خوض نہیں ہو سکتا۔ یہ آزادانہ غور و خوض اسی
وقت شروع ہو گا جب رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ایک ایک کر کے ان ساری خرافات کو ختم
کر دیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس تعلیم کو فروغ دیا وہ ایک مثبت، حقیقی اور مفید علم تھا۔ غیر
حقیقی، غیر عملی اور مجرد نظریات کی بنیاد پر کسی علم کو اسلام میں جو صرف الفاظی ہو، حقیقی نہیں سمجھا گیا۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے لئے بھی اور اپنی امت کے لئے بھی علم نافع کی دعا مانگی اور
اپنی امت کو بھی اس کی تعلیم دی کہ وہ علم نافع کی دعا کرے اور علم غیر نافع سے پناہ مانگے۔ گویا علم
کے دو درجات ہو سکتے ہیں، ایک وہ علم جو انسانیت کے لئے مفید ہو اور دوسرا وہ جو انسانیت کے
لئے ضرر رساں ہو۔

اس کام کے لئے عقل اور نقل میں توازن پیدا کرنا ضروری تھا۔ عقل اور نقل میں توازن
پیدا کئے بغیر نہ دین کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ دنیا کے تقاضے پورے ہو سکتے
ہیں۔ جن اقوام نے نقل کے تقاضوں پر زیادہ زور دیا ان اقوام میں عقل کے تقاضے مجروح
ہو گئے۔ جن اقوام نے عقل کے مطالبات پر زیادہ زور دیا ان میں مذہب کے تقاضے مجروح
ہو گئے۔ کوئی ایسی کوشش کہ یہ دونوں تقاضے بیک وقت جمع کئے جا سکیں اور ان دونوں قسم کے
مطالبات کو توازن اور جامعیت کے ساتھ بیک وقت پورا کیا جا سکے، یہ صرف اور صرف
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم سے ممکن ہو سکا۔

یہ اس فن کا ایک عام سا مختصر تعارف تھا جس کو ہم کلامیات سیرت کہہ سکتے ہیں۔ اس کا آغاز
کیسے ہوا؟ اس میں کون کون سے مسائل زیر بحث آئے۔ کن متکلمین نے کس انداز سے اس فن
پر گفتگو کی، میں نے اس کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔

اب میں دو مزید سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ معجزہ جو کلامیات سیرت
کا ایک اہم مضمون ہے، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس پر اکابر اسلام نے کیا لکھا ہے اور رسول اللہ
ﷺ کے بڑے معجزات جو سیرت سے ثابت ہیں ان کے بارے سیرت کے ادب میں کیا
معلومات ہیں۔ معجزہ قرآن مجید کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ معجزہ ایک ایسا لفظ ہے جو عربی

کی طرح عبرانی میں بھی قریباً اسی مفہوم اور تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے نبی سے مراد وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے براہ راست علم حاصل ہو۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ایسا علم جو قطعی اور یقینی ہو اور مابعد الطبعی ذرائع سے حاصل ہوا ہو اور ایک بہت سے انسانوں کے لئے وجہ تسلیم ہو۔ اس کے حامل اور وصول کنندہ ذات کو نبی کہا جاتا ہے۔
اس بارے میں مفسرین اور متکلمین کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ کیا نبی اور رسول ایک مفہوم رکھتے ہیں یا ان کا الگ الگ مفہوم ہے۔ بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ نبی اور رسول کے مفہوم ایک ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ اکثریت کے خیال میں نبی اور رسول کا مفہوم الگ الگ ہے۔ دونوں اصطلاحات کے درمیان فرق پر بہت سی بحثیں ہیں لیکن ہمارے برصغیر کے ترجمان القرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے ایک جملے میں اس فرق کو بیان کر دیا ہے کہ نبی وہ ہے جس کو وحی ملے اور رسول وہ ہے جس کو کوئی کتاب یا نئی امت یا نئی شریعت یا تینوں دی جائیں۔ اگر کسی کو کوئی شریعت اور نئی کتاب دی گئی۔ یا شریعت اور کتاب تو نئی نہیں دی گئی لیکن نئی امت کے پاس اس کو بھیجا گیا وہ رسول ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہی تھی جو حضرت ابراہیم کی شریعت تھی۔ ان کی کتابیں وہی تھیں جو حضرت ابراہیم کی طرف نازل کی گئیں تھیں لیکن ان کو نئی امت کی طرف بھیجا گیا تھا اس لئے وہ رسول کہلائے۔ یہ فرق ہے رسول اور نبی میں۔

نبی کا لفظ لغوی اعتبار سے دو مفہوم رکھتا ہے اور متکلمین نے ان دونوں مفاہیم کو لیا ہے۔ نبی کا ایک مطلب تو ہے 'خبر دینے والا'۔ نبا عربی زبان میں کسی اہم خبر کو کہتے ہیں 'عم یتساءلون عن النباء العظیم' چونکہ نبی اللہ کی طرف سے بڑی اہم خبریں دیتا ہے اور وہ اللہ کا ترجمان ہے اس لئے اس کو نبی کہا گیا اور قرآن پاک میں جہاں بھی نبی کا لفظ آیا ہے وہ انہی معنوں میں آیا ہے۔ لیکن ہمزہ کو اس میں تخفیف کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ لیکن ورش کی روایت میں اب بھی ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ روایت حفص میں ہم پڑھتے ہیں یا ایھا النبی جبکہ ورش کی روایت میں پڑھتے ہیں یا ایھا النبیء۔ یہ صرف تلفظ کا فرق ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کا لفظ نبوۃ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے بلند مرتبہ۔ انسانوں میں سب سے بلند مرتبہ کی شخصیت نبی ہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبی کہا گیا۔

مکتوبات میں جو بحث نبوت اور معارف نبوت پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے جس سے ان تمام عقلی اور غیر عقلی الجھنوں کو صاف کرنے میں مدد ملی جو گیارہویں صدی ہجری کے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مکتوبات میں تحریر کئے ہوئے اس قیمتی مواد کے علاوہ مجدد صاحب نے اثبات نبوت پر ایک باقاعدہ رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔

نبوت و ولایت کے درمیان افضل اور مفضول کی بحث کا ذکر کرتے ہوئے مجدد صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے بعض صوفیائے کرام جذب کے عالم میں بہت کچھ کہتے رہے ہیں جو زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ جذب کی کیفیت میں انسان کو اپنے احساسات اور عقل پر کنٹرول نہیں رہتا۔ ایسی کیفیت میں زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو درست نہیں ہوتے۔ یہ مضمون بیان کرتے ہوئے مجدد صاحب فرماتے ہیں 'ازیں جاست کہ بعضے گفتہ اند الولایۃ افضل من النبوۃ' اور اسی کیفیت میں بعض لوگوں کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ مجدد الف ثانی نے تحقیق سے اس کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ نبوت انسانوں کو حاصل ہونے والے درجات میں سب سے افضل درجہ ہے۔ اور ولایت سے بدرجہا بلند ہے، چاہے اسی نبوت کی ولایت ہو یا کسی اور کی ولایت ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ نبوت انسانوں کو حاصل ہو سکنے والے درجات میں سب سے افضل ہے۔ ایک اور جگہ اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ بعض لوگ اپنی نظری نارسائی اور فکری کوتاہی کی وجہ سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتابوں میں اس کی تحقیق کی ہے اور لکھا ہے کہ کمالات نبوت کی حیثیت ایک دریائے محیط کی ہے۔ ایک سمندر کی ہے۔ اور کمالات ولایت کی حیثیت اس کے مقابلے میں ایک حقیر قطرہ کی ہے۔ مجدد صاحب کی نظر میں کمالات نبوت اور کمالات ولایت میں یہ نسبت ہے۔

کمالات و خصوصیات نبوت پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی روشنی ڈالی ہے جس کی تفصیل وقت کی تنگی کی وجہ سے میں چھوڑ رہا ہوں۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث میں حقیقت نبوت، خواص نبوت، وحی و الہام اور معجزات کی حقیقت پر بہت عالمانہ گفتگو فرمائی ہے جو قابل دید ہے۔

نبی کا ذریعہ علم وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کی حقیقت اور نوعیت اور مقام و مرتبہ کے بارہ

میں قرآن مجید میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ علمِ وحی کی عظمت پر قرآن پاک میں اور سابقہ مذہبی کتابوں میں رہنمائی ملتی ہے۔ وحی کا لفظ دو مفہوموں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مفہوم جو بہت عام ہے، وہ یہ کہ خاموشی کے ساتھ اور جلدی کے ساتھ کسی کو ایسا اشارہ کر دینا کہ وہ اس سے مطلوب چیز سمجھ لے۔ یہ اشارہ عربی زبان میں وحی کہلاتا ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام پر انتقالِ علم اتنا لطیف ہوتا ہے کہ عام انسان کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی اور اتنی جلدی ہوتا ہے کہ صرف انبیاء ہی اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس ذریعۂ علم کے لئے وحی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

وحی کا ایک دوسرا مفہوم کسی پتھر یا کسی دوسری چیز پر ایسا نقش ثبت کر دینا کہ جو مٹ نہ سکے، اس کو بھی وحی کہتے ہیں۔ لبید بن ربیعہ عامری جو مشہور شاعر ہیں۔ معلقات کے شاعروں میں آخری شاعر ہیں۔ ان کا شعر ہے:

فمدافع الريان عري رسمها

خلقا كما ضمن الوحي سلامها

منظر یہ بیان کر رہے ہیں کہ جس جگہ میرے جاننے والے ٹھہرے ہوئے تھے جب ان کا قافلہ روانہ ہوا تو ان کے آثار پر بھی گرد پڑ گئی اور وہ مٹ گئے۔ جب بارش ہونے کے بعد وہ گرد بیٹھ گئی تو وہ آثار دوبارہ نمایاں ہو گئے۔ اس طرح نمایاں ہو گئے جیسے پتھر پر کندہ کوئی تحریر مٹی میں چھپی ہو اور پھر بارش ہونے سے دوبارہ روشن ہو جائے۔ اسی طرح میرے محبوبوں کے آثار بھی نمایاں اور روشن ہو گئے۔ یہاں پر انہوں نے وحی کا لفظ اس نقش کے لئے استعمال کیا ہے جو پتھر پر ہو، نا قابلِ شکست ہو اور جس کو مٹایا نہ جا سکے۔

دلائلِ نبوت پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں سب سے قدیم اور مستند کتاب ابو نعیم اصفہانی کی ہے جنہوں نے پہلے دلائلِ نبوت کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہونے والی بشارتیں، آپ کے فضائل، قرآن مجید کی تاثیر سب کا ذکر کیا تھا۔ بعد میں ابو نعیم نے خود ہی اپنی کتاب کا خلاصہ لکھا جو دو جلدوں میں چھپا ہے۔ اس خلاصہ میں انہوں نے حضور کے ان فضائل کا تذکرہ کیا ہے جو قرآن پاک میں آئے ہیں۔ اور وہ خصائص بھی بیان کئے ہیں جو سیرت، آپ کے ارشادات، سابقہ آسمانی

کتابوں سے سامنے آتے ہیں۔

افسوس ہے کہ علامہ ابونعیم اصفہانی کی اصل اور ضخیم تر کتاب آج دستیاب نہیں ہے۔ آج اس کی یہ تلخیص ہی دستیاب ہے جو انہوں نے خود تیار کی تھی۔ یہ تلخیص بعض طلبہ کے کہنے پر تیار کی گئی جو غالباً یہ کتاب ان سے پڑھنا چاہتے تھے۔ کتاب میں ۳۵ ابواب یا فصلیں ہیں۔ شروع میں ایک بہت فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں انسانی نفسیات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ انسانوں میں چار قسم کی اخلاقی اور روحانی خوبیاں اور چار قسم کی کمزوریاں (فضائل اور آفات) پائی جاتی ہیں۔ عقل مند وہ ہے جو ان چاروں آفات سے پاک ہو۔

نبوت کی نفسیاتی اور روحانی تعبیر کرتے ہوئے علامہ ابونعیم نے لکھا ہے کہ نبی ان چاروں سے فضائل کے ہر اعتبار سے مزین اور چاروں آفات سے ہر اعتبار سے پاک ہوتا ہے۔

کتاب کے اہم مباحث میں قرآن مجید کے فضائل، آپؐ کا سردار انسانیت ہونا، کتب مقدسہ میں آپؐ کے تذکرے، آپؐ کے اخلاق عالیہ، آپؐ کی صفات فاضلہ، وحی نبوت، تاثیر قرآن اور آپؐ کے معجزات شامل ہیں۔

دلائل نبوت پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم مضمون سابقہ کتابوں میں آنے والی بشارتیں بھی ہیں۔ مختلف آسمانی کتابوں میں حضورﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں کس قسم کی بشارتیں بیان کی گئیں۔ کس انداز سے حضور کی تشریف آوری کو بیان کیا گیا۔ یہ مضمون شواہد نبوت کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

شواہد نبوت پر ہمارے برادر اور پڑوسی ملک افغانستان کے ایک بزرگ مولانا نورالدین جامی نے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ مولانا جامی عربی زبان کے مشہور ادیب، قرآن کے مفسر، محدث اور متکلم بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب شواہد النبوت میں اس موضوع پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے اور وہ سب صفات بیان کی ہیں جو حضورﷺ کی ذات مبارکہ میں پائی جاتی ہیں۔ مولانا جامی نے سات ابواب میں شواہد نبوت کو بیان کیا ہے۔ شواہد نبوت قبل ولادت، شواہد نبوت وقت ولادت، شواہد نبوت از بعثت تا ہجرت، شواہد نبوت از ہجرت تا وصال، شواہد نبوت بعد از وصال، شواہد نبوت بدست صحابہ کرام، شواہد نبوت بدست تابعین، تبع تابعین اور

صوفیائے کرام۔

مولانا جامی بہت بڑے شاعر اور ادیب بھی تھے، اس لئے ان کی کتاب ادبی اعتبار سے بھی بہت اونچے درجے کی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے معجزات بھی بیان کئے ہیں اور جہاں مناسب سمجھا ہے وہاں معجزہ کی تفصیل بھی دے دی ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود کتاب میں شامل بعض بیانات غیر مستند یا کم مستند ہیں۔ کتاب الحاقات سے بھی پاک معلوم نہیں ہوتی۔ فارسی میں لکھی جانے والی دوسری بہت سی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی کہیں کہیں الحاقات کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔

ان کے بعد سب سے آخری اور جامع ترین کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی خصائص کبریٰ ہے۔ اس میں انہوں نے معجزات کے بارے میں بہت سی معلومات جمع کی ہیں۔ علامہ سیوطی بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ ان کی کتابوں کا معیار خاصا بلند اور تحقیقی ہوتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کا یہ مزاج ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے محبت اور عقیدت میں بعض اوقات تحقیق کے دامن کو چھوڑ دیتا ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی بعض روایات کے بارے میں تحقیق نہیں کی ہے اور بعض ایسی روایات کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے جو علم حدیث، روایت و درایت اور تحقیق کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی ایک جلد میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، وہاں خصائص نبوت کا جو علامہ سیوطی کی تصنیف ہے، تفصیلی جائزہ لیا ہے اور جہاں جہاں علامہ سیوطی سے کمزور روایات بیان ہوئی ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ سیوطی کی یہ کتاب بعد کی کتابوں کا ماخذ رہی ہے۔ اردو اور فارسی میں جتنے میلاد نامے لکھے گئے ہیں ان میں بہت سی تفصیلات اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔

شواہد نبوت اور معجزات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں مختلف اصطلاحات استعمال ہوئیں۔ بینہ کی اصطلاح استعمال ہوئی جس کے معنی واضح دلیل اور نشانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی اسی مفہوم میں بینات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ولقد اتینا موسیٰ بینات، 'ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات'، ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا۔ آیت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی نشانی کے ہے۔ معجزہ کا لفظ بھی قرآن پاک میں براہ راست

نہیں لیکن بلاواسطہ طور پر استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک میں برہان اور دلیل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ بعض احادیث میں علامات، ورشواہد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن عام طور پر اسلامی ادب میں معجزہ کا لفظ مشہور ہے۔ اگرچہ قرآن پاک میں معجزہ کا لفظ خاص اس مفہوم کے لئے براہ راست استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی احادیث میں استعمال ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو جن جن حضرات نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے معجزات کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

سب سے بڑا معجزہ تو قرآن پاک ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے۔ آپ نے جب بھی اپنی نبوت کی تائید اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش فرمایا تو قرآن پاک ہی کو پیش فرمایا۔ یوں تو بہت سے معجزات آپ کے دست مبارک سے صادر ہوئے جن کی ابھی میں مثالیں بھی دیتا ہوں۔ لیکن ان میں سے کسی معجزہ کا بھی حضور نے کبھی چیلنج کے جواب میں پیش نہیں کیا۔ جب کسی طرف سے کوئی چیلنج دیا گیا اور آپ کی نبوت کی تصدیق مانگی گئی تو آپ نے قرآن پاک کو جواب میں پیش کیا۔ قرآن مجید میں کفار مکہ کا یہ اعتراض نقل ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے وقالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں کی گئیں"۔ اس کا جواب حضور پاک کی طرف سے قرآن مجید نے یہ دیا کہ "اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم" کیا ان کے لئے بطور نشانی کے یہ کافی نہیں کہ قرآن کی یہ آیات ان کے لئے تلاوت کی جا رہی ہیں۔ گویا قرآن کی آیات اور قرآن مجید کو حضور نے اپنی نبوت کے ثبوت اور معجزہ کے طور پر ہمیشہ پیش کیا۔ قرآن مجید کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ اس کے اعجاز کے کون کون سے پہلو ہیں۔ اس پر گزشتہ چودہ سو سال سے اہل علم غور کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کے اعجاز کے نئے نئے پہلو سامنے لا رہے ہیں۔ یہ بات علوم قرآن سے تعلق رکھتی ہے اس لئے میں اس کی مزید تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

دوسری چیز جو رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں بڑی نمایاں ہے اور خود قرآن پاک نے بیان کی ہے۔ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسراء کا معجزہ ہے۔ معجزہ معراج یا اسراء۔ قرآن پاک میں جس انداز سے سورۃ اسراء کی ابتداء میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جس کے ذریعہ بیان اور

عالیشان انداز سے اس کا آغاز ہوا ہے اس سے خود ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی غیر معمولی بات بیان فرمائی جا رہی ہے۔ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تا کہ ہم اپنی بڑی بڑی نشانیاں ان کو دکھائیں۔" بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جانا اور بڑی بڑی نشانیاں دکھانا اور وہ ذات جس کے بارے میں آغاز ہی میں کہا گیا کہ وہ بہت پاکیزہ اور مبارک ذات ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی خواب یا منام کی کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسی غیر معمولی چیز ہے جو دوسرے انسانوں کو پیش نہیں آئی۔ اگر یہ محض خواب ہوتا تو کفار مکہ کی طرف سے اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص خواب دیکھتا ہے اور کوئی بھی کسی کے خواب کی تردید نہیں کرتا کہ فلاں چیز دیکھی اور فلاں چیز نہیں دیکھی۔ صحابہ کرام میں جنہوں نے سب سے پہلے اس واقعہ کی تصدیق کی اس کی بنیاد پر ان کو صدیق کا لقب دیا گیا۔ خواب کی تصدیق پر صدیق کا لقب دیے جانے کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ واقعی یہ ہے کہ صدیق کے لقب کی معنویت اس وقت تک اس اہمیت کی حامل قرار نہیں دی جا سکتی جب تک کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی تصدیق عام انسانوں کے لئے آسان نہ ہو اور خالص ایمان و یقین کے بجائے محض عقل کی بنیاد پر جس کی تصدیق کی جا سکتی ہو۔

اسرا اور معراج کے علاوہ جس معجزہ کا ذکر قرآن اور احادیث میں آیا ہے وہ شق قمر کا معجزہ ہے۔ "اقتربت الساعة وانشق القمر" ان کے علاوہ جتنے معجزات بیان ہوئے ہیں وہ اکثر و بیشتر کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ جن میں بڑی تعداد میں کتب صحاح، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، سنن نسائی میں بیان کردہ معجزات کو استناد کا اونچا درجہ حاصل ہے۔ ان معجزات کی تعداد کیا ہے اور ان کی تفصیلات کیا ہیں اس پر سیرت نگاروں نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ حضور علیہ السلام کے معجزات کا اندازہ چند سو سے لے کر تین ہزار تک کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کو بطور مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی سوال کا ذکر ضروری ہے، جو متکلمین نے اٹھایا۔ وہ یہ ہے کہ معجزہ کا مقصد کیا ہے۔ اگر معجزہ کا مقصد یہ ہو کہ اس سے نبوت کی تائید اور ثبوت حاصل ہو اور معجزہ دیکھنے والوں کو نبوت کی صداقت کا یقین آ جائے تو یہ مقصد بہت کم پورا ہوا ہے۔

تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان نہیں لائے۔ ان کے برعکس بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لے آئے۔ حضرت خدیجہؓ کو حضور نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ جب پہلی مرتبہ آ کر بیان کیا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے۔ انہوں نے فوراً آپ کی نبوت اور صداقت پر ایمان کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کو بھی دین کی طرف بلایا اس نے کوئی نہ کوئی تامل ضرور کیا سوائے ابوبکر کے۔ جیسے ہی میں نے ان کو اسلام کے بارے میں بتایا انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا۔ بڑے بڑے صحابہ کرام میں سے شاید کسی نے بھی کوئی ثبوت یا معجزہ طلب نہیں کیا۔ لیکن جو لوگ معجزے طلب کرتے تھے اور جن کو معجزات دکھائے بھی گئے ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان ہوا ہو۔ ابولہب، ابوجہل، عبداللہ بن ابی اور بڑے بڑے سرداران قریش اور سرداران یہود۔

اس لئے معجزہ کے حوالہ سے متکلمین نے تین نوعیت کے انسانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ انسان تو وہ ہوتے ہیں جو ہر نبی کے ساتھیوں میں سابقون الاولون میں شمار ہوتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعید روح، سلیم عقل و طبیعت لے کر آتے ہیں اور وہ نبی کی شخصیت اور کردار کو ہی اصل معجزہ سمجھتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ نبی کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کا اندازہ کر سکیں۔ اس کے کردار اور شخصیت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ شخص غلط بیانی نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ اس نے کیا ہے یہ صداقت اور حق پر مبنی ہے۔ اس لئے جوں ہی وہ اس کے منہ سے پیغام نبوت کو سنتے ہیں تو وہ فوراً دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ دراصل نبوت کا ادراک کرنے کا واحد اور حقیقی راستہ ذوق سلیم اور فطرت سلیمہ ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اندر سے نفرت اور دشمنی کا ایک ذخیرہ رکھتے ہیں اور ان کو چاہے ہزار معجزات دکھائے جائیں وہ نبوت کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔ کسی ذاتی مفاد، تعصب یا کسی بھی وجہ سے ان کے لئے معجزہ کا ہونا نہ ہونا بے کار ہے۔

ان دونوں کے علاوہ انسانوں کا ایک طبقہ اور ہوتا ہے اور یہ تعداد میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ متامل اور متردد ہوتے ہیں اور معجزہ دیکھنے کے بعد ان کی آنکھ پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جاتا ہے

چاہے اور جہاں چاہے معجزہ تخلیق کر کے دکھا دے، یہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ذات پر ظاہر کر دیتا ہے۔ معجزہ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، پیغمبر نہیں ہے۔ پیغمبر اس کا مظہر، ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

قرآن پاک کے اندر کچھ ایسے پہلو ہیں جن کی وجہ سے اس کو ہمیشہ معجزہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ماضی کے بعض واقعات بیان ہوئے ہیں جو قبل از یں رسول اللہ ﷺ کے علم میں نہیں تھے۔ ذالک من انباء الغیب نوحیه الیک، سابقہ مذاہب اور انبیا کی بہت سی تفصیلات پہلے سے حضور کے علم میں نہیں تھیں۔ کفار مکہ اور قریش میں بھی معروف نہیں تھیں۔ جہاں قرآن میں ایسی چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے تو ساتھ میں یہ بھی یاد دلایا گیا ہے کہ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں۔ آئندہ آنے والے بعض واقعات کی خبریں قرآن پاک میں دی گئی ہیں، جو قرآن پاک میں دی گئی پیش گوئی کے مطابق واقع ہوئے۔ مثلاً رومیوں کی کامیابی کی خبر ایک مشہور خبر ہے۔

شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں جو کامل شریعت رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں جس کا مبنی بر عقل ہونا، مکمل ہونا اور زندگی کے ہر پہلو کے لئے رہنما خطوط فراہم کرنا یہ خود اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ ایک دوسرے مصنف نے لکھا ہے کہ یوں تو پوری شریعت ایک معجزہ ہے لیکن شریعت کا قانون میراث ایک ایسا معجزہ ہے جس کی مثال خود احکام شریعت میں بھی نہیں ملتی۔ قرآن پاک کی صرف تین آیتوں میں چند بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان بنیادی اور اساسی احکام کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے اتنے تفصیلی احکام مرتب بیان کئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہمارے بزرگ دوست جناب ملک بشیر احمد بگوی صاحب یہاں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کمپیوٹر پر قانون میراث کو فیڈ کیا ہے۔ چند سال پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کوئی ایک کروڑ ممکنہ صورتیں سوچ سوچ کر کمپیوٹر میں فیڈ کر دی ہیں اور ان میں سے ہر صورت کا جواب کمپیوٹر میں موجود ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی ان تین آیات سے نکلنے والے احکام کو جب کمپیوٹر کے ذریعے شمار کیا تو لاکھوں کروڑوں مسائل کا حل ان تین آیات سے ان کے سامنے آیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت جس کو بجا طور پر شاہ ولی اللہ نے معجزہ قرار دیا ہے فی الواقع اپنے اندر غیر معمولی اعجازی پہلو رکھتی ہے۔ یہ وہ معجزات ہیں جن کو عقلی یا علمی معجزات کہا جاتا ہے۔

حسی معجزات ہیں۔ ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والے معجزات۔ ان کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں نے بہت سی باتیں کی ہیں۔ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں ایک ہزار معجزات کی تفصیل بیان کی ہے۔ امام بیہقی بھی ایک ہزار معجزات کے قائل ہیں۔ امام نووی نے ان معجزات کی تعداد ۱۲ سو قرار دی ہے۔ بعض نے تین ہزار کسی نے ساڑھے تین ہزار کی تعداد بتائی ہے۔ یہ وہ واقعات اور معجزات ہیں جن کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔ ان میں سے بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن کے معجزہ ہونے یا نہ ہونے میں علمائے سیرت کے مابین اختلاف ہے۔ ایک واقعہ ایک خاص انداز سے پیش آیا۔ کسی محقق نے اس کو معجزہ سمجھا، دوسرے سیرت نگار نے اور نظر سے دیکھا تو اس کو عام واقعہ سمجھتے ہوئے معجزہ قرار نہیں دیا۔ اسی وجہ سے تعداد میں کمی بیشی ہو گئی ہے۔ ان میں سے چند معجزات کا میں بطور نمونہ ذکر کرنا چاہوں گا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک بڑا معجزہ جس کو سب نے بار بار دیکھا اور محسوس کیا اور مختلف واقعات اور مواقع پر سامنے آیا وہ آپ کا مستجاب الدعا ہونا تھا۔ آپ جو بات کہتے تھے وہ اسی طرح پوری ہو جاتی تھی۔ یہ بات نہ صرف صحابہ کرام بلکہ خود دشمن کے علم میں بھی تھی۔ مخالفین میں مشہور سردار قریش عتبہ بن ولید ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کفار مکہ کی طرف سے بات کرنے کے لئے آیا۔ وہ کفار مکہ کی طرف سے حضور سے کوئی معاملہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے اپنی پوری بات کہہ دی تو حضور نے جواب دیا کہ چچا! آپ کو جو کہنا تھا کیا آپ وہ کہہ چکے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں کہہ چکا۔ اس کے جواب میں آپ نے سورۃ حم السجدہ پڑھنا شروع کی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس سورت میں جب یہ آیت آئی کہ فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود 'اگر یہ لوگ ماننے سے انکار کریں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں جس سے عاد و ثمود کو تباہ کیا گیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ عتبہ نے حضور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ بھتیجے ایسا نہ کہو۔ تم جو کہتے ہو وہ ہو جاتا ہے۔ اپنی قوم کا برا نہ چاہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ حضور مستجاب الدعوات ہیں اور آپ کی زبان مبارک سے جو بات نکلتی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس کی درجنوں مثالیں سیرت اور احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مختلف حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے تو کسی نے آپ کے نامۂ مبارک کو احترام کے ساتھ وصول کیا۔ کسی نے جواب احترام کا خط لکھا۔ سب سے زیادہ بدبخت شخص ایران کا کسریٰ خسرو پرویز تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑ کر پھینک دیا اور جو صحابی اس کے دربار میں خط لے کر گئے تھے ان کو منافی آداب کے برخلاف اپنے دربار سے نکال دیا۔ انہوں نے آکر حضور کو رپورٹ دی کہ میں نے خط دیا تو اس نے آپ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک طرف پھینک دیا اور بہت گستاخی سے پیش آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے اللہ! اس کو بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ پھر دنیا نے حضور کی بد دعا پوری ہوتے دیکھی۔ جلد ہی اس کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا۔ بیٹے کو بھی لوگوں نے قتل کر دیا اور بیٹی کو تخت پر بٹھا دیا۔ حضور کی وفات تک پے در پے ایران کے حکمران بدلتے رہے اور آپ کے جانشینوں نے تقریباً دس سال کے قلیل عرصہ میں کسریٰ کی سلطنت کو ختم کر دیا اور اس کی ریاست سلطنت اسلامیہ کا حصہ بن گئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو سب سامان مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ مدینہ آئے تو خالی ہاتھ تھے اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ حضور نے ان کو ایک انصاری صحابی کا بھائی بنا دیا۔ انصاری بھائی نے ان سے کہا کہ میری آدھی زمین، آدھا گھر، سب کچھ حاضر ہے۔ اس میں سے اپنا حصہ لے لیں۔ میری دو بیویاں ہیں، آپ جس کو چاہیں اس کو میں طلاق دے دیتا ہوں۔ عدت گزرنے پر اس سے آپ نکاح کر لیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیں۔ پھر حضور سے جا کر عرض کیا کہ میں کاروبار اور تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ! عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت میں برکت عطا فرما۔ اس دعا کا انتہائی غیر معمولی اثر ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجارت میں اتنی برکت ہوئی کہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی جگہ سے پتھر بھی ہٹاتا تو یہ گمان ہوتا کہ اب یہاں سے سونا برآمد ہو جائے گا۔ چند سال کے اندر اندر ان کا شمار مدینہ منورہ کے دولت مند ترین انسانوں میں ہونے لگا۔ صحابہ کرام اپنے پیسے ان کو دیتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ہماری دولت بھی اپنے کاروبار میں لگا دیں۔ اس لئے کہ جو فائدہ اور جو نفع آپ کے کاروبار میں ہوتا ہے اتنا نفع کسی اور کے کاروبار میں نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس جب اسلام قبول کر کے حضور کے پاس آئے تو ان کی عمر ۱۳ سال تھی۔ تین سال حضور کی معیت میں رہے۔ سولہ سال کے تھے جب حضور دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کے لئے حضور نے دعا فرمائی تھی کہ اللھم علمہ التاویل، اے اللہ ان کو قرآن کا علم سکھا، وفقھہ فی الدین، اور ان کو دین میں سمجھ عطا فرما۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ خود بڑے بڑے صحابہ کرام ان سے رہنمائی اور مشورہ لیا کرتے تھے۔ آج قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت اور کلام، عقیدہ، عربی ادب، عربی زبان کی نزاکتیں، غرض اس زمانے کے علوم وفنون میں کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس سند کی حیثیت نہ رکھتے ہوں اور ان کے اقوال وارشادات اس زمانے کے علوم وفنون کی ہر کتاب میں موجود نہ ہوں۔

ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ، مدینہ منورہ میں بارش نہیں ہوئی اور ہمارے سارے کھیت اور باغات سوکھ رہے ہیں۔ مدینہ بارانی علاقہ ہے۔ یہاں کوئی دریا نہیں ہے، دو ایک برساتی نالے ہیں۔ بارش ہو جائے تو ان میں پانی آتا ہے ورنہ سوکھے پڑے رہتے ہیں۔ سارا دارومدار ایک حد تک تو کنووں پر ہوتا تھا، جو خاصا گراں بھی تھا اور محدود بھی۔ بیشتر دارومدار بارش پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن بارش نہیں ہوئی۔ حضور اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے خطبہ کے دوران دعا کی۔ صحابہ کہتے ہیں کہ مدینہ کے آس پاس بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن حضور نے ابھی دعا ختم نہیں کی تھی کہ بادل آ گئے اور اتنی کثرت سے برسنے لگے کہ لوگ نماز سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ سارا مدینہ جل تھل ہو گیا۔ اسی صحابیؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ! اتنی بارش میں تو ہمارے درخت ضائع ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اللھم حوالینا ولا علینا، اے اللہ ہمارے چاروں طرف برسا، ہمارے اوپر نہ برسا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نکلے تو دیکھا کہ مدینے کا آسمان صاف ہو گیا ہے۔ اور چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ نالوں میں پانی بہہ رہا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے بہت سی پیشن گوئیاں بھی جاری ہوئیں۔ ان میں قرآن پاک میں سورۃ روم کی پیشن گوئی تو الگ حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن حضورؐ نے روم وفارس کی فتح کی بھی پیشن گوئی فرمائی۔ جس زمانے میں حضور نے یہ پیشین گوئی فرمائی

تھی یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان مدینے کے اندر بھی محفوظ نہیں تھے۔ خود منافقین نے طعنہ دیا تھا کہ
اپنے گھر میں تو ڈر لگتا ہے، اتنی بڑی باتیں ہیں اور خبر دے رہے ہیں قیصر و کسریٰ کی۔ اس وقت حضور
نے غزوۂ خندق کے دوران یہ پیشین گوئی بھی فرمائی تھی کہ: اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده
واذا هلك كسرى فلا كسرى بعده۔ جب یہ قیصر ہلاک ہو جائے گا تو کوئی قیصر اس
کی جگہ نہیں لے گا اور جب یہ کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو کوئی کسریٰ اس کے بعد نہیں
ہوگا۔ چنانچہ آج تک رومیوں کے عرب مقبوضات میں قیصر اور ایران میں کوئی کسریٰ نہیں آیا اور
یہ دونوں علاقے سو فیصد مسلمان ہو گئے ہیں۔

حضور نے استنبول کی فتح کی پیشین گوئی کی تھی۔ اس زمانے میں ترکی کو روم اور وہاں کے
فرمانروا کو قیصر کہا کرتے تھے۔ آپ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ: لتفتحن مدينة قيصر،
مسند امام احمد میں ہے کہ تم قیصر کے دار الحکومت کو ضرور فتح کرو گے۔ ولنعم الامير اميرها
ولنعم الجيش ذالك الجيش، وہ سردار کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا اور وہ لشکر کتنا
اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا۔ یہ پیشین گوئی بالآخر پوری ہوئی اور 1453ء میں سلطان محمد
فاتح کے ہاتھوں استنبول فتح ہوا۔ مجھے نہیں معلوم سلطان محمد فاتح کی کیفیت کیا ہوئی ہوگی جب
ان کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ حضور نے ان کو بہترین امیر اور ان کے لشکر کو بہترین لشکر قرار دیا تھا۔

جب سلطان محمد فاتح سے کہا گیا کہ آپ وہ بہترین امیر ہیں جن کے بارے میں
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیشین گوئی کی تھی تو محمد الفاتح نے انتہائی تواضع سے جواب دیا کہ
نہیں میں وہ بہترین امیر نہیں ہوں۔ بہترین امیر تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہیں جو مسلمانوں کی
پہلی فوج کے ساتھ یہاں آئے تھے اور یہیں انتقال فرما گئے تھے۔ اور جن کا مزار یہاں موجود
ہے۔ سلطان محمد فاتح نے حضرت ابو ایوب کے مزار پر جا کر حاضری دی اور ان کو فاتح استنبول
قرار دیا۔ جس علاقے میں حضرت ابو ایوب انصاری کا مزار ہے اس کو استنبول میں فاتح کہتے
ہیں۔ وہ استنبول میں حضرت ابو ایوب انصاری کو سلطان ایوب کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل
حکمران تو یہ ہیں جنہوں نے استنبول فتح کیا تھا۔

ایک جدید سیرت نگار نے بہت خوب لکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی
نبوت کی گواہی نباتات، جمادات، حیوانات، کائنات اور سیارگانِ فلک نے بھی دی۔ پھر ایک

ایک ترتیب کے ذہنوں نے معجزات کو اس کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے تو حضرت علی نے کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ فلاں چٹان کے قریب یہ واقعہ ہوا۔ آپؐ نے کہا کہ ہاں میں اس چٹان کو جانتا ہوں نبوت سے پہلے وہ مجھے سلام کیا کرتی تھی۔ جب میں گزرتا تھا تو اس چٹان سے آواز آتی تھی کہ السلام علیک یا محمد۔ یہ صحیح بخاری میں ہے اور کئی جگہ ہے۔

اسطوانہ حنانہ کی روایت سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ ستون آج بھی مسجد نبوی میں موجود ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ استوانہ حنانہ۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آغاز میں ایک خاص ستون سے حضور ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب منبر بن گیا اور حضور منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس ستون سے رونے کی آواز آئی۔ جیسے کوئی بچہ بلک کر روتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے جا کر اس کو تسلی دی اور وہ ستون ایسے خاموش ہو گیا جیسے بچہ بلک کر رو رہا ہو اور کوئی اس کو دلاسہ دے کر چپ کرا دے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ جبل احد پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق بھی تھے۔ میں نے بھی وہ جگہ ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب کی معیت میں دیکھی ہے۔ وہ پتھر بھی موجود ہے جس پر حضور تشریف فرما تھے۔ دونوں صحابہ بھی ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو دیکھا کہ جبل احد تھوڑا سا ہلا۔ اب بھی اس میں زلزلے کے آثار موجود ہیں۔ جب پہاڑ ہلنے لگا تو آپؐ نے قدم مبارک زمین پر مار کر کہا کہ ٹھیر جا تجھ پر ایک نبی ایک صدیق اور ایک شہید کھڑے ہیں۔ یہ حضرت عمر فاروق کی شہادت کی خبر بھی ہے۔ حضور نے بات ختم کی تو پہاڑ ٹھیر گیا۔

ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی سفر سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں ایک بدو ملا۔ اس کو حضور نے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ آپ اپنی نبوت کا کوئی ثبوت دے سکتے ہیں؟ حضور نے پوچھا کہ کیا ثبوت چاہئے۔ بدو نے پوچھا کہ کیا یہ درخت آپ کی نبوت کی گواہی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں۔ درخت کو بلا کر کہا کہ ادھر آؤ۔ درخت حرکت کر کے قریب آیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اللہ کے حضور سجدہ کرو۔ وہ سجدہ ریز ہو گیا۔ آپ نے کہا کہ اب واپس جاؤ۔ درخت اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ بدو کی اسلام سے

اصحاب صفہ جن کی تعداد ستر کے قریب ہوا کرتی تھی۔ اکثر وبیشتر ان کے پاس اپنے وسائل نہیں ہوا کرتے تھے۔ صحابہ کرام ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ کوئی کسی کے ساتھ اور کوئی کسی اور صحابی کے ساتھ چلا جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی دن سے وقفہ ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ اصحاب صفہ ضرورت مند تھے خود رسول اللہ ﷺ بھی ضرورت مند تھے اور آپ کے گھر میں بھی کھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک صحابی دودھ کا ایک پیالہ لے کر آئے۔ حضرت ابوہریرہؓ موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ میں کئی روز کے فاقے سے تھا۔ دودھ کا پیالہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ اصحاب صفہ کو بلا کر لے آؤ۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا مجھے کیا ملے گا۔ اصحاب صفہ کو بلا کر لے آئے۔ وہ ستر آدمی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ایک کو دودھ پلانا شروع کر دو۔ چنانچہ پیالہ ایک آدمی کو دے دیا گیا۔ اس نے پی کر دوسرے کو، اس نے تیسرے کو دیا اور اس طرح ستر کے ستر آدمی سیر ہو گئے۔ پھر حضور نے مسکرا کر حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا "بقیت انا وانت" "میں اور تم رہ گئے"۔ پھر حضرت ابوہریرہ سے فرمایا تم پیو۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے پیا تو آپ نے فرمایا کہ اور پیو۔ جب میں مزید پی چکا تو گنجائش نہیں رہی اور اصرار نہ کر مزید گنجائش نہیں ہے تو حضور نے فرمایا کہ اب مجھے دے دو۔ پھر سب کا بچا ہوا خود نوش فرما لیا۔

حضور ﷺ غزوہ خندق میں تھے۔ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے۔ پیٹ اتنا دب گیا ہے کہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے چار انچ پتھر پیٹ پر باندھ لیا ہے۔ حضور نے شکم مبارک دکھایا۔ وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ایک دوسرے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ جلدی سے اپنے گھر گئے۔ گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا اس کو ذبح کر کے بیوی سے کہا کہ جلدی سے کھانا پکاؤ۔ میں رسول اللہ ﷺ کو لے کر آتا ہوں۔

حضرت جابر نے جب حضورؐ کو کھانے کی دعوت دی تو آپؐ نے وہاں موجود سب لوگوں سے کہا کہ چلو جابر کے ہاں دعوت ہے۔ اسی آدمی حضور کے ساتھ تھے۔ حضرت جابر پریشانی میں بیگم کے پاس گئے اور کہا کہ حضور کے ساتھ تو اسی آدمی ہیں۔ بیگم نے پوچھا کہ کیا آپ نے بتا دیا تھا کہ کتنا بندوبست ہے۔ حضرت جابر نے جواب دیا کہ میں نے تو کچھ بتایا تھا

کہ بکری کا ایک بچہ ذبح کیا ہے۔ جیسا کہ کہا کہ جب تم نے کہہ دیا ہے تو باقی ذمہ داری حضورؐ کی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب تشریف لائے تو فرمایا کہ سالن کو ڈھک دینا اور تھوڑی مقدار میں سالن نکالتی جاؤ اور روٹیاں پکاتی جاؤ اور ایک ایک کر کے دیتی جاؤ۔ بس دس آدمیوں کی ٹولی اندر آتی، کھانا کھاتی اور چلی جاتی۔ پھر دس مزید آتے۔ ایک اور خاتون بھی روٹیاں پکانے کے لئے آ گئیں۔ دونوں خواتین جلدی جلدی روٹیاں پکاتی گئیں اور ڈھکے ہوئے برتن سے سالن نکال کر دیتی رہیں اور جب تمام آدمی سیر ہو گئے تو آخر میں رسول اللہ ﷺ نے گھر کے افراد کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت انسؓ کے والد ابو طلحہؓ کے ساتھ پیش آیا۔ انہوں نے بھی چند لوگوں کے کھانے کا بندوبست کیا تھا جو بعد میں ستر اسی افراد کے لئے بخوبی کافی ہو گیا۔

غزوہ خندق کے علاوہ بھی مختلف غزوات میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اگر ان میں سے چیدہ چیدہ واقعات بھی بیان کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جو صحاح ستہ کی عام کتابوں میں موجود ہیں۔ باقی تفصیلات میں چھوڑ دیتا ہوں۔

ایک اور چیز جو کلامیاتِ سیرت سے تعلق رکھتی ہے اس کی طرف علامہ شبلی نے اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ پہلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علم کلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن آج بہت سے مسائل جو دراصل تاریخ کے ہیں، لیکن اب ان کا تعلق علم کلام سے بھی ہو گیا ہے، کیونکہ لوگوں نے ان کے بارے میں شکوک اور تامل کا اظہار کیا۔ اس پر بحثیں شروع ہو گئیں اور یوں وہ تاریخ کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ علم کلام کا بھی مسئلہ بن گیا۔ آج کل اہل مغرب اور ان کے مشرقی تلامذہ جن چیزوں پر کم تر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ زیادہ اعتراض حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت مبارک، آپ کے اخلاق وعادات، آپ کے خاندان پر کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کی دوسری باتوں پہ اعتراضات کئے جاتے ہیں جن کا جواب مسلمان علماء نے بار بار دیا ہے۔ ان کے جواب پہ اعتراضات ہوئے، ان کے اعتراضات کے جواب الجواب دیئے گئے اور اسی طرح یہ بحث جاری رہی اور آئندہ بھی نہ معلوم کب تک جاری رہے گی۔ اس طرح بہت سے ایسے امور جو

دراصل کلامیات کے مسائل نہیں تھے لیکن کسی بحث مباحثہ کی وجہ سے وہ کلامی مباحث بن گئے۔

کچھ کلامی مسائل ایسے تھے کہ جو دراصل کلامی نہیں تھے لیکن مسلمانوں میں بعض موضوعات پر بحث مباحثہ کی وجہ سے وہ معرکۃ الآراء کلامی مسئلہ بن گئے۔ مثلاً حضرت ابوطالب اسلام لائے تھے یا نہیں۔ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے۔ عبدالمطلب جن کا اسلام سے پہلے انتقال ہوگیا ان کی حیثیت کیا ہے۔ ویسے تو یہ سوال ہم میں سے کسی سے بھی قیامت کے دن نہیں پوچھا جائے گا کہ ہاشم اور عبدمناف وغیرہ کا رویہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو لوگ حیات رہے، کس عقیدہ پر رہے، کس مذہب پر تھے، ہم نہیں جانتے۔ یہ ان لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا۔ اس پر بحثیں شروع ہوئیں۔ اس پر دلائل اور جوابی دلائل پیش کئے گئے۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی کلامیات کا ایک تنازعہ اور مسئلہ بن گیا۔ حضرت ابوطالب کے معاملہ میں فرقہ وارانہ رنگ بھی پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اصرار کیا کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ دوسرے گروہ نے اصرار کیا کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ محض تاریخ کا مسئلہ ہے اور اللہ تعالیٰ اور ان کے بندے کے درمیان ہے۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا ہو، جس طرح کہ ہم سب کا دل چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو، تو میری اور آپ کی دینی ذمہ داری پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر وہ رائے صحیح ہے کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا تو بھی ہماری ذمہ داریاں وہی رہیں گی جو اب ہیں۔ لیکن بہرحال یہ مسئلہ متنازعہ قرار پایا اور اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئیں۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے والدین کا معاملہ ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ صحابیت کے مقام پر فائز ہوئے اور پھر دوبارہ فوت ہو گئے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ بشرطیکہ ایسا ہونا مسلمانوں کی قابل قبول روایات کے مطابق ثابت ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عمومی مشیت اور سنت (چند مستثنیات اور معجزات کو چھوڑ کر) کسی کو زندہ کرنے کی نہیں رہی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ بات بہت کثرت سے مشہور اور معروف ہوتی۔ مستند احادیث میں

آئی ہوئی۔ غیر مستند احادیث میں نہ آئی ہوتی۔ بہرحال بعض غیر معیاری اور غیر مستند یا ثانوی ماخذ میں موجود اس بات پر بعض حضرات نے کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی بھی اس کے قائل ہیں اور انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

یہ اور اس طرح کے کئی مسائل بنیادی طور پر تاریخی مسائل تھے۔ لیکن بعض اسباب کی بنا پر وہ تاریخی مسائل نہیں رہے۔ کلامی مسائل بن گئے۔ کچھ اور مسائل ایسے ہیں جو ایک اعتبار سے فقہی مسئلہ تھے۔ لیکن ایک دوسرے اعتبار سے وہ کلامی مسئلہ قرار دیا گئے۔ خاص طور پر مغربی مستشرقین نے ایسے چند مسائل کو بہت اچھالا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعداد کا ہے۔ اسلام سے پہلے تعدد ازدواج پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں تھیں۔ بائبل ہی میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں۔ اسی طرح سے مختلف انبیا کی ازواج کی تعداد کے بارے میں بائبل میں آیا ہے۔ ایک ہزار اور تین ہزار اور چار پانچ سو تک کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بائبل کی حد تک تعدد ازدواج کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہوں نے اپنی دنیوی زندگی کے پہلے دور میں شادی نہیں کی تھی، دوبارہ تشریف لا کر لاتعداد شادیاں کریں گے۔ عیسائی خیال کے مطابق یہ تمام عورات ان کی اعزازی بیویاں ہیں۔ نن اس انتظار میں تیار رہتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو یہ ان کی بیوی بن جائے۔ تو ان ہزاروں لاکھوں راہباؤں کو عیسائی نظری طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیویاں سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض سابقہ مذاہب کے پیروکاروں کو تو زیب نہیں دیتا۔ لیکن بہرحال انہوں نے اعتراض کیا۔

ان اعتراضات کا جواب عام طور پر علمائے کرام یہ دیتے چلے آئے ہیں کہ یہ خصائص نبوت میں سے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خاص اجازت دی۔ لیکن خاص اجازت کیوں دی، یہ سوال پھر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاص اجازت کی بات ایک صاحب ایمان مسلمان کے لئے تو قابل قبول ہو سکتی ہے، غیر مسلم پھر بھی اعتراض کرے گا۔ جو شخص حضور کو نبی ہی نہیں مانتا وہ تو قرآن میں اجازت ہونے یا نہ ہونے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے دو باتیں پیش نظر

دوسرا کی منزل میں رکھا ہے۔ اس میں بھی قرآن حکیم نے فرمایا کہ آپ کوئی ردوبدل کرنا چاہیں تو
نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ لا یحل لک النساء من بعد۔ اس کے بعد آپ کے
لیے کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ گویا وہ پابندی جو بقیہ لوگوں پر عائد تھی
ایک اعتبار سے حضور پر بھی عائد ہو گئی۔ ورنہ ازواج مطہرات اس وقت حیات تھیں وہ عقد
نکاح میں رہیں۔ ان سے جو کسی یہ انتظام کر دیا گیا کہ پہلے حضور نے ان کو پیشکش کی کہ تم
چاہو تو میں تم کو مال و دولت دے کر رخصت کر دوں۔ یہ بھی سورہ احزاب میں ہے۔ ظاہر ہے کوئی
خاتون اس شرف کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ پھر حکم دیا گیا کہ اب تم اپنا حق چھوڑنے کو تیار
ہیں۔ لیکن آپ انہیں زوجیت کے اس شرف سے محروم نہ کریں۔ حضرت سودہ کا نام نامی
ان میں آتا ہے۔ ایک طرح کا انتظام حضور نے جو لیا کہ ازواج مطہرات میں چار حضور کے
ساتھ دوسری منزل میں رہیں اور بقیہ پانچ اسی کی منزل میں رہیں۔ یہ ایک بحث ہے جو بعض
حضرات نے کی ہے۔ اس کا تعلق کلامیات سے ہے وہ اس پر دو قطعی رائے دینا بہت مشکل
ہے۔ معاملات کی غیر معمولی شخصیت کا اور اتنا نازک ہے کہ اس پر بات کرنا آسان کام نہیں
ہے۔ میں نے بطور مثال صرف اس لیے عرض کیا کہ یہ مسائل بھی کلامیات سیرت میں شامل
تھے جن کا براہ راست سیرت سے تعلق ہے۔

ایک اور چھوٹی سی بات عرض کر کے میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ یہ بھی ایک رائے ہے جو
امام جعفر صادق سے منسوب ہے۔ حضرت امام جعفر صادق بہت بڑے فقیہ تھے، اہل بیت میں
سے تھے۔ قرآن پاک میں جو آیت ہے کہ سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد
الحرام الی المسجد الاقصی۔ کہ پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام
سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔ مسجد اقصیٰ کے بارے میں صحابہ کرام سمیت غالب اکثریت کا
نقطہ نظر عام طور پر یہی ہے کہ مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس اور یروشلم کی مسجد مراد ہے۔ امام جعفر
صادق سے البتہ یہ بات منسوب ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے بیت المعمور مراد ہے۔ یعنی
آسمان والی مسجد۔ بعض حضرات نے اس بات کی تائید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ظاہر سے اندازہ
ہوتا ہے کہ واقعی یہ بات درست ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک ایک بہت جامع اور عمیق
کتاب ہے اور کلام الٰہی کا ایک تقاضا اور خوبی یہ بھی ہے کہ اگر دو کاموں کا ذکر ہوا ہو اس

مشترک مضامین ہیں۔ سیرت کو سمجھنے کے لئے یہاں علم کلام کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور علم کلام کے اس پہلو کو سمجھنے کے لئے سیرت کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ سیرت پر گفتگو کے اس سلسلہ میں اس موضوع پر بھی ضروری گزارشات پیش کی جائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

— ☆ —

سوال وجواب

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ایک
زمانہ ایسا آئے گا جس میں مسلمان ستر سے زائد فرقوں میں
تقسیم ہوں گے۔ اگر واقعی اسی طرح ہے اور یہی ہونا ہے تو
ہمیں فرقوں کو ختم کرنے کی کاوشوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

جس حدیث میں یہ بات آئی ہے اس کی فنی حیثیت کے بارے میں بہت باتیں ہوئی
ہیں۔ ان بحثوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک چیز یاد رکھنے کی ہے کہ عربی زبان میں ستر کا لفظ
کثرت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یہاں ستر سے مراد ستر کا عدد نہیں، بلکہ کثرت تعداد
مراد ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ میری امت میں بہت سے فرقے ہوں گے۔ اس کا یہ مطلب
نہیں کہ میری امت میں لازماً ستر فرقے ہوں گے۔ بیان یہ کیا گیا ہے کہ طرح طرح کی
گمراہیاں پیدا کرنے والے آئیں گے۔ تم لوگ میرے طریقے پر قائم رہنا۔ اسی حدیث میں
یہ بھی ہے کہ ما انا علیہ واصحابی۔ کہ ان تمام گمراہیوں کے سیلاب میں میرا اور میرے
صحابہ کا طریقہ ہی حق کا محفوظ راستہ ہوگا۔ اسی روایت کے مطابق صحابہ نے پوچھا کہ ان حالات
میں ہمیں کیا کرنا چاہئے، تو آپ نے فرمایا کہ میں اور میرے صحابہ جس طریقے پر ہیں تم اس
پر قائم رہنا۔ حضور اور حضور کے صحابہ کے طریقے پر جو رہے گا تو وہ کامیاب رہے گا۔ اس کے یہ
معنی نہیں ہیں کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی
کوشش ضرور ہونی چاہئے۔

☆

رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات جو مسلمانوں کی مائیں
قرار دی گئیں، تو کیا ان کا اصحاب کرام سے پردہ کرنا لازم

نہیں تھا؟

ازواج مطہرات کے لئے پردہ ذرا سخت تھا۔ ازواج مطہرات کو پردے کا حکم تھا۔ قرآن مجید میں سخت پردے کا جو حکم ہے وہ براہ راست ازواج مطہرات ہی کے لئے تھا۔ بعض فقہا کا یہ کہنا ہے کہ پردے کے احکام ازواج مطہرات کے لئے نسبتاً زیادہ سخت تھے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت یا روایت نہیں رہی، جب کہ قرآن میں ہے کہ ثم بعثناکم من بعد موتکم

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یقیناً بطور معجزہ کے مردے زندہ ہوتے رہے ہیں۔ میری مراد یہ تھی کہ چونکہ عام معمول اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے اس لئے اگر ایسا ہو چکا ہوتا تو بہت کثرت سے اس کو روایت اور نقل کیا گیا ہوتا۔ چونکہ حضورؐ کے والدین کا دوبارہ زندہ کیا جانا کثرت سے نقل نہیں کیا گیا۔ بعض کمزور اور انفرادی روایتوں میں آیا ہے اس لئے بہت سے محدثین حدیث کی نظر میں وہ محل نظر ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتے یا نعوذ باللہ ایسا نہیں کرسکتے۔ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیرؑ کو زندہ کیا، اصحاب کہف کو زندہ کیا۔ لیکن قرآن پاک میں آ جانے کی وجہ سے یہ واقعات قطعی طور سے اور یقین کے ساتھ مشہور ہیں، اتنے یقین سے وہ واقعات مشہور نہیں ہیں۔

☆

آپ کی بعثت کے وقت دنیا میں کتنے ادیان تھے اور دین ابراہیمی کا کیا مقام تھا؟ قریش میں عبداللہ کا نام کثرت سے ملتا ہے یہاں اللہ سے کیا مراد تھی؟

قریش کے اکثر لوگ دین ابراہیمی کے قائل تھے اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر

برصغیر پاک و ہند میں نبی ﷺ کے علم کے بارے میں بحث
رہی ہے۔ کیا کسی ذاتی کا یہ منصب اور حیثیت ہو سکتی ہے کہ وہ
کہے کہ حضورؐ کو دیوار کے آگے کا علم ہے، پیچھے کا نہیں؟

کم سے کم میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حضور علیہ السلام کے علم کا وزن کرکے اس کی مقدار بیان کرسکوں۔ حضورؐ کا علم بہت وسیع اور غیر معمولی تھا۔ تمام انسانوں سے زیادہ تھا۔ تمام انبیاء کے علم سے بڑھ کر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین اور آخرین کا علم دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں حضورؐ کا علم بہرحال بہت محدود تھا۔ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود، بے نہایت یقینی اور قطعی ہے۔ حضورؐ کو جو علم زیادہ اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود علم الٰہی کے مقابلہ میں محدود علم تھا۔ اس لئے جب اللہ اور اس کے رسول کے علم کا تقابل ہوگا (جو میری ناچیز رائے میں ایک غیر ضروری اور بے فائدہ مشغلہ ہے) تو اور بات کہی جائے گی اور جب حضورؐ کے علم کا موازنہ بقیہ انسانوں کے علم سے ہوگا (جو کوئی فضول شخص ہی کرے گا) تو پھر یہی کہا جائے گا کہ حضورؐ کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

☆

جو امور صرف نبی کی ذات سے متعلق تھے وہ قرآن پاک میں
کیوں ذکر کیے گئے؟

اس لئے ذکر کیے گئے کہ اگر نبی کو اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے کسی خاص امتیاز کی ضرورت ہے تو لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ امتیاز قرآن پاک نے آپ کو دیا ہے اور آپؐ نے اپنی ذات کے لئے خود کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اللہ نے جو چیز حضورؐ کو دی تو وہ قرآن میں لکھ دی گئی۔ تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی یا بدگمانی کا امکان نہ رہے۔ اس لئے قرآن پاک میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

☆

اہلِ تشیع نبی ﷺ کو معصوم کلی مانتے ہیں۔

نبی ﷺ کو معصوم کلی تو ہر مسلمان مانتا ہے۔ ہر پیغمبر کو معصوم کلی ماننا ایمان کا تقاضا ہے۔ اس میں اہلِ سنت اور کسی اور میں کوئی فرق نہیں ہے۔

☆

علامہ شبلی نعمانی کے نزدیک ازواج مطہرات کی تعداد نو سے زائد ہے لیکن آپ نے نو ارشاد فرمائی ہے۔

نو سے زائد تو بہرحال نہیں ہے۔ لیکن میں نے جن نو کا ذکر کیا تو یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کی نکاح میں نو ازواج مطہرات موجود تھیں۔ اُس وقت حضرت خدیجہؓ، زینبؓ بنت خزیمہ اور غالباً ایک دو اور کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت حضور کے نکاح میں نو ازواج مطہرات تھیں۔

☆

معجزے نبی کی طرف بھی منسوب ہیں اور باقی انبیا کی طرف۔ ان میں کس حد تک فرق کیا جا سکتا ہے؟

ایک بڑا فرق تو یہ ہے کہ بقیہ انبیا کے معجزے جو قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں وہ حسی یعنی physical معجزے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ قرآن کریم کی صورت میں ایک intellectual اور معنوی معجزہ ہے۔

☆

واقعہ اسرا میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے۔ کیا کوئی اشارہ قرآن پاک میں آسمان کی سیر کا بھی ہے؟

قرآن پاک میں آسمان کی سیر کے بالواسطہ اور لطیف اشارے ہیں۔ قرآن پاک میں

ان کی صراحت نہیں ہے۔

☆

واقعہ معراج کے وقت مسجد اقصیٰ کی صورت کیا تھی؟

مسجد اقصیٰ کی جو موجودہ عمارت ہے یہ بنو امیہ کے دور میں بنی ہے۔ واقعہ معراج کے وقت یروشلم میں یہ کوئی عمارت موجود نہیں تھی۔

☆

آپ نے اقطاع کا قیصر کے ہاتھوں فتح کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی ہے کہ قیصر نے اقطاع کو فتح کیا ہو۔ پتہ نہیں آپ نے کس بات کو سمجھ سے کس طرح یہ مطلب لیا ہے۔ کسریٰ شہنشاہ ایران نے حضورؐ کا نامہ مبارک چاک کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح اس نے میرا خط چاک کیا ہے اسی طرح اس کی سلطنت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

☆

عقلیت اسلام اور عقلیت مغرب کے تحت اسلام کی توجیہ کو اسلام کی اصل توجیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن مجید زیادہ تر عقل و فکر کو استعمال کرنے اور سوچنے پر زور دیتا ہے؟

میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں بلکہ ہر قوم میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو معاملات کے عقلی پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ دینی معاملات میں بھی عقلی انداز سے غور کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ دینی معاملات کو عقلی دلائل کے ساتھ بیان کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ دینی حقائق کی کوئی غیر مستند یا کمزور اور رکیک تاویل نہ کی جائے۔

کلامیات سیرت کی ضرورت تو جب پڑے گی جب مسلمانوں
پر لازم ہو کہ غیر مسلموں کو اپنے دلائل سے مطمئن کریں۔
حالانکہ مسلمان پر ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔

میرے خیال میں تو واجب ہے۔ مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے اور ان کے لئے دینی اعتبار سے ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو مطمئن کریں۔ یہ ہمارا دعوتی اور تبلیغی فریضہ ہے۔ اسلام کے عقائد اور تعلیمات کی صداقت کے بارہ میں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مغربی انداز کے دلائل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کو یہ دلائل دینے پڑیں گے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا بہترین معجزہ خود آپ کی سیرت
مطہرہ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت ہے جس کا مثالی نمونہ
آپ کی شخصیت تھی۔ اگر وقت ہو تو اس اہم اعجاز پر مزید
روشنی ڈالیں کیونکہ شریعت آپ کی خاص دلچسپی کا مضمون
ہے اور شریعت کے بارے میں بڑے فتنے پھیلائے جا
رہے ہیں۔

شریعت پر مفصل گفتگو کی جائے تو یہ بات تو بہت لمبی ہو جائے گی۔ شریعت کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور اتنے مضبوط عقلی دلائل پر استوار ہے کہ چودہ سو سال سے اس پر لوگ غور کر رہے ہیں اور اس کے عقل پر مبنی ہونے کے نئے نئے دلائل سامنے آ رہے ہیں۔ اس کے معقول ہونے کے بارے میں نئے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ شریعت میں جن موضوعات پر احکام دیئے گئے ہیں ان میں خالص اخلاقی احکام بھی شامل ہیں۔ روحانیات کے اصول بھی ہیں اور خالص قانونی مسائل اور تصورات بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں عملیت یعنی اس کا

اور practical بھی ہے۔ شریعت بیک وقت عملی چیز بھی ہے اور مثالی بھی ہے۔ اس میں قانون اور اخلاق کا انسانی تاریخ میں پہلی بار کامیاب امتزاج بھی ہے۔ شریعت کا ہر حکم اخلاقی اصولوں پر مدار رکھتا ہے اور تمام اخلاقی اصول قانون کی شکل میں concretize ہو گئے ہیں۔ یہ یہاں اخلاق اور قانون محض نظریہ نہیں جس کی عملی تشکیل کا سامان نہ ہو، جس طرح کہ دوسرے بہت سے فلسفوں میں محض نظریات ہوتے ہیں کہ نظریاتی حد تک تو وہ بہت خوشنما اور اچھے اخلاقی اصول ہوتے ہیں لیکن عمل کی میزان میں بہت ہلکے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ کوئی تمہارے ایک گال پر چانٹا مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو، تقریر کرنے میں تو اچھی لگتی ہے، لیکن کیا آج تک کوئی ایسا آدمی آیا ہے جس نے ایک گال پر چانٹا کھا کر دوسرا گال بھی واقعتاً دشمن کے سامنے پیش کر دیا ہو۔ کسی دشمن نے ایک شہر فتح کر لیا ہو تو مفتوح ملک کے حکمران نے دوسرا شہر بھی رضاکارانہ حوالے کر دیا گیا ہو کہ یہ بھی لے لو۔ ایک کمرے میں ڈاکو گھس آئے تو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی کھول دے کہ میاں چور یہاں کا مال بھی لے جاؤ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نظری حد تک تقریر کرنے اور شعر و شاعری کے لئے یہ بڑا اچھا نعرہ ہے، لیکن جب تک کسی نعرہ کو قانون کی شکل دے کر عملاً یہ نہ بتایا جائے کہ اس پر عمل کیسے ہوگا وہ محض ایک نظریہ اور ایک نعرہ ہے۔

اسلامی شریعت نے جہاں اخلاقی اصول دیئے ہیں وہاں ان کو قانون سے relate کیا ہے۔ جو قانونی احکام دیئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی اساس اخلاقی ہدایات اور اصولوں پر ہے۔ اسلام میں اخلاق اور قانون دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔ اسلام میں جو آدمی جتنا مذہبی ہے وہ اتنا ہی قانون کا پابند ہے۔ اسی طرح جو شخص اسلامی قانون پر جتنا کاربند ہے اتنا ہی وہ مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے اونچے مقام پر ہے۔ یہاں روحانیت، spirituality, legality, religiosity اور قانون کی پابندی سب ایک جگہ جمع ہیں جو پہلے کبھی بھی اس طرح توازن سے جمع نہیں تھیں۔ دوسری روایات میں مذہبی لوگ دنیا کے عملی مسائل سے دور ہیں۔ جو عملی مسائل سے قریب ہیں وہ مذہبیات سے دور ہیں۔

☆

اگر بچہ کو پیدائش کے فوراً بعد ماں سے الگ کر دیا جائے اور
بعد میں جب اس کو موقع دیا جائے تو کیا وہ اپنے والدین کو
پہچانے گا؟

جی نہیں آپ نے میری بات کو کیسے سنا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ہر بچہ ہر حال میں اپنے ماں باپ کو پہچان لیتا ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ جو شخص زندگی بھر اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ جس نے تیس چالیس سال ماں باپ کو دیکھا ہو، ان کی محبتوں اور شفقتوں سے بہرہ مند چلا آ رہا ہو، جو ہر دکھ درد میں ان کی ہمدردی اور سرپرستی دیکھتا آیا ہو، اس کو ماں باپ کو ماں باپ ماننے کے لئے کسی اور خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کو بغیر کسی دلیل کے والدین کے اس پورے رویہ اور طرز عمل کی وجہ سے قطعی یقین ہوتا ہے کہ یہی میرے ماں باپ ہیں۔ اس کو مزید کسی دلیل، کسی دستاویزی ثبوت یا نکاح نامہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ماں باپ کا کردار اور رویہ ہی ان کے ماں باپ ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جو شخصیات حضور کی ذات اور کردار سے واقف تھیں۔ جنہوں نے تیس تیس چالیس چالیس سال تک آپ کو قریب سے دیکھا تھا، انہوں نے حضور کی دعوت سنتے ہی قبول کر لیا اور کوئی خارجی ثبوت اور معجزہ طلب نہیں کیا۔

☆

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا نام دوبارہ بتائیں اور یہ بھی
بتائیں کہ یہ کس language میں ہے؟

کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ یہ براہ راست سیرت پر نہیں بلکہ علوم سیرت اور علوم حدیث پر ہے۔ انہوں نے اس موضوع کا نام علم اسرار حدیث قرار دیا ہے۔ جگہ جگہ سیرت پر بھی بحث کی ہے۔ ایک حصہ میں سیرت کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے۔ غزوات بھی بیان کئے ہیں۔ جگہ جگہ منصب نبوت، مقام نبوت اور فرائض نبوت کو بیان کیا ہے۔ حضور کی تعلیم میں جو حکمتیں اور سبق پوشیدہ ہیں ان کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ اس کے اردو اور

انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

☆

کیا رسول اللہ ﷺ کے پاس قیامت کا علم تھا؟ کیا آپ نے قیامت کے آنے کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟

حضور کو قیامت کے وقت کا قطعی اور حتمی علم تھا یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مشہور حدیث جبرئیل میں حضورؐ نے فرمایا تھا: ما المسئول عنھا باعلم من السائل ' ۔یعنی میرا علم قیامت کے بارہ میں جبرئیل کے علم سے زیادہ نہیں۔ یہ بات بہرحال واضح ہے کہ اس سے زیادہ قیامت کے بارہ میں حضور نے بتایا نہیں۔ اگر کسی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔ مثلاً ایک صحابی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔ تو آپؐ نے جواب میں قیامت کا وقت نہیں بتایا، بلکہ سائل سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے کہا کہ میں نے تو نماز روزہ زیادہ نہیں کیا لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم اس کے ساتھ ہوگے جس کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔

حضور نے قیامت کے دن یا وقت کا تعین نہیں کیا، کیونکہ یہ اللہ کی حکمت اور سنت کے خلاف تھا۔

☆

سائنس اور اسلام کے تصور عقل کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت فرمادیجئے۔

ہمارے ملک کے معروف سائنسدان ڈاکٹر ایم ایم قریشی صاحب یہاں تشریف فرما ہیں وہ مجھ سے کہیں بہتر وضاحت کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے بڑے سائنسدانوں میں سے ہیں۔ میں خود کبھی بھی سائنس کا طالب علم نہیں رہا اس لئے سائنس کے تصور عقل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اسلام کا تصور عقل یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی

طلب نہیں کیا۔ حضرت علی نے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔ یہ سب پہلے سے ایک سعادت مندی رکھتے تھے۔ ان کی فطرت سلیم تھی۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگ ساری عمر معجزے ہی طلب کرتے رہے لیکن مسلمان نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ان کے دل میں کھوٹ تھا۔

جو لوگ درمیان میں تھے ان میں سے اگر کسی نے کوئی معجزہ دیکھا تو ان کی کمزوری دور ہو گئی اور شکوک ختم ہو گئے۔

☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ازواج مطہرات کی جو تقسیم کی اس کی تفصیل بیان فرما دیں۔

یہ سورۃ احزاب میں ہے۔ اس کی تفصیل میں علامہ جوزی نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب اور حضرت ام سلمہ کو حضور نے قریب رکھا اور بقیہ کو ارجاء کی منزل میں رکھا۔

☆

دورِ نبوی کے بعد اکثر یہ ہوا ہے اور آج بھی یہ ہو رہا ہے کہ مختلف طبقوں کے مطابق اسلام کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک دوئی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ کیا ہم aggressive بھی رہے ہیں؟

میرے خیال میں یہ دفاعی اور جارحانہ کی اصطلاحات اسلامی اصطلاحات نہیں، مغربی اصطلاحات ہیں۔ اسلامی تعلیم اور شریعت کے سیاق و سباق میں مغربی اصطلاحات استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں اسلام کی دعوت مثبت طور پر پیش کرنی چاہئے۔ چاہے کسی کے اسلوب کے مطابق وہ قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی اسلام پر علمی اور عقلی اعتبار سے اعتراض کرے تو اس کا جواب دینا چاہئے۔ یا جو مسلمان کسی اعتراض سے متاثر ہو رہا ہو تو اس کو مطمئن کرنے کے لئے جواب دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کو اہل مغرب دفاعی کہیں یا

جارحانہ نہیں۔

☆

آپ نے فرمایا کہ آپ کے خواب عام خوابوں کی طرح ہیں۔
اگر اسراء اور معراج خواب میں ہو تو قابل قبول نہیں۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ رسول ﷺ کے خواب نعوذ باللہ دوسرے انسانوں کے عام خوابوں کی طرح ہیں۔ نبی کا خواب بھی وحی کی ایک شکل ہوتی ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ معراج اگر محض خواب ہوتی تو منکرین اور کفار اتنی شدت سے اس پر اعتراض نہ کرتے اور اس کا استہزاء نہ کرتے۔ جس شدت سے انہوں نے انکار کیا اور مذاق ظاہر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خواب نہیں تھا، بلکہ خواب سے بڑھ کر کوئی چیز تھی۔ جمہور کے نزدیک معراج کا سفر روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں کا سفر تھا اور کچھ کے نزدیک، جن میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی شامل تھیں، معراج روحانی تھی۔ لیکن یہاں روحانی ہونے کا مطلب بھی خواب یا منام کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ خواب میں انسان کی روح اس کے جسم سے جدا نہیں ہوتی۔

☆

قیصر نام رکھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں قیصر کے لفظ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس وجہ سے نہ رکھے کہ ایک غیر مسلم کا نام تھا تو تو اس کا اختیار ہے۔ شرعاً اس نام کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ محض ایک لفظ ہے اور اس کو نام کے طور پر پہچان کے لئے استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس لفظ میں کوئی مشرکانہ بات نہیں اس لئے اس کو نام کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

☆

آپ صرف اہل حدیث کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ
ان کی کتابوں پر بہت تنقید ہوئی ہے۔

میں نے تو کسی متعین مسلک کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر مجدد الف ثانی، قاضی عیاض، شاہ ولی اللہ اور ابن قیم آپ کے نزدیک اہل حدیث ہیں تو پھر بات اور ہے۔ میں تو مسلمانوں کی مشترک علمی میراث سے حوالے دے رہا ہوں اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر حوالے نہیں دے رہا ہوں۔

☆

> اتنے بڑے علمی خطبات کا کیا فائدہ جب آپ میں عمل نظر نہیں آ رہا۔ مثلاً تصویر اتروانا منع ہے، لیکن یہاں آپ کی اور ہم سب کی تصویریں بن رہی ہیں۔ خواتین کے لئے الگ ہال میں خطبہ سننے کا انتظام نہیں ہے۔ کرسیوں کی ترتیب مردوزن کے اختلاط کے طرز پر ہے۔ کیا آپ کسی نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ میں آج پہلی بار خطبہ سننے آئی تھی۔ آئندہ کبھی نہیں آؤں گی اس لئے کہ اس گندگی میں بیٹھ کر حکمت کے موتی نہیں چن سکتی۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی اس گندگی کا حصہ بن جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ جو چیز آج مجھے بہت بری لگ رہی ہے کل کو اتنی بری نہ لگے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں صحابیات نماز کے لئے مسجد نبوی میں آیا کرتی تھیں … مرد صحابہ بھی ہوتے تھے۔ مردوں کی صف آگے اور صحابیات کی صف پیچھے ہوتی تھی۔ … کا انتظام تھا جیسا یہاں کیا گیا ہے کہ خواتین کے آنے جانے کا راستہ الگ اور مردوں … تھا۔

تمام صحابہ امہات المومنین کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ امہات المومنین کے علاوہ بھی محدث صحابیات تھیں۔ عمرہ بنت عبدالرحمن بڑی معروف محدثہ صحابیہ تھیں۔ ان کے پاس لوگ جایا کرتے تھے۔ ان کے بعد بھی ہر دور میں فقیہات اور

محدثات ہوتی رہی ہیں جن سے لوگ کسب فیض کرتے رہے۔ یہ کہنا کہ پرانے سارے ائمہ مجتہدین کو علم حاصل نہیں تھا یہ جملہ درست نہیں ہے۔ شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ مرد و زن باپردگی کی پابندی کے ساتھ دینی احکام پر عمل نہ کریں۔ آخر طواف، سعی، حج یہ سب عبادات مرد و زن ایک ساتھ ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے دور سے اسی طرح ہوتا آرہا ہے۔ آپ دوبارہ شریعت کا مطالعہ کریں۔ سیرت کو دیکھیں، حدیث کی کتابیں پڑھیں اور آپ نے ذہن میں اگر پہلے سے کچھ تعصبات ہوں تو ان کو نکال دیں۔ آپ نے سیرت کی کس پاکیزہ، بابرکت اور مقدس محفل کو گندگی کہا ہے یہ خود ایک بہت بڑی جسارت اور گستاخی ہے۔ اس پر اللہ کے حضور دو رکعت نماز پڑھ کر توبہ کریں اور ہم سب کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور ہم سب کو نیک ہدایت دے۔ آمین

☆

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی۔
ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

یہ فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کرے گا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ عام طور پر متکلمین اسلام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انسان ایسا ہو جس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو تو وہ اگر جزوی طور پر بھی توحید پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔

☆

جادو اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟

جادو اور معجزہ میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ جادو کا فن جاننے والے جب معجزہ کا مقابلہ کرنے آئے تو انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا کہ جادو کے مقابلہ میں جو چیز سامنے آئی ہے یہ جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کی نشانی ہے۔ جادو ایک فرضی چیز ہے جو محض نظر کا دھوکا اور کھیل ہے۔ معجزہ حقیقی چیز ہے۔

☆

مجھے یہ حقیقت ہے کہ تقدیر یا کوئی بھی قرآن یا اس کی ایک
آیت جیسی آیت بنانے سے قاصر رہے تھے۔ اس سے
مراد قرآن کی فصاحت و بلاغت ہے یا کچھ اور؟

اس سے مراد قرآن کی فصاحت اور بلاغت بھی ہے اور بھی بہت کچھ مراد ہے۔ قرآن میں جو کچھ بھی ہے فصاحت و بلاغت اور معانی و مطالب یہ سب چیزیں اس درجہ کی ہیں کہ ان کا مثل بنانا کسی بھی انسان کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔

س:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا واللہ یعصمک من الناس اس کا
ایک مفہوم تو یہ بھی ہے کہ آپ کی جسمانی حفاظت بھی کی گئی
لیکن طائف کے موقع پر اور دوسرے غزوات میں آپ زخمی
ہوئے اور آپ پر جادو بھی ہوا۔ کیا یہ آیت ان واقعات کے
بعد نازل ہوئی تھی یا پہلے؟ کیا یہ سوال یہی ہے؟ ایک روایت
سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔
ان میں سے 313 رسول تھے۔ اگر ایسا ہے تو رسولوں کی
تعداد 313 ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دشمنان اسلام سے آپ کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں تشریف لے جاتے تھے تو آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو شہادت کا منصب بھی حاصل ہو۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل۔ یعنی میری آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ گویا شہادت ایک ایسا مرتبہ ہے جس کی آرزو نبی کی

گزرتا ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا کہ کوئی شخص نبی آخر الزمان کی جان لینے کا ذریعہ بنے۔ یہ بات ہوتی تو شاید پوری امت ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی خواہش جزوی طور پر پوری کر دی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے راستہ میں کئی بار زخمی ہوئے اور پروردگار کے حضور میں اپنا خون بہایا اور کئی بار ایسے ہوا۔

☆

جو لوگ اسلام سے پہلے حج کرتے تھے وہ کس عقیدہ اور
مذہب کے تحت حج کرتے تھے؟

وہ ملتِ ابراہیمی کے طریقے کے مطابق حج کرتے تھے۔ ملتِ ابراہیمی کے بہت سے آثار عرب میں موجود تھے۔ کچھ چیزیں ان میں غلط شامل ہو گئی تھیں۔ بعض قبائل غلط چیزوں میں زیادہ مبتلا تھے بعض کم مبتلا تھے۔ لیکن حج کے اکثر و بیشتر مراسم ملتِ ابراہیمی کے مطابق ہی ادا ہوتے تھے۔

☆

کلامی طریقے سے سیرت کے کسی پہلو یا کسی اور حکم پر ایمان لانا
اور یقین کرنے کو عبادت کہہ سکتے ہیں؟

یقیناً یہ عبادت ہے کہ آپ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی عقل سے دستبردار ہو جائیں اور اللہ کی تعلیم کو مان لیں۔

☆

نبی ﷺ نے بہت سی پیشین گوئیاں فرمائیں جو ہر بار درست
ثابت ہوئیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ غیب کا علم
رکھتے تھے؟

جس اور جتنے غیب کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ آپ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ

نے غیب کا تصور حضور علیہ السلام کو یا خدا نے عطا کیا ہوتا ہے۔

☆

کیا سیرت کا ہر متنازع پہلو کلامیات کے تحت آئے گا؟

سیرت کا کوئی متنازعہ پہلو نہیں ہے۔ متنازع پہلو سے اگر وہ پہلو مراد ہیں جو عقائد اور کلام سے متعلق ہیں، وہ کلامیات کے زمرے میں آئیں گے اور جن میں کلامی بحثیں نہیں ہوں گی وہ کلامیات میں نہیں آئیں گے۔

☆

راجہ حسن اختر نے علامہ اقبال کے خط کا حوالہ دیا ہے۔

علامہ اقبال کی بعض منتخب تحریروں کا مجموعہ انوار اقبال کے نام سے اقبال اکیڈمی نے 1968 کے لگ بھگ شائع کیا تھا۔ اس میں یہ خط بھی شائع ہوا تھا۔ ایک عجیب بات ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کام کس نے کیا ہے، اقبال اکیڈمی کی انتظامیہ یا کوئی اور ہے۔ علامہ اقبال کے خط کا اصل جملہ یہ تھا کہ جو شخص ان تین چیزوں کا منکر ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ مدعی نبوت سمجھا جائے گا اور خارج اسلام اور واجب القتل ہوگا۔ اس میں آخری دو جملے کاٹ دیئے گئے ہیں اور اس کی جگہ نقطے ڈال دیئے گئے ہیں۔ لیکن اسی کتاب کے آخر میں بعض منتخب دستاویزات کا فوٹو بھی ہے۔ علامہ اقبال کے اس مذکورہ خط کا فوٹو بھی ہے جس میں یہ الفاظ صاف پڑھے جا سکتے ہیں کہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوگا اور واجب القتل ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرنٹنگ کے کام میں کوئی قادیانی صاحب بیٹھے ہوں گے جس لئے یہ حصہ نکال دیا گیا۔ انوار اقبال 1968، اقبال اکیڈمی کراچی۔

☆

یہ بات کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں، یہ بحث کیوں شروع ہوئی اور اس کی وجوہات کیا تھیں؟

مجملاً یہ مسئلہ تو بہت طویل فرصت کا متقاضی ہے۔ اصل بحث یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور ذات میں تعلق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو قدیم ہے، ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ صفات بھی اسی طرح ہیں۔ جب یہ سوال سامنے آیا تو بالاتفاق یہ رائے قائم کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی قدیم ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ذات موجود ہے تو اسی وقت سے وہ خالق بھی ہے، متکلم بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ کیا جب اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں تو کیا ان کے مظاہر بھی اسی طرح قدیم ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ خالق ہے تو کیا مخلوقات بھی ہمیشہ سے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ متکلم ہے تو کیا کلام بھی ہمیشہ سے ہے؟ اس پر محدثین نے رائے ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہمیشہ سے ہے۔ انہوں نے کلام نفسی اور کلام لفظی کی دو قسمیں قرار دیں جن پر ہونے والی بحثیں علم کلام کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ پھر چونکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ بھی پہلے سے اسی طرح محفوظ تھا۔ کچھ حضرات نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ کلام اللہ تو ایک physical چیز ہے۔ اس کو بھی اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح قدیم مان لیا جائے تو دو قدیم ذاتوں کا ماننا لازم ہو جائے گا۔ یہ تصور توحید کے خلاف ہے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا اور چونکہ حکومت ان لوگوں کے پاس تھی جو اس رائے کے قائل تھے اس لئے انہوں نے اس عقیدہ کو منوانے میں زبردستی سے کام لیا۔ اس سے بعض محدثین اور حکومت کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ دونوں طرف سے اپنے اپنے موقف کو بیان کیا گیا۔ حکومت نے بعض لوگوں پر سختی کی جو نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہ سختی معتصم کے زمانے میں زیادہ ہوئی۔ اس کے افسوس ناک مظاہر بعض قابل احترام اور بزرگ شخصیات کو آزمائش میں ڈالنے کی صورت میں برآمد ہوئے۔

اس سے حدیث کے مطالعہ میں کلامی رجحان کے نام سے ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔

☆

نہ صرف مستشرقین نے بلکہ اب تو تمام اہل مغرب نے اسلام
کے نظریہ جہاد کو بڑے شد و مد کے ساتھ اپنے شبہات و
اعتراضات کا ہدف بنایا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف

پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ کیا یہ بھی
کلامیات سیرت کا ایک اہم بحث ہے؟

یقیناً یہ کلامیات سیرت کا ایک اہم بحث ہے۔ اس پر بات ہونی چاہیے لیکن مختصر وقت میں بات کرنا دشوار ہے۔ جہاد اسلام کا ایک حکم ہے۔ ایک حدیث میں اس کو ذروۃ سنام الاسلام یعنی اسلام کی عمارت کا سب سے اونچا مقام قرار دیا گیا ہے۔ عمارت کا برج اس کی خوبصورتی اور اس کی تعمیر کی تکمیلی شان کو واضح کرتا ہے۔ جہاد سے اسلام کے تکمیلی شان کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ وہ دین اور شریعت نہایت مکمل ہے جس میں جہاد کے احکام بھی دیئے گئے ہوں۔ پھر انہوں نے عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی شریعت کس طرح اور کیوں مکمل ہے۔ اس لئے جہاد پر تو گفتگو ہونی چاہیے۔ اگر آپ پہلے توجہ دلاتے تو میں جہاد پر بھی زیادہ تفصیل سے بات کرتا۔

☆

برصغیر کے کلامیاتی مسائل پر آپ کے ارشادات مطلوب
ہیں۔

جب برصغیر پر بات ہوگی تو برصغیر کے کلامیاتی مسائل پر بھی بات ہوگی۔ تاہم اس باب میں میرے اقوال وخیالات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں اکابر اسلام کے اقوال وارشادات کا ناقل اور مرتب ہوں:

شنیدم آن چہ از پاکان امت
ترا با شوخی رندانہ گفتم

۔٭٭۔

تراب ذنب

فقہیات سیرت

نواں خطبہ

فقہیات سیرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان صاحب،
محترم جناب ڈاکٹر ظفر محمد زمان صاحب،
محترم امیر الکرم جناب افتخار احمد سرواہی صاحب،
برادران محترم،
خواہران مکرم!

آج کی گفتگو کا موضوع ہے فقہیات سیرت۔ بظاہر فقہ اور سیرت دونوں الگ الگ موضوعات اور مضامین سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ کا دائرہ کار قانون اور شریعت کے اصول ہیں۔ سیرت کا دائرہ کار عموماً تاریخ اور رسول اکرم ﷺ کی سوانح عمری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ فقہ سے مراد ایک گہری اور عمیق فہم اور profound understanding ہے۔ یعنی گہری فہم قرآن پاک کے احکام کی، حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت مبارکہ کی، اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرت طیبہ کی۔ جب تک ان تینوں چیزوں کی گہری فہم حاصل نہ ہو۔ جب تک ان تینوں مصادر ہدایت میں گہری بصیرت حاصل نہ ہو، اس وقت تک شریعت کے قوانین اور احکام پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے فقہ اور سیرت میں انتہائی گہرا اور قریبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ سیرت سے

۱۔ فقہیات سیرت کا ایک حصہ تو وہ اصول اور قواعد ہیں جو اکابر اسلام نے خود احادیث اور سیرت کی روشنی میں متعین فرمائے ہیں، جن کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، احادیث مبارکہ اور سیرت کے واقعات کو نہ صرف سمجھا جانا چاہئے بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں ان احکام کی تطبیق اور موجودہ دور کے واقعات اور مسائل و احکام کا ان کی روشنی میں تعین کیا جانا چاہئے۔ یہ وہ سب سے بڑے اصول صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے زیر غور آتے رہے ہیں۔ ان پر فقہائے اسلام نے اور شریعت کے ماہرین نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ فقہیات سیرت کا دوسرا بڑا میدان وہ واقعات یا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے وہ ارشادات ہیں جن کی فقہی تعبیر کے بغیر، یعنی ان کو فقہی نقطہ نظر سے سمجھے بغیر سیرت کے ان احکام کی تعبیر کرنا بہت مشکل ہے۔ چند روز پہلے ایک گفتگو میں میں نے حج کی مثال دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حج ادا فرمایا، اس کو ایک لاکھ تیس ہزار سے زائد صحابہ کرام نے دیکھا۔ اس کی تفصیلات تابعین کو پہنچیں۔ لیکن دیکھنے والوں کی اس کثرت کے باوجود، راویوں کے اس عظیم الشان جم غفیر کے باوجود یہ بات مختلف فیہ رہی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حج فرمایا تھا وہ حج قران تھا، حج تمتع تھا یا حج افراد تھا۔ تینوں صورتوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ اب ان تینوں میں کون سی قسم سنت کے زیادہ قریب ہے، کون سی قسم افضل ہے؟ یہ فقہ کا مسئلہ بھی ہے اور سیرت کا مسئلہ بھی۔

رسول اللہ ﷺ کے حج کی تفصیلات کے لئے فقہی احکام جاننا ضروری ہے۔ اس طرح فقہی احکام جاننے کے لئے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اس حج کی تفصیلات جاننا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع دن سے فقہائے اسلام، محدثین اور ارباب سیرت سب رسول اللہ ﷺ کے حج سے متعلق احادیث اور تفصیلات کو جمع کرنے، ان پر غور و خوض کرنے، ان سے نئے نئے نتائج اور مسائل کا استنباط اور استدلال کرنے میں مصروف رہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں۔ ہر محدث نے، ہر فقیہ اور ہر سیرت نگار نے رسول اللہ ﷺ کے اس حج کی تفصیلات کو ایک نئے انداز سے جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ فقہیات سیرت کا دوسرا میدان ہے۔

۳۔ فقہیات سیرت کا تیسرا بڑا میدان بہت دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مختلف ارشادات اور فیصلوں کو فقہائے اسلام نے مختلف زمروں میں مرتب کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اولین اور سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی مرضی کے ترجمان ہیں۔ حامل وحی ہیں اور قرآنی شریعت عطا فرمانے والے ہیں۔ اس لئے حضور نے جو کچھ فرمایا وہ اللہ کی رہنمائی میں فرمایا۔ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی 'وہ کوئی لفظ اپنی زبان سے خواہش نفس کے زیر اثر نہیں نکالتے، بلکہ جو کچھ بولتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ جو کچھ حضور فرماتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے بہت سے وہ الفاظ بھی نکلتے تھے جو انسانوں کے مابین عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحابہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری مجلس میں تشریف لاتے تھے اور ہمیں دیکھتے تھے کہ ہم شعر و شاعری کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں تو آپ ہماری گفتگو میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ آپ دیکھتے تھے کہ ہم پرانے واقعات اور ایام العرب کو بیان کر رہے ہیں تو آپ اس میں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کے ذوق، مزاج اور کسی کے انداز زندگی کو بدلنے کی اور ایک مصنوعی یا متصنعانہ مذہبیت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حضور کی محفل میں لوگ خود بخود اس رنگ میں رنگے جایا کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا رنگ تھا۔

لیکن اگر کوئی بات آپ نے ایسی ارشاد فرمائی جو عرب کے رسم و رواج یا اس زمانے کے لحاظ سے تھی تو اس کی شرعی حیثیت یا درجے کے بارے میں اہل علم میں گفتگو رہی ہے۔ عرب میں بہت سے واقعات، ضرب الامثال، قصے کہانیاں اور تفریح کے کئی قصے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کی دلجوئی کی خاطر ان میں بھی شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح کے مواقع پر حضور نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ بھی شریعت کا اسی طرح حصہ ہے جیسے شریعت کا حصہ وہ احادیث ہیں جن سے سنت ثابت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور عموماً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ حضور کے کون کون سے ارشادات وہ ہیں جو ماخذ و مصادر شریعت ہیں، اور کون کون سے ارشادات گرامی وہ ہیں جو آپ نے بطور ایک عام انسان کے ارشاد فرمائے۔ جو کچھ آپ نے

بطور ایک انسان ارشاد فرمایا، اس میں بھی شریعت کا ایک پہلو موجود ہے۔ اس سے بھی شریعت کے بہت سے احکام نکلتے ہیں کیونکہ شریعت کے عمومی دائرہ سے اور عمومی حدود سے کوئی چیز خارج نہیں ہو سکتی۔

اس حد تک تو کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جہاں بحث وتمحیص کی زیادہ گنجائش ہے یہ وہ معاملات ہیں جہاں فقہاء کے اسلوب اور محدثین کی تعبیرات اور اتفاق رائے سے یہ تعیین نہیں ہو پاتی کہ رسول اللہ ﷺ کی کون سی بات بطور نبی اور رسول کے ارشاد فرمائی گئی اور کون سی بات آپ نے بطور سربراہ ریاست اور قاضی کے ارشاد فرمائی۔ جو چیز آپ نے بطور قاضی کے ارشاد فرمائی، اس کا دائرہ محدود ہے۔ ملک کے صف اول کے قانون دان حضرات یہاں تشریف فرما ہیں، وہ مجھ سے بہتر اس بات کو جانتے ہیں کہ قانون کی اصطلاح میں ایک معاملہ ہوتا ہے in personem اور ایک معاملہ ہوتا ہے in rem۔ جو بات آپ نے نبی اور رسول کے طور پر ارشاد فرمائی وہ in rem ہے یعنی تمام انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ جو فیصلہ آپ نے بطور قاضی کے فرمایا وہ in personem ہے یعنی ان دو فریقوں کے لئے واجب التعمیل ہے جن کا مقدمہ پیش تھا۔ آپ نے کسی جائیداد کی ملکیت کا فیصلہ ایک شخص کے حق میں کیا۔ دوسرے صاحب کے حق میں کسی اور حق کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ صرف ان دونوں کے لئے ہوا ہے اور انہی دونوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ باقی لوگوں کا اس کے مندرجات یا مشمولات سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض مواقع ایسے آئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی معاملہ میں رہنمائی فرمائی۔ بعد میں محدثین اور فقہاء نے اس کی جزئیات اور دقائق پر غور کیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ بات آپ نے کس حیثیت میں ارشاد فرمائی تھی۔ اگر بطور نبی کے ارشاد فرمائی تو اس کے تقاضے اور implications اور ہیں۔ اگر بطور سربراہ حکومت کے ارشاد فرمائی تو اس کے تقاضے اور نتائج اور ہیں۔ اگر بطور قاضی کے ارشاد فرمائی تو اس کے تقاضے اور ہیں۔ اس بارہ میں فقہاء کا اختلاف بھی ہوا ہے جس کی ایک دو مثالیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق فقہیات سیرت سے ہے۔ بلکہ ان سب واقعات و مسائل کو جمع کیا جائے تو ان سب کا ایک عمومی عنوان فقہیات سیرت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے چلیں، ایک بہت اہم ارشاد گرامی کی طرف اشارہ کرنا ضروری

ہے کہ یہ ارشاد کس امر کی جانب ہے؟ یہ حدیث سیرت اور فقہا کے علماء کے درمیان ایک طویل بحث
کا موضوع رہا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ
انصار کی صحابہ کرام کی بڑی تعداد زراعت سے وابستہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں زراعت کا کوئی نام
ونشان نہیں تھا۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ وادی غیر ذی زرع کہلاتا تھا۔ وہاں گھاس کی پتی بھی نہیں
اُگتی تھی۔ اس لئے اہل مکہ زراعت سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں زراعت کے تقاضوں
سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ ان کو جانتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تشریف لا کر دیکھا کہ لوگ کھجور کی زراعت کا
کاروبار کرتے ہیں۔ وہ کھجور کے درختوں میں قلم لگاتے ہیں اور ان کی قسمیں نر اور مادہ پودوں
میں کرتے ہیں۔ بظاہر آپ کو یہ چیز نامناسب معلوم ہوئی۔ آپ نے ایسا نہ کرنے کا
مشورہ دیا۔ صحابہ کرام تو حضور کے ہر اشارہ کو حکم سمجھتے تھے۔ انہوں نے قلم لگانے کا یہ عمل ترک کر
دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن جن حضرات نے تابیر کا یہ عمل نہیں کیا
ان کے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی۔ جن کی پیداوار کم ہوئی انہوں نے احترام اور عقیدت سے یہ بات
حضور کے سامنے پیش کی۔ کسی صاحب نے آپ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ نے
تابیر سے منع فرمایا تھا۔ یہ عمل ترک کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں پیداوار بہت کم ہوئی ہے۔
آپ نے فرمایا کیا بات ہے؟ اس پر انہوں نے بتایا کہ ہم جو تابیر کا طریقہ زراعت کرتے
تھے انہوں نے تصدیق کی کہ پیداوار میں واقعتاً کمی ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے۔
پھر صحابہ نے وضاحت کی کہ کھجور کے بعض پودے بار آور ہوتے ہیں اور بعض بار آور نہیں
ہوتے۔ جو بار آور ہوتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا قلم دوسرے پودے میں
لگایا جائے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ غیر بار آور پودے میں جو ... ہوتے ہیں وہ
دوسرے پودے سے جوڑے جاتے ہیں ورنہ اس میں پھل نہیں آتا ہے۔ یہ ایک فنی چیز ہے
جو زراعت کی دنیا میں ہر ایک کو معلوم ہے۔

اس پر آپ نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا جو یہاں پیش کرنا مقصود ہے۔ آپ نے فرمایا:
’’انتم اعلم بامور دنیاکم‘‘ تم اپنے دنیوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ جب میں
تم سے دین کی کوئی بات کہوں تو وہ تمہارے لئے واجب العمل ہے۔ اگر دنیاوی

معاملے میں کوئی مشورہ دوں تو اس پر دنیاوی مصلحتوں اور حکمتوں کے مطابق غور کرو اور جو حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہو اس کے مطابق عمل کرو۔

تابیرِ نخل کی یہ روایت تمام بڑے بڑے محدثین نے بیان کی ہے۔ اس پر بڑی تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں۔ اصولی حد تک تو یہ بات مختلف فیہ نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات خود سرکارِ دوعالم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہے اس لئے سب فقہا اور محدثین اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ البتہ یہ بات کہ کون سی بات جو آپؐ نے ارشاد فرمائی وہ دنیاوی معاملات میں مشورہ کے مترادف ہے اور شریعت کا حکم نہیں ہے، اس کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔

بعض صحابہ کرام ایسے بھی تھے جو عشقِ رسول کی انتہا پر تھے۔ وہ یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ کون سی بات آپ نے بطور انسان ایک مشورہ کے طور پر فرمائی ہے اور کون سی بات بطور نبی ہدایت ربانی کے طور پر فرمائی ہے۔ صحابہ کرام تو لفظاً اور اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کچھ صحابہ مسجد نبوی کے اندر کھڑے تھے اور نماز وغیرہ کی تیاری کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا کہ جو کھڑے ہیں وہ بیٹھ جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں کئی ایسے صحابہ بھی بیٹھ گئے جو ابھی گلی میں تھے اور مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ گلی ہی میں بیٹھ گئے۔ بعد میں حضور نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں بیٹھ گئے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یا رسول اللہ آپ کی زبان مبارک سے بیٹھ جانے کا حکم سننے کے باوجود کیسے نہ بیٹھتے۔ حضور ﷺ نے اس پر ان کے لئے برکت کی دعا کی اور ان کے اس عمل کو ناپسند نہیں فرمایا۔ تو صحابہ کرام میں تو ایسے عشاق اور فدا کار بھی تھے جو یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ حضور کی کون سی بات بحیثیت انسان کے عام بات ہے اور کون سی بات بطور نبی کے ایک ہدایت ہے۔ انہوں نے تو جو کچھ زبان مبارک سے نکلا اس پر اسی وقت عمل کر لیا۔

بعد میں جب فقہی احکام کو مرتب کرنے کا مرحلہ آیا اور فقہا نے ایک ایک چیز کو الگ الگ متعین کیا کہ کیا فرض ہے، کیا واجب ہے، کیا مندوب ہے، کیا مستحب ہے اور کیا جائز ہے تو پھر اس اہم سوال کا جواب پانا ناگزیر ہو گیا کہ ہر چیز کے بارے میں الگ الگ حکم متعین کیا جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات میں جو شرعی رہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں بھی بعض احکام و ہدایات کی حیثیت فرض اور واجب کی ہے۔ بعض ارشادات میں کسی چیز

نہیں فرمائی۔ وہ سب پیغمبر کی ہدایت اور رہنمائی ہے۔ عبادات اور مکارم اخلاق کے بارے میں جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ شرعی ہدایت اور رہنمائی ہے۔

وہ معاملات ایسے ہیں جہاں اس بات کی گنجائش ہے کہ آپ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بطور ایک عام انسانی مشورہ کے ارشاد فرمائی ہو۔ ایک کا تعلق عام انسانی زندگی اور عادات سے ہے۔ دوسرے کا تعلق معاملات سے ہے۔ انسانوں کے درمیان لین دین اور تجارت کے معاملہ میں شریعت کا مزاج یہ نظر آتا ہے کہ شریعت رائج الوقت معمولات یا تصورات کو سو فیصد ختم نہیں کرتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اپنے زمانے کے رائج الوقت کاروباری طریقوں کو مکمل طور پر منع نہیں فرمایا۔ کاروبار کے وہ طریقے جو کسی پہلو سے کسی ناجائز عنصر پر مشتمل تھے، اس ناجائز عنصر کو آپ نے منع فرما دیا۔ اس طرح سے کاروبار اور تجارت کے تمام جائز پہلوؤں کی نشاندہی فرما کر بقیہ حصوں کو آپ نے اسی طرح جاری رہنے دیا۔ یہ مضاربہ اور مشارکہ اور دوسرے متعدد کاروبار سب اسلام سے پہلے سے رائج تھے۔ مضاربہ کو اگر ہم اسلامی طریقہ کار کہتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا حدیث میں آیا ہے کہ اے مسلمانو مضاربہ کیا کرو۔ بلکہ یہ طریقہ عربوں میں اسلام سے پہلے سے رائج تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پندرہ بیس سال قبل حضرت خدیجہ کا مال لے کر مضاربہ فرمایا۔ یہ طریقہ کار عرب میں رائج تھا۔ دنیا میں ہر جگہ sleeping partners کا سسٹم رائج ہے۔

ان معاملات میں جو چیز شریعت سے متصادم تھی اور جن میں ناجائز عناصر کی آمیزش تھی ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرما دی اور جو پہلو جائز تھے ان کی آپ نے اجازت دے دی۔ یوں تجارت اور کاروبار میں جائز اور ناجائز دونوں کو حضور نے الگ کر کے بیان فرما دیا۔ اس لئے معاملات کی حد تک شریعت کا منشا یہ تھا کہ معاملات میں جو ناجائز یا غلط پہلو ہیں ان کی اصلاح کر دی جائے اور باقی پہلوؤں کو جاری رکھا جائے۔ اس لئے معاملات میں اس امر کی قدرے گنجائش تھی کہ حضور ﷺ کا کوئی ارشاد بطور مشورہ کے ہے یا بطور شرعی رہنمائی کے ہے۔ حضور ﷺ خود اپنے زمانے کے کامیاب ترین تاجر تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تجارتی سامان لے کر بارہا ایک علاقے سے دوسرے علاقے تشریف لے گئے۔ نبوت سے

پہلے آپؐ نے کئی تجارتی سفر فرمائے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جزیرہ عرب کے مشرق میں جو بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں جہاں چین اور ہندوستان سے مال آتا تھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں بھی تشریف لے گئے اور چینی اور ہندوستانی تاجروں سے ملاقات ہوئی۔

یہاں اگر ہمارے کوئی جاٹ بھائی موجود ہوں تو ان کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ ان تجارتی سفروں کے دوران جاٹوں سے بھی رسول اللہ ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک دلچسپ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معراج کے سفر میں مختلف انبیا سے ملاقات کی تو مختلف انبیا کا حلیہ بھی بیان فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ بیان فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ انہیں دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے ہندوستان کے جاٹ ہوتے ہیں۔ طویل قامت، بلند قد، ورزشی جسم اور کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ اس طرح آپؐ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد وقامت اور جسمانی ساخت کو ہندوستان کے جاٹوں سے تشبیہ دی۔

اب محدثین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جاٹوں کی ساخت اور قد وقامت کا علم کہاں سے ہوا۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے اپنے تجارتی اسفار میں ہندوستان سے آنے والے تاجروں سے معاملہ کیا ہوگا۔ ان کے ساتھ تجارت بھی کی ہوگی۔ اسی طرح چین سے بھی حضور کی واقفیت چینی تاجروں کے ذریعے ہوئی جو یہاں آیا کرتے تھے۔ اب اگر تجارت کے معاملے میں حضور کوئی بات کسی سے ارشاد فرمائیں تو اس میں دونوں امکان موجود ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک تجربہ کار بزرگ تاجر کی حیثیت سے کسی نوجوان اور نووارد تاجر کو مشورہ دے رہے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور نبی اور پیغمبر کے رہنمائی ارشاد فرما رہے ہوں۔

اسی طرح سے عادات میں یعنی قوموں کے عام رہن سہن کے طریقہ کار میں، لوگوں کے کلچر کے انداز میں، کھانے پینے اور لباس میں ہر علاقے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہر علاقے کا لباس اس کی آب وہوا اور موسم کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر علاقے کے کھانے پینے کا طریقہ اس علاقے کی پیداوار اور موسم کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے کبھی ان چیزوں میں مداخلت نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ فلاں علاقے کے لوگو! فلاں چیز کھانا چھوڑ دو۔ یا فلاں چیز کھایا کرو۔ یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، نہ اسلام اس کام کے لئے آیا ہے۔ البتہ کھانے پینے کے

طور طریقوں اور لباس میں جو چیز ناجائز تھی وہ آپ نے کھل کر بیان کر دی اور بتا دیا کہ یہ ناجائز ہے باقی چیزیں جائز ہیں۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام آداب اور عادات کے باب میں ہیں ان میں شریعت نے انسانوں کو بہت آزادی دی ہے اور مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مباحات کے اس وسیع دائرہ ہی کی وجہ سے فقہا کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ جو بات آپ نے ارشاد فرمائی ہے وہ مباحات کے اس دائرہ میں ایک مشورہ ہے یا حلت و حرمت کا کوئی سوال ہے، یا یہ ایک ایسا میدان ہے کہ یہاں غلط فہمیوں کا امکان بھی ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں انسان کے غلط فہمی کا شکار ہونے کا امکان تھا وہاں حضور نے اس کا راستہ بند کر دیا۔ مکارم اخلاق انسانوں میں مشترک رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے ہر دور میں مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ ہر پیغمبر نے بد اخلاقی سے روکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف ان مکارم اخلاق کو برقرار رکھا جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے بقایاجات کے طور پر چلے آ رہے تھے۔ بلکہ ان کی تکمیل فرمائی۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، میں اس کام کے لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں۔ گویا جو مکارم اخلاق پہلے سے آ رہے تھے ان کو برقرار رکھوں، ان کی مزید وضاحت کروں اور ان میں جہاں جہاں کمی باقی ہے اس کو پورا کر کے اپنے ماننے والوں کو مکارم اخلاق کا ایک پورا نظام دے دوں۔ مکارم اخلاق میں جہاں جہاں انسانی عقل سے غلطی کا امکان تھا وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت فرما دی۔ جہاں مکارم اخلاق میں ماضی کے کسی فرد یا قوم کی جانب سے کوئی غلطی پیدا ہوگئی تھی اس کو آپ نے دور فرما دیا۔ اس اعتبار سے جو اختلافی مباحث ہیں وہ عموماً آداب اور معاملات کے میدان میں ہیں۔ مکارم اخلاق، عقائد اور عبادات میں ایسے اختلافی امور نہ ہونے کے برابر ہیں۔

محاضرات سیرت کا ایک پہلو اور بھی ہے جو ان تینوں پہلوؤں سے مختلف ہے اور براہ راست سیرت کا حصہ بھی ہے اور حکمت تشریع کا حصہ بھی ہے۔ حکمت تشریع سے مراد یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں جو ایک مکمل نظام قانون دیا گیا ہے اس کی بنیادی حکمت اور بنیادی تصورات کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے تمام احکام ایک حکمت پرمبنی ہیں۔ شریعت کے کچھ بنیادی مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے یہ احکام دیے گئے ہیں۔ ان احکام پر عمل درآمد کو

ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک غالباً چھ سات سال تھی۔ حضور کے بہت بچپن کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔ جناب عبدالمطلب ابھی حیات تھے جب جسٹینین دنیا سے رخصت ہوا۔

لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اہم کام میں جسٹینین کا اپنا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کام میں اپنا ذاتی کارنامہ اس لئے نہیں ہے کہ یہ سارے قوانین پہلے سے موجود تھے۔ ایک ہزار برس سے ان پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ ان کے کئی تحریری مجموعے موجود تھے۔ جسٹینین نے کچھ لوگوں سے کہا اور انہوں نے تمام قوانین کو جمع کر کے ان کی ایک جامع کتاب مرتب کر دی۔ زیادہ سے زیادہ اس کارنامے کو اورنگزیب عالمگیر کے فتاویٰ عالمگیری کے برابر کا کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کے کہنے پر تقریباً 200 فقہا نے بیٹھ کر فتاویٰ عالمگیری مرتب کر دی۔ اس میں اورنگزیب کا صرف اتنا کارنامہ ہے کہ اس کے حکم سے یہ کام ہوا۔ اس کا کارنامہ سوائے اس کی دلچسپی کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہی جسٹینین کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے از سر نو بنیادی تصورات عطا فرمائے۔ بنیادی تصورات کے بعد جب نظام عطا فرمایا تو اس کے قواعد اور اساسات عطا فرمائے۔ پھر ان اساسات کی بنیاد پر ایک مکمل اور elaborate legal system آپ نے عطا فرمایا۔ پھر اس لیگل سسٹم پر بے شمار لوگوں نے غور کیا ہے۔

دنیا کے قانونی نظاموں اور تصورات پر غور کرنے والوں اور کتابیں لکھنے والوں نے نظری کام تو بہت کیا ہے۔ لیکن آج تک کوئی ایسا قانون دان انسان کی معلوم تاریخ میں روئے زمین پر نہیں ہوا ہے جس نے خود قانون کا کوئی تصور دیا ہو، قانون کے اساسات وضع کئے ہوں اور ان کی بنیاد پر نظام بھی بنا دیا ہو۔ نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا بھی دیا ہو اور دس لاکھ مربع میل رقبے پر اس نظام کے مطابق ریاست اور معاشرت کا قیام بھی کر کے دکھا دیا ہو۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کو بجا طور پر نوع انسانی کا مقنن اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اور حضور ہی نوع انسان کے مقنن اعظم کہلانے کے مستحق اور حقدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے معجزات میں ایک بہت بڑا معجزہ خود آپ کی شریعت بھی ہے جو اپنے ربط، نظم، تناسق اور تکامل کے اعتبار سے دنیا کے نظاموں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ بیک وقت معلم اخلاق بھی ہیں اور مقنن بھی ہیں۔ آپ کا دیا ہوا قانون اخلاقی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم اور روحانی ہدایت کی روشنی سے مستنیر ہے۔ آپ کے دیئے ہوئے اخلاق محض نظریاتی نعرے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد پر ایک پورا عملی نظام منضبط صورت میں موجود ہے جس پر کروڑوں انسان عمل پیرا رہے ہیں۔ آپ کے دیئے ہوئے قانون شریعت پر اخلاقی اصولوں اور اقدار سے متصف ہوئے بغیر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مرحلہ پر جا کر اخلاق اور قانون دونوں اس طرح ضم ہو جاتے ہیں جیسے ضم ہیں۔ قرآن پاک سے یہ دونوں چیزیں نکلی ہیں اور پوری شریعت کو اپنے دائرہ میں لے کر وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ مرکز انسان کا مزاج، طبیعت اور ساخت ہے۔ یہ دونوں اخلاق اور قانون وحی الٰہی کے چشمے سے مستنیر ہیں۔ وحی الٰہی ان دونوں کی اساس اور بنیاد ہے۔

مغرب اور دور جدید کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ناقص مذہب سے مایوس ہو کر اور سینٹ پال کی دی ہوئی غیر عملی مذہبیت کی ناکامی کو دیکھ کر مذہب ہی سے ہاتھ دھو لئے۔ بجائے اس کے کہ اہل مغرب یہ غور کرتے کہ جو مذہب ان تک پہنچا ہے وہ کس حد تک حقیقی اور عملی ہے، انہوں نے مذہب ہی سے جان چھڑانے میں عافیت سمجھی۔ مذہب سے جان چھوٹی تو اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی۔ اس لئے کہ مذہب کے علاوہ اخلاق کی کوئی اور مستقل اور پائیدار بنیاد آج تک دریافت نہیں ہو سکی۔ جب اخلاق سے بھی جان چھوٹ گئی تو اخلاق اور قانون کا تعلق ختم ہو گیا۔ آج کل مغرب میں ایک بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ وہ چیز ان کو positive درکار ہے۔ پازیٹو سے مراد مثبت اور عملی والا پازیٹو نہیں۔ بلکہ ان کے ہاں آج کل پازیٹو سے مراد یہ ہے کہ جو چیز جیسے ہے ویسے ہی اس پر عمل کیا جائے۔ ہر چیز کو amoral ہونا چاہئے۔ قانون کو value-neutral ہونا چاہئے۔ اخلاقی، مذہبیات اور روحانیات کا دائرہ محدود کرنا چاہئے۔ ان سب چیزوں کو معاشرتی اور اجتماعی نظام سے دیس نکالا دے دینا چاہئے۔ جب ایک بار اخلاق اور روحانیات کو دیس نکالا دے دیا تو پھر قانون کی حقیقی اور پائیدار بنیاد ختم ہو گئی۔ اب قانون کی بنیاد کیا ہو۔ قانون کے بارے میں وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہو۔ نہ اللہ اور رسول سے اس کا کوئی تعلق ہو۔ کسی مذہب کی پرچھائیں تک ان کے دعوے کے بموجب قانون پر نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قانون ایک ایک

کر کے آہستہ آہستہ اپنی معنویت کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور اصطلاحات میں عجیب تعارض پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ سوشل سائنسز ہوں یا ہیومینٹیز، ان سب کو ویلیو نیوٹرل ہونا چاہئے۔ یعنی اخلاقی اقدار سے ماورا یا پاک ہونا چاہئے۔ یہ نہ دیکھیں کہ کیا ہونا چاہئے۔ تجربی اور اطلاقی علوم کی طرح انسانی اور معاشرتی علوم میں بھی یہ دیکھیں کہ کیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں، بلکہ نظر انداز کرتے ہیں کہ کیا ہے میں تو بہت کچھ ہے۔ چوری چکاری بھی ہے، جھوٹ بھی ہے، بداخلاقی اور بددیانتی بھی ہے۔ ان سب مظاہر کا مطالعہ کر کے تو سوشل سائنسز کا مطالعہ ہوگا۔ ورنہ یہ مطالعہ معروضی اور متعصبی نہ رہے گا۔ اس طرح کی سوشل سائنس کو خوبصورت ناموں سے یاد کر کے لگتے ہیں کہ ان کے تصورات اور خیالات بھی خوشنما ہو گئے ہیں۔ وزین لهم الشیطان اعمالهم، شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ خوبصورت اصطلاحات کے پردے میں مکروہ اور مخفی تصورات کو چھپا دیا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ قانون وہ نہیں ہو سکتا جو سمجھ لیا گیا ہے۔ معاشرہ میں تو آج کل بھی چوری ہے۔ اب اگر قانون یہ کہنا چاہے کہ چوری نہیں ہونی چاہئے تو اس کو ایک ویلیو پوزیشن لینی پڑتی ہے۔ ویلیو پوزیشن وہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ اگر ویلیو پوزیشن قانون کو نہیں دیتے تو وہ قانون نہیں رہتا، اخلاقیات بن جاتا ہے۔ یہ سوشیالوجی بن جاتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ پچھلے پچیس تیس سال سے مغربی قانون دانوں کو درپیش ہے۔ آج کل jurisprudence پر جو کتابیں آ رہی ہیں ان میں یہ مسئلہ بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ قانون کو کیسے موثر بنایا جائے۔ اس طرح کا کوئی مسئلہ فقہائے اسلام کے ہاں پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو شریعت عطا فرمائی تھی اس میں قانون، اخلاق، روحانیات اور مذہبی عقائد یہ چاروں چیزیں اس طرح یکجا ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ سورتیں دیکھیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک ایک کر کے وہ اخلاقی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں، روحانیات کی وہ اساسات تعمیر ہو رہی ہیں جن پر آگے چل کر قانون کی تعمیر ہوئی۔ یہ meta-jurisprudence کی بنیاد ہے۔ پھر جب حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان اخلاقی بنیادوں کی تکمیل بھی ہوئی۔ اس پر قانون کی دیوار بھی

عادی کو ختم کر دیں۔ اب اگر یہ تدریج کسی کے سامنے نہ ہو تو اس کے لئے حکمت تشریع کو سمجھنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔

کچھ لوگ یہ سوچتے ہوئے بھی کہ احکام میں یہ تدریج ہے، بعض درمیانی یا ابتدائی احکام کو لے کر ہمارے اس دور کے بعض غیر اسلامی روایات اور غیر شرعی معاملات کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف وہ سود حرام ہے جو سود در سود یعنی compound interest کے دائرہ میں آتا ہو۔ حالانکہ کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی حرمت تو سود کی حرمت کا ایک مرحلہ تھا۔ اس کے بعد اور بھی مراحل آئے۔ شراب کی حرمت کئی مراحل میں آئی۔ اسی طرح سے کئی اور احکام ایسے ہیں جن کی حرمت یا وجوب کا نزول مختلف مراحل میں ہوا۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نزول احکام اور اصلاحات نبویہ میں تدریج کو سمجھنے کے لئے سیرت سے واقفیت ضروری ہے۔

بعض معاملات ایسے ہیں جن میں نسخ کا اصول کارفرما رہا۔ پہلے لوگوں کو کسی خاص چیز کے لئے تیار کرنے کی خاطر ایک حکم دیا گیا۔ جب لوگوں کی ذہنی اور مزاجی سطح ایک خاص حد پر آ گئی تو پھر دوسرا اصلی اور دائمی حکم دیا گیا۔ قرآن پاک میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ نسخ کا یہ تصور قرآن پاک میں کئی جگہ ملتا ہے۔ پانچ چھ آیتوں کے بارے میں تو تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ ان میں نسخ یا تدریج کا یہ عمل ہوا ہے اور احادیث کے کئی احکام کے بارے میں ملتا ہے۔ میں نے ایک گفتگو میں مثال دی تھی کہ جب شراب کی حرمت کا حکم آیا تو حضور ﷺ نے شراب کے بعض برتنوں کے استعمال سے منع کرنے کا حکم بھی دیا کہ میں تمہیں شراب کے فلاں فلاں برتنوں کے استعمال سے بھی روکتا ہوں۔ جب شراب کی پابندی عام ہو گئی اور لوگ شراب کے بغیر زندگی کے عادی ہو گئے اور انہوں نے ان برتنوں کا استعمال بھی ترک کر دیا تو ان کی حرمت بھی ختم کر دی گئی۔ شراب سازی اور شراب داری کے برتنوں کی یہ حرمت ایک وقتی چیز تھی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی بڑی برائی کو روکنے کے لئے اس برائی کے ذریعے کا راستہ بھی بند کر دے۔ چاہے اس راستہ میں فی نفسہ کوئی برائی نہ ہو، لیکن اگر وہ راستہ کسی برائی کی طرف لے جاتا ہو تو برائی روکنے کی خاطر اس راستہ کو بھی روکا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا

اختیار حکومت کو حاصل ہے۔

یہ جو تدریج آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ حکمت تشریع کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہ حکمت تشریع کی ایک بہت اہم بنیاد ہے۔ حکمت تشریع کا ایک اور اہم اصول جس کی طرف مختلف موضوعات کے ضمن میں اور مختلف مواقع پر آپ نے بار بار توجہ دلائی وہ تیسیر کا عنصر ہے یعنی آسانی پیدا کرنا۔ خود قرآن پاک میں ہے یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا۔ پھر آپ نے مختلف مواقع پر جب مختلف لوگوں کو مختلف علاقوں میں باہر بھیجا، کسی کو قاضی، کسی کو گورنر، کسی کو معلم بنا کر بھیجا تو ان کو یہ ہدایت دی کہ لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل دونوں کو ایک ذمہ داری پر بھیجا اور ان سے فرمایا کہ یسروا ولا تعسروا، آسانی پیدا کرنا، مشکل پیدا نہ کرنا۔ بشروا ولا تنفروا، لوگوں کو خوش خبری دینا، متنفر نہ کرنا۔ اس لئے تیسیر کے پہلو کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر جو فیصلے فرمائے، بعض اقدامات کئے۔ اگر تیسیر کا اصول سامنے نہ ہو تو ان معاملات کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی۔

پھر قرآن پاک میں حکمت تشریع کے دو اصول اور بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں پر غیر ضروری قانون سازی کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اس ضمن میں ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے قرآن پاک میں کہا گیا ہے: 'ویضع عنہم اصرہم والاغلال التی کانت علیہم' یعنی یہ پیغمبر لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور جو زنجیریں ان پر ڈال دی گئی ہیں وہ دور فرماتے ہیں۔ اس اصول کا صاف الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ عامۃ الناس پر قواعد وضوابط کا بوجھ کم سے کم ڈالا جائے۔

یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل دنیا بھر والوں نے ڈی ریگولیشن قرار دیا ہے۔ جس کو وہ ڈی ریگولیشن کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ قانون کے بوجھ کو حتی الامکان کم کیا جائے اور لوگوں کے لئے آسانی پیدا کی جائے۔ یہی بات حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ آسانی پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو، غیر ضروری طور پر قوانین کا بوجھ نہ بڑھاؤ۔ پابندیاں کم سے کم کرو۔ بوجھ کو گھٹاؤ اور لوڈ شیڈنگ کرو۔ لوگوں کے لئے حرج یعنی غیر ضروری مشکل اور مشقت پیدا نہ کرو۔ رفع حرج اور رفع مشقت بھی شریعت کی حکمت کا ایک عام اصول ہے۔

ایک اور اہم بات جو حضور نے حکمت تشریع کے حوالے سے بیان فرمائی۔ وہ بڑی غیر معمولی ہے جس کو نہ جاننے اور نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ کل پرسوں ہماری کسی بہن نے سوال کیا تھا کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے اور وہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ حکمت تشریع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ حکمت تشریع یہ ہے کہ شریعت کے جو بنیادی مقاصد اور اہداف ہیں سب سے پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ اگر بنیادی اہداف اور بعد والی چیزوں میں کوئی تعارض ہے تو اہداف کو ترجیح دی جائے۔ جب اہداف تکمیل ہو جائیں تو پھر بعد والی چیزوں پر توجہ دی جائے۔ بعد والے احکام اور شریعت کی مندوبات میں کوئی تعارض ہے تو مندوبات کو نظر انداز کر کے واجبات کو ترجیح دی جائے۔ مندوبات اور مباحات میں تعارض ہے تو مباحات کو نظر انداز کر کے مندوبات کو ترجیح دی جائے۔ یہ ترتیب شریعت کی حکمت کا ایک بنیادی اور ناگزیر حصہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا حکم جو شریعت میں مطلوب ہو، جس کا شریعت حکم دیتی ہو، جس کو شریعت قائم کرنا چاہتی ہو، لیکن آپ یا فیصلہ کرنے والے دیانت داری سے یہ سمجھیں کہ اگر اس حکم پر عمل کیا گیا تو اس کے نتیجے بہت سی ایسی قباحتیں پیدا ہو جائیں گی جو اس حکم پر عمل نہ کرنے کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہوں گی۔ اور اگر فی الحال اس کو نظر انداز کر لیا جائے تو شاید اتنی قباحتیں پیدا نہ ہوں۔ تو اس حکم پر عمل درآمد کو وقتی طور پر ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کرتا ہوں جو اس معاملہ میں بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور سیرت کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی تو کعبہ کی عمارت مستطیل تھی۔ ایک طرف سے بیضوی تھی اور دوسری اطراف سے مستطیل تھی۔ اس وقت کی کی عمارت کی طرح چوکور نہیں تھی۔ اسی طرح سے یہی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے رسول اللہ ﷺ کے بچپن تک چلی آرہی تھی۔ جو چوکور نہیں تھی، مستطیل تھی اور آگے سے بیضوی شکل کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی نوجوانی کا زمانہ تھا جب مکہ مکرمہ میں سیلاب آیا جس سے کعبہ کی دیواروں کو نقصان پہنچا اور دیواریں گر گئیں۔ کچھ سامان سیلاب کے ساتھ بہہ گیا۔ اس وقت قریش مکہ نے یہ طے کیا کہ ہم بیت اللہ کی عمارت کی از سر نو تعمیر کریں گے۔ چونکہ ملت ابراہیمی کے کچھ نہ کچھ آثار اور بقایاجات ان میں موجود تھے۔ اس لئے ان کو یہ احساس تھا کہ ہماری

آمدنی کا خاصا حصہ ناجائز دولت یا ناپاک آمدنی پر مشتمل ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر شخص جائز اور پاکیزہ آمدنی الگ کر کے دے۔ اس سے ہم کعبہ کی تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہ جائز اور پاکیزہ دولت جمع کی۔ اس سے سامان خریدا، مزدور لگائے اور بیت اللہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ وہی موقع تھا جب رسول ﷺ کو حجر اسود کی تنصیب کے لئے متفقہ طور پر چنا گیا تھا اور آپ کے صادق و امین ہونے کا اعتراف کیا گیا تھا۔ جب بیت کی تین اطراف کی دیوار بن گئی اور چوتھی طرف کی دیوار رہ گئی تو پیسے ختم ہو گئے۔ باقی جو پیسہ تھا وہ ناجائز کاروبار، دولت بازی کا اور چوری کا پیسہ تھا وہ انہوں نے لگایا نہیں۔ اس پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت عمارت کو نامکمل چھوڑ دیا جائے اور آگے نامکمل حصہ کا ایک نشان چھوڑ دیا جائے بعد میں جب جائز وسائل دستیاب ہوں گے تو اس کو مکمل کر دیں گے۔

چند سال کے بعد رسول اللہ ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ آپ نے اسلام کی دعوت دی اور لوگ دعوت کی موافقت اور مخالفت میں لگ گئے۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں کی توجہ اس طرف ہو گئی اور بیت اللہ کی تعمیر یا نامکمل عمارت کی تکمیل کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ کہ اگر تمہاری قوم اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوئی ہوتی اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ یہ اسلام سے پھر جائے گی تو میں کعبہ کی عمارت کو ڈھا کر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دیواروں پر استوار کرتا۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشہ کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر نو شریعت کا ایک مقصد تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بیت اللہ کی عمارت کو گرانے کی ضرورت تھی اور بیت اللہ کی عمارت گرانے سے یہ خطرہ تھا کہ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں یا منافقین کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ پہلے تو اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا داعی کہتے تھے۔ لیکن کامیابی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھا دیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ لہٰذا لوگوں کے برگشتہ ہونے کے خطرہ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے یہ کام نہیں کیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ شریعت

کے مقاصد اور احکام میں یہ دیکھنا چاہئے کہ بڑا مقصد کون سا ہے، چھوٹا مقصد کون سا ہے۔ کسی چھوٹے مقصد کی خاطر بڑے مقصد کو نظر انداز کر دینا حضور ﷺ کی سیرت، سنت اور حکمت تشریع کے خلاف ہے۔

یہ سمجھنا کہ کس مقصد کے بڑا یا چھوٹا ہونے کا یقین بڑا دشوار کام ہے۔ یہ کام فقہائے اسلام اور محدثین بہت پہلے کر چکے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام اور محدثین نے چودہ سو برس غور کر کے یہ معاملہ صاف کر دیا ہے کہ شریعت کے احکام میں کس حکم کی کیا حیثیت ہے اور کس حکم کو کس درجہ پر رکھنا چاہئے۔ چونکہ بہت سے مواقع پر یہ چیز نظر انداز ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے حضرات اس ترتیب، تدریج اور اس حکمت تشریع کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نظر انداز کر دینے سے نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے مخالفین اور کمزور عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

فقہیات سیرت میں ایک اہم چیز جو ضروری ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک اور آپ کے عہد مبارک کے ماحول سے واقفیت ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں کون سا محاورہ رائج تھا، کون سی عادات اور طور طریقے رائج تھے۔ یہ جاننا شریعت کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ پاکیزہ اور طیب چیزیں کھاؤ۔ کئی جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز ہیں اور ناپاک چیزیں تمہارے لئے ناجائز ہیں۔ احل لکم الطیبات، پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز قرار دی گئی ہیں۔ اب فقہا کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ پاکیزہ چیزوں سے کیا مراد ہے۔ جو چیزیں قرآن پاک یا احادیث میں صراحتاً جائز قرار دی گئیں ان کا پاکیزہ ہونا تو معلوم ہے۔ ان کے علاوہ کس کس چیز کو پاکیزہ سمجھا جائے۔ اس پر محدثین اور فقہا کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم یعنی عرب اور قریش اور ملت ابراہیمی، ان کے محاورے اور معاشرہ میں جو چیز طیب سمجھی جاتی تھی وہ طیب سمجھی جائے گی۔ جو چیز ناپاک اور گندی سمجھی جاتی تھی اس کو ناجائز اور حرام سمجھا جائے گا۔ اس اصول کے تحت کچھ جانوروں کا گوشت اور دودھ جائز ہے۔ کچھ جانوروں کا دودھ اور گوشت جائز نہیں ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں کچھ ایسے بھی آتے ہیں جن میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ ان کا شمار پاکیزہ چیزوں میں ہے یا ناپاک چیزوں میں۔ کچھ

ہے۔ ابن قیم نے سیرت کے تمام پہلوؤں کو ایک ایک کر کے بیان کر دیا ہے۔ پھر ان سے جو فقہی احکام نکلتے ہیں وہ بیان کئے ہیں۔ جو دروس اور عبرتیں کسی واقعے میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ غزوات کے بیان کے بعد جنگی قوانین کے احکام تو نکالے ہی ہیں معاہدات اور صلح کے احکام تو یقیناً بیان کئے ہیں۔ لیکن جزوی اور انفرادی معاملات کے بہت سے احکام بھی مختلف غزوات کے دوران جو واقعات پیش آئے ان سے استنباط کر کے بیان کئے۔ بہت سے اخلاقی پہلو بھی بیان کئے۔

مثال کے طور پر غزوہ احد کے واقعات کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے پہلے غزوہ احد کے احکام اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ پھر سولہ احکام بیان کئے ہیں جو غزوہ احد کے واقعات اور معاملات سے نکلتے ہیں۔ پھر ایک اور فصل میں جو حکم، دروس اور عبرتیں غزوہ احد کے سارے قصے میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔ صلح حدیبیہ کی تفصیلات بیان کر کے 34 فقہی احکام بیان کئے ہیں۔ یہ سارے کے سارے مباحث فقہیات سیرت کا ایک انتہائی اہم اور بنیادی مضمون ہے۔ سورۃ فتح کی روشنی میں صلح حدیبیہ کی حکمتیں اور اس کے احکام، اسی طرح سے فتح مکہ اور غزوہ حنین سے الگ الگ احکام نکالے ہیں۔ بعض جگہ ارباب سیرت میں چونکہ واقعات کی تفصیلات میں اختلاف ہے، اس لئے اس اختلاف کے نتیجے میں احکام میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر قانون جنگ کا ایک حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شہر کسی جنگ کے نتیجے میں فتح ہو تو مفتوحہ علاقوں کے احکام اور ہیں۔ اور اگر صلح کے نتیجے میں فتح ہو تو اس کے احکام دوسرے ہیں جو صلح کی شرائط میں طے کئے گئے ہوں۔ اسلامی تاریخ میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں کہ کچھ علاقے جو صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ ایسے علاقوں پر صلح کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ کچھ علاقے فتح کے ذریعے مسلمانوں کے قبضے میں آئے، ان پر فتح کے احکام جاری کئے گئے۔

اس کی بڑی دلچسپ مثال دمشق کی فتح ہے۔ مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید پوری فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ حضرت عمر فاروق ان کے بعض فیصلوں کے بارے میں شرح صدر نہیں

رکھتے تھے ایران کی رائے یہ تھی کہ سپہ سالار کمان سے حضرت خالد کو معزول کر دینا چاہئے۔ جب
حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو پہلا کام انہوں نے حضرت خالد کی معزولی کا حکم بھیجنے کا کیا اور کمان
حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ سونپنے کی ہدایت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان دمشق کا محاصرہ کئے
ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضور کی
وفات کے بعد جو دو نام خلافت کے لئے تجویز کئے تھے ان میں سے ایک حضرت ابوعبیدہ کا تھا۔
آپ نے فرمایا تھا کہ تم میں حضرت عمر فاروق اور حضرت ابوعبیدہ موجود ہیں ان دونوں میں سے
کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یعنی وہ اس درجہ کے انسان تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق کے
نزدیک ان کا نام حضور کے براہ راست جانشین کے طور پر ایک موزوں اور مناسب نام تھا۔

جب حضرت ابوعبیدہ کو اپنے تقرر کا یہ خط ملا تو انہوں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی اور خط
اپنے پاس رکھ لیا۔ قاصد کو بتایا کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلے کہ خلیفہ رسول کا انتقال ہو گیا ہے
اور ان کی جگہ نئے خلیفہ منتخب ہو گئے ہیں اور نئے خلیفہ نے سپہ سالار کمان تبدیل کر دی ہے۔ وہ خود
بدستور حضرت خالد کی کمان میں جنگ کرتے رہے۔ شہر کے ایک طرف کے دروازے
پر حضرت ابوعبیدہ کمان کر رہے تھے۔ دوسری طرف کے دروازے پر حضرت خالد خود کمان
کر رہے تھے۔ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ حضرت ابوعبیدہ نے اپنے علاقے کے دروازہ
پر متعین کردہ دشمن کے کمانڈر سے مصالحت کر لی۔ اور اس سے طے کر لیا کہ وہ چند طے شدہ
شرائط پر شہر کا دروازہ کھول دے اور مسلمان فوجیں صلح کر کے شہر میں داخل ہوں۔ عین اس وقت
جب صلح کی یہ گفتگو مکمل ہوئی حضرت خالد شہر کا دروازہ توڑ کر شہر میں فاتحانہ داخل ہونے میں
کامیاب ہو گئے۔ حضرت خالد کو ابوعبیدہ کی اس کارروائی کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت
ابوعبیدہ کو حضرت خالد کے فاتحانہ داخل ہو جانے کا علم نہیں تھا۔ حضرت خالد کا خیال یہ تھا کہ وہ
ایک طرف سے داخل ہو کر شہر کے دوسرے دروازے کی طرف سے نکل جائیں گے تو پورا شہر فتح
ہو جائے گا۔ لیکن جب فوجیں درمیان میں آئیں تو دیکھا کہ دوسری طرف سے ابوعبیدہ کمان
کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حضرت خالد نے پوچھا کہ آپ کیسے داخل ہوئے!
انہوں نے کہا کہ صلح کر کے داخل ہوا ہوں۔ اس پر حضرت خالد نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور
کہا کہ تمہاری وجہ سے اب وہ مراعات دینی پڑیں گی جو صلح میں دی جاتی ہیں۔ آپ نے کہا

صلح کی اور کس کی اجازت سے کی؟ حضرت ابوعبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ حضرت خالد کو یہ بدگمانی تھی اس لئے انہوں نے بہت کچھ کہا۔ روایت میں آتا ہے کہ بہت سخت سست کہا۔ حضرت ابوعبیدہؓ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر یہ طے ہوا کہ جہاں دونوں کمانداروں کے گھوڑوں کے سر آپس میں ملے ہیں وہاں ایک لکیر کھینچ دی جائے۔ آدھے شہر پر فتح کے احکام جاری ہوں گے اور آدھے پر صلح کے احکام جاری ہوں گے۔ چنانچہ آدھے دمشق شہر پر وہ احکام جاری ہوئے جو حضرت ابوعبیدہ نے صلح کی شرائط کے ضمن میں طے کئے تھے۔ آدھے پر فتح کے احکام جاری ہوگئے۔ جب یہ سارے معاملات طے ہوگئے اور سب لوگ ضروری انتظامات سے فارغ ہوکر اپنے کیمپ میں پہنچے تو حضرت خالد نے پوچھا کہ آخر آپ نے اتنا اہم فیصلہ کرنے کے لئے مجھ سے اجازت کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔ اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے وہ خط دکھایا کہ اس لئے نہیں پوچھا۔ خط دیکھ کر حضرت خالد رو پڑے اور کہا کہ واقعی تم جیسا آدمی بننے سے قاصر ہیں۔

اسی طرح کا اختلاف فتح مکہ کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں بھی ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو فتح مکہ اور شہری حیثیت کیا تھی۔ کیا یہ فتح جنگ کے نتیجہ میں ہی تھی یا صلح کے نتیجہ میں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ صلح کے نتیجہ میں فتح ہوا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے فتح ہوا۔ دونوں میں فرق ہے۔ جو فقہائے کرام سمجھتے تھے کہ مکہ صلح کے نتیجہ میں فتح ہوا ان کے نزدیک مکہ کی زمین اور مکانات کے احکام اور ہیں۔ جو سمجھتے تھے کہ مکہ بزور اور فوج کشی کے ذریعے فتح ہوا ہے ان کے خیال میں مکہ کی جائدادوں کے احکام اور تھے۔ ابن قیم نے بھی اس بارہ میں رائے دی ہے۔

فقہیات سیرت کا بڑا میدان جس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں، اور ہمارے صدر محفل جسٹس خلیل الرحمن خان صاحب نے اس پر ایک کتاب بھی تیار کرائی ہے۔ وہ اقضیۃ الرسول کا میدان ہے۔ یعنی عدالت نبوی اور دربار رسول کے فیصلے۔ رسول اللہ ﷺ نے بطور قاضی اور سربراہ ریاست کے جو فیصلے کئے تھے وہ کیا تھے۔ ان سب فیصلوں کو الگ الگ موضوع وار یکجا جمع کرنے کی آج سے نہیں بلکہ ایک ہزار سال سے کوششیں ہو رہی ہیں۔ محدثین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں حضور ﷺ کے فیصلے نقل کئے ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی اور کئی ایک دوسرے

محدثین نے ان کے لئے الگ الگ ابواب اپنی اپنی کتابوں میں باندھے ہیں۔ محدثین کے ان ابواب کے علاوہ الگ سے مستقل کتابیں بھی اس موضوع پر لکھی گئیں۔ خود ابن قیم نے زاد المعاد کی پانچویں جلد ساری کی ساری اسی کام کے لئے وقف کی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بیان فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیاوی معاملات کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" کہ تم اپنے دنیاوی معاملات سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہو۔ یہ فرق بعض صورتوں میں تو بالکل واضح ہوتا تھا اور صحابہ کرام کو اس بارے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات ان معاملات میں جہاں صحابہ کرام کو شبہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ فیصلہ ان دونوں میں سے کون سی نوعیت کا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال غزوہ بدر کے موقع پر سامنے آئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ طے کر لیا کہ اب قریش کے لشکر سے مقابلہ کرنا ہے اور قریش کی فوجوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہونے والی ہے تو آپ نے ایک جگہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہاں مسلمانوں کی فوج کو کیمپ قائم کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج وہاں کیمپ لگا کر قیام کی تیاری کرنے لگی۔ اس پر ایک انصاری صحابی حضرت حباب بن المنذرؓ نے جو انصار میں ایک بڑے صاحب الرائے سردار تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ جگہ جو آپ نے منتخب کی ہے تو کیا اس انتخاب کا حکم اللہ نے دیا ہے؟ اگر وحی کے ذریعے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے تو اس میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ام هو الرأي والحرب والمكيدة، یا یہ آپ کی ذاتی رائے اور جنگی تکنیک اور چال ہے؟ آپ نے فرمایا بل هو الرأي والحرب والمكيدة، بلکہ یہ میری ذاتی رائے، جنگی حکمت عملی اور تکنیک ہے۔ حضرت حباب بن المنذر نے عرض کیا کہ پھر میرا خیال یہ ہے کہ یہ جگہ نہیں بلکہ فلاں جگہ زیادہ موزوں ہے۔ پھر انہوں نے اس جگہ کی خوبیاں بیان کیں تو آپ نے حضرت حباب بن المنذر کی رائے سے اتفاق فرمایا اور اپنی رائے سے رجوع فرمایا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں بہت سے مباحث اس مضمون سے متعلق بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو کی مثال میں آپ کے سامنے ابھی پیش کرتا ہوں۔

پر حیرت کا اظہار کیا کہ امام ابوحنیفہ کس طرح اور کس بنیاد پر اتنے کھلے اور واضح حکم کو بطور سربراہ ریاست کے ایک فیصلہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن آج نہیں بلکہ کئی سو سال سے دنیا میں امام ابوحنیفہ ہی کے نقطۂ نظر پر عمل ہو رہا ہے۔ جن ممالک میں فقہ مالکی اور فقہ شافعی رائج ہے وہ بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ مراکش میں فقہ مالکی کی حکومت ہے۔ وہاں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں کہ حکومت کی مرضی کے بغیر جس غیر آباد زمین کو چاہے آباد کر کے اپنی ملکیت میں شامل کر لے۔ حکومت کی اجازت وہاں بھی ضروری ہے۔ مصر میں جہاں فقہ شافعی کی اکثریت ہے، وہاں بھی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی مصری کاشتکار غیر آباد زمین کو آباد نہیں کر سکتا۔ وہاں بھی حکومت کی اجازت ضروری ہے۔ گویا عملاً دنیا نے امام ابوحنیفہ کے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بطور بیان شریعت کے نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک اجازت تھی جو بطور سربراہ ریاست کے حضور نے دی تھی اور آئندہ جب کوئی سربراہ ریاست یہ اجازت دے گا یا حکومت کا متعلقہ محکمہ اس کی اجازت دے گا تو اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ ایک مثال ہے اس اختلاف کی جو رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے بارے میں سامنے آیا۔

ایک اور مثال۔ جنگ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ سپاہیوں کو جوش دلانے کے لئے کبھی کبھی یہ اعلان فرمایا کرتے تھے: من قتل قتیلا فلہ سلبہ۔ کہ اگر کسی دشمن کو قتل کر دو گے تو اس کا ساز و سامان قتل کرنے والے کا ہو جائے گا۔ من قتل قتیلا فلہ سلبہ۔ سلب اس ذاتی ساز و سامان کو کہتے ہیں جو کسی سپاہی کے اپنے تصرف میں ہو۔ مثلاً اس کے جسم پر کوئی کپڑے ہیں، زیور ہے، زرہ ہے، تلوار اور دیگر ہتھیار ہیں، یہ چیزیں مال غنیمت میں شمار نہیں ہوں گی اور قتل کرنے والے مجاہد کی ہوں گی۔ اب من قتل قتیلا فلہ سلبہ۔ کے بارے میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے درمیان وہی اختلاف ہے جو مردہ زمین کی آبادکاری کے بارے میں تھا۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ یہ بات حضور نے بطور فوج کے کمانڈر کے فرمائی تھی۔ غالباً غزوہ بدر میں یہ بات ارشاد فرمائی۔ اس لئے جب اسلامی فوج کا کمانڈر میدان جنگ میں مناسب سمجھے تو ایسا حکم دے سکتا ہے۔ اور اس جنگ میں شرکت کرنے والے سپاہیوں کو اجازت ہو گی کہ اگر اسلامی فوج کا کوئی سپاہی دشمن فوج کے کسی سپاہی کو قتل کر دے تو اس کا ذاتی سامان قتل

اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی حق کسی کے ذمہ
واجب الادا ہو اور وہ جائز ہو اور اتفاق سے حق دار کو وہ رقم مل جائے تو امام مالک کے نزدیک
جائز ہے کہ وہ اپنا حق وصول کرے۔ امام مالک کے پورے احترام کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ
آج اگر اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ امام ابو حنیفہ اس پورے
واقعہ کی تعبیر اور تفسیر یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک عام مشورہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے خاندان کے
ایک بزرگ کے طور پر دیا۔ ابوسفیان کے خاندان سے حضور کی رشتہ داریاں تھیں اور آپ اس
خاندان کے لوگوں سے فرداً فرداً ذاتی طور پر واقف تھے۔ خاندان کا بزرگ ہی اپنے ذاتی امور
میں مشورہ دے سکتا ہے۔ حضور کو یقین تھا کہ ابوسفیان اس کو محسوس نہیں کریں گے۔ جب ان کو
پتہ چلے گا کہ حضور نے یہ مشورہ دیا ہے تو وہ خوشی سے اس کو قبول کر لیں گے۔ اس لئے یہ ایک
بزرگانہ اور خاندانی مشورہ تھا۔ جس طرح ایک بھائی بہن سے کہے کہ تم بقدر ضرورت لے
لیا کرو اور اس کو یقین ہو کہ بہن کا شوہر اس پر اعتراض نہیں کرے گا

یہ چند وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ ان پر
کیسے عمل درآمد کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں 'ملت ابراہیمی کے
تقاضاجات' کے نام سے فقہیات سیرت کے ایک نئے پہلو پر توجہ دی ہے۔ قرآن پاک میں
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کا روحانی باپ کہا گیا ہے۔ ملت ابیکم ابراہیم۔
حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیشہ اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا ہے۔ ملت ابراہیمی
کے پیروکار ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑی تفصیل اور گہرائی
کے ساتھ بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ بحث قابل دید ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یوں تو
تمام انبیا علیہم السلام کی بعثت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک تمہید تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ
السلام کی بعثت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے ایک فوری مقدمہ یا فوری ارہاص یا
تمہید تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ ایک بین الاقوامی ملت پیدا کی۔ وہ پہلے
پیغمبر تھے جنہوں نے مختلف اقوام میں دین کی تعلیم دی۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت
ابراہیم علیہ السلام وہ واحد نبی ہیں جن کی بعثت مختلف اقوام کے لئے ہوئی۔ جنہوں نے عراق،
شام، فلسطین، مصر اور جزیرہ عرب میں تبلیغ کے فرائض سرانجام دیئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روم بھی تشریف لے گئے۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آپ
ہندوستان بھی تشریف لائے۔ لیکن یہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مشن
رکھنے والے پہلے پیغمبر ہیں اور اس بین الاقوامیت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی ملت بعض ایسے
اساسات پر قائم ہو جو انسان کی فطرت کے قریب تر ہوں۔ انسانی فطرت جلد ان کو تسلیم کر لیتی ہو۔
ان اساسات کا اعتراف کرتی ہو اور ان کی بنیاد پر جو عالمگیر تہذیب قائم کی جائے وہ تمام
انسانوں کے درمیان ایک مشترک تہذیب کے طور پر پنپ سکتی ہو۔

یہی سبب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیرو قرار دیا۔ ملت
ابراہیمی کا مرکز بیت اللہ روز اول سے ہی چلا آرہا تھا۔ حج حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے شروع کیا۔ حج کے تمام احکام اور مراسم جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے دور
حضور کے زمانے تک چلے آرہے تھے اور ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بیت اللہ کا
طواف، بیت اللہ کی حرمت، حجاج کرام اور عمرہ کے لئے آنے والوں کا اللہ کے نام پر قربانی
دینا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی، منیٰ کا قیام، عرفات کا اجتماع، یہ ساری وہ عبادات تھیں جو
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو
جاہلیت کے زمانے میں بعض عربوں نے چھوڑ دی تھیں تو ان کو رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ بحال
کرادیا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں جو بعض لوگوں نے جاہلیت کے دور میں شرارت یا جہالت سے حج
میں شامل کر دی تھیں وہ حضور نے نکال دیں۔ اور حج کی عبادات کو پاکیزہ اور منقح کر کے دوبارہ
ملت ابراہیمی کے مطابق قائم کر دیا۔ یہ ساری تفصیل جاننے کے لئے ضروری ہے کہ جب شریعت
کے احکام کی بنیاد پر کوئی عالمگیر ملت یا معاشرہ قائم کیا جائے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
چھوڑے ہوئے اصول اور آپ کی دی ہوئی سمت کے آثار وہ بنیادی جہات اس کی بنیاد ہوں گے اور
ان ہی بنیادوں پر یہ تہذیب قائم کی جائے گی۔

جو چیزیں عرب لوگ ناپسند کرتے تھے ان کی ناپسندیدگی کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ مثال کے طور پر منیٰ میں شروع سے میلہ اور بازار لگا کرتا تھا۔
باہر سے آنے والے قبائل اپنا سامان لا کر وہاں بیچا کرتے تھے۔ یہ چیز قریش اور طائف کی
تجارت کو نقصان پہنچاتی تھی۔ قریش کے بعض بڑے بڑے ساہوکاروں کا خیال تھا کہ منیٰ کے

پیروی میں بقیہ صحابہ کرام نے بھی اپنی اپنی جائدادوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ وہ جائداد پھر انہی لوگوں کی قرار پائی جو اس پر قابض تھے۔ مورخین اور سیرت نگاروں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس نے کس کی جائداد پر قبضہ کیا تھا۔ میں نے بعض تفصیلات نوٹ کی ہیں لیکن ان کو بیان کرنے کا اب وقت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مہاجر صحابہ کرام میں سے کچھ صحابہ کرام تو اپنی جائداد کی چابیاں اپنے کسی دوست کو دے آئے تھے۔ ان دوست نے جائیداد پر خود قبضہ کر لیا یا اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اکادکا صورتوں میں امانت کی حفاظت بھی کی گئی اور جب اصل مالکان مکہ آئے تو ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔ لیکن یہ واقعات بہت شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں۔ اکثر صورتوں میں وہ جائدادیں ہاتھ سے چلی گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو واپس لینے کی کوشش نہیں کی۔ امام ابوحنیفہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر کسی دشمن ملک کا شہری کسی اسلامی ملک کے مسلمان شہری کی جائداد پر قبضہ کر لے تو وہ جائداد اس قابض ہی کی سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ جائدادیں ان غیر مسلموں کی نہ ہوگئی ہوتیں جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے تو رسول اللہ ﷺ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ناجائز جائداد کا برقرار رہنا پسند نہ فرماتے اور اس کو تلقین فرماتے کہ تمہارے قبضہ میں یہ جائداد ناجائز ہے۔ حضور کا اس پر اعتراض نہ کرنا اور مسلمان ہونے کے باوجود انہی ہاتھوں میں اس جائیداد کا رہنا اور بعد میں ان کا اس میں اپنی جائداد کی طرح تصرف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور نے ان کی اس ملکیت کو درست تسلیم کیا۔ جب حضور نے ملکیت کو درست تسلیم کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احراز کی بنیاد پر ملکیت مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ غیر مسلم دشمن کے لئے ہے جو حالت جنگ میں ہو۔

دوسرے فقہا بالخصوص امام شافعی اور امام مالک اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اس اصول پر عملدرآمد سے بہت قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مالکی اور شافعی فقہاء نے بہت شد و مد سے ان قباحتوں کا ذکر کیا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ احراز کا اصول ہے جس سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کر کے اس اصول کو بیان کیا ہے۔

ایک اور اہم بات جو فقہیات سیرت سے متعلق ہے جس کے بارے میں فقہائے اسلام نے بڑی بحثیں کی ہیں وہ جزیہ کا حکم ہے۔ ان بحثوں میں کئی چیزیں ایسی بھی آگئیں جن کی

وجہ سے غیر مسلموں کو مسلمان امت کے بارے میں بہت سی غلط اور بے سروپا باتیں کہنے کا موقع ملا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اس شرط پر کیا جا سکتا ہے کہ وہ جزیہ اور ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں: حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون۔ جزیہ کے لفظی معنی بدلہ، consideration کے ہیں۔ یعنی غیر مسلموں سے شہریت کا معاہدہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب وہ حفاظتی ٹیکس یا شہریت کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جس طرح مسلمان زکوۃ یا عشر ادا کرتا ہے۔ اسی طرح غیر مسلم خراج ادا کرتا ہے۔ مسلمان سے زکوۃ لی جاتی ہے جو نا قابل تغیر اور تبدیل ہے۔ غیر مسلم سے جزیہ لیا جاتا ہے جس کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے اور کمی بھی کی جا سکتی ہے۔ مسلمان سے زرعی پیداوار پر عشر لیا جاتا ہے جبکہ غیر مسلم سے خراج لیا جاتا ہے۔ خراج معاف بھی ہو سکتا ہے لیکن عشر معاف نہیں ہو سکتا۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ عشر، زکوۃ، خراج اور جزیہ کے معاملے میں غیر مسلموں کی حالت مسلمانوں کی نسبت بہتر ہے، کیونکہ بعض صورتوں میں وہ اس سے مستثنیٰ بھی ہیں اور بعض صورتوں میں مکمل معافی اور کمی کے بھی مستحق ہیں۔ جبکہ مسلمان نہ زکوۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہے اور نہ ہی اس میں تخفیف ہو سکتی ہے۔

اس سیاق وسباق میں قرآن میں آیا ہے کہ حتى يعطوا الجزية وهم صاغرون یہاں صاغرون سے کیا مراد ہے۔ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ وہ چھوٹے ہو کر جزیہ دیں۔ چھوٹے ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں اور بعض فقہا نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کی وجہ سے بعض غیر مسلموں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم دوسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں۔ امام شافعی نے اس کی بڑی خوبصورت اور معقول تعبیر کی ہے اور کتاب الام میں لکھا ہے کہ والصغار ان يجري عليهم حكم الله صغار سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم یعنی قانون کی بالادستی قبول کر لیں۔ شریعت کی بالادستی قبول کرنے کے بعد یعنی اسلامی ریاست کے دستور کو بطور قانون ماننے کے بعد وہ ریاست میں برابر کے شہری کے طور پر قبول کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ریاست کے مالی تقاضے اور ضروریات اسی طرح ادا کریں جیسے مسلمان ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے غیر مسلموں کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جائے۔

یہ وہ چند مسائل تھے جو فقہیات سیرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض چیزیں میں ضروری سمجھتا تھا لیکن میں نے چھوڑ دی ہیں، کیونکہ وہ تفصیلات سے متعلق تھیں۔ فقہیات سیرت میں فقہائے اسلام نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ اجتہاد فرماتے تھے؟ بعض فقہا کا خیال ہے کہ حضور اجتہاد نہیں فرماتے تھے۔ ان حضرات کی رائے میں اجتہاد تو ہم جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ نبی تو صاحب شریعت اور صاحب وحی ہے۔ اس لئے نبی کو اجتہاد کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس بعض فقہا کا خیال ہے کہ جن معاملات میں واضح رہنمائی نہیں ہوتی تھی حضور ﷺ ان معاملات میں اجتہاد فرماتے تھے۔ چونکہ آپ کا اجتہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے محفوظ اور مامون تھا اس لئے وہ بھی وحی کا ایک حصہ تھا۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے اجتہاد کے بجائے ملکۂ نبوت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بعض فقہا نے اس کے لئے فہم نبوی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ اجتہاد نبوی ہو یا فہم نبوی ہو، یہ وہ صورت ہے جس سے رسول اللہ ﷺ اپنی سنت اور حدیث سے ارشاد فرماتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شریعت کی فہم میں جو غیر معمولی ملکہ حاصل ہو چکا تھا اس کا اندازہ ہم سب کر سکتے ہیں۔ اس کی روشنی میں حضور بعض معاملات کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دو مواقع پر ایسا ہوا کہ حضور نے ایک چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا اور قرآن پاک میں اس کے بارے میں تھوڑا سا اختلافی حکم آگیا۔ اس حد تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بعد میں بدل گیا۔ لیکن آخر وہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ کے علاوہ ۔ حضور نے جو فیصلہ کیا قرآن پاک نے اس کی تائید کی اور اسی کے مطابق قوانین شریعت بعد میں مرتب ہوئے اور تیار ہوئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

—☆—

سوال و جواب

رسولِ پاک ﷺ کے وہ فیصلے جو آپ نے بطور قاضی کئے،
صرف فریقین مقدمہ پر نافذ ہوتے تھے۔ جبکہ آج سپریم کورٹ
کا فیصلہ پورے ملک میں نافذ العمل ہوتا ہے اور اس وقت تک
نافذ العمل ہوتا ہے جب تک اس کے برعکس فیصلہ نہیں آتا۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جہاں سپریم کورٹ نے قانون کے کسی پہلو کی وضاحت کی ہو یا کوئی قانون enunciate کیا ہو۔ یہ حصہ تو ہر شخص کے لئے واجب التعمیل ہے اور تمام ماتحت عدالتیں اس کی پابند ہیں۔ جس طرح رسول ﷺ کی ان ہدایات اور فیصلوں کا ہر مسلمان پابند ہے جو حضور نے بطور نبی کے ارشاد فرمائے۔ لیکن سپریم کورٹ کے فیصلہ میں بحث کا جو خاص حصہ ہوتا ہے جس میں متعلقہ عرضداشت یا اپیل کے بارے میں رائے دی ہوتی ہے وہ صرف فریقین پر نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے جو میں نے عرض کیا اس میں اور اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

★

کسی مصلحت کے پیش نظر حاکم وقت جب فیصلہ کرتا ہے۔ نبی
کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کو موجودہ صورت حال پر برقرار رکھا
حالانکہ آپ کی خواہش تھی کہ حضرت ابراہیم کے طریقے کے مطابق
بنایا جائے کیونکہ اس سے پہلے تو یہی قبلہ ہونا اعتراض کا موجب تھا۔
مسلمان دنیا پر قابض بھی ہو گئے۔ پھر بھی قبلہ موجود ہے؟

میں آپ کے اس سوال کو صحیح طرح سے سمجھا نہیں۔ غالباً آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ

حد درجے نفیس ہے تو وہ جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ شریعت نے اوامر و نواہی بیان کر دیئے ہیں۔ محرمات بھی واضح ہیں۔ واجبات اور فرائض سب واضح ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ شریعت کی رو سے کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

دورِ نبوت سے پہلے کا رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل تو وہ ملت ابراہیمی کے مطابق تھا اس میں کوئی چیز ملت حنفیہ سے متعارض نہیں تھی۔ لیکن اس عمل کی بنیاد پر حلال و حرام کے احکام مرتب نہیں کئے گئے۔

☆

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیرت اور فقہ کے درمیان وہی نسبت ہے جس کو اہل منطق عموم خصوص من وجہ کہتے ہیں؟

جی ہاں بالکل وہی نسبت ہے۔

☆☆

فردوسی کے فارسی اشعار کا ترجمہ بیان کر دیجئے۔

فردوسی کے اشعار تو ضمناً آ گئے تھے۔ میں صرف یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ عربوں کے ماحول میں گوہ کا گوشت کھانے کا رواج تھا۔ عرب قبائل گوہ کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ چونکہ ایران کی قوم نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن تھی اس لئے ایرانی عربوں کو غیر مہذب سمجھتے تھے اور عربوں کے ساتھ جب استہزا کیا کرتے تھے تو دوسری باتوں کے علاوہ اس ضمن میں اونٹ کے دودھ اور گوہ کے گوشت کا حوالہ بھی دیتے تھے۔ فردوسی نے کسی قدیم ایرانی سردار کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور کہا ہے کہ

اونٹ کا دودھ پینے اور سوسمار یا گوہ کا گوشت کھانے سے،
عربوں کی نوبت اب اتنی ہو گئی ہے
کہ وہ کیانی تاج و تخت کی آرزو کرنے لگے ہیں
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

زاد المعاد کے علاوہ فقہیات سیرت پر چند مستند کتابوں کے نام
بتا دیں۔

فقہیات سیرت پر تمام بڑے سیرت نگاروں نے لکھا ہے اور یہ مواد سیرت کی تمام بڑی کتابوں میں منتشر موجود ہے۔ فقہ کی کتابوں میں بھی منتشر طور پر موجود ہے۔ فقہیات سیرت پر اگر زاد المعاد کے علاوہ کوئی تفصیلی کتاب ہے تو وہ ہمارے شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ جس کو آپ فقہیات سیرت کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سیرت اور احادیث کے بے شمار مسائل پر شاہ صاحب نے بحث کی ہے۔

☆

جیسا کہ آپ نے چیزوں کے پاک اور ناپاک ہونے کے
بارے میں بتایا۔ براہ کرم اس بات کی بھی وضاحت کر دیں
کہ جانوروں کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں فقہ
میں کیا قاعدہ ہے؟ یعنی مثلاً گھوڑا کیوں حرام ہے اور اونٹ کیوں
حلال ہے؟ پانی میں مچھلی حلال اور مینڈک کیوں حرام ہے؟

آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ گھوڑا بھی شریعت میں حلال ہے۔ تمام فقہاء گھوڑے کے گوشت کو جائز کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ مکروہ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ اگر گھوڑے کے گوشت کو کھانا شروع کر دیا جائے تو جہاد کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ جہاد کے ذرائع کے تحفظ کی خاطر امام صاحب نے اس کو مکروہ قرار دیا ورنہ وہ جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دریائی اور سمندری جانوروں میں وہ جانور حلال ہیں جن کو عرب پاکیزہ اور جائز سمجھتے تھے۔ امام صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ عرب صرف مچھلی کو پاکیزہ سمجھتے تھے۔ مچھلی کے علاوہ بقیہ جانوروں کو ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک سمندری جانوروں میں مچھلی کے علاوہ کوئی اور جانور حلال نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر سمندری جانور جائز ہے اس لئے کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ أحل لكم صيد البحر وطعامه،

ٹھہرے سے پتے سمندر کا شکار ہو کر کھانا حلال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سمندر میں پلنے والی جو چیز کھانے کے قابل ہے وہ آپ کھا سکتے ہیں۔

بعض اوقات امام مالک کا فتویٰ بڑا ہی عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ میں آج سے بارہ تیرہ سال پہلے جاپان گیا۔ میں امریکہ سے ایک طویل سفر کر کے جاپان پہنچا تھا۔ کئی وقت سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے میرے جو میزبان اسٹیشن سے لینے آنے والے تھے وہ موجود نہیں تھے۔ ایک صاحب تھے جو جاپانی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے اشاروں سے دو ایک چھوٹے موٹے الفاظ میں کہا کہ مجھے کھانا کھانا ہے۔ وہ مجھے ہوٹل لے گئے۔ لیکن جو کچھ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اور جو میں بتانا چاہتا تھا وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی میں نے اتنی بات ان کو سمجھا دی کہ مجھے ہوٹل میں sea food منگوا دیں۔

وہ تو ہوٹل کے بیرے کو سمجھا کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوٹل کا بیرا کھانا لے آیا۔ میں شدید بھوک کے عالم میں منتظر تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بڑی پلیٹ میں کچھ لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں جیسوں قسم کے سمندری جانور اور کیڑے تھے، جو رینگ رہے تھے، کچھ آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہے تھے، کچھ رینگتے ہوئے تھے۔ کچھ تلے ہوئے تھے۔ اب اگر عام حالات ہوتے تو شاید اس کو دیکھ کر مجھے الٹی ہو جاتی۔ لیکن میں نے بہت احتیاط سے اس انبار میں دو کیڑے تلاش کر کے پہلے الگ کئے جو تلے جا چکے تھے۔ پھر دل ہی دل میں امام مالک کو دعائیں دیتے ہوئے میں نے وہ چیزیں کھائیں۔

☆

آپ نے معاملات اور عبادات کے بارے میں بتایا۔ غیبیات صرف حضور کے بتانے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام علمِ غیب جانتے تھے؟

آپ بار بار یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں۔ میں کئی بار یہ بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر کو جتنا علمِ غیب دیا تھا وہ آپ جانتے تھے۔ جو غیبیات حضور نے ہمیں بتائے ہیں وہ اللہ کے

میرے خیال میں داڑھی کا شمار سنن عادات میں نہیں ہے۔ داڑھی عادات میں بھی ہے، لیکن یہ سنت بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی۔ داڑھی کو تمام انبیا کی سنت قرار دیا۔ سنت زوائد سے مراد وہ سنت ہے جو حضور کا اپنا طرز عمل تو ہے لیکن اس کا حضور نے دوسروں کو تاکیدی حکم نہیں دیا۔ حضور کا لباس ایک خاص طریقے کا تھا وہ سنن زوائد میں سے ہے۔ حضور کے دعائیں مانگنے کے کچھ خاص طریقے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ حضور بعض نوافل ادا کرتے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ وہ چیزیں جن کی حضور نے دوسروں کو تاکید نہیں فرمائی اور ان پر عمل نہ کرنے پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ وہ سنن زوائد میں سے ہیں۔

☆

آپ نے مقاصد شریعت کی طرف اشارہ کیا اور ان کو بیان کیا۔ کیا کسی ایک مقصد کی تکمیل کے لئے دوسرے مقصد کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

جی بالکل کیا جا سکتا ہے۔ ان مقاصد میں ایک ترتیب ہے جس کو لازماً ملحوظ رکھنا ہو گا۔ آپ پہلے مقصد کی خاطر دوسرے مقصد کو قربان کر سکتے ہیں۔ ایک فرق کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسان جان قربان کرنے کے لئے مشکل سے تیار ہوتا ہے۔ اس لئے اگر جان بچانے کے لئے صرف زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا جائے، بشرطیکہ دل و جان ایمان پر مطمئن ہوں، تو قرآن نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس ایک اجازت کے علاوہ بقیہ تمام مقاصد میں اس ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اس میں تحفظ جان سب سے پہلے اور تحفظ مال سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے اگر مال قربان کر کے جان بچائی جا سکتی ہے تو بچانی چاہئے۔

☆

آپ نے فرمایا کہ صحابہ آپ کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ جب آپ نے کدو کا گوشت پسند نہیں کیا تو صحابہ نے

کیوں کھایا؟

رسول اللہ ﷺ ساتھ ساتھ صحابہ کی تربیت بھی کرتے تھے اور یہ بھی بتاتے تھے کہ کچھ معاملات میں شریعت کا حکم کیا ہے اور حضور کا ذاتی ذوق کیا ہے۔ صحابہ کرام کے مختلف مدارج تھے۔ بعض صحابہ کرام کا رویہ بڑا عاشقانہ تھا۔ بعض کا بڑا مؤدبانہ تھا۔ ہر ایک اپنے طرز کے مطابق حضور کی پیروی کرتا تھا۔

☆

مدینہ منورہ مکہ مکرمہ کے شمال میں ہے اور غار ثور جنوب میں ہے۔ تو آپ نے جنوب کی طرف کیوں ہجرت فرمائی؟

بظاہر تو تعلیمات سیرت کے ساتھ اس سوال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے غالباً یہ سوچا کہ کفار مکہ کو یہ سوچنے سے باز رکھنے کے لئے کہ حضور مدینہ کی طرف گئے ہوں گے۔ اس لئے شمال کی طرف تعاقب کرنے کا امکان زیادہ تھا اور جنوب کی طرف کم تھا۔ اس لئے حضور نے ابتدائی تین دن جنوب کے ایک غار میں قیام فرمایا۔ جب کفار مکہ شمال میں تلاش کر کر کے مایوس ہو گئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دوبارہ اصل راستہ اختیار فرمایا اور سفر جاری رکھا۔ بظاہر یہ ایک حکمت عملی تھی۔

☆

قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ اپنی زبان سے کہتے ہیں وہ ہماری طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ لیکن بعض مواقع پر آپ نے اپنی رائے کو پس پشت ڈال کر کسی صحابی کی رائے کو ترجیح دی۔ کیا اس طرح کے اقوال جو آپ سے منسوب ہیں وہ بھی وحی تصور کئے جائیں گے؟

قرآن پاک کی یہ آیت کہ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ یہ آیت

بنیادی طور پر قرآن پاک کے بارے میں ہے کہ قرآن پاک کے نام سے حضور جو کچھ بیان کر رہے ہیں یہ اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ہماری طرف سے وحی ہے۔ اپنے عام ارشادات کے بارے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں اور جو بات کہتا ہوں وہ تمہاری مصلحت کے لئے ہوتی ہے۔ اپنے دنیاوی معاملات کو تم بہتر جانتے ہو۔

☆

اخلاق کی ایک جامع تعریف ارشاد فرمائیں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ دنیا کے تمام معاشروں کے لئے اخلاق کا ہر پہلو یکساں ہونا چاہیے؟

اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح تو وہ بنیادی اخلاق یا مکارم اخلاق کی سطح ہے جو قرآن پاک میں یا حدیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً سچ بولنے کا حکم ہے، لوگوں کی مدد کرنے کا حکم ہے۔ اچھائیوں کو فروغ دینے کا حکم ہے۔ برائیوں کو مٹانے کا حکم ہے۔ یہ ہر جگہ یکساں ہے۔ لیکن ان سطحوں کے مظاہر یا ظاہری پہلو، وہ ایک دوسری سطح ہے جو مختلف علاقوں میں مختلف ہوگی۔ مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک صاحب ایمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ من کان یومن اللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ۔ جو شخص اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔

اب دیہات میں مہمان کی تکریم کا اور مفہوم ہوگا، بڑے شہروں میں اور مفہوم ہوگا۔ دیہات میں کوئی جائے تو اس کو لسی بھی پلائیں گے، مکھن بھی کھلائیں گے اور درخت کے سائے میں بٹھا کر مکئی کی روٹی بھی کھلائیں گے۔ شہروں میں اگر کسی مہمان کو لسی پلا دیں تو ممکن ہے کہ وہ شکایت ہی کرے کہ مجھے لسی کیوں پلا دی۔ لہٰذا مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔ مشرق و مغرب، متمدن اور غیر متمدن میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

☆

حضرت ابوعبیدہ نے کس مصلحت کی خاطر خط میں موجود حکم کو وقت پر ظاہر نہ کیا؟ جب کہ بعد میں مسائل کا سامنا بھی ہو۔

کوئی مسائل کا سامنا نہیں ہو۔ انہوں نے حکمت یہ سمجھی کہ میدان جنگ میں کمان کی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تو ایک بہت اچھا فیصلہ تھا۔ میدان جنگ میں کمان کی تبدیلی سے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ بعد میں تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شروع میں جو تھوڑی سی ناگواری ہوئی تھی وہ بھی جلد ہی دور ہو گئی۔ بعد میں ان کو بھی محسوس ہو گیا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ درست تھا۔

☆

امام ابوحنیفہ کی جو آرا حکومت کے بارے میں ہیں ان پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح امام شافعی اور امام احمد کی آرا پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لوگ امام ابوحنیفہ کی رائے کو کیوں ترجیح دیتے ہیں جبکہ وہ authentic نہیں ہیں؟

یہ آپ نے کیسے کہا کہ امام ابوحنیفہ کی آرا authentic نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے جو آرا ظاہر کی ہیں وہ ان کے براہ راست شاگردوں کے قلم سے مدون ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ امام محمد اور امام ابویوسف کی کتابوں میں موجود ہیں۔ امام شافعی کی اپنی کتاب کتاب الام میں موجود ہیں۔ authenticity کا جہاں تک تعلق ہے تو دونوں آرا مستند ہیں۔ دلائل سے بعض فقہا امام ابوحنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض حضرات امام مالک اور بعض امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابھی آپ نے احیاء موات کی مثال میں دیکھا کہ امام ابوحنیفہ کا موقف زیادہ مبنی بر حکمت معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے معاملات میں کسی اور فقیہ کا نقطہ نظر درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی علاقہ میں کسی انتظامی سہولت کی خاطر کسی ایک فقیہ کے اجتہادات کو ترجیح دی جائے تو یہ ایک انتظامی فیصلہ ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

☆

دسواں خطبہ

مطالعۂ سیرت ۔ پاک و ہند میں

دسواں خطبہ

مطالعہ سیرت۔ پاک و ہند میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

محترم جناب ڈاکٹر وقار مسعود صاحب،
قابل احترام جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری/ ایم زمان،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
محترم جناب امیر العسکر افتخار احمد سروہی،
برادران محترم،
خواہران مکرم

برصغیر پاک و ہند میں مطالعہ سیرت ایک ایسا مضمون ہے جس پر بہت تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران برصغیر میں سیرت پاک کے موضوع پر کمّاً اور کیفاً اتنا وقیع کام ہوا ہے کہ اس پر برصغیر کے مسلمان باشندوں کو نہ صرف بارگاہ رب العلمین میں سجدہ شکر ادا کرنا چاہئے بلکہ برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس پر کسی حد تک احساس تفاخر بھی ہونا چاہئے۔ برصغیر میں آغاز اسلام سے لے کر ایک طویل عرصہ تک سیرت پر کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ یہاں کی علمی روایت ایک طویل عرصہ تک عقلیات اور لفظیات کے گرد گھومتی رہی ہے، جس کی کچھ جھلکیاں میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ لیکن ماضی کی دو صدیوں میں برصغیر کے اہل علم نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا اور اس کوتاہی کی کما حقہ تلافی

کر دی جو ابتدائی ایک ہزار برس یا دو سو سالوں میں واقع ہوئی تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں نے علوم سیرت اور علوم نبوت پر گزشتہ دو ڈھائی سو سال کے دوران جو کام کیا ہے اس کی عظمت کا اعتراف دنیائے عرب کے بڑے بڑے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ علوم حدیث کا صرف برصغیر میں چرچا تھا اور ان پر صرف برصغیر میں کام ہو رہا تھا۔ برصغیر کا گوشہ گوشہ قال قال رسول اللہ ﷺ کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ یہاں کے چپے چپے پر حدیث اور علوم حدیث کی تدریس، تحقیق اور تصنیف و تالیف کا بازار گرم تھا۔ اس کے برعکس اور دنیائے اسلام کے بیشتر علاقے یا تو علم حدیث سے غافل تھے یا وہاں اس سطح کا کام نہیں تھا جس سطح کا کام برصغیر میں ہو رہا تھا۔

یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خود دنیائے عرب کے بڑے بڑے جید اہل علم نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے۔ دنیائے عرب کے ایک مشہور صاحب علم، مفسر قرآن، مفکر، متکلم اور ادیب علامہ سید رشید رضا بیسویں صدی کے آغاز میں دنیائے اسلام کے سرخیل بن گئے تھے۔ علامہ سید رشید رضا مفتی اعظم مصر مفتی محمد عبدہ کے نامور ترین شاگردوں میں سے تھے۔ وہ اپنے دور کے مصر کے صف اول کے مفسرین اور مفکرین قرآن پاک میں سے تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام کے بیشتر حصوں کا دورہ کیا۔ آخر میں وہ برصغیر آئے۔ یہاں کی مختلف دینی درسگاہوں کا دورہ کیا۔ یہاں کے محدثین اور اساتذہ حدیث سے ملے۔ یہاں کے اہل علم نے حدیث پر جو کام کیا تھا اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس بات کا تحریری اعتراف کیا کہ اگر برصغیر کے ہمارے مسلمان بھائی نہ ہوتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آج علم حدیث کا کیا حال ہوتا، آج علم حدیث باقی ہوتا یا نہ ہوتا۔ یہی معاملہ علوم سیرت کا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط سے مطالعہ سیرت کی جو غیر معمولی سرگرمی برصغیر میں دیکھنے میں آئی اس کی مثالیں دنیائے اسلام میں کم ملتی ہیں۔ آج بھی عرب دنیا میں انتہائی وسیع پیمانہ پر علمی اور بڑے اونچے معیار کی تحقیقی سرگرمیوں کے باوجود سیرت اور علوم سیرت کے موضوع پر برصغیر کے گزشتہ دو ڈھائی سو سال کا کام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبارات سے پوری عرب دنیا کے کام پر بھاری ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ برصغیر کی تاریخ کے ابتدائی دور میں بارہ سو سال تک یا کم از کم گیارہ سو سال تک علوم سیرت میں وہ دلچسپی نہیں رہی جو ہر مسلمان معاشرہ میں ہونی چاہئے۔ یہ وہ

زمانہ تھا کہ جب عرب دنیا میں علوم سیرت پر بڑا قابل ذکر کام ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بڑی کتابیں جن میں سے چند کتابوں کا تذکرہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، وہ سب دنیائے عرب میں مصر، شام اور اندلس میں لکھی گئیں۔ مراکش سے لے کر ایران تک اور ترکی اور مشرقی یورپ سے لے کر سوڈان تک پورے علاقے میں مطالعہ سیرت میں غیر معمولی سرگرمی نظر آتی ہے۔ یہ دور وہ ہے جب برصغیر سیرت کے کام سے تقریباً خالی محسوس ہوتا ہے۔

برصغیر کا مطالعہ کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے۔ وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تاریخ ہے۔ اتنی منفرد کہ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں میں اس انفرادیت کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس ایک ہزار سال حکومت کے باوجود یہاں مسلمانوں کی تعداد کبھی بھی چودہ فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ میں بلکہ دیگر مذاہب کی تاریخ میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے کسی ملک میں چودہ فیصد ہونے کے باوجود چھیاسی فیصد آبادی پر کامیابی کے ساتھ ایک ہزار سال تک حکومت کی ہو۔ اگر ان کی آپس کی کمزوریاں، باہمی اختلافات، انتشار کو یہاں اور دوسرے عوامل ان کو شکست سے دوچار کرتے تو کم از کم یہاں کی مقامی آبادی کے لئے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ مسلمانوں کی بالادستی کو ختم کرنے کی سوچ بھی کامیابی تک پہنچ سکے۔

اس بارہ سو سالہ دور میں برصغیر کے لوگوں نے مختلف علوم و فنون پر کام کیا۔ علم فقہ اور اصول فقہ، ادبیات، معقولات، حدیث اور علم تفسیر۔ یہ قابل ذکر علوم یہاں نظر آتا ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ علوم سیرت سے دلچسپی اور اعتنا بھی کم رہا ہے۔ برصغیر کی تاریخ کو علمی اور فکری اعتبار سے دور جدید کو نکالنے کے بعد جس پر کل گفتگو ہوگی، ہم تین حصوں یا ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ تین حصے وہ ہیں جن میں سے پہلا حصہ دور سندھ کو قرار دیا جا سکتا ہے جب مسلمانوں نے سندھ میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کا یہ علاقہ فتح ہوا اور موجودہ پاکستان کے بیشتر علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب یہاں کے مسلمانوں کے علمی روابط دنیائے عرب کے بڑے بڑے علمی مراکز مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بغداد، دمشق، کوفہ اور بصرہ سے قائم تھے۔ یہاں

کے اہل علم وہاں جاتے تھے اور وہاں کے اہل علم یہاں آتے تھے۔ عربی زبان برصغیر میں سندھ اور موجودہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی علمی زبان تھی۔ یہاں جو کتب لکھی جاتی تھیں وہ عربی میں لکھی جاتی تھیں۔ کچھ کام فارسی میں ہوا۔ اس دور میں یہاں کے سیرت نگاروں میں کئی نام نمایاں طور پر سامنے آئے۔ ابو معشر نجیح السندی کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ ہمارے سندھ کے رہنے والے تھے اور سندھ کے نام کو انہوں نے اس طرح روشن کیا کہ صدر اول کے دوسری صدی ہجری کے مشہور ترین سیرت نگاروں میں شمار ہوئے۔ انہوں نے اپنا اور اپنے علاقہ کا نام نہ صرف سیرت اور علوم سیرت کے میدان میں، بلکہ عربی زبان اور شعر و ادب کے میدان میں بھی عرب دنیا میں روشن کرایا۔ وہ علامہ ابو معشر نجیح سندی تھے۔ افسوس کہ ابو معشر السندی کی کوئی کتاب یا تحریر آج اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔ ان کی بیان کردہ روایات مختلف کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے سیرت کے علم کو محفوظ کرنے میں جو کارنامے انجام دیئے، ان اہل علم، بالخصوص مؤرخین سیرت نے اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن ان کی اپنی کوئی تحریر آج موجود نہیں ہے۔ ان کا سارا علمی کام برصغیر اور سندھ سے باہر ہوا۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے یہ کام نہیں کیا، ورنہ غالباً سندھ کے اہل علم کو ان کی زندگی میں ان کے کام سے زیادہ واقفیت ہوتی۔

ایک اور بڑا نام جو سیرت نگاری اور سیر کے باب میں، یعنی سیرت کے اس شعبہ یا علم کے باب میں نمایاں تھا جس کا تعلق جنگ اور مغازی سے تھا، اور جس کو قانون جنگ کی شکل میں مرتب کیا جا رہا تھا اور علم سیر کے نام سے وہ ایک مستقل فن کی صورت میں سامنے آ رہا تھا۔ اس فن میں انہوں نے مہارت اور امامت کا درجہ حاصل کیا۔ میری مراد امام اہل الشام امام عبدالرحمن الاوزاعی سے ہے۔ امام عبدالرحمن الاوزاعی امام ابو حنیفہ کے معاصر تھے۔ امام ابو حنیفہ کا انتقال 150 ہجری میں اور امام اوزاعی کا انتقال 157 ہجری میں ہوا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے۔ دونوں نے اسلام کے بین الاقوامی قانون یعنی علم سیر کو اپنی دلچسپی کا موضوع قرار دیا۔ ان موضوعات پر ان دونوں حضرات نے کتابیں چھوڑیں۔ ان موضوعات پر ان دونوں حضرات کے خیالات اور اجتہادات پر مبنی کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ امام اوزاعی کی اپنی کتاب سیر الاوزاعی بھی موجود ہے اور اس پر امام ابو حنیفہ کے ایک شاگرد امام ابو یوسف کی

طرف لکھی جانے والی سے تردید یعنی Rejoinder 'الرد علی سیر الاوزاعی' بھی موجود ہے۔ امام اوزاعی کی بات ذرا لمبی ہوگئی۔ ان کے بارے میں صرف یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ ان کا سیدالنسب بھی سیر و مغازی تھا اور ان کا تعلق بھی سندھ سے تھا۔

ایک زمانے میں سندھ سے بڑی تعداد میں لوگ نئے جاتے گئے اور وہ عرب کے مختلف حصوں میں جاکر آباد ہوگئے۔ امام اوزاعی بھی ان لوگوں میں تھے۔ اگرچہ امام اوزاعی جب سندھ سے گئے تو بہت کم سن ہوں گے اور ان کی جو بھی تعلیم وتدریس اور تربیت ہوئی وہ دنیائے عرب میں ہوئی۔ دنیائے عرب ہی میں وہ رہے اور اس بیروت کو انہوں نے اپنا وطن بنایا جو آج لبنان ہے۔ بیروت کے جس محلے میں امام اوزاعی کی قبر مبارک ہے وہ آج بھی محلہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ جو مختصر ہوکر امام وزاعی اور اب امام ہوگیا ہے۔ بیروت کے عام لوگ اسے امام اوزاعی کہتے ہیں۔ جیسے ہی ڈرائیور سے کہیں کہ امام جانا ہے تو وہ آپ کو محلہ امام اوزاعی پہنچادے گا۔ یہ روایت جس میں چند مثالوں کا مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سندھ کے دور کی ہیں۔ جیسے ابو معشر سندی کی طرح امام اوزاعی کا سارا کام بھی سندھ سے بہت دور شام میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ سندھ کے اہل علم کو ان کے کام کی صدیوں تک خبر نہ ہوئی اور نہ اس بات کی کہ امام اہل الشام کا لقب پانے والے بابائے مغازی کا تعلق اصلاً سرزمین سندھ سے تھا۔ ان حالات میں ان دونوں بزرگوں کے کام کو سندھ کا حصہ قرار دینا مشکل ہے۔

جب سندھ کا دور ختم ہوگیا اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے سیاسی اور انتظامی روابط افغانستان اور وسط ایشیا سے قائم ہوگئے تو برصغیر کی علمی اور فکری تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں یہاں کے مسلمانوں اور حکمرانوں کے سیاسی روابط عرب دنیا سے پہلے کمزور ہوئے اور پھر ہوتے ہوتے بالکل ہی کٹ گئے کیونکہ عباسی سلطنت کمزور ہوگئی۔ درمیان میں مختلف علاقوں کے حاکم خودمختار ہوگئے اور صوبہ سندھ کا براہ راست رابطہ دنیائے عرب سے کٹ گیا۔ جب انتظامی اور سیاسی روابط کٹ گئے تو علمی روابط پر بھی اثر پڑا۔ علماء اور طلبہ کی جو براہ راست آمد ورفت تھی اور یہاں کے حضرات وہاں جاکر کسب فیض کیا کرتے تھے، وہ روایت کمزور پڑگئی۔ اس کے باوجود سندھ کے بعض علاقوں اور خاص طور پر ٹھٹھ میں اور ہندوستان کے مغربی صوبہ گجرات میں عرب دنیا میں جاکر کسب فیض کرنے کی روایت قائم

رہی۔ بہت سے لوگ گجرات اور سندھ سے حرمین اور دوسرے عرب مراکز آتے جاتے رہے۔ وہاں سے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روشنی حاصل کرتے رہے اور وہ روشنی برصغیر میں سندھ اور گجرات کے راستے پھیلتی رہی۔

جتنے اہل علم علم حدیث اور سیرت پر کام کرنے والے سندھ میں پیدا ہوئے شاید اتنے پورے پانچ سو سالہ دور میں پورے سندھ میں پیدا نہیں ہوئے۔ بعد کے دور میں بھی سندھ کے اہل علم سندھ کی علمی تاریخ کا بہت اہم اور درخشاں باب ہے۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، مولانا ابوالحسن سندھی دونوں کی کتابیں بہت مشہور و معروف ہیں۔ سیرت کے موضوع پر علامہ محمد ہاشم ٹھٹھوی نے ایک کتاب لکھی تھی جو عرب دنیا میں بھی بہت مقبول ہے۔ اس کا عربی اور اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے رسول ﷺ کی پوری سیرت کو سامنے رکھ کر ایک ایسا نقشہ مرتب کیا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ پورے سال کے بارہ مہینوں کے باون ہفتوں اور باون ہفتوں کے 354 دنوں میں رسول اللہ ﷺ کے معمولات کیا ہوتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایک ایک دن کے حساب سے جو جو معلومات ملی ہیں وہ جمع کر کے ایک ایسا نقشہ بنا دیا ہے جو اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ ترجمہ ایک بڑی ضخیم کتاب کی صورت میں کراچی سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کا عنوان ہے "عہد نبوت کے ماہ و سال"۔ اس کتاب کی اصل تحقیق سندھ کے ایک عالم علامہ شیخ محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی نے کی تھی۔ انہوں نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں اور علم حدیث اور علوم نبوت پر ان کا کام بہت نمایاں اور قابل ذکر ہے۔

آخری دو صدیوں میں جو دو نام سندھ کی شہرت، عظمت اور احترام کا باعث بنے وہ سندھ ہی کے ایک بزرگ علامہ ابوالحسن سندھی ہیں جن کو ایک بڑی خصوصیت یہ حاصل ہے کہ وہ صحاح ستہ میں سے ہر کتاب کے شارح ہیں۔ جزوی طور پر علامہ جلال الدین سیوطی کے علاوہ کسی اور محدث کو یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا کہ وہ صحاح ستہ کی تمام کتابوں کے شارح رہے ہوں۔ علامہ ابوالحسن نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور ابن ماجہ میں سے ہر کتاب کی شرح لکھی ہے جو مطبوعہ بھی ہے اور دستیاب بھی ہے۔

سندھ کے ان علما اور محققین کا کام باقی برصغیر میں زیادہ عام اور متعارف نہیں ہوا۔ یا تو اس لئے کہ ان میں سے بیشتر حضرات کی زیادہ تر آمد و رفت عرب دنیا میں رہی۔ وہاں ان

کا کام ہندوستان اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں زیادہ معروف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب دنیا میں شیخ ابوالحسن ٹھٹھوی، شیخ محمد عابد سندھی، علامہ محمد ہاشم سندھی اور دوسرے سندھی اہل علم خاصے معروف رہے ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ کتابیں عرب دنیا میں شائع ہوئی ہیں۔ ابھی حال ہی میں پی ایچ ڈی یا ایم فل کا ایک مقالہ کتابی صورت میں شیخ محمد عابد سندھی پر شائع ہوا ہے جو مکہ مکرمہ کے ایک فاضل نے لکھا ہے، مکہ مکرمہ ہی میں چھپا ہے۔ برصغیر کے اکثر اہل علم شیخ محمد عابد سندھی سے واقف نہیں ہیں۔ عرب دنیا میں ان کا نام مشہور و معروف ہے اور ان کے بارے میں چیزیں آتی رہتی ہیں۔

ان جزوی کاوشوں کے علاوہ جن کا دائرہ سندھ اور کسی حد تک گجرات تک محدود تھا، برصغیر کے بقیہ حصے علم سیرت کی روشنی سے بڑی حد تک محروم رہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی ہے کہ علم سیرت برصغیر میں ایک طویل عرصہ تک نصاب کا حصہ نہیں رہا۔ (بلکہ اب بھی ساری ترقیوں اور دعووں کے باوجود بیشتر دینی مدارس کے نصاب میں سیرت پاک کا موضوع الگ سے نصاب میں شامل نہیں ہے)۔

محمود غزنوی نے جب شمال کی طرف سے حملے شروع کئے اور ہندوستان کا بیشتر حصہ محمود غزنوی کی سلطنت کا جزو بن گیا اور موجودہ پاکستان کا بڑا حصہ ان کے انتظام میں آ گیا۔ تو ان کے جانشینوں کے زمانے میں شمالی ہندوستان مسلمانوں کا سیاسی اور ثقافتی مرکز بنا، اور ایک طویل عرصے کے بعد شہاب الدین غوری اور ان کے جانشینوں کے ہاتھوں شمالی ہندوستان میں یہ مرکز قائم ہوا۔

قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک خودمختار حکومت قائم کی۔ وہاں ایک نیا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم سامنے آیا۔ یہ نظام اور نصاب افغانستان اور وسطی ایشیا کی روایات سے مستفید تھا۔ اس نصاب کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں یہ بات بڑی حیرت انگیز اور افسوسناک ہے کہ اس نصاب میں نہ صرف سیرت پر کوئی کتاب شامل نہیں تھی بلکہ علم حدیث اور علوم نبوت کا حصہ بھی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام تھا۔ تفسیر قرآن کا حصہ بھی بہت کم تھا اور علوم نبوت کا حصہ بھی بہت کم۔ حدیث پر ایک آدھ اور جزوی کتب کے علاوہ جو علم حدیث کے ذخائر میں قطرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھی، علم حدیث کا مطالعہ براہ راست اور علوم حدیث میں تخصص

اس نصاب کا حصہ نہیں تھا۔ یقیناً اس کے منفی روحانی اثرات تو ضرور ہوئے ہوں گے لیکن اس
کمزوری یا کوتاہی کے اجتماعی اثرات بھی ہوئے اور مسلمان اہل علم میں دو مسائل نمایاں ہوتے
چلے گئے اور اہل علم کی دلچسپی کا مرکز بنتے گئے جو اسلامی نقطہ نظر سے ہرگز بنیادی اہمیت کے
حامل نہیں تھے۔ بہت سے حضرات کی دلچسپی عربی زبان و قواعد کے صرف اس پہلو پر تھی جس کا
تعلق لفظی چیستانوں اور صرفی نحوی بازی گری سے ہے۔ صرف و نحو کی وہ کتابیں جو صرف و نحو تو
نہیں سکھاتیں لیکن لفظی بازیگری میں خواہ مخواہ طلبہ کو طاق کر دیتی ہیں وہ برصغیر میں خوب رائج
رہیں۔ اور ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کی علمی روایت کی انتہا یہی تھی کہ کس نے کتنے
متون یاد کیے ہیں، کس کو کس متن کے کتنے حاشیے یاد ہیں۔ کتنے حاشیوں کے ذیلی حواشی یاد
ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور علمی سرگرمی ایک طویل عرصہ تک یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔

سلطنت کا پورا دور ایسے ہی گزرا۔ علم حدیث سے ناواقفیت کا یہ عالم تھا۔ ایک چھوٹی سی
مثال عرض کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ ایک سلطان کے دربار میں (میں نام نہیں لوں گا) دو اہم دینی
شخصیات کے درمیان مناظرہ ہوا۔ یہ مناظرہ برصغیر کی تاریخ کے ایک بہت ہی نمایاں دور کی
بہت اہم مثال ہے۔ یہ انتہائی اہمیت کی حامل بات ہے۔ مناظرہ اس موضوع پر ہوا کہ صوفیا کے
حلقہ میں جو سماع ہوتا ہے، یعنی غزلیں یا اس طرح کے جو عشقیہ مضامین سنے جاتے ہیں، یہ
جائز ہیں کہ ناجائز ہیں۔ دونوں بڑی دینی شخصیات نے اپنا اپنا موقف پیش کیا۔

ایک بڑی دینی شخصیت جن کا علم و فضل قابل احترام اور جن کا دینی مقام بہت اونچا ہے،
ان سے پوچھا گیا کہ آپ سماع کو جائز سمجھتے ہیں تو آپ کی دلیل کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ
حدیث میں آیا ہے کہ 'السماع مباح لاهله'۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ایسی کوئی حدیث موجود
ہے، نہ سماع کا لفظ ان معنوں میں حضور ﷺ کے زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ معلوم نہیں کس کا
قول ہے لیکن بہرحال یہ کسی متاخر صوفی کا قول ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے
کہ برصغیر میں علم حدیث سے ناواقفیت کتنی عام تھی۔ اور برصغیر کے تمام علاقوں کے لوگوں میں
جہاں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا، وہاں علم حدیث سے کتنی دوری تھی۔

اس کے بعد دور سلطنت ختم ہو گیا اور مغل سلطنت قائم ہو گئی۔ مغل بھی وسطی ایشیا سے
آئے تھے۔ اس لئے دور سلطنت میں جو علمی روایت وسطی ایشیا اور افغانستان سے آئی تھی، اس پر

مغلوں کی آمد سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔ وہی لفظی بازیگری، ظواہر پر زور، جزئیات پر بحث و تمحیص اور کتابوں کے حواشی، شرحیں اور الفاظ کی چھان بین کہ کسی مصنف نے کوئی خاص لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہی لاحاصل اور فضول بحثیں شعر کی معراج سمجھی جاتی تھیں۔ علم نحو کی ایک کتاب کافیہ طویل عرصہ سے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ نحو کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی طالب علم کو کسی زبان کے قواعد سے واقفیت ہو جائے۔ وہ زبان لکھنے، پڑھنے اور بولنے کے قابل ہو جائے۔ عربی نحو و صرف کا مقصد بنیادی طور پر قرآن مجید، حدیث رسول اور عربی ادب کے ذخائر کو سمجھنا ہے۔ اگر اس کے علاوہ نحو کا کوئی مقصد قرار دیا جاتا ہے تو وہ فضول اور لغو ہے۔ کیونکہ مطالعہ نحو کا ان دو مقاصد کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہے۔ لیکن یہ کتاب جو پڑھائی جاتی ہے۔ آج بھی بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے لیکن کافیہ۔ اس میں یہ بحث سب سے اہم سمجھی جاتی ہے کہ مصنف نے کتاب کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی۔ کیوں نہیں لکھی۔ ممکن ہے غلطی ہو گئی ہو۔ بھول گیا ہو یا جو بھی وجہ ہو، تو اس پر ہفتہ ہفتہ بھر بحث ہوتی تھی کہ مصنف نے بسم اللہ کیوں نہیں لکھی۔ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی ہے وہ مقصد بھی پیش نظر نہیں ہے۔ پھر جملہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی کتاب یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ "الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد"۔ اب اس پر بحث ہوتی ہے کہ مفرد ہے، مفرد ہے یا مفردٌ ہے۔ اس پر لمبی لمبی تقریریں اساتذہ بھی کرتے ہیں اور طلبہ بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ طلبہ جو ان بحثوں کو یاد کرتے ہیں اور وہ اساتذہ جو یہ بحثیں یاد کرواتے ہیں اگر ان سے آپ کہیں کہ عربی زبان میں ایک پیراگراف ایسا لکھیں جس میں صرف و نحو کی کوئی غلطی نہ ہو تو نحو کے بڑے ماہرین جو کافیہ کی ان لفظی جزئیات کے حافظ ہیں ان میں سے نوے فیصد حافظ اور نحوی عربی زبان کا ایک پیراگراف بھی غلطیوں سے پاک نہیں لکھ سکتے۔ بہر حال یہ روایت تھی جو وسطی ایشیا سے آئی تھی۔ یہی ہمارے ہاں علم سمجھا جاتا تھا۔ اس میں علم حدیث کا کتنا مقام تھا، قرآن کا کتنا مقام تھا۔ اس کی تفصیلات میں اگر جائیں گے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

اس کے بعد جب شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں ہمایوں کو شکست ہوئی اور اس کی جگہ سوریوں نے لے لی۔ تو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہمایوں کو ہندوستان سے نکلنا پڑا۔ ہمایوں نے جا کر ایران میں پناہ لے لی۔ جب ایک عرصہ کے بعد ہمایوں واپس آئے تو یہ کہا جاتا ہے کہ

باقاعدہ نصاب کا حصہ نہیں تھیں ۔ تفسیر کی کچھ کتابوں کے بعض اجزا پڑھائے جاتے تھے ۔ مثلاً کہیں صرف سورۃ فاتحہ، کہیں صرف سورۃ بقرہ شامل درس تھی، اور وہ بھی ان متاخرین کی تفسیریں، جن کو یہ غرض نہیں تھی کہ قرآن پاک کیا کہتا ہے۔ ان کتابوں کے فاضل مصنفین کو صرف اس سے غرض تھی کہ میرے کلامی حریف رد نے کیا کہا تھا۔ جس امام کا علم کلام میں میں پیرو ہوں وہ قرآن کے بارے میں نہیں، کلامی مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ تفسیر اور علم قرآن کے نام پر علم کلام کی تعلیم ہو رہی تھی۔ کہیں معتزلہ پر رد ہو رہا تھا، کہیں اشاعرہ پر ہو رہا تھا۔ کہیں ماتریدیہ پر رد ہو رہا تھا۔ وہ تفسیر پڑھنے والا متکلم تو شاید اچھا بن جاتا ہو۔ اگر چہ مجھے اس میں بھی تامل ہے، لیکن قرآن پاک کے حقیقی طالب علم اور قرآن پاک کی رہنمائی سے مستفیض وہ لوگ نہیں ہو سکتے تھے جو قرآن پاک کو کسی کلامی مسلک کی عینک سے دیکھتے تھے۔ قرآن پاک تو اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس کے چشمے سے باقی تمام کائنات کو دیکھا جائے اور جو چیز اس کے معیار پر پوری نہ اترے اس کو کھوٹا سمجھا جائے۔ جو قرآن کے چوکھٹے میں جتنا چھوٹا ہے وہ اتنا کھوٹا سمجھا جائے۔ اگر کوئی قرآن کے چوکھٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ الحاد و زندقہ ہے۔ یہ معیار قرآن پاک، سیرت پاک اور حدیث کے مطالعہ کا ہونا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معیار برصغیر میں ایک طویل عرصہ تک نہیں رہا۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس کا شاید برصغیر کی اجتماعی نفسیات کو آگے چل کر احساس ہوا۔ اور جب احساس ہوا تو انہوں نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا۔ اور حدیث و سیرت پر وہ کام کر کے دکھایا جو ان علوم کی تاریخ میں بہت روشن مقام رکھتا ہے۔ اس میں سے کچھ کا تذکرہ تو میں آج کروں گا اور کچھ کا کل کروں گا۔

برصغیر میں جب مسلمانوں کی حکومت کو تقریباً آٹھ نو سو سال ہو گئے۔ اور یہاں اس پورے سلسلہ تعلیم کے نتیجہ میں جو کوتاہی ہوئی تھی، اس کے اثرات بھی سامنے آنا شروع ہوئے۔ یہ اتنی بڑی کوتاہی ہے کہ قرآن، حدیث اور سیرت کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کوتاہی کے نتائج اور ثمرات تو سامنے آنے ہی تھے۔ وہ ثمرات سامنے آئے اور ایسی ایسی گمراہیاں سامنے آئیں جن کی مثال دوسرے مسلم ممالک میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نے باقاعدہ اٹھ کر یہ کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا دین تو نعوذ باللہ ایک ہزار سال کے لئے آیا تھا۔ اب ایک ہزار سال کے بعد حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب ایک نئے دین کی ضرورت

ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جس کو تحریک الٰہی کہتے ہیں۔ تحریک الٰہی پر لوگوں نے کتابوں کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ یہ ساری لمبی داستان تاریخ میں تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تحریک چونکہ سرکاری سرپرستی میں شروع ہوئی اس لئے اس کے اثرات بھی خاصے قوی تھے۔

اس تحریک کا اصل ہدف اور مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دین کو اب غیر متعلق قرار دے دیا جائے۔ اور دور جدید کے لئے ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالی جائے۔ پھر ایک ایک کر کے اس کے لئے کوششیں بھی شروع ہو گئیں۔ سرکاری سرپرستی میں اسلام کی ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ اسلام کے ہر پہلو کو محل نظر اور محل اختلاف قرار دیا گیا۔ بہت سے معاملات میں سرکاری فیصلے ایسے سامنے آ گئے جو شریعت سے صریحاً متعارض تھے۔ غرض ملت اسلامیہ ایک ایسے مشکل مرحلہ میں گرفتار تھی جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک شخصیت کو بروقت خبردار نہ کرتا تو ہم نہیں جانتے کہ ملت کا کیا حال ہوتا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

دو شخصیتوں نے کھڑے ہو کر اس پوری تحریک کے اثرات کو مٹایا۔ ایک شخصیت حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی کی ہے جو مجدد الف ثانی کہلاتے ہیں۔ الف ثانی کا لقب کی بڑی معنویت اس الٰہی تحریک کی وجہ سے ہے جس میں کہنے والے کہتے تھے کہ ایک ہزار سال پورے ہونے پر حضور ﷺ کی نبوت ختم ہو گئی۔ اس غلط فہمی کی تردید کرنے کے لئے اس عظیم شخصیت نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا، اس کی وجہ سے اس شخصیت کو مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیا گیا۔ یہ بات ہمارے اہل پاکستان کے لئے بڑی خوشی کی ہے کہ جس شخصیت نے ان کو سب سے پہلے مجدد الف ثانی کا لقب دیا وہ ہمارے سیالکوٹ کے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی تھے۔ عرب دنیا میں سیالکوٹ کے دو نام بہت مشہور ہیں ان میں ایک علامہ اقبال اور دوسرے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہیں۔ مجدد الف ثانی نے براہ راست سیرت پر تو کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن انہوں نے مکمل طور پر ان غلط فہمیوں کی تردید کر دی جو علوم سیرت اور علوم نبوت کے انکار پر مبنی تھیں۔ حضرت مجدد نے مقام نبوت اور مرتبہ نبوت کو لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے جائز قرار دے دیا۔

دوسری شخصیت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تھی جن کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شمالی ہندوستان میں پہلی بار علم حدیث کو متعارف کروایا، علم سیرت کو متعارف کرایا اور اسی طرح متعارف کرایا کہ اگر ان کو ہندوستان میں علم سیرت کا جد امجد قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ حضرت شیخ عبدالحق برصغیر اور شمالی ہندوستان کے پہلے سیرت نگار ہیں۔ وہ بہت اونچے درجہ کے محدث اور بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ علم حدیث میں ان کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ محدث ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ ان کا عشق رسول اور ذات رسالت مآب سے وابستگی ان کی کتابوں کے صفحے صفحے اور سطر سطر سے نمایاں ہے۔ انہوں نے حجاز میں چار سال تک قیام کیا۔ علم حدیث دنیائے اسلام اور حرمین کے بڑے بڑے علما سے حاصل کیا اور پھر واپس اپنے وطن دہلی تشریف لے آئے۔ آپ نے بہت سے دہلویوں کے ناموں کے ساتھ محدث کا لقب سنا ہوگا۔ یہ حقیقی معنوں میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد ہونے کا اشارہ ہے۔

حجاز سے واپسی کے بعد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے پچاس سال تک یہاں درس حدیث دیا۔ پورے شمالی ہندوستان، بالخصوص ممالک متحدہ اور پنجاب میں اور قرب و جوار کے علاقوں میں علم حدیث کی شمع روشن کردی۔ انہوں نے حدیث، سیرت اور علوم نبوت اور ان سے متعلقہ مسائل پر سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ علم حدیث کے لئے انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کو، جو حدیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے، درسی کتاب کے طور پر منتخب کیا۔ اس کتاب کو یہاں متعارف کرایا اور ان کے زمانے سے لے کر آج تک مشکوٰۃ المصابیح برصغیر، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان کے تقریباً تمام دینی اداروں میں درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

جنوبی ایشیا اور افغانستان کے جو لوگ مشکوٰۃ المصابیح سے علم حدیث حاصل کرتے ہیں وہ سب کے سب بلا استثنا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ممنون احسان ہیں۔ شیخ عبدالحق نے یہاں علم حدیث کو متعارف کرانے کے لئے دو کتابیں لکھیں۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ عربی کتاب علمائے کرام کے لئے، اور فارسی کتاب عامۃ الناس کے لئے۔ فارسی کتاب کا نام "اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ" ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور چھپی

ہوئی تھی۔ عربی کتاب کا نام ہے لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح۔
یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ کئی بار چھپی ہے اور مشکوٰۃ کی مقبول ترین شرحوں میں
سے ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسی نوعیت کی بھی ایک کتاب لکھی جس نوعیت کی کتاب
علامہ محمد [illegible] نے لکھی تھی۔ اس کا عنوان ہے ماثبت من السنۃ فی ایام السنۃ۔
یعنی سال کے پورے 354 دنوں میں کون کون سے اعمال کرنے سنت ہیں اور ان کے
بارے میں حدیث اور سنت میں کیا کیا معلومات ملتی ہیں۔ انہوں نے علم حدیث اور سنت پر
فارسی زبان میں بھی متعدد کتابیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک کتاب جو دراصل چالیس منتخب
احادیث کی بنیاد پر مرتب ہوئی تھی شاہجہاں کے کہنے پر لکھی تھی۔ شاہجہاں نے ان سے کہا
تھا کہ آپ مجھے ایک ایسی کتاب لکھ کر دیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ حکمرانوں کے لئے اسلام میں
کیا ہدایات ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک، سنت اور اسلامی ہدایات سے ضروری مواد جمع
کر کے وہ کتاب لکھی تھی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث پر جو کام کیا وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کام تھا۔
حدیث کے علاوہ ان کا کام سیرت پر بھی بہت اونچے درجے کا ہے۔ برصغیر میں سیرت پر جو
بہترین کتابیں اور سب سے ابتدائی کتابیں لکھی گئیں وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے قلم سے
سامنے آئیں۔ مدارج النبوۃ ان کی دو جلدوں میں 12 سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب
ہے۔ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ یہ برصغیر کی سب سے پہلی اور مستند کتاب سیرت ہے۔ سیرت
کے ہر گوشے سے بحث کرتی ہے۔ کئی سو سال تک برصغیر کے دینی حلقوں میں فارسی میں سیرت
کی جامع ترین کتاب یہی تھی۔ اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں قسم اول یا
پہلے حصہ کا عنوان رکھا گیا ہے در فضائل و کمالات و اخلاق و صفات رسول ﷺ کے
فضائل، کمالات و صفات کا تذکرہ۔ یعنی سب سے پہلے حضور ﷺ کی شخصیت کی عظمت کو قارئین
کے ذہن نشین کرایا۔ اس کے بعد دوسرے حصے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نسب، خاندان،
آپ کی ولادت، پیدائش اور بچپن کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اس حصے میں ان کا ماخذ
کتب حدیث، صحاح ستہ وغیرہ، کے علاوہ المواہب اللدنیہ اور اس کی شرح علامہ زرقانی
کی شرح المواہب اللدنیہ ہے۔ ان دونوں کتابوں میں آنے والے تمام مضامین خلاصے کے

طور پر شامل کئے ہیں۔ تیسرے حصے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کے تمام واقعات نوجوانی سے لے کر وفات تک، بعثت، ہجرت، غزوات تک سب بیان کئے ہیں۔ یہ اس کتاب کا طویل ترین حصہ ہے اور اس میں پوری سیرت کا خلاصہ آجاتا ہے۔ چوتھے حصے میں آپ کے مرض الموت اور دنیا سے تشریف لے جانے کا تذکرہ ہے اور پانچویں حصے میں آپ کی اولاد، خاندان، ازواج مطہرات اور بقیہ اہل بیت کا تذکرہ ہے۔

یہ کتاب برصغیر میں کئی بار شائع ہوئی تھی۔ اب کافی عرصے سے نایاب ہے۔ چونکہ برصغیر میں فارسی کا دور ختم ہوگیا اس لئے اس طرح کی علمی کتابوں کی مانگ بھی ختم یا بہت محدود ہوگئی۔ برصغیر سے باہر جہاں فارسی بولی جاتی ہے، وہاں بھی اس کتاب کی اشاعت نہ ہوسکی۔ افغانستان میں گزشتہ پچیس تیس سال سے بدنظمی ہے اور کوئی علمی کام ہو نہیں رہا۔ وسطی ایشیا میں مسلمانوں کے پاس شاید وسائل نہیں ہیں۔ اس لئے اگر شائع ہوسکتی تھی تو برصغیر اور پاکستان ہی میں ہوتی۔ پاکستان کے لوگوں کو شاید اب سنجیدہ دینی اور علمی کاموں سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے کافی عرصے سے یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اردو ترجمے ہوگئے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کراچی میں دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ان سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن اصل فارسی کتاب میں جو ادبیت ہے اور فارسی زبان کی جو چاشنی ہے اس سے اردو ترجمے کے قارئین محروم رہتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ۱۸۳۲ء میں نول کشور کانپور سے اور دوسرا ۱۸۸۹ء میں نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صرف سیرت کے کام پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے یہ بھی ایک شعوری کوشش کی کہ برصغیر کے مسلمانوں میں عشق رسول اور حب رسول کا جذبہ بیدار کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک کتاب لکھی 'جذب القلوب الی دیار المحبوب'۔ یہ کتاب بنیادی طور پر مدینہ منورہ کے بارے میں ہے۔ مدینہ منورہ کے فضائل، مدینہ منورہ کی خوبیاں اور مدینہ منورہ کے بارے میں جو کچھ اس موضوع پر لکھی جانے والی قدیم کتابوں میں ملتا ہے، انہوں نے اس کی بڑی جامع تلخیص کی ہے۔ علامہ نورالدین سمہودی کی وفاء الوفاء، ان کا سب سے بڑا ماخذ تھی اور وفاء الوفاء کے بہت سے مضامین کو انہوں نے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

خطاب کرکے کہتے ہیں کہ ۔

تو باش ایں جا و با خاصان بیامیز

کہ من دارم ہوائے منزل دوست

سنا ہے کہ علامہ اقبال ایک مرتبہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے شعر سنا رہے تھے۔ کسی بے تکلف دوست نے پوچھا کہ کوئی نیا کلام ہوا ہے۔ تو انہوں نے یہ رباعی سنائی۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ جب دوست کا لفظ آیا اس پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اسی جذبے سے شیخ عبدالحق نے بھی مدینہ منورہ کو افضل قرار دیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ایک اور کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو علم حدیث کی کتاب بھی کہی جاسکتی ہے اور علم سیرت کی کتاب بھی کہی جاسکتی ہے۔ وہ کتاب سیرت کی زیادہ ہے۔ میرے علم کی حد تک تو شائع نہیں ہوئی۔ بعض جگہ اس کے مخطوطات موجود ہیں۔ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بارے میں ہے۔ اس کا نام ہے: "مطلع الانوار البہیہ فی الحلیۃ النبویۃ"۔ یہ کتاب کتنی ضخیم ہے اور اس کے مندرجات کیا ہیں۔ میں اس کے بارے میں نہیں جانتا اس لئے کہ مخطوطہ میں نے نہیں دیکھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک ہم عصر اور انتہائی عظیم الشان اور جلیل القدر شخصیت جن کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک جملہ میں پہلے بھی دہرا چکا ہوں کہ The greatest religious genious of Muslim India۔ یعنی مسلم ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم عبقری یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی۔ انہوں نے ایک دوسرے انداز میں اس مسئلہ کو لیا۔ شیخ عبدالحق نے تو حدیث اور سیرت پر کتابیں لکھیں اور اس فن کو متعارف کرایا۔ خود پچاس سال حدیث اور سیرت کا درس دے کر اس کمی کو پورا کردیا جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔

شیخ احمد سرہندی نے مقام نبوت اور علوم نبوت کے بارے میں غلط فہمیوں کی تردید فرمائی اور جو گمراہیاں الحادی تحریک اور اس سے وابستہ لوگ پھیلا رہے تھے ان کی ایک ایک کرکے تردید کردی۔ ان کو اپنی نوجوانی میں ہی اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا، جبکہ وہ ابھی مجدد الف ثانی کے لقب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، اور یقیناً ان کا وہ درجہ بھی ابھی تک تسلیم نہیں ہوا

تھا جو بعد میں تسلیم کر لیا گیا۔ انہیں اپنی نوجوانی میں اس وقت کے دارالحکومت آگرہ جانے کا موقع ملا۔ جس دور میں وقت آگرہ گئے تھے۔ وہاں جب انہوں نے حکومت کے تنزل، وزراء اور درباریوں کو خود دیکھا تو ان کو اس صورتِ حال کی تبدیلی کا احساس ہوا اور انہوں نے وہیں دورانِ قیام ایک کتاب لکھی۔ جو مکمل نہیں کر پائے لیکن جتنا حصہ لکھا وہ انتہائی جامع اور بہت بروقت اور برمحل اقدام تھا۔ رسالہ فی اثبات النبوۃ (رسالہ در اثباتِ نبوت)۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ واضح کیا کہ نبوت کیا ہے۔ ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی تردید کی جو فلسفی سرپرستی میں پھیلائی جا رہی تھی۔ پھر معجزات پر بحث کی کہ معجزات سے کیا مراد ہے۔ انبیاء کی بعثت کیا معنی رکھتی ہے اور انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں بعثتِ انبیاء کا کردار کیا ہے۔ ختمِ نبوت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کن معنوں میں اور کیسے خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کی ختمِ نبوت کے نتائج اور ثمرات کیا ہیں۔ پھر آپ نے قرآن پاک کو، جو حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی عظمت اور اس کے فضائل بیان کئے اور بتایا کہ یہ حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو ہمیشہ کے لئے ہے۔ جو کوئی تحریک الٰہی نہ ہو وہ اتنی ہی پُر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ زمان و مکان سے ماوراء ہے اور حضورؐ کی نبوت اور آپ کو دیا ہوا قرآن پاک اور شریعت ہر دور اور ہر انسان کے لئے ہے۔ یہ اس دور کا پیغام تھا جو ان کی زندگی ہی میں بڑا مقبول ہوا۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے یہ محسوس کیا کہ یہ جو گمراہیاں پھیلائی جا رہی ہیں ان میں بعض صوفیائے کرام کی شطحیات کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ صوفیائے کرام میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ جہاں امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے صاحبِ علم صوفیہ ہوئے ہیں وہاں ایسے صوفیہ بھی کم نہیں تھے جن کا علمی پایہ اتنا بلند نہیں تھا۔ بلکہ بعض صوفیہ عقل و فکر کے اونچے مرتبہ پر فائز تھے، لیکن بعض حضرات جذب اور بے خودی کی کیفیت سے سرشار رہتے تھے۔ ان آخر الذکر حضرات میں بعض صوفیائے کرام ایسے بھی تھے جو اپنے جذبات اور احساسات کی شدت کی وجہ سے کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کر جاتے تھے جو اپنے عام مفہوم میں نہیں ہوتے تھے۔ ان کا مقصود ظاہری اور لغوی مفہوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان کلمات اور الفاظ کو اسلام اور شریعت کا ترجمان کبھی نہیں سمجھا گیا۔ شریعت کی ترجمانی اور اس کے مزاج کی تعبیر و تشکیل ہمیشہ قرآن و سنت کے مستند شارحین ہی کے کلام سے ہوئی۔ یہ صوفیائے کرام کا عمل

نہیں۔ مقام نبوت کی عظمت سے واقفیت نہیں۔ اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ جبکہ یہ ہے کہ ولایت تو ہمارے سامنے کی چیز ہے اس کو سمجھتے ہیں۔ نبوت کا مقام بہت بلند و برتر ہے۔ اس کو سمجھانے کا بھی کوئی اہتمام نہیں۔ اس وجہ سے میں نے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی اور جا بجا اپنی تحریروں میں ان حقائق کو بیان کیا ہے۔

ان دونوں شخصیات کے کارناموں کی برکت سے برصغیر میں گمراہی کو جو دبلی پڑی تھی، وہ ختم ہوگئی۔ یقیناً یہ ہند میں سرہ ملت کا وہ نگہبان تھا جن کو اللہ نے بروقت خبردار کیا۔ میرے خیال میں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بروقت خبردار کیا تھا۔ ایک نے علم اور شریعت کی نشرو اشاعت کا کام کیا اور دوسرے نے فکری گمراہیوں کی اور روحانیت کے راستے سے آنے والی غلطیوں کی تردید کی۔ ان دونوں حضرات کے کام کے اثرات برصغیر پر اتنے نمایاں ہیں کہ صدیوں تک محسوس ہوتے رہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اثرات تو اگرچہ ہندوستان اور برصغیر تک محدود رہے لیکن شیخ احمد سرہندی کے کام کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کئے گئے۔ جہاں جہاں اس طرح کی گمراہی پائی جاتی تھی، وہ وسطی ایشیا ہو، افغانستان ہو، ترکی ہو، وہاں ان کے مکتوبات سے استفادہ کیا گیا۔ خود مشرق وسطی میں ان کی تحریروں سے سب فیض کیا گیا۔ ان کے مکتوبات کا عربی ترجمہ ہوا۔ خود بعض عرب اور ترک علما نے ان کی کتابیں عرب دنیا میں شائع کیں۔

مجدد الف ثانی نے ایک اینٹ بنیاد تعمیر فرما دی جس پر تقریباً دو سو سال کے بعد ایک اور تعمیر ہوئی اور اس تعمیر نے اس غلطی کے راستے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ وہ تعمیر برصغیر میں حدیث کے سب سے بڑے عالم بلکہ امیر المومنین فی الحدیث فی الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کو بھی ایک نصابی متن کے طور پر متعارف کرایا۔ شاہ صاحب سے پہلے تک قرآن مجید خود بطور درسی متن کے نصاب میں شامل نہیں تھا۔ بعض تفسیروں کا انتخاب پڑھا دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بھی وہ تفسیریں تھیں جو کلامی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں یا ادبی اور بلاغتی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ ایسی تفاسیر کے نمونے برائے نام یا برائے نمونہ نصاب میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک براہ راست نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ علم حدیث کی تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کسی حد تک پوری کرائی

تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اسی کمی کو دور کرنے کے لئے علم حدیث کے مطالعہ کی بنیاد کو مزید پختہ بنایا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ محسوس کیا کہ رسول ﷺ کی سنت اور سیرت مبارکہ پر پوری امت مسلمہ کو جمع کیا جانا چاہئے۔ ملت مسلمہ کو صرف تین چیزوں کی بنیاد پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور حدیث اور آپ کی سیرت مبارکہ۔ شاہ ولی اللہ نے ان تینوں میدانوں میں کام کیا۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ بھی کیا اور اس کو مقبول بھی بنایا۔ شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے برصغیر میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک قدیم ترجمہ مخدوم نوح نے کیا تھا جو سندھ کے مشہور شہر ہالا کے ایک بزرگ تھے۔ ان کا ترجمہ بھی اب چھپ گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو ترجمے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ترجمہ متعارف اور مقبول نہیں تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ترجمہ ایک بہت مستند اور بالفاظہ ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب کا جو علمی اور فکری مقام تھا وہ دوسروں کا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے جگہ جگہ اس ترجمہ قرآن کو متعارف بھی کرایا اور وہ جلد شائع بھی ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے قرآن پاک کو درس و تدریس اور نصابی کتاب کے طور پر متعارف کرایا۔ قرآن پاک کے تفسیری اصولوں پر کتابیں لکھیں۔ اصول تفسیر پر بھی، قرآن پاک کے بعض مشکل الفاظ اور غرائب پر بھی اور اپنی متعدد کتابوں میں، حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں تفسیر قرآن کے بارے میں اتنی کثرت سے اشارات کئے ہیں کہ انہوں نے برصغیر میں علوم قرآنی کو ایک نئی جہت دے دی۔

حدیث کے باب میں جس طرح شیخ عبدالحق نے مشکوٰۃ المصابیح کو منتخب کیا تھا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موطا امام مالک کو منتخب کیا۔ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ موطا امام مالک بیک وقت حدیث اور فقہ دونوں کی کتاب ہے۔ اور جتنے فقہی مسالک ہیں وہ سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کی ذات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام محمد اور امام ابویوسف نے براہ راست امام مالک سے کسب فیض کیا۔ امام شافعی بھی ان کے براہ راست شاگرد ہیں۔ امام احمد امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ یوں چاروں بڑے فقہوں کی دو اجتہادی روایتیں امام مالک کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر موطا امام مالک جو حدیث

سے صحیح ترین مجموعوں میں سے ہے، اور جس کے بارے میں محققین حتیٰ کہ بخاری اور مسلم کی تدوین سے پہلے کہا جاتا تھا کہ قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب یہی ہے، اس کو اگر تمام فقہی مسالک میں ایک بنیادی کتاب کی حیثیت دے دی جائے تو تمام مسالک آسانی سے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔ اس لئے شاہ صاحب نے ہندوستان میں علم حدیث کے اعلیٰ اور متخصصانہ مطالعہ کے لئے موطا امام مالک کو منتخب کیا۔ جس طرح شیخ عبدالحق نے مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں لکھی تھیں، ایک عوام کے لئے، اور دوسری خواص کے لئے، اسی طرح شاہ صاحب نے بھی موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ ایک شرح فارسی میں عامۃ الناس کے لئے ہے۔ اور دوسری شرح عربی میں اہل علم کے لئے لکھی ہے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے اس کے کچھ نمونے حجۃ اللہ البالغہ کے حوالہ سے میں بیان کر چکا ہوں۔

شاہ صاحب نے سیرت پر بھی ایک رسالہ لکھا۔ یہ رسالہ سیرت پر درسی کتاب کے طور پر لکھا گیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سیرت پر پہلی درسی کتاب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پہلی یا دوسری گفتگو میں ابن سید الناس کی کتاب 'الدرر فی تلخیص المغازی والشمائل والسیر' کا ذکر کیا تھا۔ ابن سید الناس اندلس کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس دور میں سیرت اور مغازی پر جو کتابیں دستیاب تھیں ان سب کو سامنے رکھ کر ان سب کی ایک مستند اور جامع تلخیص تیار کی تھی۔ ابن سید الناس کی یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے۔ اس کتاب کی مزید تلخیص ایک اور بزرگ نے بھی کی تھی۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے اس تلخیص کی تلخیص کی اور اس کا نام انہوں نے 'سرور المحزون' قرار دیا۔ ابن سید الناس کی اصل کتاب تھی 'عیون الاثر فی فروع المغازی والشمائل والسیر'۔ اس کی تلخیص تھی 'نور العیون فی تلخیص سیرت الامین المامون' اور اس کی تلخیص تھی 'سرور المحزون'۔ یہ ایک چھوٹی کتاب ہے جو درسی کتاب کے طور پر فارسی میں لکھی گئی تھی۔ لیکن ابن سید الناس نے سیرت کے جتنے مضامین بیان کئے تھے ان سب کا خلاصہ شاہ صاحب نے بڑی جامعیت کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں جو مضامین بیان کئے ہیں وہ سیرت کے تمام موضوعات پر محیط

ہیں۔ حضور ﷺ کے سلسلہ نسب سے لے کر ولادت، رضاعت اور ایام طفلی۔ پھر غزوات، معمولات، حلیہ اور اخلاق، پھر ازواج مطہرات اور وہ تمام مضامین جو سیرت کی کتابوں میں آتے ہیں ان کا خلاصہ۔ سرور المحزون کے موضوعات کی وسعت کا اندازہ ان عنوانات سے کیجیے۔

سرور المحزون کے موضوعات

۱۔ سلسلہ نسب　　۲۔ ولادت مبارک
۳۔ رضاعت اور حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام　　۴۔ عہد طفولیت
۵۔ عہد شباب　　۶۔ تجارتی سفر
۷۔ شادی　　۸۔ بعثت مبارکہ
۹۔ معراج اور اسراء کا واقعہ　　۱۰۔ ہجرت مدینہ
۱۱۔ غزوات اور مہمات　　۱۲۔ حج
۱۳۔ حلیہ مبارک　　۱۴۔ اخلاق
۱۵۔ معمولات　　۱۶۔ ملبوسات
۱۷۔ ازواج مطہرات　　۱۸۔ اولاد
۱۹۔ اقارب اور رشتہ دار　　۲۰۔ خدام، ملازمین اور غلام
۲۱۔ کاتب　　۲۲۔ اصحاب
۲۳۔ سواریاں اور مویشی　　۲۴۔ ہتھیار اور آلات
۲۵۔ ترکہ　　۲۶۔ معجزات
۲۷۔ وفات اور وصال

شاہ صاحب نے سرور المحزون کو ضروری کتاب کے طور پر متعارف کرایا اور پہلی مرتبہ ہندوستان میں سیرت کی کوئی کتاب درس کی کتاب کے طور پر متعارف ہوئی۔ شمالی ہندوستان کے مسلمان طلباء سیرت کو ایک نصابی حیثیت کے طور پر پڑھنے لگے۔ شیخ عبدالحق کی دونوں کتابیں اگرچہ بہت مقبول ہوئیں لیکن وہ انہوں نے درسی کتاب کے طور پر نہیں لکھی تھیں۔ شاہ و

دلی ہے۔ یہ ساری کی ساری کتابیں منظومات تھیں جو سترھویں صدی کے اواخر سے لے کر اٹھارویں صدی کے اواخر تک لکھی جاتی رہی ہیں۔ گویا ہندوستان میں سو سال کا یہ عرصہ سیرت پر منظومات اور لوک ادب کا زمانہ ہے۔

1857ء سے پہلے اردو میں سیرت پر نثر میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ کتابیں تیس پینتیس سے کم نہیں ہوں گی۔ 1857ء سے پہلے کی کتابوں میں دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک 1857ء کے زمانے کی ہے اور ایک اس سے پہلے کی۔ جو کتاب 1857ء سے پہلے کی ہے وہ ایک ایسی شخصیت کی ہے جس کے خاندان میں علم سیرت ہمیشہ سے رہا ہے اور ماضی قریب میں اس خاندان کے ایک قابل ذکر فرزند نے علم سیرت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد دکن میں ایک بزرگ تھے قاضی بدرالدولہ۔ ان کا خاندان بہت مشہور تھا۔ وہ خود بڑے صاحب علم تھے۔ ان کی ایک کتاب فوائد بدریہ سیرت کے موضوع پر ہے۔ 404 صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور قدیم اردو زبان یعنی دکنی میں لکھی گئی۔ 1839ء اور 1255ھ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں لکھی گئی۔ کئی بار چھپ چکی ہے۔

قاضی بدرالدولہ خود بہت بڑے فقیہ تھے۔ ریاست کرناٹک کے قاضی القضاۃ تھے۔ مستند ترین مصادر سے کام لے کر انہوں نے کتاب لکھی جیسے زاد المعاد، فتح الباری، عیون الاثر اور المواہب اللدنیہ جیسی بڑی کتابیں ان کے سامنے تھیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں لکھی گئی یہ کتاب سب سے پہلی مستند کتاب سیرت ہے۔ فارسی میں برصغیر میں سیرت پر پہلی کتاب شیخ عبدالحق نے لکھی تھی۔ اردو میں قاضی بدرالدولہ نے لکھی۔ اگرچہ ان کی اردو قدیم ہے لیکن عام فہم ہے اور آج بھی اس کو سمجھنے میں کوئی خاص دقت محسوس نہیں کی جاتی۔ قاضی بدرالدولہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے جدِ امجد ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں سب علوم سیرت کو نئی جہتیں عطا کیں۔ جن کی وجہ سے ان کو بجا طور پر مجدد علوم سیرت کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہی ڈاکٹر حمید اللہ ہیں جن کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی کا کتب خانہ موسوم ہے۔

قاضی بدرالدولہ کی اس کتاب کے علاوہ جو کتاب یعنی 1857ء اور 1858ء کے معرکہ میں شریک ایک عالم مجاہد کے قلم سے ۱۸۵۸ اور ۱۸۵۹ کے سالوں میں لکھی گئی وہ ایک مشہور

مجاہد، فقیہ اور عالم مفتی عنایت احمد کاکوروی کی لکھی ہوئی تھی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی شمالی ہندوستان میں ایک چھوٹا سا شہر کاکوری ہے، وہاں کے رہنے والے ہیں۔ مفتی عنایت احمد 1857 کی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ پہلی مرتبہ جہاد کے وجوب کا فتویٰ جن لوگوں نے دیا ان میں مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی شامل ہیں اور جہاد کے اس تاریخی فتویٰ پر ان کے دستخط بھی ہیں۔ انہوں نے فتویٰ بھی دیا۔ رائے عامہ کو بھی ہموار کیا اور عملاً جہاد میں حصہ بھی لیا۔ چنانچہ جب انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور مجاہدین کو شکست ہوئی تو بہت سے لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔ کچھ لوگوں کو کالا پانی یعنی جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی ان لوگوں میں شامل تھے جن کو جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ لیکن جزائر انڈیمان میں قید بامشقت کے دوران جو کام ان کے سپرد کیا گیا وہ یہ تھا کہ جزائر میں جتنی گندگی لوگوں کے گھروں میں جمع ہو اس کو اٹھا کر آبادی سے باہر پھینکا کریں۔ اس زمانے میں فلش خانوں وغیرہ کا یہ نظام نہیں تھا۔ مفتی صاحب لوگوں کے گھروں میں جا کر گندگی صاف کرتے اور اس کو ایک بڑے ٹوکرے میں ڈال کر کندھے پر اٹھاتے اور آبادی سے باہر پھینک آتے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں ان کے پاس نہ وقت ہوتا تھا نہ مطالعہ کے مواقع اور نہ ہی مصادر اور ماخذ کی کتابیں۔ اس کے باوجود اس تکلیف دہ دور اسیری میں انہوں نے تین کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب سیرت پر ہے۔ یہ کتاب تواریخ حبیب الٰہ کے تاریخی نام سے معروف ہے۔ یہ ساری کتاب انہوں نے جزائر انڈیمان میں بیٹھ کر محض یادداشت کی بنیاد پر لکھی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک ان معلومات کو دوبارہ چیک نہ کیا جائے اس کتاب کو شائع کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے مسودہ اپنے پاس رکھ چھوڑا۔ اتفاق کی بات کہ ان کی ملاقات کسی شریف انگریز سے ہوگئی۔ یہ انگریز ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا سابق قاضی اور جج رہے ہیں اور یہاں عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں تو اس نے سفارش کر کے مفتی صاحب کو رہائی دلائی۔ مفتی صاحب تینوں مسودے لے کر ہندوستان واپس آ گئے۔ یہاں انہوں نے تواریخ حبیب الٰہ کے مندرجات کو مصادر و ماخذ سے چیک کیا اور کہیں ایک حوالہ بھی غلط نہیں پایا تو اس کو شائع کر دیا۔

اس کتاب میں تین ابواب ہیں۔ باب اول نور مبارک اور ولادت سے ہجرت تک ہے۔ باب دوم ہجرت سے لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دنیا سے تشریف لے جانے تک کے واقعات پر مبنی ہے اور یہ کتاب کا طویل ترین باب ہے۔ تیسرا باب حلیہ مبارک اور آپ کے اخلاق، عادات اور معجزات کے بارے میں ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جو حضور ﷺ کی شفاعت کبریٰ کے بارے میں ہے۔

یہ دو کتابیں جن میں سے ایک 1857 سے پہلے لکھی گئی اردو زبان میں سیرت پاک پر قدیم اور مستند ترین ہیں۔ ایک 1857 کے واقعات کے دوران لکھی گئی۔ تواریخ حبیب الٰہ بھی مستند اور بلند پایہ علمی کتاب ہے۔ لیکن فوائد بدریہ استناد کے اعتبار سے زیادہ اونچا درجہ رکھتی ہے۔ جامعیت بھی اس میں زیادہ ہے اور یہ ضخیم بھی زیادہ ہے۔ تواریخ حبیب الٰہ نسبتاً مختصر ہے۔ میرے پاس اس کا تیرھویں صدی ہجری کا چھپا ہوا ایک نسخہ موجود تھا جو سوا ایک سو تک صفحات پر مشتمل تھا، لیکن بعد میں جب شائع ہوا تو میں نے دیکھا ہے کہ کوئی 200 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ فوائد بدریہ بڑے انداز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر اس کو آج کی کتابت اور کمپیوٹر سے چھاپا جائے تو شاید چھ سو صفحات بن جائیں گے۔ یہ قدیم ترین دو کتابیں ہیں جو اردو میں سیرت پر لکھی گئیں۔

اسی اثنا میں ایک اور کام بھی ہوتا رہا۔ وہ یہ کہ جب اردو میں نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت سی قدیم کتابیں بھی اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام اور دوسری کتابیں ایک ایک کر کے ترجمہ ہوئیں۔ ایک کتاب جو برصغیر میں بڑی مشہور اور معروف رہی، اگرچہ وہ براہ راست سیرت پر نہیں ہے لیکن سیرت کے واقعات کا تتمہ ضرور ہے۔ صحابہ کرام کی فتوحات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو فتوح الشام کے نام سے مشہور ہے اور غلط طور پر واقدی سے منسوب ہے۔ یہ واقدی کی کتاب فتوح الشام نہیں ہے۔ واقدی کے کھاتے میں لوگوں نے ایسی بہت سی غلطیاں ڈال دی ہیں جو واقدی نے نہیں کی تھیں۔ فتوح الشام بھی واقدی کے کھاتے میں ڈال دی گئی حالانکہ یہ کسی اور کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شام کے جو علاقے صحابہ کرام کے ہاتھوں فتح ہوئے اس کی تفصیل ہے۔ شام کے علاقے میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے ہی مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی

اواخر میں شروع ہوا اور 20 ویں صدی کے ایک تہائی تک چلا۔ اس کا جو حصہ بیسویں صدی میں ہے اس کا تذکرہ دور جدید کے موضوع کے تحت ہونے والی بحث میں آئے گا۔ جو کام انیسویں صدی میں ہوا اس کا تذکرہ آج کرتے ہیں۔

انیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں پورے طور پر قائم ہو گئی۔ دہلی پر بھی 1806 میں ان کا قبضہ لارڈ لیک کے ہاتھوں مکمل ہو گیا اس وقت عیسائی پادریوں نے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ عیسائی پادری انگریز بھی تھے جو اردو سیکھ کر آئے تھے۔ ان پادریوں میں کچھ ہندوستانی مرتدین بھی شامل تھے جو اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔ کئی ہندو بھی تھے جنہوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ وہ بھی پادری ہو گئے تھے۔ ان کی ساری کوششوں کا اصل ہدف اور مرکز ہندو، سکھ یا بدھ مذہب والے نہیں تھے۔ بلکہ اسلام ان کا اصل ہدف تھا۔ اسلامی عقائد پر اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر انہوں نے ایک ایک کر کے حملوں سے تشہیر شروع کر دیں۔ ایک پادری عماد الدین ان دنوں بہت مشہور ہوا۔ یہ شخص بھی مرتد ہو گیا تھا۔ اس نے اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ عیسائی بن جانے کے بعد اس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب ذات رسالت مآب کے بارے میں بڑی گستاخانہ لکھی۔ اس کتاب کا جواب بہت سے لوگوں نے دیا۔ لیکن ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ ایک مولانا الطاف حسین حالی جو برصغیر کے مشہور ادیب، شاعر، نقاد اور تاریخ کی مشہور شخصیت ہیں۔ دوسرے مولوی چراغ علی ہیں جو سرسید کے دوستوں میں سے تھے اور اردو اور انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

لیکن یہ سب ابھی ابتدا ہی تھی۔ ہندوستان میں تب ایک اہم اور مشہور انگریز شخصیت سر ولیم میور نے جو یوپی کا لفٹیننٹ گورنر تھا اس میدان میں قدم رکھا۔ اس نے Life of Muhammad کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا چرچا چھپنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ایک تو انگریزی حکومت کا جاہ و جلال، انگریزوں میں بھی اتنا بڑا آدمی جو یوپی جیسے بڑے صوبہ کا لفٹیننٹ گورنر تھا۔ یوپی رقبہ اور آبادی دونوں میں پاکستان سے بڑا صوبہ ہے۔ یہ شخص عربی اور فارسی بھی جانتا تھا اور اسلامی علوم و فنون کا اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے چار جلدوں میں یہ کتاب لکھی جو 1860-64 میں شائع ہوئی۔ اس

کتاب میں، جس کا بڑے عرصہ سے انتظار تھا، مسلمانوں کے دلوں کو بہت دکھایا۔ سرسید نے
ایک جگہ لکھا ہے کہ جوں جوں کتاب کو دیکھتا ہوں دل کباب ہوتا جاتا ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر
سب سے پہلے سرسید احمد خان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس کتاب کا ایک عالمانہ جواب
لکھنا چاہئے۔

یوں سیرت نگاری کا ایک نیا دبستان وجود میں آیا جس کو میں آپ کی اجازت سے
دبستان سرسید کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی سیرت نگاری کا دبستان سرسید۔ سرسید احمد خان نے ان
کتابوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جو اس کتاب سے پہلے لکھی گئی تھیں اور پے در پے لکھی جا رہی
تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ولیم میور سے پہلے بھی سیرت کے موضوع پر پادریوں کے قلم سے بہت
سی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ انگریزوں نے بھی لکھی تھیں اور مقامی پادریوں نے بھی لکھی تھیں۔
لیکن وہ کوئی عالمانہ کتابیں نہیں تھیں، بلکہ مناظرانہ قسم کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں جو
مواد استعمال کیا گیا تھا وہ بھی کوئی مستند مواد نہیں تھا۔ انگریزوں نے جو لکھا اس کو مقامی پادریوں
نے دہرا دیا۔ ایک پادری نے دوسرے سے نقل کیا اور دوسرے نے تیسرے سے۔ یوں
کتابوں کی تعداد تو خاصی تھی، لیکن مواد میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ اس لئے ایسی کتابوں کی کوئی
خاص اہمیت نہیں تھی۔ سر ولیم میور نے جو کتاب لکھی تھی وہ براہ راست اسلامی ماخذ کو سامنے رکھ
کر لکھی گئی۔ مصنف عربی جانتا تھا اور اس نے خاصی محنت سے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس نے اسلامی
مصادر کا گہرائی سے مطالعہ کیا، جگہ جگہ سے مواد جمع کیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس کو چھانٹا، جس
جس چیز کی وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق تعبیر کر سکتا تھا اس کی من مانی تعبیر کی۔

یہ کتاب جب شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس پر رد عمل کا اظہار کیا لیکن سب سے
مثبت اور تعمیری رد عمل سرسید احمد خان کا تھا۔ سرسید کو بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں جو اوروں
کو حاصل نہیں تھیں۔ سرسید کی شہرت انگریزوں کے ہمدرد کے طور پر ایک عرصہ سے چلی آ رہی
تھی۔ 1857 میں انہوں نے تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کئی انگریزوں کی ذاتی طور پر
مدد کی تھی اور ان کی جان بچائی تھی۔ وہ اس بات کے داعی تھے کہ مسلمانوں کو انگریزی علوم و فنون
سیکھنے چاہئیں۔ انگریز سے دشمنی ختم کرنی چاہئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات بہتر
ہونے چاہئیں۔ اس لئے جب انہوں نے سر ولیم میور کا جواب دینے کے لئے قلم اٹھایا تو ان

کی نیت کے بارے میں کوئی انگریز یہ شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص انگریزوں کی مخالفت کی وجہ
سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کو جاننے والے ہر شخص کو معلوم تھا کہ وہ کس نیت سے یہ کتاب
لکھ رہے ہیں۔ پھر کسی اور کے لئے اتنی جرأت کرنا شاید ممکن نہیں تھی کہ ایک حاکم برطانوی مورخ
کی کتاب کے جواب میں کتاب لکھے اور اس کی تردید کرنے کی جسارت کرے۔

سرسید نے یہ طے کیا کہ وہ اس کتاب کا بہت معروضی انداز میں جواب دیں گے اور جس
طرح کے دلائل ولیم میور نے اپنے بیانات اور مآخذ کی بنیاد میں دیئے ہیں اسی طرح کے
استدلال اور جوابی دلائل سے کام لیں گے۔ جب انہوں نے یہاں ہندوستان میں اس منصوبہ
کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ بہت سی کتابیں جو اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے
ناگزیر ہیں یہاں کے کتب خانوں میں نہیں مل رہی ہیں۔ جب یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو
انہوں نے محسوس کیا کہ بڑے بڑے کتب خانے انگریز لوٹ کر لے جا چکے ہیں۔ پورا انڈیا
آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریری اور انگلستان کی دوسری لائبریریاں ہندوستان اور برصغیر کی
مسروقہ کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ خود ہمارے خاندان کی یعنی میرے خاندان کی کئی کتابیں
وہاں موجود ہیں جس پر میرے آباؤاجداد کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے مجھے ذاتی طور پر علم
ہے کہ انگریز کس طرح کی کتابیں لوٹ لوٹ کر لے گئے ہیں۔

جن دنوں یہ کتاب لکھی آئی تھی اور سرسید اس کے مندرجات سے بہت باخبر ہوتے
جاتے تھے اس کی بےچینی اور کرب کا حساب نہ تھا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ ان دنوں سرسید کی
زبان پر یہی تذکرہ رہتا تھا۔ اس زمانے کے خطوط اور مقالات میں بھی یہ مضمون بہت کثرت سے
آیا ہے۔ لکھا ہے کہ ولیم میور کی کتاب پڑھ پڑھ کر عیسائی مرد ہنستے اور مسلمان سر پیٹتے تھے۔

جب ۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے تو وہاں سے بھی اپنے احباب کو، بالخصوص نواب محسن
الملک مولوی مہدی علی خان کو، جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی بہت سے خطوط کا موضوع یہی
کتاب ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے جو بن پڑے گا سب
کروں گا، حتی کہ اپنی جان صرف کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

چنانچہ سرسید نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کام کی انجام دہی کے لئے لندن جائیں گے اور وہاں
بیٹھ کر یہ کتاب لکھیں گے۔ وہاں سے انہوں نے اپنے دوستوں اور خاص طور پر نواب محسن

الملک کے ساتھ جو خط و کتابت کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس انداز سے یہ کام کرنا
چاہتے تھے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ کل میں انڈیا آفس کا کتب خانہ دیکھنے گیا تھا۔ دیکھ کر ہوش
جاتے رہے۔ کتب خانہ کیا ہے کہ کتابوں کا ایک شہر ہے۔ جس کتاب کا نام لو وہ کتاب موجود
ہے۔ مجھے وہاں بیٹھ کر پڑھنے، کتابیں لینے اور نقل کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ یوں وہاں
بیٹھ کر سرسید نے کتاب لکھنا شروع کر دی۔ لیکن انگلستان میں قیام کے اخراجات سرسید کے بس
کی بات نہیں تھی۔ وہاں سے وہ اپنے دوستوں اور مختلف لوگوں کو لکھ لکھ کر قرض مانگتے رہے۔
ایک موقع ایسا آیا کہ قرض دینے کے لئے بھی کوئی تیار نہ ہوا تو انہوں نے نواب محسن الملک
کو لکھا کہ میرا فلاں مکان فروخت کر دو اور مجھے رقم بھیج دو۔ پھر ایک خط لکھا ہے کہ میرے فلاں
مکان میں تانبے اور پیتل کے بہت سے برتن ہیں، وہ بازار سے فروخت کر کے رقم مجھے بھیج دو۔
ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ میں اس کام میں بے گھر اور بے سہارا ہونے کو تیار ہوں۔ جب
قیامت میں کہا جائے گا کہ لاؤ اور حاضر کرو اس فقیر اور مسکین سید احمد کو جو میرے نام پر ہر چیز
لٹا بیٹھا تو میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے۔

مارا آں تحفہ گدائی است

یہی مقصد تھا جو انہوں نے یہ خط لکھا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے بے سروسامانی کے
عالم میں انگلستان میں قیام کر کے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ مزید وسائل ان کے پاس
تھے نہیں۔ ایک جلد کا جواب لکھنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ باقی تین جلدوں کا
جواب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے اس ارادہ کو پورا نہیں کر سکے۔

جب انہوں نے یہ کتاب لکھی تو اس میں پہلے بارہ ابواب تھے جن کو وہ خطبے کہتے تھے، شامل
تھے۔ بعد میں دو مزید خطبات کا اضافہ کیا۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے لندن میں
انہوں نے ایک اردو جاننے والے انگریز کو مامور کیا جو انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر کے ان
کو مواد فراہم کرتا جاتا تھا۔ ظاہر ہے بغیر تنخواہ کے کام نہیں کرتا تھا۔ ایک اور اردو جاننے والے
انگریز کو مامور کیا جو تیار شدہ ابواب یا خطبات کا انگریزی ترجمہ کیا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے
قیام کے دوران اردو میں کتاب چھپنے سے پہلے ہی انگریز سے اس کا انگریزی میں ترجمہ مکمل
کر لیا۔ 1870ء میں لندن ہی سے اسے شائع کیا۔

یہ سیرت کی تاریخ میں پہلی کتاب ہے جو ایک مسلمان دانشور نے غیر مسلم مغرب میں جا کر، غیر مسلم ماحول میں، غیر مسلموں کے اسلوب اور استدلال سے کام لے کر ایک غیر مسلم مصنف کی تردید میں لکھی اور سیرت کے بارے میں جو نقطۂ نظر ان کی رائے اور تحقیق میں درست تھا اس کو بیان کیا۔ یہ کتاب ایک مختصر کتاب تھی جو کئی موضوعات پر مشتمل تھی لیکن پھر بھی یہ ایک نامکمل کتاب ہے۔ اس کی تکمیل سرسید نہیں کر سکے۔ اس کے بارہ ابواب یا بارہ خطبات تیار کئے گئے۔ ان بارہ خطبات میں سرسید نے ایک نیا انداز اپنایا۔ مغربی تحقیقات اور تصانیف سے استفادہ کیا۔ مستشرقین کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ مستشرقین نے بالعموم اور ولیم میور نے بالخصوص جو اعتراضات کئے تھے ان کا جواب دیا۔ قدیم سیرت کے مآخذ کے بارے میں سرسید نے ایک نیا رویہ اختیار کیا جس کی بعد میں تقریباً ہر سیرت نگار نے پیروی کی ہے۔ وہ یہ کہ قدیم مآخذ کے مستند ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں از سرِ نو غور کیا جائے اور تمام دستیاب مآخذ کا ناقدانہ جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ کون سے مآخذ قابلِ اعتماد ہیں اور کون سے ناقابلِ اعتماد ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بعض مآخذ کے بارے میں شروع ہی سے محدثین نے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً ابن اسحاق، واقدی اور دیگر کئی لوگ غیر مستند کہے جاتے تھے، اور محدثین ان کے بیانات کو قبول کرنے میں تامل کرتے تھے۔ بعد میں جب ان حضرات کی کتابیں مرتب ہو گئیں تو ان کی حسنِ ترتیب، جامعیت اور دوسری خوبیوں نے ان کو جلد ہی قبولِ عام عطا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کتابیں اتنی عام ہو گئیں کہ بیشتر لوگوں نے محدثین کے ان تحفظات کو بھی فراموش کر دیا اور یہ کتابیں سیرت نگاری کے میدان میں رائج ہو گئیں۔ بعد میں تقریباً ایک ہزار بلکہ گیارہ سو سال تک کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ واقدی کے بارے میں محدثین کیا کہتے تھے۔ ابن اسحاق کے بارے میں محدثین کا کیا خیال تھا۔ فلاں اور فلاں کے بارے میں محدثین کو کیوں تامل تھا۔ جب سر ولیم میور نے یہ کتاب لکھی اور اس میں ان تمام مآخذ کی کمزوریوں کو نمایاں کیا اور ان کی وہ تعبیریں کیں جو مسلمانوں کے لئے دل آزار تھیں تو بہت سے مسلمان اہل علم کو ان قدیم سیرت نگاروں کے بارہ میں محدثین کے تحفظات ایک بار پھر یاد آ گئے۔ دوسرے متعدد سیرت نگاروں کی طرح سرسید کو بھی دوبارہ یہ خیال ہوا کہ اس پورے ذخیرے کا جب

کہ یہ شواہد اور مصادر قابل اعتماد ہیں اور یہ ناقابل اعتبار ہیں۔

سر ولیم میور نے یہ بھی لکھا تھا کہ خود بیت اللہ کا بھی بنایا گیا ہے یہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جب آدمی انکار پہ اتر آتا ہے تو پھر ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے دعویٰ کیا کہ مکہ میں موجود بیت اللہ حضرت ابراہیم کے بہت بعد میں بنایا گیا تھا جس کو بعد میں قریش اور عربوں نے حضرت ابراہیم واسماعیل سے منسوب کر دیا۔ چنانچہ اس بے بنیاد اور فضول دعویٰ کی تردید کی خاطر سر سید نے ایک باب بیت اللہ پر لکھا ہے اور بہت تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ اس کے بارے میں دلائل اور شواہد انہوں نے قدیم کتابوں سے، مغربی مصنفین کی تحریروں سے، جغرافیہ کی کتابوں، قدیم مذہبی کتابوں اور قدیم ادب کی کتابوں سے جمع کئے۔ ان سب کو ایک منطقی ترتیب سے پیش کر دیا ہے۔ اسی طرح سے انہوں نے ایک ایک کر کے بارہ خطبات لکھے اور ان غلط فہمیوں کی تردید کر دی جو سر ولیم میور نے پھیلائی تھیں۔

ایک بڑی اہم بات جو سر ولیم میور نے لکھی تھی اور جس کی تردید کے لئے سر سید نے ایک پورا باب لکھا وہ عرب کے جغرافیہ کے بارے میں تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ عرب کا جغرافیہ سیرت کا ایک حصہ بنتا ہے۔ لیکن ولیم میور کی اس کتاب کے حوالے سے اس کی اہمیت یہ تھی کہ ولیم میور نے بعض واضح جغرافیائی حقائق کو بھی جھٹلایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے بارہ میں تورات میں ایک جملہ آیا ہے۔ قدیم تورات اور عبرانی زبان میں کیا ہے یہ تو مجھے علم نہیں لیکن تورات کے عربی ترجمہ میں وہ جملہ اس طرح نقل ہوا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ وہ جملہ اس طرح ہے کہ: جاء الرب من سينا وطلع لهم من ساعير وتلألأ لهم من جبال فاران "کہ تمہارا پروردگار کوہ سینا سے ظاہر ہوا اور ساعیر کی پہاڑیوں پر وہ طلوع ہوا اور بالآخر فاران کی پہاڑیوں سے اس کا جلوہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ اب یہ صراحتاً رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیشین گوئی ہے۔ فاران ہی پر حضور پر نزول وحی ہوا۔ فاران ہی پر حضور تشریف فرما تھے جب وحی کا آغاز ہوا۔ یہ ایک ایسی واضح اور دو ٹوک بات تھی جس کا انکار کرنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن سر ولیم میور نے اس کا بھی انکار کیا۔ اس نے کہا کہ جو فاران مکہ میں بتایا جاتا ہے وہ تورات کے فاران سے وہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ تورات کے فاران سے شام کی فلاں پہاڑی مراد ہے۔ کہنے کو

مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس کا ایک ایک نسخہ میری طرف سے تحفے میں بھیج دو۔

مزید یہ چاہتے تھے کہ سر ولیم میور کے جواب میں لکھی جانے والی یہ کتاب بھی چار حصوں میں ہو اور ولیم میور کی کتاب کے چاروں حصوں کا جواب ہو۔ لیکن جیسے لکھنا چاہتے تھے ویسے نہیں لکھ سکے۔ وسائل کی کمی تھی۔ معاونین کا فقدان تھا۔ اس لئے چند مسائل پر تو لکھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک بارہ سال ہوئی۔ اس وقت تک کے واقعات پر ولیم میور کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ سر سید نے بھی حضور کی بارہ سال تک کے بارے میں جو کچھ ولیم میور نے لکھا تھا اس کا جواب دیا۔ ایک جگہ ایک خط میں لکھا ہے کہ لکھنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں، لیکن یہ یہ مشکلات ہیں۔ اور پھر مشکلات کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ ابھی لکھا اور چھپوانا تو شروع کر دیا لیکن روپیہ کہاں سے آئے گا۔ یوں خدا خدا کر کے ایک جلد مکمل ہوئی۔ مزید لکھ نہ پائے اور واپس آ گئے۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد وہ شاید اس کتاب کو مکمل کر سکتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد بھی وہ تیس سال زندہ رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں اس کتاب کو مکمل نہیں کر سکے۔ شاید وہ کتابیں اور ماخذ یہاں دستیاب نہیں تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے بہت سے لوگوں سے مدد لی۔ نواب محسن الملک کو بھی لکھا۔ مولوی چراغ علی کو بھی لکھا۔ کئی مضامین کے بارے میں ان سے مواد منگوایا۔ مثلاً ایک جگہ لکھا کہ معجزات کے بارے میں فلاں فلاں کتاب میں جو کچھ ہے اس کی ایک مکمل فہرست بنا کر مجھے بھیج دیں۔ محدثین نے کن روایات کو قابل قبول کہا اور کیوں کہا، کن روایات کو ناقابل قبول کہا اور کیوں، یہ دونوں الگ الگ فہرستوں کی شکل میں مجھے بھیج دو۔ اس طرح کا کام وہ اپنے دوستوں سے لیا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ شق صدر کے بارے میں جو کچھ قدیم کتابوں میں ہے وہ سارا نقل کروا کر مجھے بھیج دو۔ اس زمانے میں آپ کو پتہ ہے کہ فوٹو اسٹیٹ نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارا کام ہاتھ سے کرنا ہوتا تھا۔ پورا پورا دن آٹھ دس صفحات کی نقل میں لگ جاتا تھا۔ اب تو یہ کام ایک منٹ میں ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے بارہ ابواب مکمل کر لئے۔ ان بارہ ابواب کی الگ الگ تفصیل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان کے عنوانات کی فہرست دینا شاید مفید ہوگا۔

خطبات احمدیہ کے اہم مندرجات

1۔ عرب کا جغرافیہ۔ اس بات کا ثبوت کہ فاران مکہ ہی کے پہاڑ ہیں۔

2۔ عربوں کے رسوم و رواج۔ اسلام کی اصلاحات

3۔ مذاہب عرب قبل از اسلام

4۔ یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام سے فائدہ ہوا یا نقصان

5۔ قدیم مصادر سیرت کا جائزہ

6۔ روایات مذہبی کا معتبر اور غیر معتبر ہونا

7۔ قرآن مجید

8۔ تاریخ مکہ و اجداد آں حضرتؐ

9۔ نسب نامہ آں حضرتؐ

10۔ بشارات از توراۃ و زبور

11۔ شق صدر اور معراج

12۔ بارہ سال کی عمر تک حضورؐ کے حالات

ایک چیز جو سر سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ کی اور ان سے پہلے کسی نے اس انداز سے نہیں کی۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے قدیم کتابوں کا خاص طور پر تورات اور زبور کا براہ راست مطالعہ کیا اور ان کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بشارات تھیں ان کو جمع کیا اور اس مواد کو ایک مرتب انداز میں پیش کیا۔ اس کتاب کے بڑے اثرات ہوئے۔ لوگوں نے اس اسلوب کو اپنایا۔ سیرت کے مآخذ کی تنقید ہر سیرت نگار نے کی۔ مغربی اہل علم کے حوالے اب ہر سیرت نگار دیتا ہے۔ مغربی اہل علم کے حوالے اب مستند سیرت نگاروں کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ تورات اور انجیل جیسی قدیم کتابوں سے سیرت کے مضامین کی تائید اب سب کرتے ہیں۔ عرب کے جغرافیہ کی تحقیق سب نے شروع کر دی ہے۔ اسلامی تمدن کو سیرت کا حصہ سب سے پہلے سرسید نے قرار دیا تھا۔ اب ہر سیرت نگار اسلامی تمدن کا تذکرہ کرتا ہے۔ مشرقی علوم کا مغربی اسلوب سے مطالعہ اب ایک عام رواج ہو گیا ہے۔ سرسید سے پہلے یہ انداز کسی نے نہیں اپنایا تھا۔ یہ وہ کام ہے جو سرسید احمد خاں نے کیا اور اس کے گہرے اثرات ہوئے۔ وابستگان سرسید کے دو بڑے نام بہت مشہور ہیں جن کا تذکرہ کل ہوگا۔ ایک علامہ شبلی نعمانی جو کافی عرصہ تک سرسید

کتاب لکھی۔ سرسید احمد خان اور سید امیر علی دونوں کا نام انتہائی عقیدت اور عشق رسالت پر مبنی ہے۔ ذات رسالت مآب سے وابستگی دونوں کے کام میں نظر آتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے جو کچھ صلہ ملے گا وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

لیکن بطور سیرت کے ایک ادنیٰ طالب علم کے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ سرسید کے بہت سے بیانات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کئی جگہ انہوں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو اسلامی نقطہ نظر کے مطابق نہیں ہیں۔ پھر مرعوبیت کی جو کیفیت ہے وہ سرسید کے ہاں سید امیر علی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ سید امیر علی ایک اعلیٰ عدالت کے جج تھے۔ قانون دان تھے۔ ان کا مقابلہ انگریزوں کے صف اول کے قانون دانوں سے رہتا تھا۔ سرسید ایک عام مشرقی تھے۔ اس لئے جو اعتماد اور confidence سید امیر علی کی تحریروں میں ہے وہ خطبات احمدیہ کے قلم میں نظر نہیں آتا۔ یہ ایک ناچیز طالب علم کا ایک احساس ہے جس سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے سید امیر علی کی کتاب میں بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن سے اتفاق کرنا دشوار ہے۔ سید امیر علی کی یہ کتاب 18/3 میں قائداعظم اور علامہ اقبال کی پیدائش سے بھی پہلے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے کئی ایڈیشن انہوں نے مرتب کئے۔ ہر ایڈیشن میں مزید اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ آخری ایڈیشن جو سید امیر علی کی زندگی میں شائع ہوا وہ غالباً 1909 میں Spirit of Islam کے نام سے شائع ہوا۔ اور اب یہ کتاب اسی نام سے مشہور ہے۔ اور بار بار طبع ہو چکی ہے۔

یہ دو بڑے کام تو وہ تھے جو انیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں سیرت کا کوئی تذکرہ یا تاریخ علم سیرت پر کوئی کام ان دونوں کتابوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ سرسید کے خطبات اور سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام دونوں کا تقابلی ایک اہم اور دلچسپ مضمون ہے جو کسی محقق کی توجہ کا مستحق ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میرا تاثر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی سید امیر علی کی کتاب زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوئی۔ یہ کتاب یورپ میں اسلام کا سب سے پہلا سب سے زیادہ موثر اور سب سے کامیاب دفاع تھا۔

سرسید کی کتاب کے برعکس یہ ایک مکمل کتاب تھی۔ سرسید کا سارا زور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دینے پر رہا۔ مثبت طور پر اسلام کا موقف مدلل انداز میں بیان کرنے کا

فریضہ سید امیر علی نے انجام دیا۔

پھر سرسید نے اصل کتاب اردو میں لکھی، اور کسی سے اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ لیکن ترجمہ ترجمہ ہی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سید امیر علی کی کتاب براہ راست انگریزی میں لکھی گئی، اور انگریزی قارئین کے مزاج اور نفسیات کا پورا لحاظ کرتے لکھی گئی۔ مزید برآں سرسید کی کتاب میں بہت سی معلومات بالواسطہ نقل کی گئیں، جبکہ سید امیر علی کا سارا مواد ان کے اپنے اور براہ راست مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا خطبات احمدیہ کا سارا زور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دینے پر ہے۔ جس بات کا جواب نہیں بنتا وہاں سرسید متعلقہ حدیث یا روایت کو غیر مستند کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ چنانچہ آغازی میں ابن اسحاق، ابن ہشام، واقدی، طبری کو رطب و یابس کا انبار قرار دے کر مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان سب کے باوجود سرسید کے نزدیک ولیم میور کی کتاب عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ ہے۔

ان دو اہم کتابوں کے علاوہ اور بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے کتابچے سیرت اور متعلقات سیرت پر برصغیر کے مختلف علاقوں اور یہاں کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے۔ ان میں سے معراج ناموں اور میلاد ناموں کی طرف مختصر اشارہ میں کر چکا ہوں۔ جو کتابیں عربی سے ترجمہ ہوئیں ان کا بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ خصائص نبوت پر بھی برصغیر میں بہت سا کام ہوا۔ معجزات پر بہت سی چیزیں لکھی گئیں۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی جن کا پہلے تذکرہ آچکا ہے، انہوں نے بھی معجزات پر ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے تین سو معجزات کا ذکر کیا تھا۔ کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضور کے معجزات کی تعداد تین ہزار ہے۔ ان میں سے وہ صرف تین سو معجزات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں میرے علم میں نہیں۔ کم از کم میں نے شائع شدہ نہیں دیکھی۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے رسائل اردو اور متعدد علاقائی زبانوں میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے۔ خود سرسید نے قبل ازیں سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کو بعد میں انہوں نے ایک اشتہار سے disown کیا اور اس سے لاتعلقی ظاہر کی۔ یہ کتاب انہوں نے 1857 سے پہلے لکھی تھی جس میں معجزات وغیرہ کی تفصیل بہت اہتمام

سے بیان کی گئی تھی۔ یہ کتاب جس کا نام جلاء القلوب بذکر المحبوب تھا ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں لکھی
گئی تھی۔ یہ ایک طرح کا مولود نامہ تھا جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوت
سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا۔ بعد میں جب انہوں نے مآخذ پر تحقیق اور تنقید کی، اور ان کے
سامنے مآخذ سیرت کی تنقید کا سوال آیا تو ان کو غالباً یہ احساس ہوا کہ ان کی اس کتاب میں بہت
سے مآخذ کمزور ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے اس کتاب سے لاتعلقی ظاہر کی اور اس سے
براءت کا اظہار کیا۔ اسی زمانے میں اسی طرح کی ایک کتاب مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی تھی
جس کو مولانا حالی بعد میں بھی own کرتے رہے۔ اس میں نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی
سیرت کا مستند بیان تھا بلکہ پادری عماد الدین کی کئی گمراہیوں کی تذکرہ بھی تھا۔

پادری عماد الدین اور دوسرے غیر مسلم مؤلفین نے جو کتابیں لکھیں ان کے جواب میں
بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے رسائل لکھے گئے۔ ایک زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی
عبدالحق نے اپنے زمانے میں ایک قاموس کتب تیار کرائی تھی جو کئی جلدوں میں تھی۔ اس میں
اس زمانے تک چھپی ہوئی اردو کی مطبوعہ کتب کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اس فہرست میں سیرت
پر تقریباً چار سو کتابوں کا تذکرہ تھا جن میں دو سو کتابیں معجزات وغیرہ پر تھیں اور دو سوا دو سو کے
قریب میلاد نامے تھے۔ ان میں سے بہت سے میلاد نامے اسی دور میں لکھے گئے جو اٹھارویں
صدی کے اواخر سے انیسویں صدی کے اواخر تک کا زمانہ تھا۔

پھر انیسویں صدی کے اواخر میں سید امیر علی اور سرسید احمد خان اور ایسے حضرات کی
کتابوں نے ہمارے سامنے سیرت نگاری کا ایک نیا اسلوب رکھا جو زبان کے اعتبار سے سادہ،
اسلوب کے اعتبار سے دلنشین، دلائل کے اعتبار سے مؤثر اور اپنی پختگی کے اعتبار سے انتہائی
عالمانہ اور ادیبانہ تھا۔ یہ اسلوب جب متعارف ہوا اور پھر شبلی نے اس اسلوب کو غیر معمولی بلندیوں
تک پہنچا دیا، جس کا تذکرہ اگلے خطبہ میں آرہا ہے تو اس سے وہ قدیم اسلوب متروک ہو گیا جس
پر لوگ پہلے سیرت لکھا کرتے تھے۔ جس میں زیادہ بیان معجزات کا اور ان امور کا ہوتا تھا جن کا تعلق
روحانیات سیرت سے ہے۔ جس کا سیرت اور تاریخی واقعات سے نسبتاً کم تعلق ہوتا تھا۔

اس گفتگو کی تکمیل کل ہوگی ان شاء اللہ۔

☆

سوال و جواب

جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ ابن اسحاق اور واقدی کے بارے
میں محدثین نے کلام کیا ہے اور ان ماخذ کو مشکوک گردانتے ہیں تو
اس کے بعد علما اور تاریخ دان حضرات کن ماخذ سے استفادہ
کرتے رہے؟ کیا ان حضرات کے کام کو مشکوک قرار دینے
سے مسلمانوں کے علمی کام کا بڑا حصہ مشکوک نہیں ہو جائے گا؟

اصل میں بات یہ ہے کہ سیرت کا جو بنیادی ذخیرہ ہے وہ تو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے پوری طرح ثابت ہے۔ واقدی اور ابن اسحاق نے جزوی تفصیلات بہت فراہم کی ہیں۔ ان تفصیلات کے بارے میں ہر صاحب علم اپنی تحقیق کے بعد رائے قائم کرتا ہے۔ آپ نے تحقیق سے ایک بیان کو درست سمجھا اور اس کو قبول کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ لیکن ممکن ہے کہ دوسرا محقق اس بیان کو درست نہ سمجھے۔ یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔ اس سے ابن اسحاق اور واقدی کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ واقدی نے جو بڑا اور اصل کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے غزوات نبوی کے مقامات کو خود جا کر دیکھا۔ خود جا کر ان غزوات کے مقامات کا نقشہ بنایا۔ اس کام کو آج تک کسی نے مشکوک قرار نہیں دیا۔ یہ کام آج تک مستند مانا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جزوی طور پر اختلاف رائے رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

میں ذاتی طور پر نہ تو واقدی کے سارے کام کو بے اعتبار قرار دے کر رد کرنے کے حق میں ہوں اور نہ ہی واقدی کے سارے کام کے درجہ استناد کو امام بخاری کے کام کے برابر سمجھتا ہوں۔ امام بخاری اور ان جیسے دوسرے اکابر محدثین کا کام استناد کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اونچا ہے۔ کوئی بھی بیان اگر اس کے مقابلے میں آتا ہے اور بخاری اور مستند محدثین کی روایت سے متعارض ہے تو اس پر بار بار غور کرنا پڑے گا۔ اس لئے واقدی

اور دوسرے سیرت نگاروں کے بارے میں تو ان سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نہ کسی طور پر رد کرنا مناسب ہے اور نہ ان کی خوبیوں کو سوفیصد مستند سمجھنا درست ہے۔

☆☆

یہ کیا سبب ہے کہ برصغیر میں سیرت پر جو کام ہوا ہے وہ سندھ اور ایک دو علاقوں تک محدود رہا؟

شروع شروع میں سیرت نگاری کا کام سندھ تک اس لئے محدود رہا کہ اس زمانے میں سندھ کے لوگ تعلیم و تدریس کے لئے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مشرق وسطی کے علمی مراکز میں آیا جایا کرتے تھے اور یہاں کی علمی زبان بھی ایک طویل عرصہ تک عربی رہی۔ اس لئے اہل سندھ کے لئے علمی اور تحقیقی کام آسان تھا۔ وہاں عرب دنیا سے تاجر بھی آیا کرتے تھے اور اہل علم بھی آیا کرتے تھے۔ جب برصغیر کے مسلمانوں کا مشرق وسطی سے سیاسی اور ثقافتی تعلق کٹ گیا اور افغانستان اور وسط ایشیا سے یہ تعلق قائم ہو گیا تو پھر براہ راست علمی روابط کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ پھر وہ علماء زیادہ آنے لگے جن سے افغانستان اور وسط ایشیا کے اہل علم کو زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ ان جغرافیائی اور سیاسی اسباب کا نتیجہ تھا۔

☆☆

آپ نے برصغیر میں سیرت نگاروں کی کاوشوں کا ذکر کیا تو اس میں کتنا حصہ ایسا ہے جس کو عرب دنیا میں بھی سراہا گیا؟

عرب دنیا میں برصغیر کے کئی کاموں کو سراہا گیا۔ ان میں سے دو کا تذکرہ میں ضرور کروں گا جس میں ایک تو علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی ہے اور دوسرا کام قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب 'رحمۃ للعالمین' ہے۔ ان دونوں کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر کے کئی اہل علم کے کام کا عرب دنیا میں اعتراف ہوا ہے۔ مصر میں شیخ رشید رضا کی مثال دی تھی جنہوں نے علم حدیث میں برصغیر کے علماء کے کام کو قابل قدر اور قابل احترام قرار دیا ہے۔

آپ نے سرسید کا بہت اچھا دفاع پیش کیا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ منکرِ حدیث تھے تو یہ بات کس حد تک ٹھیک ہے؟

میں نے سرسید کا دفاع پیش نہیں کیا۔ سرسید کے کام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ بات کہ وہ منکرِ حدیث تھے یا نہیں تھے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے اہلِ علم کی بڑی تعداد متفق نہیں تھی۔ ان کے اپنے رفقاء کو بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مذہبی خیالات کمزور دلائل کی بنیاد پر اختیار کئے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے مجھے بھی اتفاق نہیں ہے۔ سرسید کے بہت سے مذہبی خیالات ایسے تھے جو مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ تھے۔ اس لئے ایک حد تک ان کو معذور بھی سمجھا جانا چاہئے۔ بہرحال میری ذاتی رائے میں سرسید ہوں، سید امیر علی ہوں یا انیسویں صدی کے دوسرے اہلِ علم، ان کے بارے میں سنجیدگی سے کام لینا چاہئے۔ ان کے کام کے جو مثبت پہلو ہیں ان کو سراہنے میں کسی بخل اور تامل سے کام نہیں لینا چاہئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ سیرت نگاری اور دفاعِ سیرت کے سلسلہ میں ان کا یہ کام ایک بڑے نیک جذبے پر مبنی تھا۔ اس کا اعتراف ہونا چاہئے۔

☆

سر ولیم میور کی کتاب کی بقیہ تین جلدوں کا جواب کیوں نہیں دیا جا سکا؟ اب اگر کوئی ان کا جواب دینا چاہے تو آپ اور جناب وقار مسعود صاحب کس کس نوعیت کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں؟

اگر کوئی اس کا جواب دینا چاہے تو وقار مسعود صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس کام میں تعاون کے لئے تیار ہیں تو بسم اللہ۔ میں اپنی حد تک علمی مشورہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس کام کے لئے خاصے وسیع مادی وسائل اور انتظامی سہولتوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ وسائل اور سہولتیں اگر دستیاب ہوں تو آج بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔

بابا رتن ہندی: ساتویں صدی ہجری میں ایک شخص سامنے آیا۔ یہ شخص جنوبی ہندوستان کے کسی علاقے کا غالباً بھٹیاں وغیرہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کی عمر سات سو سال ہے اور اس نے اپنی نوجوانی میں عرب جا کر رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اس لئے وہ صحابی ہے۔ ہندوستان کے بہت سے خوش گمان اور خوش عقیدہ لوگ اس شخص کے عقیدت مند ہو گئے۔ علامہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

جب بابا رتن ہندی نے یہ دعویٰ کیا تو بہت سے لوگ اس کے عقیدت مند ہو گئے۔ اس نے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کرنی شروع کر دیں جو لغویات کے زمرے میں آتی ہیں۔ محققین نے ان سب لغویات کی تردید کی اور سب اہل علم نے بالاتفاق کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس کا کوئی تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک یا صحابیت سے نہیں ہے۔

ایک اور سوال عربی میں آیا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ سوال اردو میں لکھیں۔ کیونکہ اردو کی بجائے عربی اور دوسری زبانوں میں سوال پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پوچھا ہے کہ جن سر سید کا آپ نے ذکر کیا ہے کیا یہ وہی سر سید ہیں جن کا ذکر پاکستان اسٹڈیز کی کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے۔ جی ہاں! یہ وہی سر سید ہیں۔

☆

سید امیر علی کی انگریزی کتاب کا نام بتائیں؟

ان کی انگریزی کتاب اب Spirit of Islam کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی کئی بار ہوا ہے۔ اس کتاب سے استفادہ کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ کتاب آج سے سوا سو سال پہلے کے ماحول میں لکھی گئی تھی، بلکہ سوا سو سال سے بھی زیادہ۔ 1873ء میں یہ پہلی بار چھپی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے جو خیالات مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے ان خیالات کا اظہار ہے۔ بعض چیزیں صحیح ہیں اور اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہیں۔ بعض بعض باتیں قابل غور ہیں اور محل نظر ہیں۔ سید امیر علی کی ہر بات سے

اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی یہ کاوش اور جذبہ قابل قدر ہے اور یقیناً اللہ کی بارگاہ میں ان کو اس کا اجر ملے گا۔

☆

فتوح الشام کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ واقدی کی کتاب نہیں ہے۔ وضاحت فرمائیے کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں؟

یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا مصنف کون ہے۔ لیکن شروع سے یہ واقدی سے منسوب چلی آرہی ہے حالانکہ یہ واقدی کی نہیں ہے۔ اصل مصنف معلوم ہوتا تو واقدی سے کیوں منسوب ہوتی۔

☆

محترم غازی صاحب آپ نے مولانا مودودی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

آپ کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ مولانا مودودی 1903 میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے آج کی گفتگو میں انیسویں صدی کے آخر تک کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ مولانا مودودی کو انیسویں یا اٹھارویں صدی میں لے جاسکتے تو میں ضرور ان کا ذکر کرتا۔
مولانا مودودی کا ذکر کل دور جدید میں آئے گا۔ وہ بیسویں صدی کے آدمی ہیں۔

☆

کیا ہندوستان میں کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کو ہم زادالمعاد ہند کہہ سکیں۔

میرے علم میں نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لکھی گئی ہو لیکن میرے علم میں نہیں۔

☆

برصغیر یا پوری دنیا میں کوئی تنظیم کوئی تحریک یا جماعت سیرت کی دفاع کے لئے بنی ہے؟

نیز علمی ادارے پاکستان کو یہ شرف بھی حاصل ہے۔ لاہور کے قریب چونیاں نام کا ایک گاؤں تھا جہاں ایک سیرت کمیٹی بنی تھی۔ اس نے سیرت کے رواج کا بیڑا اٹھایا تھا اور سیرت کے لئے بہت کام کیا تھا۔ انفرادی تنظیم یا ایک ادارے کی صورت میں کوئی مرکز ملک میں قائم ہوئی ہو۔ اسی قسم کی حالات میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ سیرت اور صاحب سیرت کے رواج کے لئے ادارے قائم کئے جائیں۔

☆☆

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو جہانگیر کے لئے جو کتاب لکھی تھی اس کا نام کیا تھا؟

یہ ایک مجموعہ رسائل تھا جو جس میں حدیث اور پند نامے کی طرز کا تھا۔ اس میں بادشاہ کو بتایا گیا تھا کہ شریعت کی رو سے بادشاہ کے اختیارات اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یہ مطبوعہ موجود ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زندگی پر جو مقالہ ڈاکٹر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے اس میں انہوں نے اس کا خلاصہ دیا ہے۔

☆☆

آپ نے الٰہی تحریک کا تذکرہ کیا ہے اس کی ذرا مزید وضاحت کر دیں یہ کیا ہے؟

الٰہی تحریک یا دین الٰہی کی تحریک ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ بعض گمراہ لوگوں نے بادشاہ کے ذہن میں ڈال دیا تھا کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد حضور ﷺ کا دور ختم ہو گیا۔ آپ کی نبوت بھی نعوذ باللہ ختم ہو گئی۔ اب بادشاہ نیا دین اور نئی شریعت لے کر آئے گا۔ چنانچہ اس گمراہی سے متاثر ہو کر اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کے نام سے ایک طریقہ ایجاد کیا تھا جس کو چھوٹے سے حلقے نے مانا۔ جب تک اکبر زندہ رہا اس وقت اس کا چرچا اور حکومت کے چیلوں اور خوشامدیوں اس طریقہ کا پرچار کرتے رہے۔ اکبر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا چرچا بھی ختم ہو گیا۔

آپ نے سرسید کے بارے میں اچھی باتیں کہیں، لیکن وہ جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ کیا وہ مسلمانوں کو انگریز کے خلاف جہاد سے منع کرتے تھے۔

جی میں نے یہ تو نہیں کہا کہ سرسید نے سیرت پر کتاب لکھی ہے تو ان کی ہر بات سے میں متفق ہوں۔ انہوں نے سیرت پر کتاب لکھی۔ بہت بڑی بات ہے کہ لکھی۔ اس جذبے کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ باقی سرسید نے بہت سے ایسے کام بھی کیے جن سے مجھے اور بہت سے دوسرے حضرات کو اتفاق نہیں ہے۔ مجھے جہاد کے بارہ میں سرسید کے خیالات سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال یہ سرسید کی زندگی اور خیالات کا ایک متنازعہ پہلو ہے کہ سرسید نے جہاد کی مخالفت کی تھی۔ لیکن یہ ان کی شخصی رائے تھی۔ آپ قیامت کے دن ان سے پوچھئے گا کہ ان کی یہ رائے کیوں تھی؟

☆☆

سر ولیم میور کے چند بڑے بڑے اعتراضات جو انہوں نے حضورؐ کے بارے میں کئے ہیں ان میں سے چند ایک کی وضاحت کر دیں۔

اس نے چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے اور حضورؐ کے بارے میں ہر چیز کو منفی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تین چار اعتراضات کا میں نے اپنی گفتگو میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق بنی اسماعیل سے نہیں تھا۔ بلکہ جزیرہ عرب میں آباد قبیلہ قریش کا بھی بنی اسماعیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی سرسید نے تردید کی ہے اور جواب دیا ہے۔ ایک اعتراض یہ تھا کہ مکہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس پر بھی سرسید نے مفید کلام کیا ہے۔ مزید یہ کہ جس فاران کا ذکر تورات میں ہے وہ حجاز کا فاران نہیں بلکہ شام میں کوئی علاقہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ رسول اللہ کا خاندان عرب میں نعوذ باللہ معمولی خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کے دوسرے اعتراضات ہیں۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جہاں وہ مغرب نواز تھے وہیں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی بھی کی۔ لیکن کیا یہ مدرسہ اور سکول کا الگ الگ تصور پیش کر کے انہوں نے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا؟

جہاں تک علی گڑھ کا تعلق ہے اس نے تو مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا۔ انگریزی تعلیم کا چرچا تو علی گڑھ سے بہت پہلے تقریباً پچاس سال پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے کام لے کر مغربی پادریوں کی شرانگیزیوں کا جواب دینے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ آپ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سنا ہوگا۔ جنہوں نے پادری سی جی فنڈر کی تردید میں بڑا کام کیا۔ یہ کہنا میں بھول گیا کہ فنڈر ہی کے کہنے پر ولیم میور نے یہ کتاب لکھی تھی۔ پادری فنڈر ایک بہت بڑا پادری تھا جو مسلمان علماء سے مناظرہ کے لئے آیا تھا۔ مسلمان علماء سے مناظرہ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ علمائے اسلام کو شکست دے کر عیسائیت کی تبلیغ کے لئے راہ ہموار کر دے گا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہندوستان کے مشہور عالم، مناظر اور بزرگ تھے۔ انہوں نے مغربی مذاہب یعنی عیسائیت اور یہودی مذہب کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ فنڈر کا مناظرہ ہوا۔ مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکست ہوئی اور وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کے فرار کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے کئی کتابیں لکھیں۔ فارسی میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب عربی میں لکھی۔ عربی کتاب کا نام اظہار الحق ہے اور عیسائیت کی تنقید پر مسلمانوں کی طرف سے لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

بعد میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے 1857 کے جہاد میں حصہ لیا۔ جہاد کی ناکامی کے بعد وہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں جب لوگوں کو پتہ چلا کہ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو ان کی شہرت ہوئی اور دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں ان کا نام معروف ہو گیا۔ ترکی کے عثمانی خلیفہ نے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے انہی دنوں پادری فنڈر بھی استنبول میں تھا اور وہاں وہ یہ کہتا پھر رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے علماء کو شکست دے دی ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی آ رہے ہیں تو وہ راتوں رات وہاں

سے قرار ہو گیا اور پھر استعمال ہی نہیں آیا۔ عثمانی خلیفہ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی یہ کتاب اپنے خرچ پر شائع کرائی۔ عرب دنیا میں اور عرب دنیا سے باہر درجنوں مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مشہور معروف کتاب ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا یہ تذکرہ اس لئے بھی آیا کہ ان کے معاونین میں ایک صاحب علم اور انگریزی داں شخص ڈاکٹر وزیر خان تھے جو سرسید کی پیدائش سے بھی شاید پہلے انگلستان گئے تھے۔ وہاں سے انگریزی پڑھ کر آئے تھے۔ سرسید کا ذکر نہیں تھا جب سے ڈاکٹر وزیر خان نے انگریزی زبان، مغربی علوم اور بائبل کا مطالعہ شروع کر رکھا تھا اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو انگریزی زبان میں مسیحیت کا لٹریچر اور حوالے دینا ان کا کام تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ سرسید نے پہلی بار انگریزی تعلیم کو فروغ دیا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ نہ انہوں نے مدارس اور جدید تعلیم کو الگ الگ کرنے کی کوئی بات کی۔

☆

سرسید کا تعلیمی پس منظر مذہبی تھا یا نہیں؟

اس زمانے میں ہر شخص کا تعلیمی پس منظر مذہبی ہوا کرتا تھا۔ سرسید نے وہی روایتی تعلیم حاصل کی تھی جو بقیہ لوگ حاصل کرتے تھے۔ سرسید عربی خوب جانتے تھے۔ فارسی میں ان کی غزلیں اور نظمیں مشہور ہیں۔ فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ سرسید اور بانی دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک ہی استاذ کے شاگرد اور ایک ہی درس گاہ کے پڑھے ہوئے تھے۔

ہمارے ہاں روایت یہ بن گئی ہے کہ یا تو ہر چیز کو آپ بالکل منفی انداز میں دیکھیں گے یا بالکل عقیدت مندانہ انداز میں دیکھیں گے۔ ضروری نہیں کہ کسی شخص کی ایک بات سے اگر آپ متفق ہوں تو ان کی بقیہ تمام باتوں سے بھی آپ اتفاق کریں۔ یا اگر آپ کو ایک بات سے اختلاف ہے تو اس کی باقی تمام باتوں سے بھی اختلاف کریں۔ سرسید کی بہت سی باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ لیکن ان کی جو باتیں قابل تعریف ہیں ان کی تعریف کرنی چاہئے۔ یہ رویہ مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ اگر آپ کسی کی ایک بات سے اختلاف کرتے ہوں تو آپ اس کی ہر بات کا انکار کر دیں۔ اور اگر کسی کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں تو اس کی

ہر بات سے اتفاق کریں اور اس کے ہر رطب و یابس کو درست مان لیں۔ اسلامی رویہ یہ ہے کہ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' جو اچھا ہے وہ لے لو اور جو برا ہے اس کو رد کر دو۔

☆

کیا وجہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے باوجود آبادی کا پندرہ فیصد ہی مسلمان ہو سکا۔ بعض آرا یہ ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اسلام براہ راست صحابہ کرام کی توسط سے نہیں پہنچا۔ بلکہ صوفیائے کرام اور مبلغین اس کا سبب بنے۔

اس کا جواب دینا تو بڑا دشوار ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد سے کیوں نہ بڑھ سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں وہاں آج تک مسلمان آبادی سو فیصد ہے۔ جہاں صحابہ کرام تشریف نہیں لے جا سکے وہاں مسلمان آبادیاں کہیں سو فیصد ہیں اور کہیں نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ سلاطین مغلیہ نے اس معاملے میں کوتاہی کی اور تبلیغ کا فریضہ خاص طور پر جنوب میں انجام نہیں دیا۔ محمد خان تغلق نے جو جنوب میں تبلیغ کا کام کرنا چاہتا تھا اس معاملہ پر توجہ دی تھی اور وہ بہت سے کام کرنا چاہتا تھا۔ یاد نہیں شہر کا نام کیا تھا، وہ دارالحکومت بھی وہاں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ محمد تغلق نے بعض علما اور صوفیا کو بھی وہاں بھیجا۔ لیکن دینی حلقوں میں اس کو ناپسند کیا گیا اور اس کے انتقال کے بعد یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو ممکن ہے آج حالات مختلف ہوتے۔

☆

سر سید کے دور کے اس کمبخت انگریز کا پورا نام اور اس کی کتاب کا نام بتا دیں اور یہ وہ کس صوبہ کا گورنر تھا؟

میرے خیال میں اس طرح کے غیر ثقہ الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ مصنف کا نام تھا سر ولیم میور۔ کتاب کا نام Life of Muhammad تھا۔ ۱۸۵۸ سے لے کر ۱۸۶۱

کے سالوں میں غالباً جمیعی تھی۔ وہ صوبہ یو پی کا لفٹیننٹ گورنر تھا۔

☆

کیا یہ بات صحیح ہے کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا کہ نہیں تھا۔ البتہ ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔

☆

آپ یہ محاضرات انٹرنیٹ پر کیوں نہیں دیتے۔ اپنا ویب سائٹ کیوں نہیں بناتے؟

میرے پاس ان محاضرات کو انٹرنیٹ پر دینے کے وسائل نہیں ہیں۔ پھر میرے ملفوظات اس درجے کے نہیں ہیں کہ ان کو انٹرنیٹ پر دیا جائے۔ یا ان کی ویب سائٹ بنائی جائے۔

☆

ایک صاحب نے پھر سرسید کے بارے میں پوچھا ہے کہ ان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے؟

میں ان کو انگریزوں کا ایجنٹ نہیں سمجھتا۔ میری ناچیز رائے میں سرسید کے خیالات سے اور ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو انگریز کا ایجنٹ کہنا بڑی بات ہے۔ اس طرح کی رائے دینے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ انہوں نے ممکن ہے دیانت داری سے یہ سمجھا ہو کہ مسلمان ان حالات میں انگریز سے نہیں لڑ سکتے۔ لڑیں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے وجود اور تسلط کو حقیقت مانتے ہوئے اپنے لئے راستہ تلاش کرنا چاہئے۔

☆

حضرت شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی کی سوانح عمری لکھئے

والے کسی اچھے مصنف کے بارے میں بتا دیں۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے خود ان دونوں بزرگوں کے بارہ میں کتابیں لکھی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری کتابیں پڑھیں۔ کراچی کے ایک بہت اچھے عالم، محقق اور ثقہ بزرگ مولانا سید زوار حسین شاہ نے مجدد الف ثانی پر ایک بہت اچھی اور ضخیم کتاب لکھی ہے۔ وہ آپ ضرور دیکھیں۔

شاہ ولی اللہ کی سوانح عمری پر بہت اچھی کتابیں اردو میں چھپی ہیں! لیکن مجھے اس وقت ان کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔ انگریزی میں بھی شاہ صاحب پر کئی اچھی کتابیں موجود ہیں۔

☆

شاہجہاں کے لئے شیخ عبدالحق نے جو کتاب لکھی تھی کیا اس کو آج کے حکمرانوں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

آپ ڈاکٹر وقار مسعود کو اس کا ایک نسخہ بھجوا دیجئے وہ آگے دے دیں گے۔

☆

آپ نے علامہ اقبال کا فارسی شعر بیان کیا تھا اس کا ترجمہ بیان کیجئے۔

کون سا شعر تھا؟

وہ جو مدینہ جانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

مجھے تو بس دوست کی منزل کی خوشبو آرہی ہے۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔

۔☆۔

گیارہواں خطبہ

مطالعۂ سیرت دورِ جدید میں

گیارہواں خطبہ

مطالعہ سیرت دور جدید میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی الہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام صدر جلسہ محترم جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری،
سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی،
محترم جناب امیر البحر افتخار احمد سروہی،
برادران مکرم،
خواہران محترم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے 'مطالعہ سیرت دور جدید میں'۔ دور جدید سے مراد بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک کا زمانہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں کمی اور کیفی دونوں اعتبار سے سیرت النبی کے مختلف پہلوؤں پر بہت عمیق، وسیع النوع اور مختلف الاطراف کام ہوا ہے۔ برصغیر میں سیرت پر بیسویں صدی میں جن حضرات نے قلم اٹھایا، انہوں نے سیرت پاک کے ایسے ایسے نئے پہلو روشن کئے ہیں جو صرف برصغیر کے اہل علم ہی کا خاصہ تھا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں میں سیرت پاک کے اتنے عمیق، گہرے اور وسیع مطالعہ کی مثالیں نہیں ملتیں۔ شاید ابتدائی صدیوں میں برصغیر کے مسلمانوں سے جو تقصیر سرزد ہوئی تھی، اللہ کی مشیت نے اس کی تلافی کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور برصغیر کے لوگوں نے انیسویں صدی میں اور اس سے کہیں زیادہ بیسویں صدی میں اس تقصیر کی تلافی کی اور سیرت پاک کے

ایسے ایسے پہلو قارئین کے سامنے رکھے جن کی طرف گزشتہ تیرہ سو سال میں محققین اور سیرت نگاروں کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔

دورِ جدید میں مطالعۂ سیرت کے بہت سے ایسے پہلو سامنے آئے جن کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ دراصل سیرت پر کام کا آغاز تو اب ہوا ہے۔ اور اب تحقیق کی ایک نئی دنیا، تحقیق کا ایک نیا سمندر، اور تحقیق کا ایک نیا عالم دریافت ہوا ہے۔ ان نئی نئی کاوشوں کو دیکھ کر بے اختیار علامہ اقبال کا وہ مشہور شعر یاد آتا ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ

گمان مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بیسویں صدی کے اس دور میں عسکریاتِ سیرت پر، یعنی سیرت النبی کے عسکری پہلو پر، رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی پر اور مختلف جنگوں میں استعمال کئے گئے طریقوں پر جو تحقیق ہوئی ہے وہ ماضی میں نہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ عسکریاتِ سیرت پر جس کا ابھی تذکرہ آئے گا، جن حضرات نے قلم اٹھایا ہے وہ عسکریات کے میدان کے شہسوار ہیں۔ جن کی پوری زندگیاں اسی میدان میں گزری ہیں۔ اور جس مہارت اور بصیرت کے ساتھ وہ عسکریاتِ سیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں، دوسروں کے لئے بڑا دشوار ہے۔

اسی طرح سے اداریاتِ سیرت، یعنی سیرت کے ادارتی اور انتظامی پہلوؤں پر، بعض محققین نے یقیناً قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ان میں سے دو بڑی کتابوں کا تذکرہ پہلے تفصیل سے ہو چکا ہے۔ خزاعی کی 'تخریج الدلالات السمعیہ' اور عبدالحئی کتانی کی 'التراتیب الاداریہ'۔ ان دونوں کتابوں کی خوبی یا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے سیرت، حدیث، تفسیر، اسلامی تاریخ اور متعلقہ موضوع پر دستیاب تمام لٹریچر کا جائزہ لے کر وہ معلومات یکجا کر دی تھیں جو ان مصادر میں بکھری ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کون کون سے انتظامی فیصلے فرمائے۔ آپؐ نے اپنے مبارک دور میں انتظامی طور پر کیا کیا اقدامات فرمائے۔ ان کے بارے میں معلومات بکھری پڑی تھیں۔ ان دونوں مصنفین نے یہ معلومات یکجا کر دیں۔ لیکن یہ بات کہ ان تمام چیزوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہو۔ ان کی روشنی میں نئے انتظامی اصول دریافت کئے گئے ہوں اور دورِ جدید کی اصطلاحات میں انتظامیات اور سیاسیات کا نیا نقشہ مرتب کر دیا گیا ہو کہ عہدِ نبوی

کا پورا نقشہ سامنے آجائے۔ یہ کام بیسویں صدی میں ہوا ہے۔

اسی طرح سے سیاسیات سیرت، یعنی رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہ ریاست کے جو فیصلے کئے، ان میں سے کون کون سی حکمتیں پنہاں تھیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف قوموں اور قبائل سے جو معاہدے کئے، ان میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ یہ تمام معاملات ایک نئے انداز اور نئے اسلوب سے بیسویں صدی کے محققین نے پیش کئے ہیں۔

بیسویں صدی کا ایک دوراہم پہلو جس کی طرف کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہوگی، وہ استشراقیت کا پہلو ہے۔ مستشرقین اور استشراق کی تاریخ تو خاصی پرانی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کے بارے میں لکھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مصنفین نے بھی سیرت پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دوسری مغربی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے صرف ایک یعنی سر ولیم میور کی کتاب کا تذکرہ گزشتہ گفتگو میں تفصیل سے آیا ہے۔ بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر مغرب میں سیرت پر کام ہوا۔ بلاشبہ اس کام کے بہت سے پہلو مثبت ہیں۔ ان پہلوؤں کا اعتراف کرنا چاہئے۔ بعض پہلو یقیناً عالمانہ انداز میں بیان ہوئے۔ لیکن مستشرقین کے کام سے کئی اعتبار سے اختلاف رائے کی گنجائش بھی بہرحال موجود ہے۔ مسلمانوں کو حق ہے کہ اپنے اختلاف اور رائے کا دلیل کے ساتھ اظہار کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ بعض مغربی مصنفین نے اس انداز سے کام کیا ہے کہ ان کی نیت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور ان کو نیک نیت ماننا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں بعض بڑی بدیہی معاملات کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعض ایسی صاف اور واضح چیزوں کی انتہائی غلط تعبیر کی گئی ہے جو عقل سلیم کے بھی خلاف ہے اور علمی اصولوں سے بھی متعارض ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں ان کا تفصیلی جواب موجود ہے۔ اس کے باوجود کسی چیز کی منفی تعبیر کرتے رہنا اور تکذیب اور کمزور دلائل سے کام لے کر ہر دفعہ ایک منفی نقشہ پیش کرتے رہنا ایک ایسی ناپسندیدہ کاوش ہے جس کی وجہ سے لکھنے والے کی نیت پر شک ہونے لگتا ہے۔

بیسویں صدی میں مطالعہ سیرت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ یہ پہلو بیسویں صدی سے پہلے بہت سے محققین کے سامنے نہیں تھا۔ جب تک طباعت کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا تو بہت سی

کتابیں مخطوطات کی شکل میں تھیں۔ مخطوطات کی ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں آمد و رفت کوئی آسان اور سہل کام نہیں تھا۔ اگر مراکش اور اسپین میں کوئی علمی اور تحقیقی کام ہوا ہے، قرطبہ اور غرناطہ میں کسی نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس زمانہ کے حالات میں لاہور، دہلی اور ملتان کے کسی سیرت نگار کے پاس اس کتاب یا اس کے قلمی نسخہ کا علم ہونا ایک مشکل بات تھی۔ اگر کسی نے لاہور میں بیٹھ کر کوئی کتاب لکھی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دہلی میں بیٹھ کر کوئی کام کیا ہے تو تلمسان اور فاس کے محققین کو وہ کام دستیاب ہو جائے، یہ بہت مشکل بات تھی۔ عموماً یہ مسودات اور مخطوطات حجاج کرام کے ذریعے پہنچتے تھے۔ اگر کوئی شخص حج کے لئے جاتے وقت یہاں کی کتابیں یا مخطوطات لے کر حجاز چلا گیا اور مراکش سے آنے والے کسی حاجی کو اس کا علم ہو گیا تو یہ محض اتفاقیہ بات تھی۔ اس طرح اگر اتفاقاً کوئی چیز ایک ملک سے دوسرے ملک چلی جاتی تھی تو دوسرے ممالک کے لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی، ورنہ عموماً یہ مخطوطات اسی علاقے تک محدود رہتے تھے، جس علاقہ میں وہ لکھے گئے ہوں یا دستیاب ہوں۔ اس وجہ سے بہت سی اہم اور قدیم کتابیں سیرت نگاروں کے لئے دستیاب نہیں تھیں۔

اب جب طباعت کا زمانہ آیا تو بڑے بڑے پرانے مخطوطات ایک ایک کر کے چھپنے شروع ہوئے۔ اور دنیا کے تمام سیرت نگاروں کو وہ تمام مآخذ دستیاب ہو گئے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔ خود چودھویں صدی کے آغاز تک بہت سی کتابیں موجود نہیں تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی جن کا ابھی تذکرہ آتا ہے، انہوں نے کئی مرتبہ دکھ کے ساتھ یہ لکھا کہ تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی۔ اگر مل جاتی تو میرے بہت سے عقدے حل ہو جاتے۔ تاریخ ابن کثیر یعنی البدایہ والنہایہ اب دنیا کے ہر بڑے اسلامی کتب خانے میں اور لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں موجود ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا اور اہم اسلامی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جہاں البدایہ والنہایہ موجود نہ ہو۔ لیکن مولانا شبلی کو ہمارے اسی علاقہ میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اسی طرح کی اور بہت سی کتابیں تھیں جو مورخین کے سامنے نہیں تھیں۔ اس لئے سیرت پر ان کا کام نسبتاً محدود تھا۔

چودھویں صدی میں ایک اور مثبت فرق بھی واقع ہوا۔ چودھویں صدی سے قبل ایک آدھ کے استثناء کے علاوہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تمام مسلم سیرت نگار مغربی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ سرسید کے بارے میں ہم نے دیکھا کہ انہوں نے دو انگریزوں کو ملازم

رکھا تھا۔ ان کی مدد سے وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ مغربی مصنفین نے کیا لکھا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ مترجم کی مدد سے کتنا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ جبکہ مترجم نہ اس موضوع سے کوئی ہمدردی ہو، نہ وہ اس فن کا ماہر ہو۔ اس کے برعکس آج سینکڑوں بلکہ ہزاروں سیرت نگار ہیں جو انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور تقریباً تمام مغربی زبانوں سے واقف ہیں۔ مغربی زبانوں میں سیرت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا آج لکھا جا رہا ہے وہ براہ راست آج کے سیرت نگاروں کے علم میں ہے۔ ان کے لئے ان اعتراضات اور شبہات کا براہ راست جواب دینا نہایت آسان ہے۔ جو مغربی سیرت نگاروں کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔

دورِ جدید میں سیرت نگاری کے کئی نئے پہلو یا اسالیب سامنے آئے۔ کچھ حضرات نے قدیم روایتی انداز سے سیرت پر کتابیں لکھیں۔ بعض بہت وسیع کتابیں قدیم محدثانہ انداز میں بھی بیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ تیسرا ایک نیا رجحان سیرت النبی کے تجزیاتی مطالعہ کا شروع ہوا جو ماضی میں کم تھا۔ رسول اللہ ﷺ بطور سربراہ ریاست، بطور سپہ سالار، قانونی، بطور مربی، اس طرح سے سیرت کے الگ الگ پہلوؤں پر سیرت نگاروں نے معلومات کو جمع کیا اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ جمع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح سے موضوعاتی انداز میں سیرت پر کام ہوا۔ سیرت کے مختلف موضوعات پر جہاں ایک کتاب لکھی جاتی تھی، اب درجنوں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

سیرت پر کلامی اور مناظرانہ انداز کی کتابیں پہلے بھی تھیں۔ لیکن اب اس میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی۔ مستشرقین نے سیرت پر اتنا بہت لٹریچر تیار کیا ہے جس کا جواب دینے کا سلسلہ سرسید احمد خان اور سید امیر علی جیسے مشاہیر نے شروع کیا۔ ان حضرات کے بعد آنے والا ہر سیرت نگار اب مستشرقین کی تحریروں کا نوٹس بھی لیتا ہے۔ ان کے کام کا جائزہ بھی لیتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی پیدا کی ہوئی دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح کی غلط فہمیوں کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ سیرت کا مناظرانہ ادب اہل مغرب کے جواب میں بھی تیار ہوا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے آپس کے فرقہ وارانہ مباحث میں بھی سیرت کا حوالہ کثرت سے دیا گیا اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف مسلمان مسلکوں اور مکاتب فکر نے اپنی اپنی تعبیر اور مطلب

کے نقطۂ نظر کی حمایت میں پیش کیا۔ اس طرح سیرت کا ایک داخلی مناظراتی یا داخلی کلامی ادب بھی پیدا ہوا۔

پھر یہ دور یعنی بیسویں صدی مسلمانوں میں تجدید اور احیا کی تحریکات کا دور ہے۔ بہت سی اسلامی اور دینی تحریکات مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں سامنے آئیں جن کی کوشش یہ تھی کہ اسلامی روایات کو زندہ کر کے مسلمانوں کا احیا کیا جائے۔ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا احیا کیا جائے اور قدیم اسلامی آئیڈیل کے مطابق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کی جائے۔ پاکستان خود ایک تجدیدی اور احیائی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ تحریک پاکستان خود ایک تجدیدی اور احیائی تحریک تھی جس میں سے اہم سب سے قوی اور پرزور حوالہ اسلام اور اسلامی روایات کا تھا۔ یہ بات قائداعظم کی تقریروں اور علامہ اقبال کے بیانات سے واضح ہے۔ اس تجدیدی اور احیائی ماحول میں سیرت النبی پر ایک نئے انداز سے غور و خوض شروع ہوا۔ سیرت النبی کے دروں نازل ہونے کو نمایاں کیا گیا۔ اس سے کام لے کر تجدیدی اور احیائی ادب نے سیرت میں ایک نئی معنویت پیدا کی۔

ماضی کے بیشتر سیرت نگار سیرت کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، شخصیت اور آپؐ کے غزوات اور مہمات تک محدود سمجھتے تھے۔ اگرچہ سیرت کی ابتدا ایک جامع انداز میں ہوئی تھی، لیکن درمیان میں جب سیرت کا علم ایک الگ فن بن گیا تو وہ تاریخ اسلام یا تاریخ صدر اسلام کا ایک مقدمہ یا تمہید قرار پائی۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر اور خاص طور پر بیسویں صدی کے اوائل کے مصنفین نے سیرت اور پیغام سیرت دونوں کو یکجا کر کے سیرت کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا اور پیغام سیرت کو بھی علم سیرت ہی کا حصہ بنا دیا۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوری اور ان سے پہلے سر سید امیر علی نے سیرت اور پیغام سیرت دونوں کو یکجا بیان کیا۔ اس طرح ایک اجتماعی مثبت اور قابل ذکر رجحان پوری شریعت اور پیغام سیرت کو سیرت کا حصہ سمجھنے کا سامنے آیا۔ گویا کوشش یہ ہوئی کہ پیغام سیرت کی روشنی میں سیرت کو سمجھا جائے اور سیرت کی روشنی میں پیغام سیرت کی تعبیر و تشریح کی جائے۔

دور جدید کے مصنفین نے مغربی اسلوب استدلال سے بھی کام لیا۔ بہت سے سیرت نگاروں کی تعلیم و تربیت مغربی یونیورسٹیوں اور مشرقی یونیورسٹیوں میں مغربی انداز کے مطابق

۹۔ سیرت نگاری میں تجدیدی اور احیائی رجحانات

۱۰۔ سیرت کے جامع تر مطالعہ کا رجحان

۱۱۔ سیرت نگاری اور مغربی اسلوب استدلال

۱۲۔ سیرت نبوی قرآن پاک کی روشنی میں

۱۳۔ سیرت کا تخصص اور مسند ہائے سیرت

۱۴۔ مجلہ ہائے سیرت

۱۵۔ مراکز مطالعہ سیرت

آج کی گفتگو میں ان سب اسالیب اور رجحانات پر مفصل بحث تو ممکن نہیں۔ تاہم ان میں سے اہم اسالیب اور رجحانات کا ابتدائی اور ضروری تعارف پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ بیسویں صدی کا پہلا نصف برصغیر میں دو سیرت نگاروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس میدان کے شہسوار ہیں۔ صرف برصغیر نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں میدان سیرت کے شہسوار اور اس فضا نے بے کراں کے شہباز دو شخصیات ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ بیسویں صدی کا پہلا نصف ان دونوں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا نصف بھی ہمارے برصغیر اور پاکستان کی ایک شخصیت کے ہاتھ میں ہے جن کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ بیسویں صدی میں مجدد علوم سیرت ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ان تینوں شخصیات کا کام ایک بے مثال اور رجحان ساز کام ہے، سیرت کے جن گوشوں کو انہوں نے نمایاں کیا۔ جس انداز سے سیرت پر لکھا۔ اس کی مثال عرب دنیا میں نہیں ملتی۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ جن کی تفصیل کے لئے میں ابھی راہنمائی اس موضوع کی طرف آتا ہوں، سیرت پر دو ایک اور پہلو بھی ہمارے سامنے آئے۔ ایک یہ کہ قدیم عربی کتابیں جو سیرت کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں اور عام انسانوں کو براہ راست سیرت کے ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔

سیرت ابن اسحاق جو سیرت کی سب سے پہلی مکمل کتاب ہے۔ اس کے جو اجزا موجود ہیں وہ آج سب کے سامنے ہیں۔ اس کا اردو، انگریزی، فرانسیسی اور غالباً جرمن ترجمہ بھی

دستیاب ہے۔ ترکی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ سیرت ابن ہشام دنیا کی ہر بڑی زبان میں دستیاب ہے۔ طبقات ابن سعد، سیرت حلبیہ، واقدی کی کتاب المغازی، ان کتابوں کے تراجم دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں موجود ہیں۔ خود ہمارے برصغیر میں بعض ایسی کتابیں شائع ہوئیں جو ابھی تک مخطوطات کی شکل میں تھیں اور دنیا کو ان کی خبر نہیں تھی۔ اس معاملہ میں اگر دو اداروں کا نام لیا جائے تو شاید بجا ہوگا۔ ایک ادارہ مسلمانوں کا تھا، یعنی حیدرآباد دکن کا دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ اس ادارہ نے سیرت، حدیث اور صدرِ اسلام کے اسلامی ادبیات پر سینکڑوں کتابیں شائع کیں اور پہلی مرتبہ دنیا کو سیرت اور حدیث کی درجنوں کتابوں سے واقف کرایا۔ فنِ رجال پر، سیرت پر، ابتدائے اسلام کے ادب پر، کئی احادیث کے مجموعے اس ادارہ کے زیرِ اہتمام حیدرآباد دکن میں شائع ہوئے۔

دوسرا بڑا ادارہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ ایک ہندو نول کشور نام کا قائم کردہ تھا۔ اس نے لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا جس کی ہندوستان کے کئی شہروں میں شاخیں قائم تھیں۔ اس نے اسلامی موضوعات پر سینکڑوں اچھی کتابیں شائع کیں۔ جس اچھی کتاب کو پڑھیں وہ نول کشور نے شائع کی۔ نول کشور ایک ہندو تھا۔ اس کے ہاں قرآن پاک کی طباعت کا کام ہوتا تھا۔ لیکن لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اتنے ادب اور احترام کے ساتھ قرآن پاک کی طباعت کا اہتمام کرتا تھا کہ اس نے اس کام کے لئے الگ حفاظ رکھے ہوئے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ قرآن پاک کی طباعت کے عمل میں باوضو ہو کر شریک ہوں۔ جو تختیاں دھوئی جاتی تھیں ان کے لئے ایک الگ حوض بنایا گیا تھا۔ تاکہ دھلی ہوئی تختیوں کا پانی ضائع نہ ہو۔ ایک الگ حوض میں یہ پانی جمع ہو اور وہیں خشک ہو جائے۔ اس نے کارندے مقرر کئے ہوئے تھے جو بغداد اور مصر و شام جا کر نئی نئی کتابیں لایا کرتے تھے۔ جن کو وہ شائع کراتا تھا۔ اپنے دور کے چیدہ ترین علمائے اسلام سے رابطہ رکھتا تھا۔ ان کے مشورے سے وہ کتابوں کی طباعت کرتا تھا۔ پتہ نہیں دل سے مسلمان تھا کہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے۔ لیکن ضمناً ایک قصہ مختصراً عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

نول کشور کا بیٹا نئی نئی کتابیں حاصل کرنے کی غرض سے عرب ممالک خاص طور پر عراق اور مصر جایا کرتا تھا۔ 1935-36 میں وہ عراق گیا ہوا تھا۔ وہاں مکتبہ المثنیٰ بہت مشہور کتب

ملازمت تھا۔ وہاں کتابیں خریدنے گیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک دو دن میں تو وہاں نہیں جایا جا سکتا تھا۔ بحری جہاز میں پندرہ بیس دن لگتے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ بہت دو مہینے قیام کر کے کتابیں خریدیں اور پھر بحری جہاز سے واپس آ گئے۔ نول کشور کے اس بیٹے نے سنا کہ کسی سیلاب کی وجہ سے دو صحابہ کرام کی قبریں کھل گئی ہیں۔ ایک حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور دوسرے حضرت جابر بن عبداللہؓ۔ حکومت عراق کی سطح پر یہ طے ہوا کہ ان دونوں صحابہ کی میتوں کو نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ جب حکومت عراق نے یہ فیصلہ کیا تو بعض ملکوں سے مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی شرکت کا موقع دیں۔ بعض حجاج کرام جو حج کرنے جا رہے تھے انہوں نے بھی شرکت کی خواہش کی اور مطالبہ کیا کہ حج کے بعد تک اس کو ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ معاملہ ملتوی کر دیا گیا۔

حج کے بعد ہزاروں افراد کے مجمع میں دونوں صحابہ کی قبریں کھولی گئیں۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ایک فلم بنانے والی جرمن کمپنی بھی وہاں موجود تھی۔ مشرق و مغرب کے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی حاضر تھے۔ انگریزی فوجیں اس زمانے میں وہاں موجود تھیں، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بہت سے انگریز بھی آئے ہوں گے۔ جب دونوں صحابہ کی میتیں کھولی گئیں تو دونوں کی میتیں تر و تازہ تھیں۔ دونوں چونکہ شہدا تھے اس لئے ان کی میتوں پر تازہ خون موجود تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہودی ڈاکٹروں نے یہ دیکھ کر کہا کہ ان آنکھوں میں ابھی تک روشنی موجود ہے۔ اس موقع پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اسی موقع پر نول کشور کا وہ بیٹا بھی مسلمان ہو گیا اور باپ کی ناراضگی کے خوف سے واپس نہیں گیا۔ عراق ہی میں رہا۔ جب پاکستان بن گیا تو وہ کراچی آ گیا۔

مجھے 1980 میں کسی نے بتایا کہ نول کشور کا جو بیٹا اس واقعے سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا وہ کراچی میں ہے۔ میں 1980-81-82 میں تین چار مرتبہ اس سے ملنے اس کے مکان پر گیا لیکن اتفاق سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ صاحب ظاہر ہے کہ اس وقت خاصے بوڑھے ہو چکے تھے۔ اتفاق سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایک صاحب نے ان کا انٹرویو بہت تفصیلی کیا تھا جو کراچی کے کسی

جرائد جن میں ہفت روزہ شمشیر بھی شامل تھا شائع ہوا تھا۔ سیرت پاک اس کی نظم در حقیقت ہے وہ اس
میں انہوں نے یہ سارا واقعہ منظوم بیان کیا ہے اور کہا کہ میں نے یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں
سے دیکھا۔

یہ بات نول کشور کے حوالے سے آئی۔ منشی نول کشور نے جتنا کام کیا ہے، سیرت پر گفتگو ہو
اور نول کشور کی خدمات کا تذکرہ نہ ہو، یہ بڑا مشکل ہے۔ سیرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اور
بہت سی اصل کتابیں نول کشور کے مطبع میں شائع ہوئیں اور پہلی مرتبہ ان کے ذریعے مسلمانوں
تک پہنچیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جو بڑا کام ہوا میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ دو
کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ایک ایسی شخصیت کی ہے جن کے بارے میں
کچھ کہنا دشوار ہے۔ وہ بہت مختلف قسم کے تھے۔ بہت غیر معمولی ادیب تھے۔ قلم ان کا بہت
رواں تھا۔ انہوں نے بہت سے موضوعات پر کتابیں لکھیں اور بعض اختلافی موضوعات پر بھی لکھا
۔ وہ ان ہی اختلافی موضوعات پر لکھنے کی وجہ سے وہ ایک مختلف فیہ شخصیت بن گئے۔ مرزا حیرت
دہلوی۔ مرزا حیرت دہلوی ایک زمانے میں انگریزوں کے معتوب رہے۔ انگریزوں نے ان کو
سزا بھی دی۔ انہوں نے قید بھی کاٹی، لیکن قید کاٹ کر واپس آ گئے اور علمی اور دینی کاموں میں
مصروف ہو گئے۔ بڑے صاحب طرز ادیب تھے۔ انہوں نے سیرت رسول پر ۱۹۰۲ء میں چھ
جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے بعض حوالے میں نے کہیں کہیں پڑھے ہیں۔ یہ کتاب
قدیم اسلوب سے جدید اسلوب کی طرف پیشقدمی کے سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت
رکھتی ہے۔ زبان بڑی دلچسپ، بڑی شگفتہ ہے۔ لیکن مندرجات کے بارے میں اکثر اہل علم کو
تامل تھا۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ مصنف نے ادبیت پر تاریخیت کو قربان کیا ہے۔ ادیب
کے قلم میں جب زور بیان جوش دکھاتا ہے تو وہ احتیاط ملحوظ نہیں رہتی جو محدث یا سیرت نگار کے
مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں یعنی ۱۹۰۵ء میں لکھی جانے والی دوسری کتاب
مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی سیرت النبی ہے جو عام قارئین کے لئے لکھی گئی تھی۔

بیسویں صدی میں سیرت نگاری کا سب سے اہم پہلو مستشرقین کی سیرت نگاری کا
مطالعہ اور ان کے اعتراضات کا جواب ہے۔ مستشرقین نے کب سے کام شروع کیا۔ اس پر

بڑی لمبی بحث ہو سکتی ہے۔ ایک بڑی مشہور کتاب ہے المستشرقون فی الاسلام ہے۔ نجیب العقیقی نامی لبنان کے ایک بزرگ تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ہے۔ خود لبنان کے ایک مسیحی عالم نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھی ہے Orientalism کے نام سے۔ اور بڑے عالمانہ اور تحقیقی انداز میں یہ کتاب لکھی ہے اور مستشرقین کے مختلف ادوار کو بیان کیا ہے۔ ابتدائی مستشرقین یعنی وہ مغربی علما جو اسلامی علوم کو تحقیق کا موضوع بناتے تھے۔ وہ پادری تھے۔ اور ایک مذہبی اور مشنری جذبے سے اسلام کی کمزوریوں کو تلاش کرنا اور اسلامی تعلیمات کے منفی پہلوؤں کو بیان کرنا اپنا مشن سمجھتے تھے۔ انہوں نے سیرت کے بارے میں اتنی عجیب و غریب اور اتنی غیر علمی اور فضول باتیں کی ہیں کہ جن کو دہرانا بھی ایک سلیم الطبع انسان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان خرافات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک چھوٹی سی مثال میں دیتا ہوں جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جب انسان کی عقل ماری جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے تو انسان کتنا گر جاتا ہے۔ تعصبات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں تو وہ کتنی بے بنیاد باتیں کرتا ہے۔ یہ قصہ یا حکایت یا فضول گوئی کئی سو سال تک مغربی مصنفین کے ہاں مقبول رہی۔

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کبوتر کو سدھا رکھا تھا۔ اس کبوتر کو آپ اکثر اپنے کندھے پر بٹھا لیتے تھے اور اپنے کان میں کچھ دانے ڈال لیا کرتے تھے۔ کبوتر تھوڑی تھوڑی دیر میں دانہ چگنے کے لیے کان میں چونچ ڈالتا تو آپ فرماتے تھے کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ اللہ کا فرشتہ ہے جو میرے کان میں پیغام وحی ڈال رہا ہے۔ یہ بات کہاں سے آئی۔ کسی نے گھڑ لی، کسی کو اس کا علم نہیں۔ کسی تاریخ سے، کسی کتاب سے، کسی افسانے سے، کسی جھوٹ سے کسی لطیفے سے بھی اس طرح کی کوئی بات نکلی ہوتی تو اس کو دہرانے کا جواز ہو سکتا تھا۔ لیکن اسی طرح کی فضول باتیں یہ لوگ بیان بھی کرتے تھے اور پھر بار بار دہراتے بھی رہتے تھے جن کا جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ اول تو مسلمان اہل علم کو اس کا علم نہیں ہوا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ یورپ اور دنیائے اسلام کے درمیان کوئی آمد و رفت بھی خاص نہیں تھی اس لئے نہ ان خرافات کا علم ہو سکا اور نہ لوگوں نے اس کا نوٹس لیا۔

اس کے بعد جب استعماری قوتیں دنیائے اسلام پر قابض ہوئیں۔ فرانسیسی استعمار شمالی افریقہ اور مشرق وسطی پر، ولندیزی استعمار مشرق بعید پر اور انگریزی استعمار برصغیر پر قابض ہوا

تو استعماری ضروریات کی خاطر ان کو یہ شرق کے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مغربی قومیں جب کوئی فیصلہ کرتی ہیں تو بہت غور و خوض کے بعد کرتی ہیں۔ وہ لوگ قبضہ کرنے سے پہلے بہت سوچتے ہیں، کارروائی کرنے سے پہلے دشمن کی ہر چیز کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لئے دنیائے اسلام کا مطالعہ کرنا، مسلمانوں کے رجحان و مزاج کو سمجھنا، مسلمانوں کی کمزوریوں کو تلاش کرنا ان کی سیاسی اور استعماری ضرورت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے بڑے پیمانے پر ادارے قائم کئے۔ اہل علم کو مقرر کیا۔ ان اہل علم میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ خالص علمی ذوق رکھنے والے بھی تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے علمی کام بھی کئے۔ تاہم سنجیدہ اہل علم کے پہلو بہ پہلو مغربی استعمار کے مفاد کی نگہداشت کرنے والے بھی تھے۔ بہت سے 'اہل علم' اور 'محققین' ایسے تھے جو مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے باقاعدہ کارکن تھے۔ پادری تو بہت تھے جو مشنری جذبہ سے مسلمانوں کے علوم و فنون کا مطالعہ کرتے تھے۔ ہمارے دور میں بھی کئی پادری مستشرق ہوئے ہیں۔ یہ سب مل کر مشرقی علوم و فنون پر کام کرتے تھے۔

اس ضمن میں قرآن پاک، حدیث، سیرت اور فقہ سے مسلمانوں کی ادبیات، شاعری، قدیم شاعری، جدید شاعری، تاریخ اور ان سب موضوعات پر انہوں نے کام کیا ہے۔ اچھا کام بھی کیا ہے، بعض بڑے تحقیقی کام بھی کئے ہیں۔ فارسی ادب کی بڑی عالمانہ تاریخ جس نے لکھی ہے وہ ایک انگریز مصنف ہے۔ عربی زبان کی ایک بہت اچھی تاریخ بھی ایک انگریز نے لکھی ہے۔ یہ کام بھی ہوئے ہیں۔ اگرچہ پروفیسر براؤن جنہوں نے فارسی ادب پر بہت اچھی کتاب لکھی ہے اس کے قریب قریب ہر صفحے پر مولانا شبلی کا حوالہ ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ایسا ہو جس پر مولانا شبلی کا حوالہ نہ ہو اور شبلی نعمانی پر بہت زیادہ بھروسہ نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے اور عالمانہ کتاب ہے۔

یہ لوگ جب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قلم اٹھاتے تھے تو شروع شروع میں تو ان کا رجحان انتہائی منفی اور گستاخانہ ہوا کرتا تھا جس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک چھوٹے سے جملے سے آپ اندازہ کرلیں کہ کس انداز کے بیانات ہوتے تھے۔ جو جس کے دل میں آتا تھا بغیر کسی جوابدہی کے احساس کے بیان کر دیا کرتا تھا اور لکھ دیتا تھا۔ جان بوجھ کر بے بنیاد الزامات لگانا مستشرقین کے کام کا دور اول ہے۔

جب اٹھارویں صدی میں یہ تحقیقی ادارے بنے شروع ہوئے۔ مختلف ملکوں میں ایشیاٹک سوسائٹیاں بنیں۔ فرانس اور انگلستان میں بھی اور ہندوستان میں اس کے شعبے قائم ہوئے۔ کالجز بنے۔ انگریزوں اور دوسرے مغربی لوگوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ براہ راست اسلامی ورثہ سے واقف ہوئے تو ان کے کام میں تھوڑا سا ایک علمی رنگ آنا شروع ہوا۔ اس علمی رنگ کی وجہ سے بہت سی قدیم کتابیں انہوں نے شائع کیں۔ سب سے پہلے الاصابہ فی تمییز الصحابہ اسپرنگر نے شائع کی جو صحابہ کے تذکرہ پر ہے۔ کتاب المغازی سب سے پہلے ایک جرمن نے 1904 میں شائع کی۔ اس طرح ایک ایک کر کے یہ ساری کتابیں آنی شروع ہوئیں۔ لیکن جو کچھ پہلے لکھا گیا تھا ایک حد تک اس کا اثر موجود تھا۔ جو لوگ متعصب نہیں تھے وہ انہی باتوں کو دہراتے تھے۔ گبن بڑا ادیب اور مشہور مورخ ہے۔ اس کی کتاب بڑی عالمانہ کتاب ہے اور کلاسکس میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں میں نے بڑے اشتیاق سے اس کو پڑھا تھا۔ اس کا بڑا چرچا سنا کرتا تھا۔ درسی کتابوں میں اس کے بہت چرچے تھے۔ کتاب بہت اچھی اور عالمانہ ہے۔ لیکن جب وہ روم اور اسلام کے تصادم پر بات کرتا ہے اور بات رسول اللہ ﷺ پر آتی ہے تو وہ ساری علمیت، ساری ادبیت اور سارا توازن کم ہو جاتا ہے اور وہی باتیں جو پہلے سے لوگ لکھتے چلے آ رہے تھے انہی کو دہراتا ہے۔ اس میں بڑے گستاخانہ بیانات ہیں۔ گمان نہیں کہ یہ وہی گبن ہے۔ اس نے رومن ازم کو اتنا چڑھایا اور بڑھایا ہے کہ آج تک لوگ اس کے بیانات اور دعووں کو دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ سلسلہ اٹھارویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ انیسویں صدی کے وسط تک اس میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مستشرقین نے باقاعدہ سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ سیرت کا مطالعہ شروع کیا۔ بہت سے مستشرقین نے عربی زبان سیکھی۔ بہت سی کتابوں کا عربی سے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انہوں نے اسلامی ماخذ سے کام لے کر اور اسلامی مصادر کی بنیاد پر وہی بات کہنی شروع کی جو وہ پہلے سے کہہ چکے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک کے بارے میں جو کچھ انہوں نے اس دوران میں کہا۔ حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا۔ سیرت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

حدیث کے بارے میں ان کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث کے ذخائر جیسا کہ مسلمانوں کے پاس موجود ہیں، یہ سب کے سب غیر مستند ہیں۔ سب کے سب گھڑی ہوئی باتوں پر مبنی ہیں اور جو قصے کہانیاں مسلمانوں میں مشہور تھیں انہی قصوں کہانیوں کو چوتھی صدی کے مصنفین اور محدثین نے جمع کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے منسوب کر دیا۔ کچھ اور حضرات نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے اتنی بڑی بڑی متمدن حکومتوں کو ختم کر کے ایسا نظام قائم کیا کہ خود ان ملکوں کے رہنے والوں نے تسلیم کیا کہ انہیں جو عدل و انصاف اب ملا ہے پہلے نہیں ملتا تھا۔ تو یہ بات ان کے مستشرقانہ پندار نے قبول نہیں کی کہ ان کے آباؤ اجداد کو مسلمانوں سے کمتر سمجھا جائے اور ان کے نظام پر مسلمانوں کے نظام کو ترجیح دی جائے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ جو نظام مسلمانوں نے شریعت کے نام پر بنایا ہے، یہ تو ہمارے ہی رومن لا سے ماخوذ ہے۔ رومن لا کو عربی میں لکھ دیا اور وہ شریعت بن گئی۔ یہ بات انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر سے لکھنا شروع کر دی۔ مسلمان اہل علم نے اس کا اتنا مدلل جواب دیا کہ اس کے بعد انہوں نے یہ کہنا چھوڑ دیا۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں نے مختلف علاقوں سے کہاوتوں اور حکمت کی باتوں کو جمع کیا۔ ان کو عربی میں لکھ دیا اور حدیث کے طور پر حضور علیہ السلام کی ذات مبارک سے منسوب کر دیا۔ مسلمان علما نے اس کا بھی جواب دیا اور ایسا مدلل جواب دیا کہ اب یہ بات بھی کوئی نہیں کہتا۔ لیکن حدیث اور سیرت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیے جانا مستشرقین کی ایک پرانی عادت ہے اور وہ اور ان کے مشرقی تلامذہ طرح طرح سے آئے دن اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے اسرائیل کے شہر تل ابیب میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں سیرت کے مآخذ کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں جس بنیادی سوال پر بحث کی گئی وہ یہ تھا کہ سیرت کے مآخذ اور مصادر کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس پر بڑے بڑے مستشرقین نے تحقیقی مقالات پیش کیے اور مآخذ سیرت کے بارے میں وہی پرانی باتیں دہرانے پر اکتفا کیا اور انہی شکوک کا اظہار کیا جو گزشتہ کئی سو سال سے دہرائے جا رہے ہیں۔ یہ وہ شکوک ہیں جن کا جواب بیسیوں مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ جن کا جواب مسلمان اہل علم کثرت سے دے چکے ہیں۔ اب یہ بات کہ حدیث کے جتنے مآخذ تھے یہ چوتھی صدی ہجری میں لکھے گئے اس لئے ذخیرۂ

سارے مواد کو غیر تاریخی اور غیر معتبر قرار دے رہے ہیں۔ جس سیمینار کا میں نے ذکر کیا اس کے دس مقالے مجھے ملے ہیں۔ ان میں ان مآخذ کو ایک ایک کر کے مشکوک قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انہی مآخذ میں اگر کوئی ایسی چیز ہے جس کو اسلام کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اس کو استعمال کرنے میں ان مغربی مستشرقین اور یہودی محققین کو کوئی تامل نہیں ہے۔ تمام مستشرقین اس کو استعمال کرتے ہیں۔

مثلاً یہ بات ایک ضعیف راوی نے لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بچپن میں تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا کے ساتھ شام گئے تھے اور وہاں بصریٰ میں جو اس وقت اردن کا ایک شہر ہے، ایک راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس راہب نے حضور کو دیکھا اور آپ کے چچا سے کہا کہ آپ اس بچے کو لے جائیں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ یہودی اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ چنانچہ ابو طالب نے حضور کو فوراً واپس بھیج دیا۔ یہ واقعہ مستند محدثین کی نظر میں درست نہیں ہے۔ تمام معتبر علمائے حدیث اصول حدیث اور قواعد حدیث کی بنیاد پر اس روایت کو غیر معتبر قرار دیتے آرہے ہیں۔ خود اس روایت میں ایک داخلی گواہی اس بات کی موجود ہے کہ یہ واقعہ کمزور بلکہ بے بنیاد ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت ابو طالب خود تو سفر پر آگے چلے گئے اور حضرت بلال اور حضرت ابوبکر کے ساتھ حضور کو واپس بھیج دیا۔ حضرت بلال امیہ بن خلف کے غلام تھے اور شاید اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کیونکہ جب حضور تیرہ سال کے تھے تو حضرت بلال شاید ابھی پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ عمر میں حضور سے بہت کم تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق حضور سے دو سال چھوٹے تھے۔ جب حضور تیرہ سال کے تھے تو وہ گیارہ سال کے ہوں گے۔ لہٰذا یہ بات کسی طرح بھی معقول اور قرین قیاس نہیں ہو سکتی کہ ایک تیرہ سال کے بچے کو گیارہ سال کے بچے کی نگرانی میں بصریٰ سے واپس کر دیا کہ ریگستانوں میں دو ہزار میل سے زائد کا سفر کر کے اس کو واپس لے جاؤ۔ یہ اور اس طرح کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ درست نہیں ہے۔ محدثین نے پہلے ہی اس کو کمزور قرار دیتے چلے آرہے ہیں۔ محدثین کی نظر میں یہ مستند نہیں ہے۔

لیکن جن مآخذ کو وہ خود بھی غیر مستند قرار دیتے ہیں ان مآخذ کی یہ بات انہوں نے پکڑ لی اور کہنا شروع کر دیا کہ اصل حضور کو یہ ساری مذہبی معلومات اسی راہب نے دی تھیں۔ حضور نے

صحیح بخاری اور قرآن پاک کے غیر مستند ہونے کے بارے میں تو شیعوں کی کتابیں ہیں۔ جن کتابوں کو پہلے دن سے لاکھوں لوگ یاد کر رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں قلمی نسخے ہر دور کے لکھے ہوئے آج بھی جگہ جگہ دستیاب ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت کو ماننے میں تو تامل ہے۔ لیکن جن ادبی لطائف اور قصے کہانیوں کا کوئی آگا پیچھا نہیں ان کو بلا چون و چرا ماننے پر اصرار ہے، جبکہ ان میں کوئی منفی بات نکل آئے۔ قرآن پاک کو اتنے لوگوں نے حفظ کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر قرآن کے تمام نسخے ختم ہو جاتے تو قرآن پاک کو حافظے سے بیان کرنے والے ہزاروں آدمی موجود ہوتے۔ یہودیوں نے تو ایک بزرگ کو اس بنیاد پر اللہ کا بیٹا مان لیا کہ انہوں نے تورات از بر یادداشت کی بنیاد پر لکھوا دی تھی۔ اگر کتاب اللہ کا زبانی یاد کر لینا اللہ کا بیٹا ہونے کے لئے کافی ہے تو مسلمانوں کو کیا قرار دینا چاہئے، میں نہیں جانتا۔

یہ ساری چیزیں ہیں جن کا انیسویں صدی سے جواب دیا جا رہا ہے۔ سر سید امیر علی اور سر سید احمد خان کے زمانے سے لوگ اس کا جواب دے رہے ہیں۔ آج تک کسی مستشرق نے ان جوابات کا نوٹس نہیں لیا۔ آپ بڑے سے بڑے مستشرقین کی کتابیں دیکھیں۔ ان کے مآخذ میں آپ کو ڈاکٹر حمید اللہ نظر نہیں آئیں گے۔ سید امیر علی، ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور ایسے بزرگوں کا کوئی حوالہ نظر نہیں آئے گا۔ وہ ہمیں objectivity اور معروضیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ یقیناً ہمارا کام ہے کہ ہم objective اور معروضی انداز میں چیزوں کو لیں۔ یہ عجیب objectivity ہے کہ جن کے بارے میں آپ منفی باتیں کہہ رہے ہیں ان کی کسی دلیل کا سرے سے نوٹس ہی نہ لیا جائے، نہ یہ دیکھا اور سنا جائے کہ وہ آپ کی ان تحقیقات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دلائل سے آپ کی بات کو کمزور ثابت کیا ہے لیکن اس کا کوئی نوٹس آج تک کسی مستشرق نے نہیں لیا۔

مارگولیتھ کی صرفی، نحوی اور لغوی غلطیاں علامہ سید سلیمان ندوی نے ثابت کیں۔ ایک عربی عبارت کو اس نے غلط سمجھا۔ جان بوجھ کر غلط سمجھا یا غلط فہمی سے غلط سمجھا، یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ لیکن آج تک کسی مستشرق نے یہ نوٹس نہیں لیا کہ سید سلیمان ندوی نے سیرت میں کیا کہا تھا یا ڈاکٹر حمید اللہ یا کسی اور اسلامی مصنف نے ان کی کس غلط فہمی کا کیا جواب دیا۔ یہ لوگ ہیں جو ہمیں معروضیت سکھاتے ہیں۔ ہمارے بہت سے لوگ معروضیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں

کہ جب تک مغربی مصنفین کی بات کو سر آنکھوں پر نہ رکھا جائے آپ objectivity کا تقاضا پورا نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ان کی objectivity یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تردید میں لکھی ہوئی کسی بات کا آج تک نوٹس نہیں لیا۔ پچھلے سو برس میں جو کچھ لکھا گیا ہے آج تک کسی مغربی آدمی نے اس کا نوٹس نہیں لیا ہے۔ لیکن اس کا ایک یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ مستشرقین کا رویہ گزشتہ ایک سو سال کے دوران کچھ بدلا ہے۔ نئی کتابیں آنے اور مسلمانوں کا جواب دینے کے بعد ان کے منفی بیانات میں کافی کمی آئی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔ بعض لوگوں نے اسلام کے بارے میں خاصی ہمدردانہ تحریریں لکھیں اور اسلام کے نقطہ نظر کو زیادہ ہمدردانہ انداز میں پیش کیا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں چودھویں صدی میں کام کا آغاز ہوا۔ کل میں نے دبستان سرسید کا ذکر کیا تھا۔ دبستان سرسید سے میری مراد یہ تھی کہ سیرت النبی پر مغربی مستشرقین کے اعتراضات کے پس منظر میں مغربی طرز استدلال اور اسلوب تحقیق سے کام لے کر اسلام کے موقف کو مغربی انداز میں بیان کیا جائے۔ اس کے سب سے بڑے نمائندہ تو خود سرسید ہی تھے۔ لیکن وہ یہ کام مکمل نہیں کر پائے۔ چار جلدوں میں سے ایک جلد ہی کا جواب دے پائے اور جو جلد انہوں نے لکھی ان میں بھی بہت سی باتوں کے بارے میں اہل علم نے تامل کا اظہار کیا۔ ان کے بہت سے نتائج سے خود مسلمان اہل علم متفق نہیں۔ اس لئے ان کے کام کا اثر بڑا محدود رہا۔ لیکن سرسید کے حلقے کے دو قابل ذکر حضرات نے سیرت کے موضوع پر کام کیا اور زیادہ موثر کام کیا۔

ان میں سے ایک پروفیسر سید نواب علی تھے۔ یہ علی گڑھ میں استاد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی علی گڑھ میں گزری تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مغربی مستشرقین اور ان سب کے کاموں کا جائزہ لے کر سیرت پر ایک بڑی جامع کتاب سیرت رسول اللہؐ تیار کی تھی۔ وہ عبرانی زبان بھی جانتے تھے۔ قدیم آسمانی کتابیں ان کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ مستشرقین کا انہوں نے اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے اور بھی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ چونکہ ان کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا اس لئے شمالی ہندوستان، پنجاب اور موجودہ پاکستان کے علاقوں میں ان کی کتابیں زیادہ مقبول اور معروف نہیں ہوئیں۔ لیکن یہ ایک پہلی،

مفصل اور کامیاب کوشش تھی جو سیرت کے سارے بنیادی موضوعات پر پھیلا ہوا تھی۔ انہوں نے بچوں، نوجوانوں اور ہر عمر کے قارئین کے لئے سیرت پر تین الگ الگ کتابیں تیار کیں۔

سید نواب علی کے بعد جس شخصیت کو بھرپور کام کرنے کا موقع ملا وہ شمالی ہندوستان کے مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری تھے۔ قاضی سلیمان منصور پوری عربی اور فارسی کے ماہر بھی تھے۔ انگریزی قانون کے ماہر بھی تھے۔ انگریزی تعلیم سے واقف تھے۔ انہوں نے جب یہ سارا منظر دیکھا اور مستشرقین کی تنگ نظریوں کا ان کو علم ہوا تو انہوں نے تین کتابیں لکھنے کا پروگرام بنایا۔ ایک مختصر کتاب، ایک متوسط کتاب اور ایک بہت مفصل اور جامع کتاب۔ مختصر کتاب 'مہر نبوت' کے نام سے مشہور ہوئی۔ متوسط کتاب تین جلدوں میں 'رحمۃ للعالمین' کے نام سے لکھی۔ تینوں جلدیں 18 یا 19 سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ پہلی دو جلدیں انہوں نے اپنی زندگی میں خود شائع کروی تھیں۔ تیسری جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

یہ اپنی نوعیت کی بڑی منفرد کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جو پہلے سیرت نگار بیان نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ان تمام اعتراضات کا جو کہ یورپی مستشرقین یا معترض کرتے ہیں مدلل اور عالمانہ جواب دینے کی کوشش کی۔ ایک مقدمہ لکھا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ولادت تک پوری تفصیل بیان کی ہے۔ اس مقدمہ میں آپ کے نسب نامہ اور قریش کا بنی اسماعیل سے ہونا بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ گویا اس مسئلہ میں ولیم میور کا یہ اعتراض ہے کہ عربوں کا تعلق خاندان بنی اسماعیل سے نہیں تھا، اس کی تردید خود بخود ہوگئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے آباو اجداد کا جو مقام و مرتبہ مکہ مکرمہ اور قبیلہ قریش میں تھا اس کو بیان کیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس اعتراض کا جواب دینا مقصود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان کوئی معمولی یا چھوٹا خاندان تھا نعوذ باللہ۔

اسی طرح سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یعنی شریعت کو حضور ﷺ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ جو کام سید امیر علی نے کیا تھا کہ سیرت، صاحب سیرت اور پیغام سیرت ان تینوں کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا۔ اسی طرح سے قاضی سلیمان منصور پوری نے رسول اللہ کے دین اور آپ کی تعلیم کے خصائص اور آپ کی تعلیمات کی جامعیت اور کاملیت دونوں چیزوں کو آپ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ پھر سیرت کے بعض واقعات کو جن

جلد میں بیان کیا۔ خصائص وہ ہیں جو انہوں نے تلاش و جستجو سے جمع کیے۔

جلد دوم میں حضور کے غزوات، ازواج، امہات اور بقیہ تفصیلات بڑی محنت سے جمع کیں۔ خاص طور پر غزوات کی تفصیلات پر جس انداز سے انہوں نے تحقیق کی ہے وہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ قدیم مصنفین میں اتنی تفصیل سے اور اتنی باریک بینی سے جستجو کرنے کا کسی کو اتفاق نہیں ہوا۔ ایک ایک غزوہ کی جزوی تفصیلات جمع کی ہیں۔ کون سے غزوہ میں کتنے مسلمان شہید ہوئے، یہ تفصیل کم از کم بعد کے سیرت نگاروں میں سب سے پہلے انہوں نے جمع کی۔ کتنے کفار مارے گئے، یہ تفصیل ایک ایک واقعہ کی چھان بین کر کے مرتب کی۔ اس طرح سے انہوں نے دلائل اور اعداد و شمار کی بنیاد پر غزوات کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کی تردید کی۔ اعداد و شمار سامنے آئے تو بہت سی غلط فہمیاں خود ہی دور ہو گئیں۔

ایک عجیب و غریب چیز انہوں نے لکھی جو پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگی کے دن جوڑے۔ انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے دنیا میں 22 ہزار 3 سو 30 دن چھ گھنٹے قیام فرمایا۔ ان میں سے 1856 دن آپ نے تبلیغ و رسالت کا فریضہ انجام دیا۔ یوں حضور کی زندگی کے ایک ایک گھنٹے اور ایک ایک منٹ کو انہوں نے جوڑ لیا۔ یہ کسی اور کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ پھر انہوں نے فضیلت انبیا اور رسول اللہ کی صفت رحمت للعالمین پر روشنی ڈالی اور حضور کے پورے پیغام اور سیرت کو رحمت للعالمین کے وصف کی روشنی میں دیکھا اور دکھایا۔

تیسری جلد ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ وہ تین موضوعات پر ہے۔ ایک خصائص النبی، یعنی حضور کی امتیازی خصوصیات جو آپ کو بقیہ انبیا سے ممیز کرتی ہیں۔ قرآن پاک کے خصائص جو آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس میں انہوں نے اعجاز قرآن کو نئے انداز اور نئے زاویے سے دیکھا ہے جو پہلے لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسلام کے خصائص یعنی حضور کی تعلیم کے خصائص کیا ہیں اور یہ خصائص کس طرح حضور کی رسالت کی دلیل ہیں۔

یہاں اس رجحان ساز کتاب کے مندرجات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مفید ہوگا:

رحمۃ للعالمین

جلد اول

مقدمہ:

حضرت ابراہیمؑ جد امجد النبی، عصر جاہلیت، قبیلہ قریش، شعب نسل، دین محمدی، ولادت مبارکہ سے ہجرت مدینہ تک۔

پہلا باب: میثاق مدینہ تا غزوہ تبوک

باب دوم: تبلیغی نامہ ہائے مبارک جو معاصر حکمرانوں اور فرمانرواؤں کو لکھے گئے۔

باب سوم: وفود جنہوں نے حاضر خدمت ہو کر اسلام قبول کیا۔

باب چہارم: اہم وقائع عہد نبوی پر ایک عمومی نظر

باب پنجم: اخلاق نبوی

جلد دوم

بعض مہتم بالشان مسائل پر مشتمل ہے

۱۔ نسب نبوی، اباء و امہات، اعمام و عمات، اولاد و بنات،

۲۔ امہات المومنین، تعدد ازدواج، فضائل ازواج نبی،

۳۔ غزوات و سرایا پر ایک عمومی تبصرہ اور دیگر تفصیلات۔ یہ حصہ ادب مغازی میں خاصے کی چیز ہے۔

۴۔ قصص القرآن، فضیلت انبیاء، صفت رحمت

۵۔ نسب رسولؐ

۶۔ تقویم اور ہجری کیلنڈر

جلد سوم

تین طویل ابواب

۱۔ خصائص نبوی

۲۔ خصائص القرآن

۳۔ خصائص الاسلام

یوں اس کتاب کی تین جلدیں قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھیں۔ قاضی صاحب کے ہاں تحقیق، تجزیہ اور عشق رسول کا جو امتزاج ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ تحقیق کا بھی حق ادا

کر دیا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو گنا اور تولا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو پرکھا ہے۔ تجزیہ جس طرح سے کیا ہے وہ ان کی خاص امتیازی نشان اور اپنی مثال آپ ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق رسول کے بغیر تو یہ کام ہو نہیں سکتا تھا۔ واقعات کو مستند ترین انداز سے پیش کرنے کا جو التزام انہوں نے کیا تھا اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔ کوئی واقعہ کسی غیر مستند کتاب سے نہیں لیا۔ تمام واقعات کو مستند کتابوں، حدیث کی کتابوں اور قرآن پاک سے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی تو بہت جلد مقبول ہو گئی۔ اس وقت بھی اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ چند سال پہلے عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے جو میرے فاضل مصری دوست ڈاکٹر سمیر عبدالحمید نے کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ برصغیر کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی یہ کتاب اپنی اہمیت کے باوجود ایک دوسری کتاب کی چمک دمک کے سامنے ماند پڑ گئی۔ قاضی صاحب کی یہ کتاب یقیناً آسمان تحقیق کا بہت چمکتا ہوا ستارہ تھا، لیکن جب آفتاب تحقیق سامنے آیا تو اس ستارے کی چمک ماند پڑ گئی۔ وہ آفتاب تحقیق مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شاگرد رشید اور جانشین علامہ سید سلیمان ندوی دونوں بنیادی طور پر مورخ اور متکلم تھے۔ ان کی جتنی کتابیں ہیں وہ بیشتر تاریخ اور علم کلام پر ہیں۔ حتیٰ کہ جو تاریخ لکھی ہے اس کو بھی انہوں نے کلام بنا دیا۔ ان کی تاریخ بھی کلامی ہے۔ تاریخ لکھنے کا مقصد منکرین اسلام کی تردید، غلط فہمیوں کا جواب اور مسلمانوں کے اندر ایک اعتماد پیدا کرنا ان کی تاریخ نویسی کا مقصد تھا۔

علامہ شبلی کو جب پہلی مرتبہ مستشرقین کے ان خیالات کا اندازہ ہوا تو ان کے دل میں خیال ہوا کہ ان سب اعتراضات اور شبہات کا ایک مفصل جواب لکھا جائے۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ ایک وقت میں سب کام چھوڑ کر صرف اس کام کو کروں گا۔ چنانچہ وہ تمام کاموں سے یکسو ہو کر اس کام کے لئے وقف ہو گئے۔ ایک ادارہ اسی کام کے لئے انہوں نے قائم کیا۔ اپنا مکان، اپنی جائداد، اپنا باغ اور کتب خانہ اور پیسہ وقف کر کے دائرۃ المعارف النبویہ لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ یعنی Encyclopedea of Prophetic Sciences۔ ان کا خیال تھا کہ ابتدائی طور پر یہ انسائیکلوپیڈیا چار جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ اس میں سیرت سے متعلق

تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع دنیا کو کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کام وہ تھے جو سیرت کے تعلق سے مولانا شبلی کرنا چاہتے تھے۔ بہت سی کتابیں جو آج عام دستیاب ہیں وہ اس وقت موجود نہیں تھیں۔ البدایہ والنہایہ کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ الروض الانف موجود نہیں تھی۔ ان کی کتابوں کے علاوہ بھی مولانا شبلی اور ان کے زمانے کے سیرت نگاروں کو بہت سی بنیادی کتابیں دستیاب نہ تھی۔ ان کتابوں کے مخطوطات مصر، استنبول اور یورپ کے کتب خانوں میں بند تھے جہاں جا کر رہنے اور کام کرنے کے لئے بڑی رقم اور وسائل درکار تھے۔ سرسید نے توجہ اور کوشش کر کے ایک مخطوطہ منگا لیا تھا، مولانا شبلی کے لئے یہ بھی شاید اب مشکل تھا۔ وہ ابن کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ کے شدت سے مشتاق اور قائل تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے: 'افسوس! تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں'۔

مستشرقین اور دوسرے مغربی اہل علم کے اعتراضات کا مدلل جواب دینا مولانا شبلی کے پیش نظر روز اول ہی سے تھا۔ ان اعتراضات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

'مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے'۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل مغرب کو یہ بات آج تک ہضم نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کی کوئی دینی یا مذہبی شخصیت اس معیار پر ثابت نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی نے بہر حال یہ کام شروع کر دیا۔ جلد اول کا تمام کام مکمل کیا۔ جلد دوم کا بیشتر حصہ انہوں نے مسودات اور یادداشتوں کی صورت میں جمع کر لیا۔ اس کے بعد ان کا وقت موعود آ گیا۔ جب بستر مرگ پر تھے تو انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے تین نمایاں حضرات کو تار دیئے اور ان کو بلا کے یہ سارا کام سپرد کرنا چاہا۔ تین شاگردوں میں ایک نے تو جواب ہی نہیں دیا۔ پتہ نہیں ان کو تار پہنچا کہ نہیں پہنچا۔ انہوں نے نہ کوئی جواب دیا نہ آئے۔ یہ تھے مولانا ابو الکلام آزاد۔ دوسرے شاگرد تھے مولانا حمید الدین فراہی، جن کو پیغام پایا تو دیر سے ملا یا خود دیر سے پہنچے۔ تیسرے شاگرد

مولانا سید سلیمان ندوی بروقت پہنچ گئے۔ اس وقت استاد زندہ تھے۔ استاد نے ہاتھ کے اشارے سے قلم دان طلب کیا، سیرت، سیرت، سیرت ۔ یہ گویا ان کا آخری پیغام تھا جس نے کر دیا اور گویا ان سے وعدہ لیا کہ سیرت پوری کریں گے۔

سید سلیمان ندوی دکن حیدرآباد میں کسی جگہ ملازمت کرتے تھے۔ غالباً پونا میں کسی کالج میں استاد تھے۔ انہوں نے استاد کی خواہش کے احترام میں اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ دارالمصنفین آکر بیٹھ گئے پھر مسلسل تیس سال تک استاد کے بنائے ہوئے مرکز میں بیٹھ کر سیرت النبی کی چھ جلدیں مکمل کر دیں اور اس شان سے مکمل کر دیں کہ استاد چند جلدوں میں کتاب مکمل کرنا چاہتے تھے، شاگرد نے سیرت کی جلدیں لکھ دیں۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی دونوں برصغیر کی تاریخ میں جو مقام رکھتے تھے، اس کی وجہ سے سیرت النبی کا چرچا پورے ہندوستان میں اس کے سامنے آنے سے پہلے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ سیرت النبی کے جلد اول کے دیباچے کا پہلا ہی جملہ ہے: سیرت النبی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، اور مدتوں گونج رہا تھا۔ پہلی جلد مقدمہ ہے کہ استاد کے انتقال کے بعد ہی شائع ہوئی۔ پھر چار چار پانچ پانچ برس کے وقفے سے مزید پانچ جلدیں شائع ہوئیں۔ ساتویں جلد کا مسودہ تیار تھا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے آئے۔ اگر چہ یہ جلد مکمل ہے لیکن شائع شدہ موجود ہے۔

شبلی نعمانی کا اندازہ کیا تھا، کس طرح سے سیرت لکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کے پہلے ہی جملے سے واضح ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔ گویا وہ پوری سیرت کو رسول ﷺ کے اس ارشاد کی شرح بنانا چاہتے تھے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ پھر انہوں نے لکھا کہ پہلے لوگوں کی اخلاق کے اصول قائم کئے جائیں، پھر ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔ عملی تعلیم عمل کے ذریعے، وعظ و پند کے ذریعے ممکن ہے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے ہو سکتی ہے اور قانون کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سارے طریقے جزوی طور پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں، مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مکمل اثر پذیری اور اثر اندازی کے لئے ضروری ہے کہ فضائل اخلاق کا عملی نمونہ پیش کیا جائے جو تعلیم اسلام نے پیش کیا ہے۔ جب عملی نمونہ سامنے آئے تو اس کے ذریعے وعظ و پند بھی ہو گیا۔

تصنیف کتب بھی ہوئی اور قوانین بھی آئے۔ گویا ان تمام ذرائع نے پہلے ذریعے کی تکمیل کی اور اس طرح فضائل اخلاق کی تکمیل ہوئی۔

سیرت النبی کی جلد اول میں پہلے دو مقدمے لکھے ہیں۔ پہلا مقدمہ ذرا طویل ہے۔ 103 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ادبیات سیرت میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ بہت سے مسلمان مصنفین نے اس مقدمے کو بہت وقیع، عالمانہ کام کا شاہکار، مدلل اور گہرے غور و فکر پر مبنی قرار دیا ہے۔ سیرت النبی اس مقدمے کے بعد ظہور قدسی سے شروع ہوتی ہے جو اردو نثر کی ظہور قدسی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی ظہور قدسی اردو نثر میں ظہور قدسی ہے۔

یہ کتاب چودھویں صدی کیا معنی، بلکہ گزشتہ کئی صدیوں کی ادبیات سیرت کی ممتاز ترین کتابوں میں سے ہے۔ جس طرح سر سید ولیم میور کی کتاب دیکھ کر بے چین ہو گئے تھے اسی طرح مولانا شبلی بھی مارگولیتھ کی کتاب دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ اس کتاب سے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔ حتی کہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک جگہ اس دردمندی کا اظہار کیا ہے۔ یہ کام جو دو انتہائی عالم فاضل انسانوں کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے، اپنے ادبیانہ شکوہ اور زور بیان میں اور حاشیہ جات میں، دلیل کی قوت، تحریر و تجزیے کی بلندی، روایات کا محدثانہ جائزہ بھی، مورخانہ جائزہ بھی اور متکلمانہ جائزہ بھی، یہ سب پہلو اس کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ شبلی متکلم بھی تھے اور مورخ بھی تھے۔ ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی مورخ و متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ علم تفسیر اور علم حدیث کے بہت بڑے فاضل بھی تھے۔ ان دونوں کے قلم سے یہ کتاب مکمل ہوئی۔

لیکن کمال صرف اللہ کے لئے ہے۔ کسی بھی انسانی کاوش کو کمال نہیں ہو سکتا۔ شبلی کے ہاں بھی کمزوریاں ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ شبلی کے ہاں کہیں کہیں ایک معذرت خواہانہ سا انداز پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جو ابتدائی معرکے ہیں ان کے بارے میں مستشرقین لکھا کرتے ہیں کہ یہ مال غنیمت کی خاطر کئے گئے۔ شبلی اس اعتراض سے شاید متاثر ہوئے۔ اب شبلی نے ان غزوات کی اس طرح تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کئی جگہ مسلمانوں کے متفق علیہ نقطہ نظر سے جس کی قرآن پاک سے بھی تائید ہوتی ہے، انحراف سا آ گیا ہے۔ اس میں ان کا قلم تھوڑا سا پھسل گیا ہے۔ غزوہ بدر کے بارے میں خاص طور پر شبلی

کی تحقیق سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اتفاق نہیں کیا۔

یہ تو وہ بڑا کام تھا جو شبلی اور سید سلیمان ندوی کے قلم سے انجام پایا اور آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ اردو میں یہ کتاب شاید سینکڑوں مرتبہ چھپی ہو۔ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کتنی مرتبہ چھپی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک اور چھوٹی سی کتاب نکلی جو بیسویں صدی کے ادب سیرت میں نہیں بلکہ پورے ادب سیرت میں ایک بڑا منفرد مقام رکھتی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں بقامت کہتر بقیمت بہتر۔ حجم میں بہت چھوٹی سی لیکن قیمت میں بہت بہتر۔ یہ ان کی کتاب 'خطبات مدراس' ہے۔ اس میں آٹھ مضامین یا آٹھ خطبے ہیں۔ مدراس میں ایک بزرگ تھے شیخ جمال۔ انہوں نے ایک ادارہ بنایا تھا جس کے تحت برصغیر کے مشاہیر کو بلا کر سالانہ کچھ لیکچرز کرایا کرتے تھے۔ اس میں پہلی مرتبہ جو لیکچر ہوئے وہ سیرت پر سید سلیمان ندوی کے آٹھ لیکچرز تھے۔ علامہ اقبال کے جو خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ پر ہیں وہ بھی اسی سیریز کا ایک حصہ ہیں۔ پکتھال کے چھ سات لیکچرز Cultural Side of Islam بھی اسی سلسلے میں ہوئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے یہ خطبات 1925 میں ہوئے تھے۔ یہ خطبات ادب سیرت میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ پہلے خطبہ میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کی محتاج ہے۔ یہ پہلے خطبے کا عنوان ہے جس کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ بغیر کسی نبی کے حوالے کے انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ انسانیت کے اخلاق، انسان کی روحانیات، انسان کی دینی ضروریات، انسان کی بنیادی ضروریات، انسان کی فکری ضروریات ان سب کی تکمیل انبیا کی سیرت ہی سے ہو سکتی ہے۔

پھر انہوں نے فرمایا ہے کہ اس ہمہ گیر تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ایک دائمی اور عالمگیر نمونہ موجود ہو۔ جب تک عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل موجود نہ ہو تو سیرت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ پھر انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دائمی اور عالمگیر نمونہ وہی ہو سکتا ہے جو تاریخی طور پر ثابت ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کامل نمونہ بھی ہو۔ زندگی کے ہر گوشے کے لئے نمونہ ہو۔ جامع ہو۔ عملی ہو۔

نظری اور غیر عملی نہ ہو۔ پھر انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ساری صفات رسول اللہ ﷺ پر پوری اترتی ہیں۔ حضور کے علاوہ کسی اور شخصیت کا اسوہ ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ پھر انہوں نے پیغام نبوی کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کیا ہے۔ اسلام کی تعلیم کیا کہتی ہے۔ یہ چھ خطبات ہیں جو سیرت کے لٹریچر میں مختصر ہونے کے باجود ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کا دوسرا حصہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، وہ ڈاکٹر حمید اللہ کا زمانہ ہے جو اس دور کے مجدد علوم سیرت کہے جا سکتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ علم سیرت کا جب آغاز ہوا تو جلد ہی اس کے تین شعبے ہو گئے۔ ایک حصہ خاص سیرت کے واقعات اور حوادث پر مبنی تھا۔ دوسرا حصہ غزوات کی تحقیق پر اور تیسرا حصہ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان تینوں موضوعات پر بہت تفصیل سے نہایت محققانہ انداز میں لکھا ہے اور ان تینوں موضوعات پر ان کی کتابیں بڑی خاصے کی چیزیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر تھے۔ وہ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون، اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کے استاد تھے۔ جب حیدرآباد دکن پر ہندوستان کا حملہ ہوا تو حیدرآباد دکن پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور حملہ شروع تھا۔ کہ وہاں کے وزیر اعظم میر لائق علی خان نے ایک وفد اقوام متحدہ بھیجا تھا۔ حیدرآباد اقوام متحدہ کا رکن تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ بطور انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر کے اس وفد کے رکن تھے۔ وہ حیدرآباد کے پاسپورٹ پر سفر کر رہے تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو حیدرآباد پر بھارت کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ یہ قبضہ مکمل ہوتے ہی اقوام متحدہ کی یہ تنظیم بھی سوگئی اور یہ نام نہاد عالمی برادری بھی سوگئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس وقت سے لے کر اور اپنے انتقال تک یعنی 1948 سے لے کر 2000 تک اپنے حیدرآبادی پاسپورٹ کو برقرار رکھا۔ وہ اپنے آپ کو حیدرآباد ہی کا شہری لکھتے تھے اور فرانس میں بطور پناہ گزیں کے مقیم تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ میرے ملک پر ایک غیر ملکی طاقت نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں اپنے ملک واپس نہیں جا سکتا۔ جب تک میرا ملک آزاد ہو، اس وقت تک مجھے فرانس میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہر سال وہ پناہ گزینی کے سرٹیفیکیٹ کی تجدید کراتے تھے اور اسی سفری دستاویزات پر وہ سفر کرتے تھے۔ میں نے وہ دستاویز خود دیکھی

ہے جس پر شہریت حیدر آباد کی لکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد کے آخری شہری تھے جو 2000ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ حیدر آباد کو خود حیدر آباد اور وہاں کے حکمرانوں نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ پاکستان نے بھی ایک اور بہت سی اہم ذمہ داریوں کی طرح مجرمانہ طور پر حیدر آباد کو بھی بھلا دیا۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے حیدر آباد کو نہیں بھلایا۔

انٹرنیشنل لا کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کو مسلم انٹرنیشنل لا میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے مسلم انٹرنیشنل لا کا مطالعہ شروع کیا۔ جب مسلم انٹرنیشنل لا کا مطالعہ شروع کیا تو پتہ چلا کہ آغاز میں مسلم انٹرنیشنل لا اور علم مغازی دونوں ایک فن تھے۔ اس وجہ سے ان کو مغازی سے دلچسپی ہوئی۔ مغازی سے دلچسپی ہوئی تو پتا چلا کہ مغازی اور سیرت رسول دونوں ایک ہی میدان علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں ان کو سیرت سے دلچسپی ہوئی۔ یوں آخر تک یہ تینوں موضوعات ان کی دلچسپی کے موضوعات رہے۔ انہوں نے جتنا کام کیا وہ یا تو مسلم انٹرنیشنل لا پر تھا یا سیرت اور یا مغازی پر تھا۔ انہوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلو نمایاں کئے جو پہلے کسی سیرت نگار کے سامنے نہیں تھے اور کسی سیرت نگار نے ان کو یکجا کر کے بیان نہیں کیا تھا۔ یہ دریافت کہ مکہ ایک شہری ریاست یعنی سٹی اسٹیٹ تھا، ڈاکٹر حمید اللہ کی دریافت تھی۔ انہوں نے قدیم ماخذ سے یہ ساری معلومات جمع کیں۔ اس پر اردو، انگریزی، فرانسیسی، عربی اور جرمن زبانوں میں متعدد تحقیقی مقالات لکھے۔ وہ سات زبانوں میں لکھتے تھے۔ بقیہ زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوتا تھا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے ہی مکہ مکرمہ کے بارے میں سٹی اسٹیٹ ہونے کی بات کی۔ پھر انہوں نے ہی پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں سٹی اسٹیٹ کے آغاز کی بات کی۔ وہ پہلے مسلمان محقق اور سیرت نگار تھے جنہوں نے میثاق مدینہ پر اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ اسلام کی تاریخ تو کیا بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ کا پہلا تحریری دستور ہے۔ انہوں نے اس پر کتاب لکھی The First Written Constitution of the World۔ یہ انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اس کے بعد سیرت کے بعض بنیادی ماخذ کی انہوں نے ایڈیٹنگ کی۔ واقدی کی کتاب الردۃ کی انہوں نے ایڈیٹنگ کی۔ بلاذری کی انساب الاشراف انہوں نے ایڈٹ کی۔ سیرت ابن اسحاق انہوں نے ایڈٹ کی۔ یہ سیرت کے تین قدیم ترین ماخذ ہیں جو پہلی مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ کے ذریعے لوگوں کے سامنے آئے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عہد نبوی کی ڈپلومیسی اور سفارت کاری پر اتنا وقیع اور قابل ذکر کام کیا کہ اتنا کام پورے ماضی میں کسی نے کیا ہے نہ ان کے معاصرین میں کسی نے کیا ہے اور نہ بعد میں آنے والوں نے کیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے مسلم انٹرنیشنل لا پر ایک کتاب لکھی۔ یہ انگریزی زبان میں اس موضوع پر چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ The Muslim Conduct of State۔ اس کے بعد انہوں نے فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو 1933-34 میں پیرس میں چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا Diplomacy During the Days of the Prophet and the Orthodox Caliphs۔ یہ فرانسیسی کتاب کے عنوان کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے جرمنی کی بون یونیورسٹی میں ایک دوسرا تحقیقی مقالہ لکھا جس میں انہوں نے صدر اسلام کی ڈپلومیسی میں غیر جانبداری کے تصور کے موضوع پر تحقیق کی۔ ان سے پہلے کسی نے اس کو ایک الگ تصور کے طور پر بیان نہیں کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ 1933 میں جرمنی میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔

انہوں نے اس تحقیق کے دوران یہ محسوس کیا کہ ایک بے شمار دستاویزات ہیں جو عہد نبوی کی سفارت کاری سے متعلق ہیں اور ان کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ساڑھے چار سو کے قریب یہ دستاویزات، وثائق اور معاہدات جمع کیے جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے وثیقہ جات کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑا مجموعہ نہ پہلے کوئی مرتب ہوا تھا، نہ ان کے معاصرین میں کسی نے مرتب کیا، نہ ان کے بعد اب تک کسی نے کیا۔

اس کے بعد ان کو خیال ہوا کہ عہد نبوی کے میدانہائے جنگ پر ایک کتاب لکھی جائے۔ چنانچہ انہوں نے جب حجاز کا سفر کیا تو مختلف غزوات کے مقامات کو خود جا کر دیکھا اور یہ دیکھا کہ جو تفصیلات واقدی نے بیان کی ہیں وہ موجودہ نقشے کے مطابق کس حد تک پوری اترتی ہیں۔ واقدی کے بعد غالباً ڈاکٹر حمید اللہ دوسرے آدمی ہیں جنہوں نے خود جا جا کر ان سب مقامات کو دیکھا اور وہاں کئی کئی مہینے رہ کر یہ کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود مجھے بتایا کہ میں نے فیتہ لے کر ناپ ناپ کر ان جگہوں کا تعین کیا اور نقشے بنائے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے ان غزوات کے مقامات کے نقشے بنائے جو بہت مقبول ہوئے اور مختلف کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ بہت سے مصنفین نے وہ نقشے جوں کے توں اپنی کتابوں میں شامل کر لئے ہیں اور یہ اعتراف نہیں کیا ہے کہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب پہلی بار 1944 میں حیدر آباد دکن میں چھپی جس میں انہوں نے نقشے خود بنا کر دیے۔ بعد میں بہت سے مصنفین ان نقشوں کو نقل کرتے آئے ہیں۔ لیکن اصل کام ان کا تھا۔ ان نقشوں سے غزوہ احد اور غزوہ بدر کی اہمیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

قرآن پاک میں غزوہ بدر کے بارے میں آیا ہے کہ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم "تم نچلی گھاٹی پر تھے وہ اونچی گھاٹی پر تھے اور قافلہ تمہارے نیچے سے گزر رہا تھا"۔ جب تک نقشہ سامنے نہ ہو تو اس کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے نقشہ بنایا۔ اس میں یہ بھی لکھا 'اذ انتم بالعدوۃ الدنیا' تم ادھر کے ناکے پر تھے، 'وھم بالعدوۃ القصوی' وہ پرلے ناکے پر تھے، 'والرکب اسفل منکم' اور قافلہ نیچے سے گزر رہا تھا۔ نقشہ ہو تو پوری بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں کیا بتایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ پوری زندگی اس موضوع پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے یہ تمام تحقیقات تقریباً ایک ہزار مقالات میں بیان کی ہیں۔ ان ایک ہزار مقالات کی فہرست انہوں نے اپنی زندگی میں مرتب کرائی تھی۔ میرے پاس بھی اس فہرست کی ایک نقل موجود ہے۔ لیکن ان ایک ہزار مقالات کے علاوہ ان کی سب سے جامع کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔ اس کا عنوان انگریزی میں ہوگا The Prophet of Islam: His Life and Work۔ ان دونوں جلدوں میں سے جلد اول کا انگریزی ترجمہ ہو گیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس انگریزی ترجمے سے اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ میں نے دیکھا نہیں۔ جلد دوم کا ابھی انگریزی ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ دونوں جلدیں انتہائی قیمتی اور جامع معلومات پر مبنی ہیں اور سیرت کے انتظامی، ادارتی، سفارتی، سیاسی اور دوسرے پہلوؤں پر بہت مستند اور اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔ سیرت کے ان پہلوؤں پر اتنی وسیع معلومات اور کہیں نہیں ملتیں۔

سیرت پر معلومات جمع کرنے کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک ایک چیز کی دریافت اور

جغرافیہ اور تاریخ و جغرافیہ عرب کی کتابیں دیکھ ڈالی ہیں۔ لغت کی قدیم کتابوں میں کوئی لفظ اگر سیرت کے کسی واقعہ سے متعلق آیا ہے تو کس مفہوم میں آیا ہے۔ کسی گاؤں کا نام ہے جو اب۔ وہاں ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ آپ اپنی جوانی میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ بات کہ حضور کس زمانے میں وہاں تشریف لے گئے تھے؟ اس کا پتہ چلانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جغرافیہ پر جتنی کتابیں تھیں سب دیکھیں۔ لغت پر جتنی کتابیں تھیں وہ سب دیکھیں۔ تحقیق سے پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ بظاہر اس تحقیق سے معلومات سیرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ حضور وہاں تشریف لے گئے تھے کہ نہیں، وہ سالہا سال اس تحقیق میں لگے رہے اور ایک ایک چیز پر غور کرتے رہے اور لکھتے رہے۔

اسی طرح سے انہوں نے بہت سی ایسی چیزوں پر نظر رکھی جو پچھلے سیرت نگاروں نے زیادہ تحقیق کی مستحق نہ سمجھی تھیں۔ جغرافیہ سیرت، دستاویزی سیرت، ادبیات سیرت، عسکریات سیرت، سفارت اور سیاسیات سیرت اور سیرت کے بے شمار انتظامی پہلوؤں کے بارے میں ان کے ہاں ایسی ایسی جزوی تفصیلات ملتی ہیں جو دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے ایسے مختصر مقالات ہیں کہ جو اگر یکجا ہو جائیں تو کتابی شکل میں دو سو ڈھائی سو صفحے ہو جائیں گے۔ ایک مضمون انہوں نے مجھے خود بھیجا تھا جو انہوں نے 1954-55ء میں لکھا تھا۔ Military Intelligence during the time of the Prophet of Islam اس میں انہوں نے حضور کے زمانے میں انٹیلی جنس کے نظام کی تفصیل بیان کی تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے علاوہ سیرت نگاروں کی بڑی تعداد نے برصغیر میں اور برصغیر سے باہر سیرت پر انتہائی قابل قدر اور وقیع کام کیا ہے جس کی فہرست بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ فہرست بیان کرنے میں ایک مشکل یہ ہے کہ بہت سی کم معروف لیکن نہایت قابل قدر شخصیات نے سیرت پر کام کیا ہے۔ میں ان میں سے دس بیس کا نام لوں اور بقیہ کو چھوڑ دوں تو کسی کو خیال ہوگا کہ فلاں کا نام نہیں لیا، ان سے کیا کوئی مخالفت ہے؟ کس کس کا نام لے لوں، تو اتنے ہیں۔

انڈونیشیا کے بارے میں یہ خیال ہوگا۔ جتنوں کے نام گنواؤں گا وہ فہرست نامکمل ہی رہے گی اور مکمل نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے صرف نمونہ کے طور پر چند کتابوں کے نام پیش کرتا ہوں جو برصغیر اور عرب دنیا میں لکھی گئیں۔ انڈونیشیا، ملائیشیا میں کیا کام ہوا، اس کا مجھے علم نہیں۔ ترکی میں کیا کام ہوا مجھے اس کا بھی زیادہ علم نہیں۔ بعض کتابوں کے بارے میں سنا ہے کہ ان کا ترجمہ ہوئی ہیں۔ جتنی مشہور کتابوں کا میں نے نام لیا ہے تقریباً یہ سب ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ لیکن ترکی زبان میں خود کون کونسی کتابیں لکھی گئیں، میں نہیں جانتا۔ میری واقفیت انگریزی، فارسی، عربی اور اردو اور جزوی طور پر فرانسیسی تک محدود ہے۔

ایک قابل ذکر کتاب جو اردو میں لکھی گئی۔ مصنف اس کو دو جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ایک ہی جلد لکھ پائے تھا مگر جو لکھا وہ بہت قابل ذکر اور انتہائی مستند ہے۔ اس کتاب کا نام ہے اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات داناپوری ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مستشرقین جو اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت کے ماخذ غیر مستند یا غیر معتبر ہیں، اس اعتراض سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو مستند ترین ماخذ ہیں، یعنی قرآن پاک اور حدیث، ان سے کام لے کر مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا کام محض اعتراض کرنا ہے۔ اعتراض کے جواب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ ایک اعتراض کا جواب دیں گے وہ دس مزید اعتراض کردیں گے۔ آپ دس کا جواب دے دیں گے وہ بیس اعتراض اور کر دیں گے۔

مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات داناپوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلہ میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا داناپوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو حق نکلتے ہیں یعنی فقہیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں فقہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے،

یعنی نبوت، معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں ان کا جواب دینا چاہتے
تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ تاہم تب بھی ایک ہی جلد چھپی ہے اور وہ
بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔

ایک اور کتاب جو قدیم عہد تالیف اور انداز کی ہے وہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت
المصطفیٰ ہے۔ یہ ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ کتاب تمام قدیم کتب سیرت کا نچوڑ ہے۔ جدید سیرت
نگاروں سے جہاں جہاں غلطیاں ہوئی ہیں یا کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔
معجزات اور بشارات پر خاص زور دیا ہے۔ لیکن مستشرقین کا مولانا کاندھلوی نے کوئی نوٹس ہی
نہیں لیا ہے۔ اس کتاب سے کوئی بحث نہیں کی کہ کس مستشرق نے کیا کہا ہے۔ شاید انہوں نے ذکر کیا
اور شاید غالباً ان کو مستشرقین کے اعتراضات کا علم تھا۔ نہ انہوں نے ان کا جواب دیا۔

اسی زمانے میں جب مستشرقین آنحضورؐ پر اعتراضات کر رہے تھے تو بعض لوگوں کو یہ خیال
ہوا کہ قرآن پاک سے سیرت کا ایک نقشہ پیش کیا جائے۔ جس کے مستند ہونے میں ان کا
خیال تھا کہ مستشرقین کو کلام نہیں ہوگا۔ یہ کام بہت سے حضرات نے کیا۔ برصغیر میں سب سے پہلے
اس کام سے دلچسپی علامہ اقبال کو ہوئی۔ انہوں نے اپنے بعض اہل علم دوستوں کو توجہ دلائی کہ
قرآن پاک کی روشنی میں سیرت کا ایک نقشہ تیار کیا جائے۔ ان کے خطوط میں اس کا تذکرہ
ملتا ہے کئی لوگوں سے انہوں نے کہا۔ غالباً کسی کو فرصت نہیں ملی۔ ان کے انتقال کے کافی عرصہ
بعد مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ کام کیا اور وہ بھی مدراس میں جہاں کبھی پہلے علامہ
سید سلیمان ندوی خطبات مدراس کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ 1957ء میں سیرت پر کچھ
لیکچرز دیئے جو قرآن پاک کو سامنے رکھ کر سیرت کے واقعات کو سمجھنے کی پہلی سنجیدہ کوشش
تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی خود بڑے صاحب علم و فضل آدمی تھے۔ قرآن پاک پر ان کی گہری
نظر تھی۔ انہوں نے قرآن پاک کا ایک ترجمہ اور تفسیر اردو میں لکھی ہے، ایک ترجمہ و تفسیر
انگریزی میں لکھی ہے۔ انگریزی کے بڑے اچھے انشاء پرداز تھے۔ مغربی مستشرقین کی کتابوں کو
بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ مغربی مصنفین سے واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے ان تمام
چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب تیار کی ہے۔ اردو زبان میں مہارت تو ان پر ختم
ہے۔ اردو کے بہت بڑے صاحب طرز ادیب ہیں۔ عالمانہ شان بھی ہے۔ ادیبانہ انداز بھی

ہے۔ قرآن پاک چونکہ نظر بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ کتاب ایک منفرد کتاب ہے کہ ایک مفسر قرآن، ایک مفکر، ایک متکلم اور ایک فلسفی کے قلم سے نکلی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے پس منظر میں سیرت کا ایک نیا نقشہ پیش کرتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے کچھ پہلے لیکن ان کے ہم عصر ایک عرب بزرگ محمد عزت دروزہ نے قرآن پاک کی روشنی میں سیرت پاک پر دو کتابیں لکھیں۔ ایک کا نام ہے 'عصر النبی وبیئتہ قبل البعثۃ'۔ اس میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی جو تصویر کشی قرآن نے کی ہے اس سب کو یکجا کیا ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کے عقائد، طور طریقے، لوگوں کی عادات، مزاج، اندر کی نفسیات اور طور طریقوں سے بحث کی ہے۔ گویا اس ماحول کو انہوں نے قرآن کی روشنی میں re-construct کیا ہے جس ماحول میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔

دوسری کتاب شیخ محمد عزت دروزہ نے سیرت رسول کے عنوان سے لکھی جس میں انہوں نے قرآن پاک سے وہ ساری آیات یکجا کر کے ان کو مرتب کیا ہے، ان پر تبصرے کئے ہیں اور ان سے سبق نکالے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن میں آئی ہیں۔ اس میں آپ کی شخصیت، فضائل، امتیازات، مکی عہد، مدنی عہد، دعوت اسلامی کا فروغ، مدینہ کے یہودیوں سے تعلق اور روابط، مغازی، عیسائیوں سے تعلق، منافقین کے بارے میں قرآن پاک میں جو احکام نازل ہوئے، شریعت جو نازل ہوئی، ان سب کی تفصیل انہوں نے قرآن پاک کی روشنی میں دی ہے اور یہ بڑی معلوماتی کتاب ہے۔

عرب دنیا کے ایک اور صاحب علم اور محدث ڈاکٹر محمد محمد ابو شہبہ نے بھی دو ضخیم جلدوں میں قرآن وسنت کی روشنی میں سیرت پر ایک کتاب مرتب کی۔ یہ بھی ایک اچھی کوشش ہے جس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور قرآن مجید کو معیار قرار دے کر روایات سیرت کا تعین کیا ہے اور مستند ترین روایات کے ساتھ ساتھ ان میں پوشیدہ دروس اور عبر بھی بیان کئے ہیں۔

ایک اور کتاب جس میں قرآن پاک کی روشنی میں سیرت کو بیان کیا گیا وہ بھی ہمارے برصغیر اور پاکستان کے معاصر بزرگ علامہ عبدالعزیز عرفی کی کتاب ہے۔ وہ شیخ طریقت بھی ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے طریقہ قادریہ سے ان کا تعلق ہے۔ انہوں نے چار جلدوں میں

جمال مصطفی کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن پاک کی آیات کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سیرت کے واقعات کو reconstruct کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے متعلقہ آیت کی وضاحت۔ پھر اس میں جس واقعہ کا تذکرہ ہے کتب سیرت کے حوالوں کے ساتھ وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر جہاں جہاں اس واقعہ کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے وہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ کتاب قرآن، حدیث اور سیرت تینوں کا ایک یکجا مجموعہ ہے۔

عسکری سیرت پر جو کام بیسویں صدی میں ہوا ہے اس کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ماضی کے کاموں سے بہت مختلف اور منفرد ہے۔ ماضی میں بہت سے لوگوں نے یہ تو کیا کہ سیرت اور غزوات پر مواد جمع کر دیا۔ مغازی کی تفصیلات بھی جہاں جہاں ملیں وہ جمع کر دیں۔ غزوات میں کن صحابہ نے شرکت کی، کون کہاں پر کیا کر رہا تھا اور کون کس ذمہ داری پر مامور تھا۔ یہ ساری چیزیں تو آ گئیں، لیکن فنی اعتبار سے جو حکمت عملی حضور نے یا آپ کے صحابہ نے اختیار فرمائی، اس پر حقیقت میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ یہ مطالعہ بہت بہتر اور جامع انداز میں بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ اس کا آغاز بھی برصغیر سے ہوا۔ ہمارے پاکستان کے قابل احترام جنرل محمد اکبر خان نے سب سے پہلے اس پر توجہ کی اور حدیث دفاع کے نام سے اس پر ایک کتاب لکھی۔ حدیث دفاع اردو زبان میں ایک تربیت یافتہ اور تجربہ کار جنرل کے قلم سے رسول اللہ ﷺ کی حکمت حربی کو مرتب کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔

اس کے بعد عراق کی ایک مشہور شخصیت بریگیڈیئر جنرل محمود شیت خطاب نے اس موضوع پر بہت کام کیا اور سچی بات یہ ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ پر الرسول القائد کے نام سے کتاب لکھی، جس میں انہوں نے حضور کی بحیثیت قیادت، حربی صلاحیت، حکمت عملی پر فنی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ جتنے صحابہ کرام حضور کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے جو جو کارنامے انجام دیے، ان سب پر الگ الگ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب کتابیں ملا کر ایک درجن کے قریب ہو گئی ہیں۔ ان میں انہوں نے ایک ایک صحابی جنرل کی حربی مہارت کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ایک مکمل نقشہ انہوں نے پیش کر دیا ہے۔ ان کے بعد شام کے ایک جنرل مصطفی طلاس تھے، جو شام کے وزیر دفاع بھی

رہے۔ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی حربیات پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ ایک اور ماہر کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور ہدیہ عقیدت تھا۔

برصغیر میں جس شخصیت نے بہت جامعیت کے ساتھ حربیات یا عسکریات سیرت کے موضوع پر کام کیا اور دس جلدوں میں کتاب لکھی، وہ پاکستان کے بریگیڈیر گلزار احمد مرحوم تھے۔ کتاب کا نام غزوات نبوی ہے۔ خود بریگیڈیر گلزار حربی تاریخ کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے 1965 کی جنگ پر بھی کتاب لکھی تھی، اور بھی کئی موضوعات پر انہوں نے کتابیں لکھیں۔ آخر میں انہوں نے غزوات نبوی پر قلم اٹھایا۔ دس جلدوں میں اس کتاب کو مکمل کیا ہے اور ہر غزوہ کی تفصیل الف تا یا بیان کی ہے۔ جنرل آغا ابراہیم اکرم پاکستان آرمی کے ایک اور جنرل تھے۔ ان کی اصل دلچسپی تو حضرت خالد بن ولیدؓ سے تھی۔ حضرت خالد حضور کے مقرر کئے ہوئے نامزد تھے۔ حضور نے ہی ان کو سیف اللہ کا لقب دیا تھا۔ سیف کے معنی ہیں تلوار۔ جنرل اکرم کی کتاب کا عنوان بھی Sword of Allah ہے۔ لیکن جنرل صاحب کے بعض مضامین غزوات نبوی پر بھی تھے اور انہوں نے سیرت کے عسکری پہلو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

جنرل اکبر کی جو کتاب حدیث دفاع ہے اس میں انہوں نے حضور علیہ السلام کی حربی حکمت عملی اور طریقہ جنگ، اہم غزوات کا تجزیہ، ہجرت اور عرب کی دفاعی پوزیشن، اسلام کے اصول جنگ، مقامات جنگ، نتائج جنگ ان سب چیزوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا۔ یہ کتاب کئی بار پاکستان میں شائع ہوئی۔ اور اس قابل ہے کہ کم از کم پاکستان میں عسکری تربیت کے اداروں میں پڑھائی جائے۔

سیرت میں ایک اور قابل ذکر کتاب جو بیسویں صدی کے نصف آخر یا بلکہ شاید ثلث آخر میں لکھی گئی، نامکمل رہی، وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ہے سیرت سرور عالم۔ مولانا نے اپنی زندگی میں سیرت پر براہ راست تو کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ لیکن سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اپنی مختلف تحریروں میں بہت کثرت سے روشنی ڈالی تھی۔ خاص طور پر تفسیر تفہیم القرآن میں۔ جب تفسیر تفہیم القرآن مکمل ہو گئی تو ان کے بعض رفقا کو یہ خیال ہوا کہ اب تفہیم القرآن کے انداز اور اسلوب کے مطابق سیرت پر بھی کام ہونا چاہئے۔ اس خیال کے تحت

مولانا مودودی کے چند رفقاء نے ان کی کتابوں میں سیرت سے متعلق سارا مواد جمع کر کے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ ان میں جلد اول تو ایک تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مضامین اگرچہ بڑے عالمانہ اور مفید ہیں لیکن وہ براہ راست سیرت نبوی پر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سارا مواد ایک پہلو سے سیرت کی تمہید ہے جس میں نبوت، مقام نبوت اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ ماسیرت سیرت، حوالیات سیرت، عربوں کے عادات و خصائل جیسے مضامین بیان کئے ہیں۔

جلد دوم اس اعتبار سے بہت قیمتی ہے کہ اس میں مولانا مودودی نے بہت سے نئے اور گراں قدر اضافے کئے ہیں اور جہاں جہاں خلا محسوس کیا ہے اس کو نئی تحقیق اور نئے مطالعہ سے پورا کیا ہے۔ یہ ولادت سے لے کر ہجرت تک کے واقعات ہیں جو ساڑھے چھ سو صفحات کی ایک ضخیم جلد میں آئے ہیں۔ مولانا کی یہ کتاب سیرت کے مکمل نقشے کو سمجھنے کے لئے اردو میں چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بعد مولانا کی عمر میں اللہ نے مزید گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اس لئے وہ آخری حصہ مکمل نہیں کر سکے جس کے بارے میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ مدنی دور ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ مولانا کا خیال اس کو ایک الگ جلد میں مکمل کرنے کا تھا، لیکن غالباً اگر وہ لکھتے تو ایک جلد میں مدنی دور کا یہ کام مکمل نہ ہوتا۔ مدنی دور کے لئے کم سے کم دو جلدیں درکار ہوتیں۔ اس لئے کہ اس وقت بھی جو مواد مولانا کی کتابوں میں بکھرا ہوا ملتا ہے، مثلاً تفہیم القرآن میں اور خاص طور پر تفہیم القرآن کی آخری دو جلدوں میں، وہ مدنی دور کے بارے میں اتنا ہے کہ ایک جلد تو صرف اسی مواد سے بن سکتی ہے۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی اب بھی تشنۂ طلب ہیں جن کے بارے میں اگر مولانا از سر نو قلم اٹھاتے تو اس میں ایک جلد شاید کفایت نہ کرتی۔

مستشرقین کی علمی خیانتیں بھی مولانا نے جابجا بیان کی ہیں۔ اس کا مقصد مستشرقین کا جواب دینا نہیں، بلکہ مسلمان قارئین کو ان کی گمراہیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ مزید برآں مولانا چونکہ ایک دینی تحریک کے قائد بھی تھے، اور اس دینی تحریک کا مقصد اسلام کا احیاء اور اسلامی حکومت کا قیام تھا، اس لئے اس پس منظر میں انہوں نے سیرت کو بیان کیا ہے کہ جب اسلام کا احیا ہو تو کن خطوط پر اور کس انداز پر ہونا چاہئے۔ اس لئے پوری کتاب میں جو عام [illegible] اسپرٹ ہے وہ علمی یا تحقیقی کی بجائے تحریکی ہے۔ کتاب میں روح اس تحریک کی کارفرما ہے

جس کے مولانا قائد تھے۔

ایک اور کتاب جو ہماری یونیورسٹی کے انتہائی فاضل رفیق اور بزرگ ڈاکٹر خالد علوی کی لکھی ہوئی ہے وہ انسان کامل ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور آخری ایڈیشن خاصا ضخیم ہے۔ اس کا انداز بڑا عالمانہ اور تجزیاتی، استدلال قوی اور زبان بڑی رواں ہے۔ اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بطور شہری، حضور بطور تاجر، حضور بطور حاکم، بطور قاضی، بطور فاتح، بطور ایک شوہر، بطور ایک باپ اور یہ سارے پہلو الگ الگ لے کر ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بطور تاجر حضور کی شخصیت کا نقشہ سامنے آ جائے۔ بطور فاتح حضور کی شخصیت کا نقشہ سامنے آ جائے۔ یہ سب پہلو انہوں نے بیان کئے ہیں۔

اب میں تھوڑی دیر کے لئے آپ کو عرب دنیا میں لے کر چلتا ہوں تاکہ ایک سرسری نظر وہاں کے کام پر بھی ڈالی جا سکے کہ عرب دنیا میں قابل ذکر کام کیا ہوا۔ عرب ممالک میں سیرت النبی پر یقیناً بہت قابل ذکر کام ہوا ہے۔ درجنوں اور سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ بات میں پھر دہراؤں گا کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے وہ کام (کم از کم میری ناچیز رائے میں) برصغیر میں ہونے والے کام کے برابر نہیں ہے۔ جتنی جدت اور تنوع یہاں کے کام میں ہے اتنی جدت اور تنوع وہاں نہیں ہے۔

سیرت پر براہ راست تو نہیں لیکن سیرت کے ماخذ اور مصادر پر مستند ترین کام عرب دنیا میں ہوا ہے۔ سیرت کے تاریخی پس منظر یعنی تاریخ عرب قبل از اسلام پر عرب دنیا میں بیسویں صدی میں ہونے والے کام میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں۔ عراق کے ایک مورخ تھے ڈاکٹر جواد علی۔ انہوں نے سات آٹھ ضخیم جلدوں میں اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے: تاریخ العرب قبل الاسلام۔ یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اسلام سے پہلے عرب میں موجود مذاہب، رواج، طریقے، رسوم، تمدن، ریاستیں، حکومتیں، قبائل غرض جو چیز بھی اسلام سے پہلے عربوں سے متعلق تھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ مستند، جامع اور فاضلانہ کتاب روئے زمین پر اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اگر میری رائے پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ اس موضوع پر دنیا کی بہترین کتاب ہے۔

دوسرا کام عرب دنیا میں ایسا ہے جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا۔ محمد عزت دروزہ فلسطینی مصنف ہیں۔ اس کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ کا عنوان ہے نبی اکرمؐ کا زمان و مکان: جزیرہ عرب کا جغرافیہ اور وہاں کے لوگ، وہاں کا ماحول اور پس منظر۔ دوسرا حصہ ہے الحیاۃ الاجتماعیۃ، وہاں کی اجتماعی زندگی، معاشی زندگی۔ ثقافت، تہذیب، تمدن، عادات، مذہب ہر چیز کا تذکرہ ہے۔ تیسرا ہے فی الحیاۃ العقلیۃ، ان کی فکری زندگی۔

ایک اور بڑی عالمانہ کتاب جو شاید عرب دنیا کی بہترین کتابوں میں سے ہے اور سیرت اور فقہیات سیرت کے موضوع پر دور جدید کے ایک انتہائی معتبر اور محترم عالم اور فقیہ کی آخری کتاب ہے۔ یہ تین جلدوں میں شیخ محمد ابو زہرہ کی آخری تصنیف 'خاتم النبیین' ہے۔ شیخ محمد ابو زہرہ مصر کے رہنے والے تھے، بہت بڑے فقیہ تھے۔ چودھویں صدی میں مصر کے چوٹی کے صف اول کے فقہا میں سے ایک تھے۔ فقہ پر ان کی کتابیں انتہائی امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ ان کی آخری کتاب خاتم النبیین 1972 میں شائع ہوئی۔ 1974 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کتاب میں، چونکہ وہ خود فقیہ تھے اس لئے فقہیات سیرت پر بہت زور ہے اور سیرت سے جتنے فقہی احکام نکلتے ہیں یا سیرت کے سیاق و سباق میں جو فقہی امور اہم ہیں وہ انہوں نے بڑی کثرت سے بیان کئے ہیں۔

عرب دنیا میں ایک اور قابل ذکر کام جو سیرت پر ہوا جس کی وجہ سے تین بڑی کتابیں وجود میں آگئیں۔ مقابلہ سیرت ہے۔ آپ کو یاد ہوگا 1974 میں پاکستان میں ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس ہوئی تھی اور پھر حکومت پاکستان کے انتظام میں سب سے بڑے پیمانے پر سیرت کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس سیرت کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل بھی آئے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال رابطہ کی طرف سے سیرت پر تین بہترین کتابوں پر مصنفین کو انعامات دیئے جائیں گے۔ وہ بہت بڑا انعام تھا، یہ مجھے یاد نہیں کہ کتنی رقم تھی۔ اس دور کے لحاظ سے خاصی خطیر رقم کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے دنیائے اسلام کی پانچ بڑی شخصیات کی ایک کمیٹی بنائی۔ برصغیر سے مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی، عرب دنیا سے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبداللہ بن باز اور افریقی ممالک سے نائیجیریا کے مفتی اعظم شیخ ابوبکر جومی۔ ان پانچ

تو میں پر مشتمل کمیٹی کو تین بہترین کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔ حسن اتفاق، کمیٹی نے تینوں کتابیں جو منتخب ہوئیں وہ برصغیر کے مؤلفین کی تھیں۔ پوری دنیا سے کتابیں آئیں لیکن بہترین کتب برصغیر کی قرار پائیں۔ صف اول کی کتاب الرحیق المختوم تھی جس کے بارے میں کل پرسوں ایک دوست نے پوچھا تھا۔ الرحیق المختوم ہندوستان کے ایک بزرگ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے لکھی تھی۔ دوسرا انعام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر ماجد علی خان کی انگریزی کتاب نے حاصل کیا اور تیسرے انعام کی مستحق کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب تھی جن کو تیسرا انعام ملا تھا۔ اس کے بعد پاکستان کی وزارت مذہبی امور نے بھی انعامات کا سلسلہ شروع کیا اور ہر سال انعامات مضامین اور کتابوں پر دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سی نئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں وزارت مذہبی امور کا شکرگزار ہونا چاہئے۔

سیرت نگاری میں ایک نیا اسلوب جو چودھویں صدی میں پیدا ہوا وہ سیرت کا ادبیانہ اسلوب تھا۔ ادبیانہ اسلوب کو ذکر کر کے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر پچھلی صدی میں کوئی اس اسلوب پر کتاب لکھتا تو شاید محدثین اس کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اس لئے کہ اگر ادبیانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت کے واقعات کے پس منظر میں کوئی افسانہ، کسی ڈرامہ کی شکل میں یا ادبیانہ شکل میں بیان کیا جائے تو یہ چیز تو اسلامی نقطہ نظر سے محدثین کے لئے بالکل ناقابل تصور تھی کہ سیرت کے پس منظر میں واقعات، کہانیاں وہ اپنی طرف سے بیان کئے جائیں۔

لیکن ہمارے دور میں یہ انداز شروع ہوا اور اردو کے علاوہ خود عربی میں بھی اس انداز کی کتابیں لکھی گئیں۔ عربی میں طہ حسین کی کتاب علی ہامش السیرۃ اس کا ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ پرانے زمانے میں بھی فتوحات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کو ادبیات کا نمونہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ ایک اعتبار سے ابن اسحاق اور ابن ہشام کی کتابوں میں چونکہ ادب اور شاعری کا بہت ذکر ہے اس لئے اس حصہ یا مواد کو ہم سیرت کا ادبی نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں جس ادبیانہ انداز کا ذکر کر رہا ہوں وہ اور ہے۔ ادبیانہ انداز سے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اردو میں ان میں سے میں صرف دو ایک کا ذکر کروں گا۔

ایک کتاب لکھی گئی آفتاب نبوت۔ یہ ایک مشہور ادیب سید ایوب [illegible] شاہجہان پوری

نے لکھی ہے۔ بظاہر یہ کتاب سیرت پر ہے لیکن یہ ایک رومانی کتاب ہے جو کسی حد تک افسانوی رنگ بھی لئے ہوئے ہے۔ ایک دوسری کتاب جو خواتین کے لئے لکھی گئی وہ مولانا راشد الخیری ایک مشہور مصنف نے 'آمنہ کا لعل' کے نام سے لکھی اور برصغیر میں بہت مقبول ہوئی۔ آمنہ کا لال دراصل خواتین اور بچوں کے لئے ہے۔ اس کا انداز میلاد ناموں کا سا ہے۔ لیکن زبان غیر معمولی تھی۔ اس انداز کو بعد میں اور لوگوں نے بھی اپنایا۔ ہمارے برصغیر میں ملا واحدی بڑے مشہور ادیب تھے۔ ان کی کتاب 'سرور کائنات' دو جلدوں میں آئی۔ مولانا ماہر القادری نے 'درّ یتیم' ایک افسانوی انداز میں لکھی ہے۔ 'معراج انسانیت' پرویز صاحب نے لکھی ہے۔ اس کو بھی ادبیت کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ عرب دنیا میں علی احمد باکثیر، توفیق حکیم نے ناول و افسانے کے انداز میں لکھی۔ عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی نے کئی ناول سیرت اور خلافت راشدہ کے پس منظر میں لکھے ہیں۔ زمانہ اور ماحول وہی ہے لیکن انداز افسانے اور ناول کا ہے۔

لیکن اس موضوع پر سب سے دلچسپ اور انوکھی کتاب جو ادبی انداز سیرت کا بہت عمدہ نمونہ ہے وہ برصغیر کے ایک بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک کتاب ہے۔ مولانا نے 'النبی الخاتم' کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی۔ اس میں نہ واقعات میں کوئی ترتیب ہے، نہ بظاہر اس میں کوئی نئی تحقیق ہے۔ لیکن پڑھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتا ہے گویا لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے۔ میں اس کتاب کا ایک جملہ سنا کر بات ختم کرتا ہوں۔ مسجد نبوی کے فرش پر رسول اللہ کے سونے اور آرام فرمانے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں: 'اور فرش خاک پر سویا۔ کیا کیجئے کہ سونے نے خاک کو سونا کر دیا'

وقت ختم ہو چکا ہے۔ میری فہرست میں تقریباً اتنی ہی کتابیں اور ہیں جتنی کتابوں کا آج کی اس نشست میں تذکرہ ہوا ہے۔ ان میں سے ہر کتاب ایک خاص انفرادیت رکھتی ہے۔ اب ان کتابوں پر تفصیلی تبصرہ تو ممکن نہیں، صرف فہرست دینے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

ضیاء النبی مرحوم جسٹس پیر کرم شاہ الازہری کی تصنیف ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں بیسویں صدی کی آخری قابل ذکر اور اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد تمہیدی مباحث پر مشتمل ہے اور مولف کی تحقیق کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ آخری دو جلدوں کا موضوع مستشرقین کا تعاقب ہے۔

اسوۂ رسول اکرم اپنے موضوع پر اردو بلکہ شاید تمام اسلامی زبانوں میں ایک منفرد کتاب ہے۔ بار بار چھپی ہے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر عبدالحی مشہور شیخ طریقت اور مربی تھے۔ کتاب میں بھی تزکیۂ نفس اور تربیتی رنگ نمایاں ہے۔

سیرت کبریٰ مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری کی مشہور کتاب ہے۔ انداز دلچسپ اور مواد مستند ہے۔

فقہ السیرۃ کے نام سے عربی دنیا میں کئی اچھی اور مفید کتابیں بھی بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئیں۔ استاذ محمد الغزالی مصری اور ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی نے اس موضوع پر فاضلانہ کتابیں لکھیں۔ محمد الغزالی کی کتاب عالمانہ شان بھی رکھتی ہے اور دعوتی سیرت کو بھی موثر انداز میں نمایاں کرتی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے جہاں اور بہت سی مفید اور وقیع کتابیں نکلیں، وہاں ان کے قلم گوہر بار نے سیرت کے گوشوں کو بھی سیراب کیا۔ منصب نبوت پر ان کی کتاب اردو زبان میں ایک بہت وقیع اضافہ ہے۔ نبی رحمت سیرت کے ادب میں ایک قابل ذکر کتاب ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب اگرچہ مختصر ہے لیکن استناد میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ یہ کتاب مولانا نے عوام الناس کے لئے لکھی تھی اور ایک دور میں بہت مقبول بھی رہی۔ اب دوسری بہت سی آسان تر کتابوں نے اس کی مقبولیت کم کر دی۔

محمد رفیق ڈوگر کی الامین تین یا چار جلدوں میں اپنی نوعیت کی ایک اچھی کتاب ہے۔ زبان رواں، حوالہ جات مستند اور انداز متوازن ہے۔ بیسویں صدی کی آخری اہم کتاب ہے۔

مقالات کے مجموعے اور رسائل کے سیرت نمبر بھی بیسویں صدی کی ایک خاص سوغات ہے۔ ایسے مجموعے اور خاص نمبر سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک ہیں۔ ان میں لاہور کے ماہنامہ نقوش کا سیرت نمبر دوسروں سے ممتاز دکھائی دیتا ہے۔

غیر مسلم، بالخصوص ہندو اور سکھ مصنفین میں سے جی۔ ایس۔ دارا کی رسول عربی اور سوامی لکشمن پرشاد کی عرب کا چاند قابل ذکر ہیں۔ دارا کی کتاب بہت جامع، متوازن اور غیر متعصبانہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے دیباچے نے اس کے اعتبار میں اضافہ کر دیا ہے۔ سوامی لکشمن پرشاد کی

ترکی زبان میں بہت اچھی اور متوازن وارفتہ ہے۔ انگریز اور فرانسیسی مصنفین نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں متوازن کتابیں اکا دکا ہی پائی جاتی ہیں۔

محبوب خدا، چوہدری افضل حق کے قلم سے مختصر کتاب ہے۔ انداز بہت ادیبانہ اور خطیبانہ ہے۔ چوہدری صاحب مرحوم احرار کے ایک قائد اور مشہور خطیب تھے۔ کتاب میں بھی خطیبانہ انداز جھلکتا ہے۔

بلاغ المبین تین حصوں پر مشتمل ایک کتاب دراصل مکاتیب سید المرسلین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے مرتب کی تھی جو تحریک آزادی ہند کے ایک اہم رہنما تھے۔ اس کتاب میں اصول تبلیغ و دعوت، فرامین سید المرسلین اور ان سے نکلنے والے نتائج وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

مولانا عبد الحلیم شرر کا ناول جویائے حق اور معروف مصری ادیب طہٰ حسین کی الوعد الحق اپنے اپنے زمانہ میں بہت مقبول رہی ہیں۔ یہ سیرت کے ادبی اسلوب کا نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ دونوں کا اسلوب ناول کا سا ہے، پس منظر زمانہ نبوی کا ہے۔

پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا ذکر کر کے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ یہ کتاب سیرت منظوم کا اردو میں بہترین نمونہ ہے۔

☆

اس کا ایک اہم مقام ہے۔ ضیاء النبی میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں۔ ان میں دو خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو اس کی زبان بہت اچھی، بڑی عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔ مصنف کی نظر بہت وسیع ہے۔ وہ فقیہ بھی ہیں۔ متکلم بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور محدث بھی ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایسا انداز اپنانے کی کوشش کی ہے کہ ان تمام علوم و فنون کے تقاضے اس کتاب میں پورے ہو جائیں۔ سات جلدوں کی اس کتاب میں جامعیت بہت ہے۔ دوسری اہم خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں وہ کلامی مسائل جو مسلمانوں میں مختلف فیہ رہے ہیں، ان کا بڑا معتدل جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا انداز بیان یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلافات کو کم سے کم کیا جائے۔ پیر صاحب بہت مدلل اور شستہ انداز میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں، لیکن دوسرے نقطۂ نظر کا پورا احترام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

☆

سنا ہے مولانا طاہر القادری نے بارہ جلدوں میں لکھی ہے، کیا وہ آپ نے دیکھی ہے؟

افسوس ہے کہ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ میرے علم میں نہیں۔ یقیناً یہ ایک بہت اچھی کتاب ہوگی۔ ڈاکٹر قادری صاحب کی کتابیں بہت فاضلانہ ہوتی ہیں۔ لیکن میں پھر یہ عرض کروں گا کہ اس مختصر فرصت میں سیرت کی سب کتابوں کا تذکرہ ممکن نہیں ہے۔

☆

مطالعہ سیرت دور جدید میں آپ نے زیادہ تر توجہ برصغیر اور عرب دنیا پر دی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مختصر سے وقت میں دنیائے اسلام کے دیگر خطوں کا ذکر بھی کیا جائے؟

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ برصغیر، عرب دنیا اور چند مغربی ممالک کے علاوہ باقی خطوں کے بارے میں میرے پاس معلومات نہیں ہیں۔ انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش وغیرہ میں کیا کام ہوا، اس سے میں واقف نہیں ہوں۔ ان تینوں علاقوں کی زبانیں میں نہیں

جاتا۔ وسط ایشیا میں کوئی نیا قابلِ ذکر کام پچھلے کم از کم سو سال میں نہیں ہوا۔ گزشتہ دس پندرہ سال میں کئی بار وسط ایشیا جانا ہوا۔ وہاں سیرت پر کسی نئے کام کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ایران میں واقعی قابلِ ذکر کام ہوا ہے اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ایک بڑا فرق ہے کہ شیعہ مصنفین کے بہت سے ماخذ الگ ہیں اور سنی مصنفین کے الگ ہیں۔ کئی ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہیں کہ نہیں۔ ان کا تذکرہ کرنے سے ایک نئی بحث شروع ہو سکتی تھی اس لئے میں نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

☆

انیسویں صدی کے اواخر میں چند اصلاحی اداروں نے جنم لیا۔ جامعہ ملیہ، جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ دارالعلوم دیوبند، ان کا سیرت اور مغازی کے میدان میں کوئی اثر و نفوذ ہے کہ نہیں۔

دیکھئے، ادارہ جامعہ ملیہ نے تو بطور ادارہ کوئی کام نہیں کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں بطور دیوبند کے سیرت پر کوئی کام نہیں ہوا۔ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ اہلِ علم نے کام کیا جن میں سے کچھ کا میں نے نام لیا ہے۔ ندوۃ العلماء سے وابستہ حضرات کا میں نے ذکر کیا ہے جن میں سے ایک دو تو تفصیل سے بیان کئے۔ جامعہ ملیہ کے استاذ ڈاکٹر ماجد علی خان کی کتاب کو رابطہ عالمِ اسلامی کا دوسرا انعام ملا تھا۔ جامعہ ملیہ کے اور لوگوں نے بھی کام کیا ہوگا۔ اس لئے سیرت پر جب کام کا ذکر آئے گا تو افراد کا تذکرہ ہوگا جنہوں نے وہ کام کیا ہے۔ جن اداروں سے وہ وابستہ تھے ان اداروں کا اس کام میں کیا contribution ہے یہ کہنا تو بہت دشوار ہے۔

☆

آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کی دو کتابوں کے ترجمے کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک کتاب فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ دوسری کتاب کا انگریزی سے اردو ترجمہ نہیں ہو سکا۔ کیا آپ یہ کمی پوری نہیں کر سکتے؟

[illegible] ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرانسیسی زبان میں دو جلدوں میں کتاب لکھی ہے۔ اس کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ ہوا ہے۔ اس انگریزی سے اردو ترجمہ ہو گیا ہے۔ جلد دوم کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق ارزانی کرے۔

☆

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب کا نام بتادیں۔

سیرت نبوی قرآنی۔

☆

ماجد علی خان اور نصیر احمد ناصر کی کتب کا نام بتادیں۔

1۔ Muhammad: The Final Messenger

2۔ پیغمبر اعظم و آخر

یہ دونوں کتابیں لاہور میں بھی چھپ چکی ہیں۔

☆

سیرت النبی کی کتنی جلدیں مولانا شبلی نے تحریر فرمائیں۔

علامہ شبلی نے دو جلدیں تحریر فرمائی تھیں۔ پہلی جلد مکمل تھی۔ دوسری کا بہت تھوڑا حصہ رہ گیا تھا۔ جو ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ بقیہ جلدیں علامہ سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔

☆

غزوہ بدر کے بارے میں آپ نے جو آیت تلاوت فرمائی وہ کون سی سورۃ میں مذکور ہے؟

غزوہ بدر پر قرآن مجید کے جو حصے میں نے پڑھے ہیں وہ سورۃ الانفال کی ہیں۔

آپ نے ان قدیم علمائے اسلام کے کارنامے بیان فرمائے، ان کی کتب کی بھی نشاندہی کریں۔

سیرت اور علوم سیرت کے باب میں میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔

☆

نول کشور ہوتے ہندو تھے، مسلمانوں کی کتب چھپوانے سے ان کا کیا مقصد تھا؟

وہ کتابوں کا ایک تاجر تھا۔ بظاہر اس نے یہ کام تجارتی اغراض سے شروع کیا تھا۔ اس کا بظاہر اور کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔

☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں مستشرقین کی کتابیں بظاہر مسلمانوں کی بیزاری کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رشدی کی Satanic verses، اس کا منبع کیا دیگر مستشرقین سے مختلف ہے؟

مستشرقین نسبتاً زیادہ سنجیدہ ہیں۔ وہ اس انداز کی کتابیں پہلے بھی لکھتے ہوں گے۔ اب ان کا انداز نسبتاً عالمانہ ہوتا ہے اور جو بات لکھتے ہیں وہ شواہد اور حوالہ جات کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔

☆

چودہویں صدی کے عظیم مجدد پیر سید مہر علی شاہ چشتی گولڑوی کی شہرہ آفاق کتاب جو ردِ قادیانیت پر لکھی گئی تھی، کیا اس کو بھی سیرت کی کتابوں میں شامل کیا جائے گا؟

میرے خیال میں وہ مناظرہ کی کتاب ہے سیرت کی کتاب نہیں ہے۔ سیف چشتیائی

میں نے دیکھی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد کی تردید میں ہے۔ اگر آپ اس کو سیرت کی کتاب قرار دیں گے تو پھر قادیانیت کی تردید میں جو بھی کتاب لکھی جائے گی وہ سیرت کی کتابوں میں شمار کی جانی چاہئے۔ تو یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا۔

☆

مولانا عبدالوالی رازی کی کتاب سیرت پر ایک منفرد کتاب ہے۔

جی ہاں، وہ ایک منفرد کتاب ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر کتاب کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر پچاس کا تذکرہ ہوگا تو مزید پچاس کا ہونا چاہئے۔ سو کا ہوگا تو مزید سو تبصرہ کے لئے موجود ہیں۔ میں ماشاءاللہ بہت سی کتابوں کا تذکرہ نہیں ہو سکا۔

☆

مستشرقین کے علاوہ بعض اہل اسلام بھی حضور کے والدین
کو اہل توحید و ایمان نہیں سمجھتے۔

میں دوسروں کی رائے کے بارہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو آپ ان سے پوچھیں جن کی یہ رائے ہے۔

☆

دور جدید میں سیرت کے حوالے سے اعلیٰ حضرت احمد
رضا خان بریلوی اور پیر کرم شاہ صاحب کی کتاب کے بارے
میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

پیر کرم شاہ صاحب کی کتاب کے بارے میں بیان کر چکا ہوں۔ بہت اچھی عالمانہ اور فاضلانہ کتاب ہے۔ مولانا احمد رضا صاحب کی سیرت پر لکھی جانے والی کسی کتاب سے میں واقف نہیں ہوں۔

☆

غزوہ بدر کے بارے شبلی نعمانی کا طرز عمل مستشرقین کے
جیسا شاید نہ ہو۔ کیونکہ حالیہ دور میں شائع ہونے والی اور
سعودی عرب سے اول انعام پانے والی کتاب الرحیق المختوم
میں بھی غزوہ بدر کے واقعات کو پڑھ کر وہی تاثر ابھرتا ہے جو
مستشرقین نے تحریر کیا ہے۔ براہ کرم غزوہ بدر کے پس منظر پہ
اجمالاً روشنی ڈالئے جو آپ کے خیال میں مستند بھی ہو۔

اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے اختصار سے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اصل میں واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ کفار مکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بہت بڑا لشکر تشکیل دیا جا رہا ہے اور اس غرض کے لئے انہوں نے فنڈ ریزنگ کا کام شروع کیا ہے اور ایک تجارتی قافلہ اسی کام کے لئے شام بھیجا ہے کہ جب وہ تجارت کر کے آئے تو اس سے آنے والے منافع کا ایک حصہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے استعمال کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تجارتی قافلے کو روکنا چاہا۔ ایسا کرنا حالت جنگ میں بالکل جائز ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں ہے کہ حالت جنگ میں آپ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالیں اور دشمن فوج تک ایسے وسائل کی آمد اور رسائی روکیں جو آپ کے خلاف استعمال ہو سکتے ہوں۔ دنیا کا ہر قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ آج کا بین الاقوامی قانون بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی جائز دفاع کرنے کی خاطر اس کو روکنا چاہا۔

جب آپ اس کو روکنے کے ارادے سے مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے لیکن قریش کی ایک فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آن پہنچی ہے۔ دراصل جونہی قریش کو یہ اطلاع ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ لشکر لے کر نکلے ہیں تو قریش بھی ایک ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لئے روانہ ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس فوج کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی تیاری اور بے سروسامانی کے اس کا مقابلہ کیا۔ حضور تو چونکہ کسی فوجی لشکر کا مقابلہ کرنے نہیں آئے

تھے۔اس لئے آپ کے پاس عسکری تیاری نہ ہونے کے برابر تھی۔بہت سے صحابہؓ جوان تھے وہ موجود نہیں تھے۔صحابہ کرام کے پاس اسلحہ بھی پورا نہیں تھا۔لیکن انہوں نے جرأت اور ہمت سے مقابلہ کیا اور انہیں کامیابی ہوئی۔

یہ غزوہ بدر کی تفصیل ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے۔یہی تفسیر ہے جو سیرت کی کتابوں میں بھی آئی ہے۔علامہ شبلی نعمانی نے یہ چاہا کہ وہ یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ ﷺ قافلہ کو روکنے کے ارادے سے نہیں نکلے تھے۔اس کے لئے انہیں بہت سے واقعات کی تاویل اور توجیہ کرنی پڑی جو بہت کمزور ہے۔

☆

رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ایک تاریخی واقعہ کے بارے میں میری یا کسی اور کی رائے کا کیا تعلق۔رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ صحابہ کرام نے انفرادی طور پر پڑھی۔آپ کی نماز جنازہ باجماعت نہیں ہوئی تھی۔صحابہ کرام تین تین اور چار چار کی تعداد میں حجرہ مبارک میں داخل ہوتے تھے اور نماز جنازہ پڑھ کر واپس آجاتے تھے۔حضور کی نماز جنازہ جماعت سے نہیں ہوئی۔حضور کی میت مبارک اپنی جگہ سے نہیں ہلائی گئی۔اسی کمرے میں رہی جس میں انتقال ہوا تھا۔جس بستر پر انتقال ہوا اسی کی جگہ پر قبر مبارک بنائی گئی۔

☆

آپ نے فرمایا کہ عیسائی پادری اسلام کے منفی پہلو تلاش کرکے اعتراضات کرتے ہیں۔کیا اسلام کے منفی پہلو بھی ہیں؟

منفی پہلو تو ہر چیز میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ایک بزرگ جو بڑے صاحب کرامت تھے لیکن ان کی بیگم صاحبہ ان کو صاحب کرامت نہیں مانتی تھیں اور اعتراضات کرتی رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ بیگم نے کہا کہ رات میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نیک بخت وہ میں ہی تو تھا۔ بیگم نے کہا کہ بھئی اسی لئے تو تم ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔

اعتراض تو ہر چیز پر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں الحمد للہ کوئی منفی پہلو نہیں ہے۔ لیکن دشمن جس چیز کو چاہیں قابل اعتراض قرار دے دیں۔ عربی کا ایک شعر ہے

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة

کما انّ عین سخط تبدی المساویا

جب انسان کی آنکھ ناراضگی کی ہو تو ہر چیز بری ہی نظر آتی ہے۔

☆

اورینٹلزم کے راقم کا نام بتا دیں۔

اورینٹلزم کے نام سے کتاب لکھنے والے مصنف کا نام ایڈورڈ سعید تھا۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

☆

مستشرقین جیسے گبن وغیرہ کے نام بتا دیں۔

گبن مستشرق نہیں تھا۔ گبن تو ایک مورخ اور ایک ادیب تھا جس نے سلطنت روما کے عروج و زوال پر کتاب لکھی ہے۔ جب وہ رومن ایمپائر کے زوال کا ذکر کرتا ہے تو ضمناً مسلمانوں کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرقی رومن ایمپائر کا زوال مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس سیاق و سباق میں اس نے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہاں اس نے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں وہی باتیں دہرائی ہیں جو مغربی مستشرقین لکھا کرتے تھے۔ لیکن گبن کو میں اس لئے معذور سمجھتا ہوں کہ گبن اسلام یا اسلامی تاریخ کا ماہر نہیں تھا۔ مغربی تاریخ کا ماہر تھا۔ جب اس نے اسلامی تاریخ کے بارے میں جاننا چاہا ہوگا تو اس کو اپنی زبان میں یہی زہر آلود کتابیں ملی ہوں گی جنھیں پڑھ کر اس نے اپنا متعلقہ باب لکھ دیا۔

برطانوی مصنفین نے ایک معتبر سا نہ کتاب لکھی ہے جس کا
نام غالباً Hergress ہے۔ کیا اس کے جواب میں کوئی
کتاب لکھی گئی ہے؟

مجھے اس کتاب کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

☆

کیا مستشرقین ہمیشہ سے غیر مسلم ہی رہے ہیں؟

مستشرق تو کہتے ہی اس مغربی پادری یا صاحب علم کو جو مشرقی علوم سے دلچسپی رکھتا ہو۔ مسلمان کو مستشرق نہیں کہتے۔

☆

نعیم صدیقی صاحب کی محسن انسانیت اور محمد عربی دونوں
کتابیں کس حد تک مفید اور مستند ہیں؟

بہت مفید ہیں اور بہت مستند ہیں۔ میں نے یہ کتاب اس لئے نہیں چھوڑی کہ میں ان میں سے کسی کتاب کے بارے میں منفی رائے رکھتا ہوں۔ بلکہ انتخاب کی اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

☆

دورِ جدید اور دورِ قدیم میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھی گئی
کتابوں میں افغانستان کی contribution کا آپ نے
کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔

میں افغانستان کی contribution سے واقف نہیں ہوں اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں۔ مولانا بیانی کی ایک کتاب کا حوالہ کتابیات سیرت کے ضمن میں دے چکا ہوں۔

مولانا جامی کا تعلق افغانستان سے تھا۔ مولانا روم بھی اصلاً بلخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تذکرہ بھی ہوا ہے۔ زیادہ تفصیل میرے علم میں نہیں ہے۔

☆

ذرا پروفیسر عالم صاحب کی مدد سے بتایا جائے کہ ہمارے سکول اور کالج کے نصابوں میں سیرت النبی پر لکھی گئی کوئی کتاب شامل کرنے کے لئے حکومت کیا کچھ کر رہی ہے؟

میرے علم کی حد تک سیرت کا بہت سے مواد نصابی کتابوں میں شامل ہے۔ اردو، اسلامیات، تاریخ میں سیرت کا خاصا مواد شامل ہے۔ یوں سیرت کا خاصا حصہ نصاب میں کور ہو جاتا ہے۔

☆

ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب جو فرانسیسی میں ہے اور جس کی ایک جلد کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے تو ادارہ تحقیقات اسلامی والے اس کا اردو میں ترجمہ کریں اور جلد دوم کا ترجمہ انگریزی میں کریں۔

واقعی کرنا چاہئے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ذمہ دار حضرات بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے سن لیا ہے۔

☆

آپ کا لیکچر یقیناً فائدہ مند ہے لیکن یہ مطالعہ جو دوسری صدی میں کیا گیا، اس کے باوجود مسلمان آج ابتری کا شکار کیوں ہیں؟ آپ یقیناً کہیں گے کہ مسلمان عمل نہیں کرتے۔ لیکن مطالعے سے عمل کا سبق ملتا ہے تو مسلمان سیرت کی اتنی کتابوں کے باوجود اتنے کمزور کیوں ہیں۔

ضرور بیڑا اٹھانا چاہئے لیکن ولیم میور کی کتاب اب پرانی ہوچکی ہے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی گئی تھی۔ وہ اعتراضات بھی ختم ہو گئے۔ مستشرقین نے وہ باتیں دہرانی چھوڑ دیں۔ اب مستشرقین نئے اعتراضات کرتے ہیں۔ اب ان نئے اعتراضات کا جواب دینا چاہئے۔

☆

ہم نومسلم اسکالر علامہ اسد کو کس نقطہ نظر سے دیکھیں۔

اسد بہت فاضل انسان تھے۔ بہت مخلص انسان تھے۔ ان کی کتابیں بڑی عالمانہ ہیں آپ ان سے ضرور استفادہ کریں۔ لیکن میرے علم کی حد تک انہوں نے سیرت پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔

☆☆☆

پانزدواں شعبہ

مطالعہ سیرت

مستقبل کی ضرورتیں

بارہواں خطبہ۔

مطالعہ سیرت
مستقبل کی حکمت جہتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

قابل احترام جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری

جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب

محترم جناب امیر الحجاز محمد سروش

محترم جناب ڈاکٹر ایم ایم قریشی

برادران محترم،

خواہران مکرم

آج اس سلسلہ کی آخری گفتگو ہے۔ اس کا عنوان ہے "مطالعہ سیرت: مستقبل کی حکمت جہتیں"۔ لیکن اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان گزارشات پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیے جو گزشتہ گیارہ دنوں میں پیش کی گئی ہیں۔ گزشتہ گیارہ دنوں کی ان گفتگوؤں میں ہمارے سامنے تین بنیادی حقیقتیں آئی ہیں جن کو میں اختصار کے ساتھ دہرانا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی حقیقت جو ابتدائی تین چار گفتگوؤں میں پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ کا ہر پہلو، آپ کی زندگی کا ہر گوشہ اور آپ کی سنت اور طرز عمل کا ہر ذرہ دور جدید تک مکمل طور پر اس طرح سے محفوظ ہے کہ ہزاروں لوگوں نے اس کو دیکھا۔ سینکڑوں نے اس کو قلمبند کیا، یاد کیا، اور انتہائی اعتماد، ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ اسے آئندہ آنے والی نسل، یعنی ہزاروں تابعین تک پہنچایا۔ پھر ان ہزاروں تابعین میں سے سینکڑوں تابعین نے اس کو قلمبند کیا۔ سینکڑوں تابعین نے اس کو زبانی یاد کیا اور بڑی احتیاط، محبت، دیانت داری اور جذبہ اشتیاق سے اس کو آئندہ نسل تک پہنچایا۔ تبع تابعین اور تبع تابعین کے بعد سے یہ سارا ذخیرہ جو پہلے ہی زبانی یاد بھی کیا جا چکا تھا اور ضبط تحریر میں بھی لایا جا چکا تھا، باقاعدہ مدون اور کتابی صورت میں مرتب کر لیا گیا۔ صحابہ کرام نے جو ذخیرہ تابعین تک پہنچایا تھا اور تابعین نے جس طرح اس کو قلمبند کیا تھا اس کا بڑا حصہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

دوسری حقیقت جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیرت مبارکہ کے بارے میں جو کچھ معلومات اس وقت موجود ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ، ان کا بنیادی حصہ اور متن سے متعلق معلومات کا اساسی حصہ قطعی اور یقینی طور پر محفوظ ہے۔ قرآن مجید اور سنت ثابتہ کی حامل کتابوں کے ذریعے، صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتمد کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ واقعات سیرت کے جس تفصیلاتی اور فروعی حصے کے بارے میں بعض احتیاط پسند مسلمان اہل علم تحفظات رکھتے ہیں، یہ ذیلی، فروعی اور جزئی بنیادی معلومات کی زائد تفصیلات اور بعض دوسرے مصادر کی جمع کی ہوئی معلومات پر ہے۔ وہ سیرت النبی کے کسی اساسی پہلو پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اگر یہ ساری معلومات موجود نہ بھی ہوتیں تو بھی سیرت النبی پر کوئی فرق نہ پڑتا۔ سیرت النبی کے تمام واقعات، اس کے تمام نقوش، اس کی تمام اساسات قرآن مجید کے علاوہ کتب حدیث کی مستند ترین کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان سے جو احکام نکلتے ہیں، ان سے جو رہنمائی ہمارے سامنے آتی ہے، وہ فقہائے اسلام نے پہلی صدی کے اواخر سے مرتب کرنا شروع کر دی تھی۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں بڑے بڑے اور جید فقہائے اسلام نے ان تمام احکام کو مجموعوں کی شکل میں محفوظ کر دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے مجموعے آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو جتنی اعتماد، اطمینان، بصیرت اور احساس افتخار کے ساتھ اور اس اعتماد و افتخار اور بصیرت کے ساتھ ساتھ اللہ کے حضور اسی تشکر اور امتنان کے ساتھ آپ پورے فخر سے یہ

مکمل اطمینان قلبی کے ساتھ اعتماد کرنا چاہئے۔

یہ ذخیرہ مذاہب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ مذاہب کی تاریخ میں کسی اور شخصیت، دوسری تہذیبوں کی تاریخ میں کسی اور قائد یا رہنما کے بارے میں اتنے تیقن کے ساتھ اتنی تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو خود مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ایک مغربی مصنف فلپ کے ہٹی نے لکھا ہے کہ Muhammd (ASW) was born in full light of history۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے بارے میں آپ کا بڑے سے بڑا مخالف اور بڑے سے بڑا دشمن اور گستاخ بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ آپ کی ذات تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ آپ کی ذات مبارک کے علاوہ تمام انبیا علیہم السلام کے اپنے ماننے والوں نے ان کی اپنی تاریخی حیثیت کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے۔ برٹرینڈ رسل جیسا آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کو غیر تحقیقی اور افسانوی مانتا ہے۔

تیسری اہم حقیقت جو اس گفتگو میں ہمارے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جس امت کی تشکیل فرمائی تھی اور جس امت کے تحفظ کے لئے مدینہ منورہ میں ایک مثالی ریاست کی بنیادیں ڈالی تھیں وہ امت آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ امت مسلمہ میں کمزوریاں پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں در آئی ہیں۔ اس سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ لیکن اس حقیقت واقعہ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ جن اساس پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام امت مسلمہ کو قائم فرما کر گئے تھے، امت مسلمہ میں وہ اساسات بڑی حد تک موجود ہیں۔ نظری اعتبار سے تو سب کی سب موجود ہیں۔ بہت سی اساسات عمل کے اعتبار سے بھی موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ سابقہ مذہبی شخصیات میں سے کسی کو دوبارہ زندگی عطا کرکے دنیا میں واپس بھیج دے تو ان میں سے کسی کے لئے بھی اپنی قوم یا اپنی امت کو پہچاننا ممکن نہیں ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی بھی عیسائی ملک میں جا کر شاید یہ اندازہ نہ کرسکیں کہ یہ میرے ماننے والے لوگ ہیں۔ ان کی تعلیم، ان کے نظریات، ان کے احساسات، ان کا طرز عمل ہر چیز سے کتنی دنیا کی دوری ہوگئی ہے کہ شاید چند افراد جو بعض عبادت

المؤمنین ہو، یعنی مسلمانوں سے الگ ایک امت قرار دیا۔ ان کو مسلمانوں کے علاوہ ایک مستقل بالذات امت قرار دیا۔ مسلمانوں کا جز قرار نہیں دیا۔ اس لئے کہ امت مسلمہ میں شمولیت کے لئے توحید کے ساتھ ساتھ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ جو آپ نے توحید کے بارے میں دی، خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات بابرکات اور آپ کی رسالت اور نبوت پر ایمان شرط ہے۔ جب امت کی بنا ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ پر ایمان ہے تو آپ کی ذات سے وابستگی مضبوط بنانے کے لئے امت کو کیا کرنا چاہئے؟

عربی زبان میں امت کے دو معانی آتے ہیں۔ ایک مفہوم میں امت وہ گروہ یا برادری ہے جو ایک ماں باپ کی اولاد کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ یہ تو لغوی معنی ہوئے۔ امت کے ایک اور لغوی معنی کے اعتبار سے وہ شخص بھی امت ہے جس کی طرف لوگ رہنمائی کے لئے رجوع کرتے ہوں۔ من یقصد فیہ الناس۔ من یؤم الیہ الناس۔ فُعلۃ کا وزن اس شخص کے لئے آتا ہے جس کی طرف لوگ وہ فعل کرتے ہیں۔ رحلہ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ سفر کرکے آتے ہوں۔ محدثین میں سے بعض کا لقب رحلہ بتایا جاتا ہے۔ امام نسائی کو رحلہ کہا جاتا تھا۔ ان کی طرف لوگ سفر کر کے آتے تھے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے امۃ کے معنی ہوں گے جس کی طرف لوگ قصد کریں۔ یعنی امت مسلمہ کو اپنی ذات اور طرز عمل سے ایسا ہونا چاہئے کہ لوگ رہنمائی کے لئے اس طرف رجوع کریں۔ لوگ اس کی طرف مائل ہوں۔ اس طرز عمل اور رویے سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں۔

لیکن اصطلاحی اعتبار سے امت سے مراد وہ گروہ یا جماعت ہے جس کی اساس اور بنیاد ایک ہو۔ جس کے اہداف اور مقاصد ایک ہوں، جس کی منزل مقصود ایک ہو۔ جو ایک ماں کی اولاد کی طرح متحد ہو۔ جو ایک ہدف کی طرف گامزن ہو۔ جس میں وحدت کی ساری اقسام موجود ہوں۔ ایسے گروہ یا قوم کو امت کہا جائے گا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی فرد امت کہلایا۔ اس لئے کہ وہ تنہا تھا۔ جیسے قرآن میں ہے: ان ابراہیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا۔ ابراہیم تن تنہا ایک امت تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور توحید کا علمبردار نہیں تھا۔ توحید کی تعلیم کے لئے لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعد میں دوسرے لوگ شامل ہوتے چلے گئے اور امت بنتی گئی۔

تو علامہ اقبال نے اس کو اندھی کہا ہے۔ ایک وہ علم جس میں قلبی واردات شامل نہ ہوں، علامہ اقبال اس کو بے بصری قرار دیتے ہیں۔

وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

حکمت اور تزکیہ دونوں کو یکجا کیے بغیر وہ جذبہ ایمان پیدا نہیں ہو سکتا جو ملت مسلمہ اور امت اسلامیہ کی وحدت اور تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ اگر عشق کے بغیر علم ہو تو وہ گمراہی ہے۔ علم کے بغیر عشق ہو تو اندھا ہے۔ یہ مسلمانوں کا طرز عمل اور رویہ سیرت کے بارے میں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اس کو میں آگے عرض کرتا ہوں۔

اہل مغرب نے سیرت کے بارے میں گزشتہ دو سو سال کے دوران جو لکھا ہے اس کا ہم نے ان کیا رو دنوں میں ایک سرسری جائزہ لیا۔ لیکن اگر استشراق کی پوری تاریخ سامنے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک کر کے مغربی مستشرقین اور دانشور اسلام کی بنیادوں کو ہدف بناتے رہے ہیں۔ یہاں ان حضرات کا شمار نہیں کرتا جنہوں نے خالص علمی جذبے سے غیر تحقیقی کام کیا اور جن کے مثبت کام کا اعتراف ہر مسلمان کو کرنا چاہیے۔ یہاں اہل استشراق کا وہ بدنصیب گروہ موضوع گفتگو ہے جو پوری زندگی اس ماحول میں گزارنے کے باوجود، پوری زندگی قرآن و سنت کی ورق گردانی کے باوجود، پوری زندگی سیرت کے ذخائر پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود اس سے اثر پذیر نہ ہوا۔ جس کے دل تک اس نور کی روشنی نہیں پہنچی، وہ بدنصیب مراد ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ انہوں نے ذات رسالت مآب پر اخلاقی حملے کیے۔ کوئی مسلمان ان گستاخیوں کو نہ دہرا سکتا ہے اور نہ ان کی کوئی مثال بیان کر سکتا ہے۔ ان سب کا مفصل اور بھرپور جواب دینے کی کوشش کی جاتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود کئی سو سال تک گستاخیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعد میں انہوں نے خود ہی اس کو بے نتیجہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ شاید ایک مسلمان بھی ایسا نہیں نکلا جس نے ان کتابوں یا تحریروں کے نتیجے میں ذات رسالت مآب سے وابستگی چھوڑ دی ہو یا اس کے دل میں آپ کی ذات مبارکہ سے عقیدت میں کمی آئی ہو۔

اس کے بعد قرآن پاک اعتراضات کا ہدف بنا۔ قرآن پاک کے بارے میں یہ کہا گیا

کہ یہ اہلِ کتاب کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ قدیم مذہبی ادب اور کتابوں سے سرقہ کی ہوئی چیزیں ہیں۔ وقتاً فوقتاً قرآن پاک کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا رہا۔ اب مستشرقین کے ہاں اس نوعیت کی باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اس لئے کہ ان کو یہ محسوس ہوا کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ قرآن پاک کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ اپنے ثبوت اور ثقاہت کے اعتبار سے، اپنے معانی اور مطالب کے اعتبار سے۔ کہ اب اس کے بارے میں اس نوعیت کی بات کرنے کو خود انہوں نے غیر علمی اور غیر عقلی سمجھا۔ اب قرآن مجید پر اور انداز کی بات کرتے ہیں۔

ابھی چند سال پہلے چار پانچ جلدوں میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں قرآن پاک کے بارے میں دورِ جدید کے صفِ اول کے مستشرقین کے منتخب مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک عجیب و غریب بات یہ کہی گئی ہے کہ قرآن پاک میں صرفی نحوی اغلاط ہیں۔ اس بات کو بہت زور و شور سے بیان کیا گیا۔ کئی سال پہلے جب یہ کتاب نئی نئی شائع ہوئی تھی تو مجھے ایک مغربی ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک صاحب جو مسلمانوں کے ساتھ دوسروں کے مقابلہ میں قدرے ہمدردی رکھتے تھے، ان سے کئی روز گفتگو رہی۔ انہوں نے ایک دن اس کتاب کا ذکر کیا اور زور دے کر کہا کہ قرآن پاک میں صرفی و نحوی اغلاط پائی جاتی ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ انگریزی زبان کی قدیم ترین گرامر کی کتاب کب لکھی گئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا چلیں کسی اور سے معلوم کر لیتے ہیں۔ کسی سے پوچھا تو بتایا گیا کہ دو سو یا سوا دو سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر اس کتاب میں یا انگریزی گرامر کی کسی کتاب میں، (پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش میں بہت سے لوگوں نے انگریزی گرامر کی کتابیں لکھی ہیں) اگر انگریزی گرامر کی کسی کتاب میں اور شیکسپیئر کے کلام میں کوئی تناقض ہو تو آپ شیکسپیئر کو نحوی غلطی کا مرتکب کہیں گے یا اس کتاب کے مصنف کو غلطی کا مرتکب اور اس کے بیان کو غلط قرار دیں گے جس نے گرامر کی کتاب لکھی ہے۔ کہنے لگے کہ یقیناً مصنف نے غلط لکھا ہوگا۔ میں نے کہا کہ عربی زبان میں گرامر کی جو قدیم ترین کتابیں لکھی گئی وہ نزولِ قرآن کے دو سو برس بعد لکھی گئیں اور غیر عربوں نے لکھیں۔ اگر قرآن مجید میں گرامر کی غلطی ہوتی تو کفارِ مکہ اور مشرکین اور پوری عرب دنیا خاموش نہ رہتی اور اس

تحدی کا چیلنج دیا تھا۔ وہ عرب فصحاء جو قرآن کے چیلنج کے جواب میں خاموش تھے، وہ اس تحدی کی نشاندہی کرتے۔ لیکن آج تک کبھی کسی بڑے سے بڑے ادیب اور عرب کے بڑے سے بڑے شاعر نے قرآن مجید کے کسی اسلوب یا انداز کو عربی زبان اور گرامر سے متعارض نہیں کہا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اردو زبان میں قدیم ترین گرامر ایک مغربی مصنف ڈاکٹر گل کرائسٹ نے لکھی تھی۔ گل کرائسٹ کی گرامر اردو کی قدیم ترین گرامر ہے۔ میں نے کہا کہ اردو وہ ہے جو مرزا غالب نے لکھی ہے، جو گل کرائسٹ کے بعد کی ہے۔ مرزا صاحب کی کوئی تحریر اگر ڈاکٹر گل کرائسٹ کے معیار سے قواعد کے خلاف بھی ہوئی تو یہی کہا جائے گا کہ گل کرائسٹ کی کتاب غلط ہے، اس نے اردو زبان کے قواعد کو غلط سمجھا ہے۔ گل کرائسٹ کے کسی بیان سے مرزا اسداللہ غالب کا کلام غلط نہیں ہوگا۔ اردو وہ ہے جو مرزا غالب نے لکھی۔ جو ابراہیم ذوق نے لکھی۔ اردو وہ ہے جو میر تقی میر نے لکھی۔ اگر ان اساطین اردو کے برخلاف اردو کے کسی بڑے سے بڑے ماہر صرف نے کوئی بات لکھی ہے تو وہ غلط ہے۔

لہذا عربی زبان وہ ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے۔ عربی زبان وہ ہے جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زبان مبارک سے نکلی۔ جس کو دشمنوں نے اپنوں پرایوں دونوں نے عربی زبان کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیا۔ جنہوں نے قرآن مجید کے ادبی اعجاز کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ لہذا اس اصول کی رو سے قرآن مجید اور حدیث رسول کی زبان ہی اصل، معیاری اور ٹکسالی عربی زبان ہوگی اور گرامر کی کسی کتاب میں اس کے خلاف لکھا گیا ہے تو غلط لکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ وہ باتیں ہیں جو آج کل قرآن پاک کے بارے میں تلاش کر کے لائی جارہی ہیں۔

کچھ دن پہلے یمن کی ایک قدیم مسجد کی چھت گرگئی تھی۔ اس کی چھت کے اندر سے قرآن پاک کے بعض نسخے دریافت ہوئے تھے۔ یہ بات عربی زبان کا ہر طالب علم اور خاص طور پر دینی مدارس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ پرانی کتابوں میں سطور کے درمیان الفاظ کے معنی لکھے ہوتے تھے۔ بین السطور معانی اور تشریحات لکھ لینے کا یہ رواج صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ بعد میں دور طباعت کے آجانے پر بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ بین السطور جو اتنی چھپے بھی ہوتے تھے اور لوگ خود بھی لکھا کرتے تھے۔ یمن کے ان پرانے نسخوں

جن سے قرآن پاک کے ایک نسخے میں نسخہ مرتب کرنے والے نے کچھ معانی اور مفاہیم لکھے ہوئے تھے۔ یہ شاید ان مغربی ماہرین کو یہ طرز حاشیہ نویسی معلوم نہیں تھی جنہوں نے اس کو دیکھا۔ انہوں نے پوری دنیا میں ایک شور مچا دیا کہ قرآن پاک کا ایک نیا نسخہ دریافت ہوا ہے۔ وہ موجودہ نسخے سے مختلف ہے اور مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا کہ قرآن اسی انداز سے چلا آرہا ہے۔ اور یہ دیکھو قرآن کا ایک نیا version سامنے آ گیا ہے۔ یہ صنعا کا ایک ورژن ہے، جیسے بائبل کے ورژن ہوتے ہیں، یا گوسپلز کے ورژن ہوتے ہیں اسی طرح قرآن کا ایک نیا ورژن ہے۔

ڈاکٹر زمان صاحب نے مجھے اس مضمون کی کاپی دی۔ پڑھا تو اس میں واقعی وہی باتیں تھیں اور مثالیں بھی دی گئی تھیں۔ میں نے وہ مضمون لے لیا۔ اور ایک مرتبہ اتفاق سے یمن میں ایک جگہ جانا تھا وہاں وہ مضمون بھی ساتھ لیتا گیا۔ وہاں یمن کے وزیر اوقاف تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے میں نے اس نسخے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ آج کل میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ مجھ سے یہی سوال پوچھتے ہیں۔ میں اس قدیم نسخے کی فوٹو کاپی کروا کر لایا ہوں۔ انہوں نے ایک فوٹو کاپی مجھے بھی دی۔ بین السطور میں معانی و مفاہیم لکھے ہوئے تھے، حاشیہ پر بھی لکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ بیچارہ مغربی مصنف جس نے مضمون لکھا تھا اس نے یہ سمجھا کہ یہ قرآن پاک کا کوئی نیا ورژن ہے اور حاشیہ پر جیسے نسخے کے ویریئنٹس یا اختلافات لکھے ہوتے ہیں یہ وہ اختلافات ہیں۔ وہ جو وضاحتی کلمات تھے وہ ان کو نسخے کے ویریئنٹس سمجھا۔

قرآن پاک پر ناکام توجہ دینے کے بعد انہوں نے حدیث پر توجہ دینی شروع کر دی۔ حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے بارے میں کچھ اشارے میں گزشتہ گفتگوؤں میں عرض کر چکا ہوں۔ فقہ پر اعتراضات ہوئے۔ ان میں سے بعض کی نشان دہی بھی کی ہے۔ خاص طور پر سیرت کے بارے میں جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ آپ کے سامنے تفصیل سے آ چکا ہے۔ آج کل مستشرقین کے ہاں ایک عام رجحان یہ ہے کہ اب اسلام کی اچھائیوں کا اعتراف تو کیا جانے لگا ہے لیکن دو اعتبارات سے۔ ایک تو یہ کہ جو اچھائیاں تھیں وہ اسلام کی کسی سابقہ دور میں تھیں۔ The Magesty That Was Islam کے نام سے ایک بڑے مستشرق نے کتاب لکھی۔ وہ عظمت جو اسلام کی شکل میں تھی۔ یعنی وہ ماضی کا ایک

قصہ پارینہ تھا، اب نہیں ہے۔ اس لئے کہ ماضی کی چیز کا اعتراف کرنے میں فوری طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے اب وہ ماضی کے حوالے سے بعض خوبیوں اور یورپ پر اسلام کے احسانات کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ دوسری چیز یہ کہ اگر اسلام میں کوئی اچھائی ہے تو وہ ہم سے ماخوذ ہے۔ اسلامی قانون میں بہت ارتقا ہوا ہے تو وہ رومن لا سے ماخوذ ہے۔ الٰہیات میں ہوا ہے تو وہ عیسائی مذہب سے ماخوذ ہے۔ تہذیب و تمدن میں ہوا ہے تو وہ ایران اور روما سے ماخوذ ہے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی چیز اپنی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ باہر سے حاصل ہوا ہے۔

تاریخ اسلام کے بارہ میں مستشرقین کی تحریروں سے جو بے شمار غلط فہمیاں پھیلی ہیں ان کا ایک مجموعی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عام تعلیم یافتہ (مغرب زدہ) طبقہ میں اسلامی تاریخ پر سے اعتماد روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ جو لوگ مغربی مآخذ سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے پورے چودہ سو سالہ دور کو لوٹ مار اور قتل و غارت اور اسلام سے مسلسل اور اجتماعی انحراف کا دور سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں اسلام کا معیاری اور مثالی نظام (جس کو بہت سے مخلص عقیدتاً اور روایتاً ہی معیاری اور مثالی مانتے ہیں) محض چند سال چلا اور بعد کی ساری صدیاں اسلام کی نہیں، اسلام سے انحراف کی تاریخ ہیں۔ یہ عقیدہ صرف اسلام کے بارہ میں بے اعتقادی اور بے یقینی پیدا نہیں کرتا بلکہ خود ذات رسالت مآب اور آپ کے عالی مقام جانشینوں کی کارکردگی کے بارہ میں منفی تاثر کو جنم دیتا ہے۔ سیرت و پیغام رسول کی معنویت، اثر خیزی اور دوام کو عامۃ الناس کے ذہن نشین کرنے کے لئے تاریخ اسلام کی نئی تدوین بھی ناگزیر ہے۔

رسول ﷺ کے بارے میں وہ چیزیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارے موجود ہیں۔ مستند ترین احادیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے بارے میں آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں نے اس زمانے میں حضور کی ذات سے منسوب کی تھیں جب مسلمان محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آئیڈیلائز (idealize) کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک مستشرق نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ کی زندگی پر تین سطحیں یا تین پردے (Layers) چڑھائے گئے ہیں۔ ایک تو اصل محمد ہے۔ اس کے اوپر

آئیڈیلائیزیشن کی لیئر (Layer) ہے۔ اس آئیڈیلائزیشن کی لیئر کو ہٹانے کی پالیسی رو سے کو بڑھانے میں یہودی اور مسیحی لٹریچر میں انبیاء کے بارے میں جو کچھ تھا، وہ سب کچھ لے کر حضور کی ذات سے منسوب کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بڑے بڑے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط لکھے، اس بات سے انکار کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی نقل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو تبلیغ کے لئے بھیجا تھا۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا تھا اس لئے یہ بات حضور سے بھی منسوب کر دی گئی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان صحابہ کا انتخاب کیا جو ان ممالک کی زبانوں اور طور طریقوں سے واقف تھے، اور ان اقوام کے ذمہ دار لوگوں کو جانتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے نقل کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن apostles کو بھیجا تھا وہ مختلف زبانیں جاننے والے تھے۔

یہاں تک کہ غزوہ بدر کے بارے میں جب صحابہ سے حضور نے مشورہ کیا اور حضرت حباب بن المنذر نے کہا کہ یا رسول اللہ، آپ چلیں اور اگر آپ ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ جائیں گے اور ہم ان یہودیوں کی طرح نہیں کہیں گے جنہوں نے کہا تھا کہ 'اذهب انت وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون'۔ اس پر ایک فاضل مستشرق نے باقاعدہ مضمون لکھا ہے جو ایک کتاب کی شکل میں شائع بھی ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دراصل اس بات کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کو یہودیوں سے بہتر ثابت کیا جائے اور مسلمانوں کے پیغمبر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اونچا ثابت کیا جائے۔ اس لئے کہ یہودیوں نے اپنے پیغمبر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور صحابہ کی زبان سے یہ کہلوایا جا رہا ہے کہ یہ اپنے پیغمبر کا ساتھ دیں گے۔

اس کے بعد ایک اور دلچسپ بات جو اسی مصنف نے لکھی ہے، وہ یہ لکھی ہے کہ انصاری صحابہ اور مہاجر صحابہ میں، اور پھر انصاری تابعین اور مہاجر تابعین میں، یعنی انصاری پارٹی کے حامیوں اور مہاجر پارٹی کے حامی سیرت نگاروں میں مقابلہ تھا۔ مہاجر پارٹی کے سیرت نگار چاہتے تھے کہ مہاجر صحابہ کی عظمت ثابت کریں اور انصاری پارٹی کے سیرت نگار چاہتے تھے کہ انصاری صحابہ کی عظمت ثابت کریں۔ چنانچہ بدر کے موقع پر جو شوریٰ ہوئی تھی اس میں مختلف

صحابہ نے غلط خیال کیا۔ بعض روایات میں ایک صحابی کا ذکر ہے۔ بعض روایات میں دوسرے صحابی کا ذکر ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محدثین کا طریقہ ہے کہ وہ الگ الگ راوی اور الگ الگ اسناد کے واقعات کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ یہ بات حدیث کا ہر ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت تھی جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بات ارشاد فرمائی۔ اس کے راوی اتفاق سے حضرت عروہ بن زبیر ہیں۔ اس پر ان مستشرق صاحب کی رگ تحقیق پھڑکی۔ انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ اپنے نانا کی عظمت کے لئے عروہ بن زبیر نے ان سے منسوب کیا ہے۔ ایک اور روایت کی اور سند بھی یا تیسری سند ہے۔ اس میں حبیب بن ابی ثابت کا ذکر ہے۔ اس پر وہ مستشرق صاحب فرماتے ہیں کہ یہ انصاریوں کی عظمت کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اب اس طرح کے اعتراضات کا جواب دینا میرے خیال میں ایک کار لاحاصل ہے۔ جب کسی شخص کے دل میں پہلے سے یہ بات بیٹھی ہوئی ہو اور وہ صحابہ کرام اور تابعین کے بارے میں یہ رویہ رکھتا ہو کہ انصار کے صحابہ اپنا نام آگے لانا چاہتے تھے اور مہاجرین اپنی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے، اور ساری احادیث کو اس نقطہ نظر سے دیکھ کر بیان کرنا چاہے تو اس کا کوئی علمی جواب نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک عجیب اور افسوسناک امر ہے کہ بہت سے مغربی اہل علم اور مستشرقین بے جھجک صحابہ کرام، تابعین اور دوسرے اکابر اسلام کی نیتوں پر حملے کرتے ہیں، ان کے اندرونی عزائم اور محرکات تک کا علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی مادی اور دنیوی خواہشات کو ان کی تمام علمی اور دینی کاوشوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی تمام "تحقیقات" اسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں۔ لیکن اگر ہم اہل مشرق میں سے کوئی ان کی نیتوں اور عزائم کے بارے میں (جن کو وہ خود چھپانے کی ذرا کوشش نہیں کرتے) اظہار خیال کرے تو ہمارے یہ "محققین" کو سخت ناگوار ہوتا ہے اور وہ اس کو معروضی اور مقصدی تحقیق کے تقاضوں کے خلاف قرار دیتے کر اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔

اس ماحول اور اس ذہنی رویے کی موجودگی میں علمی جواب چاہے کتنے ہی دلائل اور معقولیت سے دیا جائے گا وہ بے اثر رہے گا۔ اگر پہلے سے یہ بدگمانی اور بد نیتی بیٹھی ہو اور صحابہ کرام کی

لاتعداد مظالم اٹھانے کے بعد اہل مغرب نے واحد راہ عافیت یہی سمجھی کہ مذہب کے لبادے کو اتار پھینکیں۔ مذہب کی جو شکل ان کے ہاں مروج تھی وہ دنیاوی معاملات میں رہنمائی دینے کے قابل نہیں تھی۔ ان کے ہاں مذہب کا استحصال صرف ایک طبقہ کی بالادستی کے لئے کیا گیا۔ وہ طبقہ کم و بیش ایک ہزار برس تک انسانوں کی گردنوں پر مسلط رہا۔ اس طبقہ کی غلامی سے نکلنے کے لئے ان کو اہل مذہب کے خلاف بغاوت کرنی پڑی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں مذہب اور اجتماعی زندگی الگ الگ ہو گئے۔ اب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جہاں بھی مذہب کے نام پر کوئی اجتماعی نظم قائم کیا جائے گا تو وہ اسی نمونے کا ہوگا جس نمونے کا ان کے ہاں قائم تھا۔ ان کے خیال میں جب دین کی بنیاد پر قوانین بنائے جائیں گے تو وہ اسی انداز کے قوانین ہوں گے جس انداز کے مغرب میں بنے تھے۔ جن کو نافذ کرنے کے لئے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا۔

دنیائے اسلام کا نہ یہ پس منظر ہے۔ نہ یہاں وہ صورت حال ہے جو مغرب کے دور تاریک میں پیدا ہوئی۔ نہ ہمارا کوئی دور الحمدللہ دور تاریک ہے۔ لیکن آج ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے لوگوں کے ذہن ضرور تاریک ہیں۔ ان میں علم و فکر کا لوازمہ تو بہت بھر دیا گیا ہے مگر دین و اخلاقیات اور روحانیات کی روشنی سے وہ یکسر محروم ہیں۔ اپنی تاریخ اور ثقافت و روایت سے ناواقفی کی وجہ سے وہ مغرب کی لااخلاقی اور لاروحانی اقدار سے متاثر ہو رہے ہیں۔ سیکولر معاشرت دنیائے اسلام میں علم کی کمی کی وجہ سے مقبول ہو رہی ہے۔ دینی پابندیوں سے جو لوگ نالاں ہیں وہ اس صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کو یہ منظر بہت پسند آتا ہے کہ مذہب سے برائے نام وابستگی بھی برقرار رہے اور مذہب کے دائرے کو گھر اور مسجد تک محدود کر دیا جائے۔ مذہب کے دائرے کو محدود کر کے زندگی کے باقی تمام گوشوں سے نکال دیا جائے۔ اخلاق اور روحانیات کو ملک بدر کیا جائے اور اس کو چند شعائر یا عبادت گاہوں میں محدود کر دیا جائے۔ جیسے جیسے یہ ہوتا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مسلمانوں کے لئے بے معنی ہوتی جائے گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کا تو بنیادی سبق فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ ہے۔ اگر دنیاوی حصہ دین کی رہنمائی سے خارج ہے تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا دو تہائی حصہ تو irrelevant ہو جاتا ہے۔

اس بھینس کو شہر میں لوگوں کو دکھانے کے لئے نکالیں۔ چنانچہ اس عجیب و غریب بھینس کو دیکھنے کے لئے پورا شہر اُمڈ آیا۔ سارے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پورے شہر میں چرچا ہو گیا کہ ایک عجیب طرح کی بھینس آئی ہے جو ہاتھی کے سائز کی ہے۔ تمام دن سب لوگ اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ شہر میں اور کوئی کام نہیں ہوا۔ بازار بند ہو گئے۔ دوسرے دن پھر بھینس کو شہر کی گلیوں میں پھرانے کے لئے نکالا تو آدھے لوگ آئے۔ تیسرے دن کوئی نہیں آیا۔ جس وزیر نے یہ مشورہ دیا تھا اس کا نام بزرجمہر تھا۔ بزرجمہر نے کہا کہ آپ کے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ پہلے دن لوگ بہت تذکرہ کریں گے۔ دوسرے دن تھوڑا سا ذکر کریں گے۔ تیسرے دن کچھ بھی نہیں کہیں گے۔

شاید اہل مغرب نے بزرجمہر نجومی کا مشورہ پڑھا ہوا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس طرح کی بھینسیں نکالتے رہتے ہیں۔ توہین رسالت کے جو واقعات وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں یہ کوئی اتفاقی واقعات نہیں۔ یہ واقعات بڑے غور و خوض اور سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔ جو قومیں دنیا پر حکومت کر رہی ہیں۔ جو دنیا کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ جو مسلمانوں کے اندرونی احساسات کا پتہ چلانے کے لئے ادارے بناتے ہیں۔ جس کام پر کروڑوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے آئندہ عزائم کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔ ان کو یہ ضرور معلوم ہو گا کہ ذات رسالت مآب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات جب ایک ایک کر کے پیش آتے جائیں گے تو جو مسلمانوں کے اندر کے جذبات ہیں وہ نکلتے جائیں گے۔ ایک مرحلہ خدانخواستہ ایسا آ سکتا ہے اور اس کا اندازہ بھی ہے کہ ایسا مرحلہ آنے والا ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب ہو اور مسلمان کسی ردعمل کا اظہار نہ کریں۔ جب وہ مرحلہ خدانخواستہ آ جائے تو پھر وہ اگلے مرحلے کا آغاز کریں گے جس میں اس وابستگی کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے جو اقدامات انہوں نے سوچ رکھے ہیں وہ کریں گے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ گزشتہ دو سو برس سے یہ کام بھی ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کی توجہات کو ایسے غیر عملی مسائل میں الجھا دیا جائے جو مسلمانوں کو تقسیم در تقسیم بھی کرتے رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی قوت عمل کو بھی ختم کرتے رہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت کے بارے میں بعض ایسے سوالات جو مسلمانوں میں کبھی نہیں اٹھے تھے۔ انیسویں صدی میں

اٹھے۔ آخر انیسویں صدی میں کیا نئی بات ہوئی تھی۔ انیسویں صدی میں ہی وہ مسائل کیوں اٹھائے گئے۔ جو صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ مسائل مسلمانوں میں اس لئے اٹھ سکے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی حاکم ہوگئی تھی۔ اس لئے اٹھ سکے کہ عیسائی پادریوں کا ایک سیلاب آگیا تھا۔ اس لئے اٹھے کہ ہندوؤں میں سے بہت سے طبقات کو انگریزوں نے کھڑا کر کے اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے عقائد پر حملے کریں۔ یہ آریہ سماجی اور برہمو سماجی از خود تو کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ یہ کسی خاص ہدف کی خاطر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ یہ مسلمانوں پر حملے کرنے پر انیسویں صدی ہی میں کیوں آمادہ ہوئے۔ اس لئے کہ کسی نے ان کو آمادہ کیا تھا ورنہ یہ حملے بہت پہلے بھی ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں پر دور زوال کئی بار آیا۔ برصغیر میں کئی بار مسلمان سیاسی طور پر کمزور ہوئے۔ دو کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت یہاں ختم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن کبھی اس طرح کی تحریکات اور اعتراضات نہیں اٹھائے گئے جو انگریزوں کے آنے کے بعد اٹھائے گئے۔ اس سے قوی امکان بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات اور مظاہر ایک منصوبے کا حصہ تھے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی کمزور کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

ان حالات میں کرنے کا بنیادی کام علم سیرت کا فروغ، علم حدیث سے واقفیت اور قرآن مجید سے تعلق کو مضبوط بنانے کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس صورت حال کا اس ایک کے علاوہ کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ قوت سے آپ ان کو روک نہیں سکتے۔ وسائل میں ہم ان سے کم ہیں۔ ان کے وسائل ہم سے بہت زیادہ ہیں۔ مسلمان مغربی میڈیا کی آئی ہوئی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ غیر مغربی میڈیا سے آئی ہوئی باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ یہ عام مسلمانوں کا رویہ ہے۔ ہمارے حاکم اور بااثر طبقہ کی نظر میں جنگ اور نوائے وقت میں جو بات چھپتی ہے وہ جھوٹ ہے، ڈان میں جو چھپتی ہے وہ سچ ہے۔ اور جو بات نیویارک ٹائمز میں چھپتی ہے وہ تو سچائی کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ یہ ایک افسوسناک امر واقعہ ہے کہ اب یہی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نظر میں حق وصداقت کا معیار ہے۔ عام مسلمان کا اب دنیا بھر میں یہی رویہ ہے۔

پھر لامذہبیت کو جو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس تحریک کو کون چلا رہا ہے۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں کون کون لوگ ذمہ دار

ہیں۔ میرے خیال میں اس کے بہت سے اسباب ہیں جن کی تفصیل میں ابھی نہیں جاتا۔ لیکن امت کو بحیثیت مجموعی اور اہل پاکستان کو خاص طور پر غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں سیکولرزم کو جو فروغ دیا جا رہا ہے وہ کیوں دیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اگر کچھ لوگ سیکولرزم کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور وہ دوسروں سے ایک لادینی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں وہ یہ نظام کیوں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس پر اچھی طرح غور کر کے ان کا سد باب نہیں کیا جائے گا اور ان گمراہیوں کو دور نہیں کیا جائے گا تو بہت جلد وہ وقت بھی آجائے گا کہ اس آفت سے نمٹنا دشوار ہو جائے گا۔ مغربی گمراہیوں کا سد باب ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان گمراہیوں کا سد باب محض فتوی جاری کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ قرآن و حدیث کے کسی حوالے سے نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ان گمراہیوں سے متاثر ہیں وہ اس میں مغرب کی تہذیبی عظمت اور فکری بالادستی سے متاثر ہیں۔ ان کی گمراہیوں کا سد باب مغربی طرز استدلال اور مغرب کے انداز تحریر و تحقیق ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ اسلامی نقطہ نظر کو مغرب کے اسلوب بیان اور طرز استدلال کے مطابق بیان کر سکتے ہیں اور مغربی فکر کی کمزوریوں کو عقلی اور منطقی دلائل کی بنیاد پر واضح کر سکتے ہیں۔

توہین انبیا کے قوانین دنیا کے کئی ممالک میں رائج ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے اور بہت دکھ کی بات ہے کہ اول تو کئی مسلم ممالک میں توہین رسالت جرم نہیں ہے۔ بعض مسلم ممالک ایسے بھی ہیں جہاں توہین رسالت کے قوانین تو موجود ہیں لیکن ان ممالک کے حکمران ان ہی قوانین کے مخالف ہیں۔ ان ممالک کے بااثر طبقات بھی ان قوانین کے حامی اور قائل نہیں ہیں۔ جہاں قانون بنانے والے اور قانون نافذ کرنے والے ہی اپنے قانون کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتے ہوں وہاں وہ قانون کیسے موثر ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہمارے ہاں بہت سے قوانین موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے۔

ان حالات میں سیرت کے حوالے سے ہمیں جو کام کرنا چاہئے وہ ایک نئے اسلوب سے، نئے مواد کی روشنی میں زیادہ بہتر اور زیادہ موثر مطالعہ کا کام ہے۔ جب سیرت کی ابتدائی کتابیں لکھی گئیں جن کی عظمت اور جن کے کارنامے کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس میں کوئی تامل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان عظیم الشان مصنفین کو بہت سے پہ

بنیادی مصادر دستیاب نہیں تھے جو بعد میں دستیاب ہوئے۔ کل پرسوں میں نے مولانا شبلی کے بارے میں یہ تذکرہ کیا تھا کہ وہ بار بار اس پر دکھ کا اظہار کرتے تھے کہ تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی۔ تاریخ ابن کثیر مولانا شبلی کو دستیاب نہیں تھی۔ لیکن آج تاریخ ابن کثیر چھپی ہوئی دنیا کے ہر کونے میں موجود ہے۔ مولانا شبلی کو ابن ہشام کی شرح الروض الانف دستیاب نہیں تھی۔ اس زمانے تک یہ کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ اور بھی بہت سی ایسی بنیادی کتابیں ہیں جو آج چھپ کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ لیکن اس زمانے کے مصنفین کے سامنے نہیں تھیں۔ آج وہ ساری کتابیں دستیاب ہو گئی ہیں۔ آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ اگر اس سارے مواد کو جو آج دستیاب ہے، مخطوطات ہر جگہ دستیاب ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کے مخطوطات کی سافٹ کاپیاں آنے لگی ہیں۔ سی ڈیز پر بے شمار مخطوطات آ رہے ہیں۔ ہر شخص کو بیٹھے بیٹھے دستیاب ہیں۔ بہت سے مخطوطات ہیں جو لوگوں نے ویب سائٹ پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ آپ یہاں بیٹھ کر جرمنی اور فرانس میں موجود مخطوطات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ بات پہلے نہیں تھی۔ آج مسلمان اہل علم اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر سیرت پر ایک نئے انداز سے کام کریں اور مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو سامنے رکھیں۔ مستشرقین نے جن معاملات کو اعتراض کا نشانہ بنایا ہے وہ مسلمانوں کے سامنے ہوں تو ان کا جواب بہت آسانی کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ جواب کے لئے کسی مناظرانہ یا متکلمانہ انداز کی ضرورت نہیں ہے۔ جواب کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقائق یا اعتراضات مسلمانوں کے سامنے ہوں اور مسلمان اپنی تحریر میں حضور کی سیرت کو ایسے انداز میں پیش کریں کہ اعتراض کرنے والے کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملے۔

مختلف اسلامی زبانوں میں سیرت پر کام ہوا ہے۔ کل اردو، انگریزی اور چند دیگر زبانوں کی کتابوں کا ہم نے تذکرہ کیا۔ یقیناً اور زبانوں میں بھی بہت کام ہوا ہوگا۔ ترکی اور فارسی میں بھی ہوا ہے۔ افریقی زبانوں میں بھی کام ہوا ہوگا۔ انڈونیشی، برمی زبانوں میں کام ہوا ہوگا۔ ملے زبان چار پانچ سو سال سے ایک علمی زبان ہے۔ اس کی ادبیات کی ایک تاریخ ہے۔ ان میں کیا کام ہوا ہے اور ان میں کیا چیز ایسی نمایاں ہے جو اہل پاکستان یا اردو داں قارئین کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ ہمارے کام اور تحقیق میں کیا چیز ہے جو دوسروں کے لئے مفید ہو سکتی

خواہانہ رویہ ملتا ہے۔ بڑے بڑے مصنفین کے ہاں معذرت خواہانہ رویے ملتے ہیں۔ علامہ شبلی کا میں نے ذکر کیا کہ ان کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خود برصغیر کے علماء نے تامل کیا ہے۔ بعض محتاط اور مستند اہل علم نے ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں معذرت خواہانہ رویہ جھلکتا ہے۔ یہ مغربی عروج کے ابتدا کا زمانہ تھا۔ مسلمان مغربی طاقتوں کے براہ راست قبضہ میں تھے اور ان کی تہذیب وثقافت کے زیر اثر تھے۔ اس کی چکاچوند سے آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ آج اس کیفیت میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ آج خود مسلمان اہل علم میں ایسے فضلاء موجود ہیں اور کثرت سے موجود ہیں جو مغربی تصورات سے اتنے ہی واقف ہیں جتنا کہ کوئی مغربی عالم ہو سکتا ہے۔ اس لئے آج ہم ایک بہتر پوزیشن میں ہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اس معذرت خواہانہ ادب کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیں۔

ہمارے جن مصنفین نے مستشرقین یا مغربی مصنفین کا جواب دینا چاہا، ان میں سے کئی حضرات مغربی زبانوں سے واقف نہیں تھے۔ سرسید انگریزی یا کسی اور مغربی زبان سے واقف نہیں تھے۔ مولانا شبلی واقف نہیں تھے۔ اس لئے ان تک جو معلومات آئی تھیں وہ ترجمے کے ذریعے آئی تھیں۔ کچھ حضرات تھے جو براہ راست مغربی تصورات سے واقف تھے لیکن ان کی اسلامی بنیاد کمزور تھی۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے اس صحیح نقطہ نظر کی ترجمانی نہ کر سکے جو مسلمانوں کی گزشتہ تیرہ سو سالہ علمی روایت کے مطابق ہو۔ کچھ حضرات جو یہ کام کر سکتے تھے لیکن ان کو شاید وقت نہیں ملا۔ مثلاً مولانا مودودی اس کام کو شاید سب سے بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ وہ سیرت کے کام کے لئے وقت نہیں نکال پائے۔ کچھ اور حضرات بھی اس کام کے لئے وقت نکال سکتے تھے لیکن ان کی مصروفیات دوسرے انداز کی رہیں۔ مستشرقین کی سیرت نگاری کا باقاعدہ علمی جائزہ لینے کا کام ایک زمانہ میں لاہور کے پروفیسر ظفر علی قریشی مرحوم نے بھی شروع کیا تھا۔ انہوں نے سالہا سال لگا کر بہت سے نوٹس تیار کئے تھے۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں ان کا یہ کام دیکھا تھا۔ اس کا ایک بہت مختصر حصہ ہی وہ تیار کر کے شائع کر پائے۔ بقیہ ساری زندگی کی کاوش پر مبنی کام ابھی تک نوٹس اور یادداشتوں کی شکل میں ہے۔ یہ سارا کام بھی از سر نو غور وخوض کا محتاج اور تشنۂ تکمیل ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو قدیم اسلامی روایت پر

گہری اور قوی نظر رکھتے ہوں۔ مغربی انداز استدلال اور اسلوب نگارش سے واقف ہوں۔ مغربی مستشرقین نے گزشتہ تین چار سو سال میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گہری نظر رکھتے ہوں اور یہ پورا ذخیرہ سیرت وحدیث جو اب دستیاب ہو گیا ہے اور پہلے جو تمام دستیاب نہیں تھا اس کی بنیاد پر سیرت کا ایک دائرۃ المعارف تیار کریں۔ ایک دائرۃ المعارف کہ علامہ شبلی جس انداز کا لکھنا چاہتے تھے، آج اس انداز کا کام کرنے کے لئے مواقع شاید زیادہ موجود ہیں۔ وسائل بھی بلاشبہ پہلے سے بہت بہتر ہیں۔

اس کام کے لئے مغربی اہل علم کے کام اور تحریروں سے واقفیت درکار ہے۔ جہاں جہاں واقعتہ کوئی بھی غلط فہمی ہے اس کا نوٹس لینا چاہئے۔ لیکن مستشرقین کی غلط فہمیوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن سے فراموش نہ ہونی چاہئے کہ وہ قرآن مجید کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے۔ حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے۔ اس پر ہمیں شکایت کرنے کا حق نہیں۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق سوچنے، لکھنے اور کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن اگر اس فرق کی وجہ سے ان کے نقطہ نظر میں فرق پیدا ہوتا ہے، مسلمانوں سے ان کا نقطہ نظر مختلف ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کو یہ حق تو ہونا چاہئے کہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق انہی کے وسائل اور انہی کے اسالیب سے کام لے کر سیرت کا صحیح پہلو سامنے لائیں اور سیرت کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اہل مغرب کے مزاج میں شاید یہ بات شامل ہے کہ وہ لوگوں کے عزائم اور نیتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ کرام کے دل میں کیا تھا۔ وہ یہ بھی جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ تابعین کے عزائم اور محرکات کیا تھے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ امام بخاری نے کن عزائم سے صحیح بخاری مرتب کی۔ ان چیزوں کا ظاہر بات ہے کہ کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی اگر کسی کے دل میں ایمان اور صحیح عقیدے کی جڑ مضبوط ہے تو عقیدہ درست ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ جو چیزیں کوئی بھی تحقیقی بنیاد رکھتی ہیں اور واقعتہ کسی غلط فہمی کا ذریعہ اور سبب بن سکتی ہیں ان اسباب کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

مسلمان علماء، سیرت نگاروں اور محدثین نے دو بڑے اسالیب سے کام لیا ہے۔ ایک اسلوب روایت ہے اور دوسرا اسلوب درایت ہے۔ محدثین نے اسلوب روایت پر زیادہ زور

ایک مظہر ہوگی کہ لیتبین لھم انہ الحق، اللہ تعالیٰ کی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ان کے سامنے ثابت کردے گا کہ یہی پیغام حق ہے۔ سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق، اس آیت کی تصدیق کا ایک ذریعہ سامنے آجائے گا۔

اس کام کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید، سنت ثابتہ اور متواترہ سے سیرت کی معلومات کا جو بنیادی چوکھٹا ہے وہ ہمارے سامنے ہو۔ اس کو ہم معیار، حوالہ اور مستند قرار دیں۔ جو بیان شان نبوت سے ہم آہنگ ہو، اس کو قبول کیا جائے۔ جو روایت شان نبوت سے ہم آہنگ نہ ہو، اس کو قبول نہ کیا جائے۔ تاریخی تحقیق کے وہ قواعد ضوابط اور معیارات جو محدثین کے اصول کے مطابق ہیں اور جدید تاریخی تنقید اور تحقیق کی نگاہ میں بھی قابل قبول ہیں ان دونوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور سیرت نگاری کی مختلف آراء سے کام لیا جائے۔ کچھ معاملات ایسے ہیں جن پر سیرت نگار اتفاق کرتے ہیں۔ مورخین، مفسرین اور سیرت نگار بھی ان تمام تفصیلات سے اتفاق رکھتے ہیں۔ آج اگر کچھ محققین بعض معاملات پر کوئی نئی رائے دینا چاہتے ہیں تو وہ کسی کی انفرادی رائے تو ہوسکتی ہے لیکن اس کی بنیاد پر سیرت کی مسلسل اور متواتر روایت کو مشکوک ٹھہرانا درست نہیں ہوگا۔

جن لوگوں نے مغربی اصول تنقید سے کام لیا یا لینا چاہا، ان میں پہلا نام تو سرسید کا ہے۔ مولانا شبلی کا ہے۔ ابھی ماضی قریب میں اکرم ضیاء العمری جو عراق کے بڑے محقق تھے۔ شیخ ابو زہرہ، مولانا مودودی، ان حضرات نے مغربی اصول تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی۔ آخر میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس سے کام لیا۔ لیکن یہ ساری کی ساری انفرادی اور جزوی کوششیں ہیں۔ ان میں سے ہر کاوش کے بعض پہلو بہت نمایاں اور بہت قابل قدر ہیں۔ لیکن بعض پہلو ایسے ہیں جن پر مزید نظرثانی اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ مثلاً سرسید اور شبلی کا کہیں کہیں معذرت خواہانہ رویہ نظرثانی کا محتاج ہے۔ اکرم ضیاء اور ابوزہرہ کی واقفیت مغربی منہاجات سے براہ راست نہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے ہاں اصول روایت سے کہیں کہیں انحراف پایا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے سیرت پر باقاعدہ کام نہیں کیا۔ سیرت پر مواد ان کی بچاس سالہ تحریروں میں بکھرا ہوا ہے۔ ایسے میں منہاج اور اسلوب کی یکسانی برقرار کیسے رہ سکتی ہے۔ اس لئے اجتماعی کام کی ضرورت اب بھی موجود ہے اور مسلمان امت کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے کہ

وہ سیرت کا ایک ایسا اجتماعی کام سامنے لائیں جس میں ان تمام تحقیق اور نتائج سے کام لیا گیا ہو۔

کل کی گفتگو میں میں نے عرض کیا تھا کہ سیرت کے بعض نئے میدان اور نئے موضوعات چودھویں صدی میں سامنے آئے ہیں اور وہ میدان اور موضوعات ایسے ہیں جن پر ابھی کام کا آغاز ہوا ہے۔ ان نئے موضوعات پر کام کرنے کے لئے سیرت کا دستیاب مواد اور قدیم سیرت نگاروں کا پورا کام، وہ ایک ماخذ اور مصدر کے طور پر تو کام دے سکتا ہے لیکن اس مواد میں معلومات کی وہ ترتیب نہیں ہے جس سے ان نئے موضوعات پر کام لیا جا سکے۔ مثال کے طور پر میں نے سیاسیات سیرت کا حوالہ دیا تھا۔ عسکریات سیرت کی مثال دی تھی۔ سیرت کی ثقافت کی رنگارنگی اور ہمہ گیری کی مثال دی تھی۔ معاشی سیرت کی مثال دی تھی۔ اجتماعیات سیرت اور نفسیات سیرت کا ذکر کیا تھا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن پر تحقیقی کام کا آغاز ہوا ہے اور چودھویں صدی کے کام میں ان امور کے مفید اشارے پائے جاتے ہیں اور ان کاموں کے ابتدائی خطوط ملتے ہیں جن پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کی ہے۔ میں نے جس مقالات پر مشتمل سیمینار کا ذکر کیا تھا۔ اس سیمینار کے منتظمین نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے اور لکھا ہے کہ Muhammad's biography is about to set off to new horizons. حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری اب نئے آفاق کی طرف سفر کرنے کے لئے تیار ہے۔ ان کی نظر میں نئے آفاق کیا ہیں، یہ نہیں بتایا۔ لیکن ہمارے سامنے جو نئے آفاق ہونے چاہئیں ان میں سے بعض کی نشاندہی میں نے کل اور پرسوں کی۔

ماضی میں علمائے اسلام نے مشکل القرآن کے نام سے ایک فن مرتب کیا۔ قرآن پاک کی تفسیر کے وہ معرکۃ الآراء مسائل جن کے بارے میں اختلاف رائے رہا۔ اور اس اختلاف رائے کو رفع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ان خاص مسائل کو الگ سے یکجا کر کے مشکل القرآن کے نام سے ایک الگ فن مفسرین قرآن نے مرتب کیا۔ اس پر بہت سے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ ہمارے برصغیر کے مولانا انور شاہ کشمیری کی بھی ایک کتاب ہے۔ اسی طرح سے محدثین نے مشکل الحدیث کے نام سے ایک فن مرتب کیا اور احادیث کے ذخائر میں وہ مسائل جو بہت

معرکۃ الآرا ہیں اور ان اختلافات کو رفع کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کو ایک الگ فن کے طور پر مرتب کیا اور اس کا خصوصی مطالعہ کیا۔ یہ فن مشکل الحدیث کہلایا۔

اس طرح کے علوم وفنون کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مشکل السیرۃ کے نام سے بھی اس طرح کا ایک فن ہونا چاہئے۔ مشکل السیرت کے فن میں وہ معاملات ومشکلات کہ جن میں بہت سا اختلاف ہوا ہے، اس کو حل کرنے کی کیا تدبیر ہونی چاہئے اور اس مشکل کو کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بہت اجتماعی غوروفکر کی ضرورت ہے۔ میں اس فن کا آدمی تو نہیں ہوں لیکن اس سے متعلق ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ سیرت کے ایک محقق اور طالب کو جو مسائل پیش آتے ہیں ان میں ایک اہم مسئلہ تقویم کا ہے۔ غوری صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ وہ اس فن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے پروفیسر ظفر احمد اور ہندوستان کے مولانا اسحاق النبی علوی نے ان مسائل پر فاضلانہ مقالات لکھے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو مکہ مکرمہ میں، مدینہ منورہ اور عرب کے مختلف مقامات میں مختلف تقویمیں رائج تھیں۔ ہر بڑے قبیلے نے ایک الگ کیلنڈر یا تقویم رائج کر رکھی تھی۔ ہر بڑے واقعے سے ایک نیا کیلنڈر شروع ہو جاتا تھا اور اس کے حساب سے سن کا شمار ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں جب ابرہہ کا واقعہ عام الفیل میں واقع ہوا تو مکہ میں عام الفیل کے نام سے ایک نیا کیلنڈر شروع ہو گیا۔ کچھ کیلنڈر پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ اسی طرح بعض وہ قبائل جو اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے تھے ان کے اپنے اپنے کیلنڈر تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ شمسی تقویم کی پیروی کرتے تھے بعض قمری تقویم کی پیروی کرتے تھے۔ شمسی اور قمری کیلنڈروں میں ہر سال بارہ دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس طرح عرب کے مختلف مقامات پر مختلف تاریخیں اور مختلف کیلنڈر چل رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں بھی دو کیلنڈر رہتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں بھی دو کیلنڈر رہتے تھے۔ اب جب ایک صحابی یا کوئی راوی کوئی بات بیان کرتا ہے کہ فلاں واقعہ فلاں سن کے فلاں مہینے میں پیش آیا، تو وہ صحابی یا راوی ان میں سے ایک مخصوص تقویم کے مطابق تاریخ کا تعین کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرے صحابی یا دوسرے راوی جو اسی یا کسی اور واقعہ کو بیان کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں سال کے فلاں مہینے میں یہ واقعہ ہوا تو وہ کسی اور تقویم کے حوالے سے بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں درحقیقت بہت کم تعارض ہوتا ہے۔

کئے جانے والے کاموں کی تحسین ہے۔ ماضی کے کئی ایسے کام ہیں جو کسی وجہ سے نامکمل رہ گئے اور آج ان کی تکمیل کے اسباب اور وسائل پہلے سے بہتر انداز میں موجود ہیں۔ پرسوں ایک دوست نے یہ سوال پوچھا بھی تھا کہ سرسید جس کتاب کو چار جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے اور جس کی وہ صرف ایک ہی جلد لکھ پائے اس کی بقیہ تین جلدیں آپ کیوں نہیں لکھتے۔ اس کا جواب میں نے عرض یہ کیا تھا کہ سرسید نے جن حالات میں وہ کتاب لکھی آج وہ حالات نہیں رہے۔ وہ اعتراضات اب لوگوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب وہ پرانے ہو گئے ہیں۔ از کار رفتہ ہو گئے۔ اب وہ اعتراضات مغربی دنیا میں لوگ نہیں دہراتے۔ وہ اعتراضات چونکہ ختم ہو گئے اس لئے ان کا جواب دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوگی۔ لیکن بعض کام ایسے ہیں جو واقعتاً بہت مفید اور ضروری تھے لیکن نامکمل رہ گئے اور انہیں کرنے چاہئے۔ مثال کے طور پر قاضی محمد سلیمان منصورپوری نے سیرت کے بعض ایسے نئے پہلو تلاش کئے اور اس کے مماثل اور متقابل حالات سے تقابل کیا اور سیرت کی عظمت کے ایسے نئے پہلو انہوں نے ہمارے سامنے رکھے۔

ایک جگہ انہوں نے بہت تفصیل سے ان لوگوں کے بارے میں اعداد و شمار جمع کئے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں غزوات میں کام آئے۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی اور غیر مسلموں کی طرف سے بھی۔ ایک ایک غزوہ کے اعداد و شمار قدیم کتابوں سے جمع کر کے یہ ثابت کیا کہ جو مسلمان اس میں کام آئے ان کی تعداد 200 سے زائد نہیں۔ جو مسلمان دھوکے سے شہید کر دیئے گئے ان کی تعداد بھی سو کے قریب ہے۔ دشمن کے جو مقتولین میدان جنگ میں کام آئے ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس ڈھائی سو میں بنو قریظہ کے مقتولین شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے جو قابل غور ہے۔ یہ سارے لوگ دشمن کے مقتولین تھے جن کی تعداد مشکل سے پانچ ساڑھے پانچ سو بنتی ہے۔

اس محدود اور معمولی قربانی سے جو تبدیلی آئی جس کی طرف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ دس مربع میل کی بستی اور چودہ مربع میل کی ریاست سے اس کام کا آغاز ہوا۔ پھر تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے اس ریاست میں توسیع ہوئی اور جب

رسول ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو دس لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت قائم تھی۔ اتنی بڑی حکومت کو قائم کرنے میں اور اتنی غیر معمولی تبدیلی لانے اور اتنے غیر معمولی انقلاب کو قائم کرنے میں، اگرچہ انقلاب کا لفظ کوئی خوشگوار لفظ نہیں ہے، لیکن ایک ہمہ گیر تبدیلی لانے میں اتنی معمولی قربانی کہ پانچ سو آدمی کام آئے ہوں، یہ کوئی قابل ذکر قربانی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں نے جنگوں کے اعداد و شمار جمع کئے ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کو سامنے رکھا جائے تو بڑی ہوش ربا تفصیلات سامنے آتی ہیں۔

قاضی سلیمان منصور پوری کے زمانے میں دوسری جنگ عظیم تو نہیں ہوئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں جو لوگ مارے گئے تھے ان کی تعداد 73 لاکھ 38 ہزار تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں انسانی آبادی کو قتل کر کے حاصل کیا ہوا؟ کوئی مثبت نتیجہ کیا نکلا، سوائے اس کے کہ دنیائے اسلام کو غلام بنایا گیا۔ دنیائے اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک بڑی سلطنت کے درجنوں ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد حاصل نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر اس طرح سے تمام واقعات کو جمع کیا جائے اور جو جو ریاستیں ان علاقوں میں قائم ہوئیں۔ یا جو انقلابات مختلف علاقوں میں آئے ہیں، ان کا تقابل اس تبدیلی سے کیا جائے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں انجام پائی تو تحقیق کا ایک نیا موضوع ہوگا اور ایک نئے انداز سے اسلام کے انداز انسانیت کو اور اسلام کے متمدن اور مہذب ہونے کے پہلو کو ہم زیادہ کامیابی سے نمایاں کر سکیں گے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ غزوہ بدر سے لے کر آج افغانستان اور عراق تک مسلمانوں کے ہاتھوں اتنے غیر مسلم نہیں مارے گئے جتنے لوگ صرف دوسری جنگ عظیم میں مار ڈالے گئے تو شاید یہ درست ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میدان جنگ میں کام آنے والے غیر مسلم اس کا پانچ فیصد بھی نہیں ہوں گے۔ دو فیصد بھی نہیں ہوں گے۔

جن موضوعات پر آج نیا کام کرنے کی ضرورت ہے ان میں اداریات سیرت یا سیاسیات سیرت کا ایک نیا پہلو ہے جس پر بیسویں صدی میں ایک نئے کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے دو کتابیں، جن کا میں تفصیلی تذکرہ کر چکا ہوں، خزاعی کی تخریج الدلالات السمعیۃ اور عبدالحئی کتانی کی التراتیب الاداریہ، ان کتابوں میں وہ معلومات موجود ہیں لیکن ان معلومات کی حیثیت ایک متفرق ذخائر کی ہے۔ ایک مکمل اور مربوط تصویر کی نہیں ہے۔ یہ کام

بیسویں صدی میں شروع کیا گیا لیکن پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے کوشش کی تھی کہ سیرت النبی کی ساتویں جلد عہد نبوی کے نظام حکومت اور نظام ریاست پر مرتب کریں، لیکن وہ کتاب کی تکمیل سے پہلے ہی رخصت ہوگئے۔ مولانا مودودی کے ذہن میں تھا کہ اپنی سیرت کی تیسری چوتھی جلد میں اس کام کو کریں گے۔ وہ اس کا آغاز بھی نہیں کر پائے۔ کچھ اور حضرات نے اس موضوع پر کام کیا ہے، لیکن وہ ابتدائی خطوط کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر نثار احمد نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔ لیکن یہ کام کا آغاز ہے۔ اب اس کام کے لئے نئی فراوانی سے مواد دستیاب ہونے لگا ہے کہ اس مواد کو سامنے رکھ کر عہد نبوی کے نظام ریاست کا ایک مربوط اور مکمل نقشہ مرتب کر سکتے ہیں۔

ایک اور چیز جس کے بارے میں مستشرقین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور ابھی مسلمانوں کو اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن جن حکمرانوں کو رسول اللہ ﷺ نے دعوتی خطوط تحریر فرمائے۔ یقیناً ان ممالک کی تاریخ میں بھی ایک اہم واقعہ ہوگا کہ عرب کے ایک گوشے سے ایک شخص دنیا کے ایک بہت بڑے فرمانروا کو ایک تبلیغی خط لکھتا ہے۔ ان کی تاریخ میں ان واقعات کو کس انداز سے دیکھا گیا اور کس انداز سے بیان کیا گیا۔ اس پر کچھ مواد سامنے آیا ہے۔ بعض لوگوں نے معلومات کو جمع کیا ہے لیکن ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس دور کے اگر کوئی مصادر موجود ہیں تو ان سے کام لے کر اس نقشے کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔

اداریات سیرت یا سیاسیات سیرت کے ساتھ ساتھ ایک اہم موضوع معاشیات سیرت بھی ہے۔ معاشیات سیرت کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ جس کی طرف ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ دوسرا اور نسبتاً زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی میں مدینہ منورہ میں اور مکہ مکرمہ میں صحابہ کرام کی معاشی زندگی کیسی تھی۔ جو معاشی اصلاحات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم فرمائیں وہ کن ترجیحات کے ساتھ اور کس تدریج کے ساتھ قائم فرمائی اور ماضی میں اس کی شکل کیا تھی اور آخر میں کیا ہوئی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو اس دور کے لحاظ سے ناگزیر ہے۔ آج کل کا دور معاشیات کا دور ہے۔ آج ہر چیز معاشیات کے نقطہ نظر سے

سے وہ مدینہ منورہ کی بہت سی زمینوں کے مالک بن گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب سود کو حرام قرار دیا تو یہودیوں کی بالادستی کو ختم کرنے کے لئے آپ نے ربا الفضل کو بھی حرام قرار دے دیا۔ ربا الفضل کی نوعیت کیا تھی۔ اس کی حکمتیں کیا تھیں۔ اس کی حرمت کے نتائج اور اثرات کیا تھے۔ اس پر آج کل کے معاشی نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسیات سیرت کے ضمن میں میں نے ایک اہم مضمون کی طرف مختصراً اشارہ کیا تھا اور قبائل سے تعلقات تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل کے ساتھ تعلقات قائم فرمائے۔ ان تعلقات کو تبلیغ اسلام اور دعوت اسلام کے فروغ کے لئے آپ نے استعمال فرمایا۔ لیکن ان تعلقات کا پورا منظر کیا تھا۔ ان میں سے ایک کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن امیہ الضمری کو کیوں نجاشی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ پس منظر سامنے ہو تو ان کے انتخاب کی معنویت اور حکمت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس طرح سے بعض واقعات ہیں جو جس انداز سے بیان ہوئے ہیں ان سے ان کی حقیقی حکمت کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

عام طور سے مشہور ہے کہ ہجرت حبشہ کفار مکہ کے مظالم سے بچنے کے لئے ہوئی۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے۔ ہجرت حبشہ میں یہ پہلو یقیناً اہمیت کا حامل تھا کہ مسلمانوں کو کفار مکہ کے مظالم سے بچایا جائے۔ لیکن ہجرت حبشہ کے اس واقعہ میں بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے جو حضرات ہجرت کر کے حبشہ گئے ان میں سے ایسے بہت سے حضرات شامل نہیں تھے جو مکہ مکرمہ میں ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ جن پر دن رات مظالم ہو رہے تھے۔ حضرت بلال حبشی کو حضرت ابوبکر آزاد کر چکے تھے۔ وہ حبشہ ہجرت کر کے نہیں گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی نہیں گئے۔ عمار بن یاسر مدینہ منورہ کے مظلومین میں شمار تھے۔ کسی کے غلام نہیں تھے لیکن وہ بھی ہجرت کر کے نہیں گئے۔ اس کے برعکس بعض ایسے صحابہ کرام ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جو عرب میں سرداری کا مقام رکھتے تھے۔ حضرت جعفر طیار، عبدالمطلب کے پوتے اور ابوطالب کے صاحبزادے، اور قبیلہ بنی ہاشم کے بہت نمایاں افراد میں تھے۔ وہ یقیناً مظلومین میں نہیں تھے۔ ان کے والد محترم جناب ابوطالب تو خود ریاست مکہ کے سربراہ اور مسلمانوں کے مؤید تھے۔ اس لئے حضرت جعفر کا شمار

ہے۔ صحیح مسلم کی ایک بہت غیر معروف روایت ہے۔ حضور کا یہ ارشاد بہت غیر معروف ہے۔ لیکن یہ اس اعتبار سے غیر معمولی ہے کہ اس میں بعض بہت عجیب باتیں بیان فرمائی گئی ہیں جو پچھلے لوگوں کے علم میں نہیں تھیں اور آج بھی بہت سے لوگوں کی توجہ اس پر نہیں ہے۔ بعض احادیث میں اہل مغرب پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ اس زمانے میں اہل مغرب کو یا تو بنو روم کہا جاتا تھا یا بنی الاصفر کہا جاتا تھا۔ بنو اصفر کی اصطلاح ان کے لئے تھی۔ اصفر یعنی زرد رو یا سرخی مائل۔ بنی الاصفر سے مراد ہوتی تھی اہل یورپ اور عام طور سے رومیوں سے یہ اصطلاح احادیث میں آئی ہے۔

امام مسلم نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ حضور کے ایک اور صحابی آپ کے پاس تشریف لے آئے۔ دوران گفتگو انہوں نے یہ بیان فرمایا کہ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ تقوم الساعة والروم اکثر الناس کہ جب قیامت قائم ہوگی تو دنیا میں رومیوں کی کثرت ہو جائے گی یعنی اہل یورپ کی کثرت ہو جائے گی۔ یہ کثرت تعداد کی بھی ہو سکتی ہے اور وسائل کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ کثرت وسائل کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے اور زور اور طاقت کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں سب کی گنجائش ہے۔ کس طرح کی کثرت ہوگی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کثرت کے بعض نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ بعض شاید آئندہ ظاہر ہونے والے بھی رہتے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص نے حدیث سن کر فرمایا کہ ابصر ما تقول، ذرا غور کیا ہے کیا کہہ رہے ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ اقول ما سمعت من رسول اللہ ﷺ، میں وہی بات کہہ رہا ہوں جو میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنی۔ انہوں نے دوبارہ اسی بات کو دہرایا۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ اچھا اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو پھر میری بات بھی سنو۔ یاد رہے کہ حضرت عمرو بن العاص کا شمار عرب کے چار ذہین ترین انسانوں میں ہوتا تھا۔ چار آدمیوں کو دہاۃ العرب کہا جاتا تھا کہ عرب کے داہیہ [illegible]۔ داہیہ غیر معمولی طور پر ذہین انسان کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لئن قلت ذلک، اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو یاد

رکھو، ان فیهم لخصالا اربعا، اہل روم میں چار خصوصیات ہیں۔ اس لئے وہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ انهم لاحلم الناس عند فتنة، جب وہ کسی فتنہ کا شکار ہوتے ہیں تو بہت تحمل اور بردباری کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دوسری خصوصیت بتائی۔ واسرعهم افاقة بعد مصيبة، جب کسی مصیبت کا شکار ہوتے ہیں تو بہت جلدی اس کے اثر سے نکل آتے ہیں۔ واوشكهم كرة بعد فرة، اور اگر کسی جنگ میں شکست ہو جائے تو بہت جلد دوبارہ حملے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وخيرهم لمسكين ويتيم وضعيف، اور اپنے مسکین، ضعیف اور یتیم کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وخامسة حسنة جميلة، پانچویں ایک بڑی خوبی یہ ہے: وامنعهم من ظلم الملوك، اور بادشاہوں کو ظلم سے روکنے کے لئے بہت آمادہ رہتے ہیں۔ یہ حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا ہے اور صحیح مسلم میں روایت ہوا ہے۔ اس طرح کے بے شمار تبصرے ہیں جو احادیث میں اہل یورپ اور مغرب کے بارے میں ملتے ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام بھی اور رسول اللہ ﷺ بھی اہل مغرب کی اس اہمیت سے واقف تھے اور اس سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً متنبہ بھی کرتے رہتے تھے۔

سیدنا عمر فاروق کے بارے میں ایک روایت میں آتا ہے کہ ان کو مشورہ دیا گیا کہ بحر متوسط اور بحر قلزم کے درمیان نہر سویز کی طرح کا ایک بحری راستہ بنا لیں۔ آپ نے سختی سے اس سے منع کیا، اور کہا کہ تم یہ نہ کرو۔ وجہ یہ بیان کی کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ اہل مغرب تمہارے گھروں کے صحنوں سے تمہاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ یعنی یورپ کے اثرات تمہارے گھروں کے اندر پہنچ جائیں گے۔ یہ نہر سویز کی تجویز کو رد کرتے ہوئے حضرت عمر نے فرمایا تھا۔ اب اگر یہ دیکھیں کہ نہر سویز کے بننے سے پہلے کیا حالات تھے اور بعد میں کیا تبدیلیاں آئیں تو سیدنا عمر فاروق کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ جو حقائق اور واقعات سیرت اور حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو جمع کر کے ایک نئے انداز سے موجودہ دور کی سیاست کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اسلامی امت کے مستقبل کو سمجھنے کے لئے ایسا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

ایک اور چیز جس کی طرف مختصر سا اشارہ کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سی احادیث اور سیرت کی کتابوں میں قدیم مذہبی اور آسمانی کتابوں کے حوالے بیان ہوئے

ہیں کہ تورات میں یہ آیا ہے۔ انجیل میں یہ آیا ہے۔ فلاں فلاں آسمانی کتابوں میں یہ آیا ہے۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو مستند احادیث میں آئی ہیں اور کچھ روایات وہ ہیں جو تابعین کے ذریعے آئی ہیں۔ ایسی روایت کا بڑا حصہ ان تابعین کے ذریعے آیا ہے جو اسرائیلیات کی روایت کیا کرتے تھے۔ اگر اسرائیلیات کی روایت کو فی الحال چھوڑ دیا جائے اور ان روایات کو لیا جائے جو احادیث صحیحہ میں آئی ہیں اور صحابہ اور مستند تابعین نے بیان کی ہیں تو ان کے حوالے قدیم کتابوں میں آج کس حد تک دستیاب ہیں اور ان بیانات کی اپنی تاریخی حیثیت کیا ہے، اس پر ابھی تک کوئی مناسب تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ یہ موضوع ابھی تشنۂ تحقیق ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ ہوں جو قدیم زبانوں کو جاننے والے ہوں۔ عبرانی، سریانی اور آرامی زبانیں سمجھنے والے ہوں۔ قدیم لٹریچر تک ان کی رسائی ہو۔ اس کے بعد وہ اس لٹریچر کا مطالعہ کرکے ان بیانات سے جو احادیث میں آئے ہیں ان کا مقابلہ کر سکیں۔

اس مواد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تو طوامیر بحر میت کا ہے۔ طوامیر بحر میت سے مراد وہ ذخیرہ ہے جو Dead Sea کے قریب ایک غار سے برآمد ہوا تھا۔ آج اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ حالانکہ یہ ذخیرہ اردن میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن مغربی طاقتوں نے اس ذخیرے کا بڑا حصہ اسرائیل منتقل کر دیا۔ آج یہ اسرائیل میں ہے اور مسلمان محققین کو اس سے استفادہ کی اجازت کافی عرصے سے نہیں ہے۔ یہ ایک بہت قدیم کتب خانہ تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی کتابوں پر بھی مشتمل ہے اور بیشتر کتابیں آپ سے بعد کی ہیں۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی تک کی کتابیں اس میں شامل ہیں۔ یہ طوامیر یعنی scrolls کی شکل میں دستیاب ہوئی تھیں۔ ان میں بہت سا ایسا مواد موجود ہے جس سے قرآن پاک اور احادیث کے بیانات کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن جب تک اس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے اور قرآن پاک اور احادیث کے بیانات سے اس کا تقابل نہ کیا جائے، اس وقت تک کوئی قطعی اور حتمی بات کہنا بڑا دشوار ہے۔

بعض مستشرقین نے جن میں سے ایک دو کی میں نے کل مثال دی تھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خانوادے کے بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں جو بڑی غلط اور غیر تاریخی ہیں۔ لیکن ان کو غلط اور غیر تاریخی کہنے کے لئے ضروری ہے کہ اس انداز کی تحقیق کو آگے بڑھایا جائے

جو سرسید نے حضورؐ کے خانوادے اور عرب کے جغرافیہ پر کی تھی۔ یہ موضوع تو قدیم ہو گیا ہے اور نئی (outdated) ہو گیا ہے۔ یہ آج بھی تازہ اور زندہ موضوع ہے۔ انساب پر اب بہت سا نیا مواد سامنے آیا ہے جو اس وقت سرسید وغیرہ کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس مواد کو سامنے رکھ کر علم انساب کی نئی تحقیق اور اس کی تدوین نو کی ضرورت ہے۔ مختلف قبائل میں حضورؐ کی جو رشتہ داریاں تھیں خاص طور پر آباؤ اجداد اور امہات نبیؐ کے بارے میں جو مواد سیرت نگاروں اور انساب نویسوں نے جمع کیا ہے، وہ بڑی آسانی سے کمپیوٹرائز کیا جا سکتا ہے۔

نفسیات سیرت کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ نفسیات سیرت میں کون کون سے پہلو ہیں۔ دعوت و تبلیغ میں نفسیات کے کیا پہلو ہیں۔ حکمت دعوت و تبلیغ کیا ہے۔ مذاکرات میں سیرت کی رہنمائی کیا ہے۔ پھر دوسرے علوم پر سیرت کے اثرات۔ اسلام کا بین الاقوامی قانون تو براہ راست سیرت سے متاثر ہے۔ لیکن تاریخ نویسی پر، علم رجال پر، فقہ اسلامی پر، تفسیر پر، تصوف پر، ان تمام علوم و فنون پر سیرت کے براہ راست اثرات ہوئے ہیں۔ وہ کیا اثرات ہیں۔ یہ چیزیں ایک نئی تحقیق کی متقاضی ہیں۔

قدیم کتب کے مغربی زبانوں میں تراجم درکار ہیں۔ آج مسلمانوں میں مغربی زبانیں جاننے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ قدیم کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ لیکن مزید ترجمہ کی ضرورت ہے۔

اجتماعیات سیرت یعنی Sociology of Sirah، اس کے بعض ضروری پہلوؤں کی طرف میں نے اشارے کیے تھے اور عرض کیا تھا کہ شاہ ولی اللہ ایک اعتبار سے اس فن کے موسس ہیں کہ انہوں نے السیاسات المدنیہ اور الاجتماعیات الملیہ کے نام سے اس مضمون سے بحث کی ہے اور اس کی طرف بعض اشارے کیے ہیں۔

طب نبوی کے نام سے بھی ایک شعبہ علم سیرت کے دفتروں میں پنہاں ہے۔ حافظ ابن قیم کی زاد المعاد میں اس موضوع پر بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ ان کی کتاب الگ سے بھی چھپی ہے۔ اس مواد کا فنی جائزہ لیا جانا چاہئے۔ آج کل کے ماہرین طب فنی تحقیق کے بعد ہی اس پر کوئی رائے دے سکتے ہیں۔

مخطوطات سیرت کا سروے کرنے کی ضرورت ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور ترکی زبانوں

میں بے شمار غیر مطبوعہ مخطوطات موجود ہیں۔ بہت سے مقالات یونیورسٹیوں میں ابھی غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ان کا ابھی سروے نہیں ہوا۔ یہ سب یکجا نہیں ہو سکے۔

سیرت کی کمپیوٹرائزیشن ہونی چاہئے۔ اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ آج کی ٹیکنالوجی مدد سے سب سے پہلے روایات معجزات کا جائزہ لیا جائے تو شاید بہت کی الجھنیں صاف کرنے میں مدد ملے۔ پہلے مرحلہ میں ان تمام راویوں کی درجہ بندی کمپیوٹرائزیشن کی جائے جن سے معجزات کی روایات نقل ہوئی ہیں۔ پھر ان سب روایات کا آپس میں مقابلہ کر کے تکرار کو دور کیا جائے اور اصل اور مستند معجزات کو متعین کیا جائے۔ معجزات کے بعد دوسرے راویوں کا اسی طرح الگ الگ جائزہ لینے سے بہت سے مسائل حل ہو سکیں گے۔

سیرت چیئرز ہمارے ہاں مختلف یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ کافی عرصہ سے میرا خیال ہے۔ میں نے یہ گزارش ایک دو مرتبہ پہلے بھی بعض یونیورسٹیوں میں کی کہ اگر ان میں سے ہر چیئر کا نام کسی نامور سیرت نگار کے نام پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً پنجاب یونیورسٹی میں سیرت چیئر کا نام مسند ابن ہشام ہو جائے۔ بہاولپور میں مسند عروہ بن زبیر ہو جائے۔ برصغیر کے سیرت نگاروں میں سے مسند شبلی، مسند سلیمان منصورپوری یا قدیم سیرت نگاروں میں سے مسند واقدی، مسند ابن ہشام وغیرہ اس طرح سے نام ہو جائے تو ان شخصیات کے کام اور نام کا ایک اعتراف ہوگا۔

سیرت نگاری کے آج مختلف درجات ہیں۔ عامۃ الناس کے لئے، تعلیم یافتہ حضرات، متخصصین اور مستشرقین ان سب کے لئے سیرت کے کام کی الگ الگ ضرورت ہے۔

قدیم کتب سیرت میں تہذیب، تمدن، تجارت، معیشت، رسوم و رواج، قبائلی تعلقات، رشتہ داریاں وغیرہ پر مواد بکھرا ہوا ہے۔ اس پر الگ سے تحقیق بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے ایسی تحقیق کی ہے۔ ان میں سے ایک بڑا مشہور کام اکرم ضیاء عمری نے کیا ہے۔ اس کا انگریزی اور اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک جامع کتابیات کی ضرورت ہے۔ جو اردو، انگریزی اور اس طرح کی تمام کتابوں کی جامع ہو۔ جس طرح کہ دنا گیلی کی کتاب کا میں نے ذکر کیا تھا۔ اس میں صرف عربی کتابوں کا ذکر ہے جو 29 ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔ مگر تمام کتابوں کا ایک نیا انسائیکلوپیڈیا اور

ببلیو گرافی بنائی جائے تو یقیناً اس کا عدد ایک ڈیڑھ لاکھ سے اوپر چلا جائے گا۔ اس لئے کوئی خود اردو زبان میں کچھ تیس ہزار کے قریب اندراجات اس میں ہوں گے۔ انگریزی اور بقیہ زبانوں کو اس میں شامل کرلیں تو یہ عدد بہت اوپر چلا جائے گا۔ یہ کام کوئی بڑا حکومتی ادارہ ہی کرسکتا ہے، افراد نہیں کرسکتے۔ اس طرح کے ایک دو کام اور بھی ہیں جو میں تجویز کرنا چاہتا تھا، لیکن وزیر صاحب تشریف نہیں لائے، مصروف ہوں گے۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں ان سے کہوں گا کہ وزارت کے تحت ان میں سے بعض کام شروع کرائے جاسکتے ہیں۔ یہ کام حکومت پاکستان ہی کرسکتی ہے۔ حکومت پاکستان خود نہ کرے تو کسی ادارے کو وسائل فراہم کرکے یہ کام سپرد کردے۔ لیکن یہ کام جب ہوسکتا ہے جب انسان کے دل میں عزم وارادہ ہو۔ نیت صاف ہو۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ دے۔ قسمت جب ساتھ دے گی جب وہ قسمت کو بنانا چاہے گا۔

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل

کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

☆

سوال و جواب

جب آپ اپنی کتاب محاضرات سیرت مرتب کریں تو وہ معلومات جو تنگی وقت کی وجہ سے پیش نہیں کر سکے ہیں وہ معلومات جو آپ کو بعد میں یاد آگئیں ہوں، براہ کرم ان کو اپنی کتاب میں شامل کریں۔

ان شاء اللہ۔ جب کتاب مرتب ہوگی تو میں وہ چیزیں ضرور شامل کروں گا جو رہ گئیں۔

☆

آپ نے علم سیرت کی تحقیق پر زور دیا۔ نبی علیہ السلام نے جو سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کا مکمل نمونہ پیش کیا، اس عملی نمونہ کی پاکستان اور بقیہ اسلامی ممالک میں ضرورت و اہمیت واضح کریں۔

یہ ساری بارہ دن کی گفتگو اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے تھی۔ مسلمانوں کی بقا اسی نمونہ کی پیروی میں ہے۔ مسلمانوں کو اگر عزت و آبرو کے ساتھ بطور مسلمان زندہ رہنا ہے تو ان کو اسی نمونہ کی پیروی کرنا ہوگی۔ اگر وہ اس نمونہ کی پیروی نہیں کریں گے تو ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔

علامہ اقبال نے الہ آباد کے خطبہ میں ایک بڑا معروف جملہ کہا ہے۔ Islam is itself a destiny, it does not suffer a destiny.

☆

آپ نے دورِ قدیم میں مختلف تقویموں کے رائج ہونے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ قریش بھی چار مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ اس وقت یہ کس تقویم کے تحت تھے؟ کیا یہ وہی مہینے ہیں جو آج بھی اسلام میں رائج ہیں؟

یہی مہینے عرب میں بھی رائج تھے۔ یہ اسلامی مہینے ہیں اور یہ بہت طویل زمانے سے، غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن عربوں نے ان مہینوں کے احترام کو اپنے مفادات میں استعمال کرنے کی خاطر نسی اور کبیسہ کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کے پیشِ نظر وہ اس میں کمی بیشی کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو اس وقت یہ دونوں کیلنڈر coincide کر گئے تھے۔ حقیقت کے اعتبار سے اس دن 9 ذی الحجہ تھی اور قریش کے جعلی کیلنڈر کے حساب سے بھی نو ذی الحجہ تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض آج زمانہ اسی وقت میں واپس آ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا۔ آج کے بعد نسی ہو گی نہ کبیسہ ہوگا۔

☆

آپ نے انتہائی اہم پہلو کی نشاندہی کی کہ اجتماعی طور پر مغربی پروپیگنڈے کے خلاف تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف اخبارات و جرائد میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے کام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ کس حد تک مثبت کام ہے؟

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کو جہاں تک میں جانتا ہوں یہ ختم نبوت کے میدان میں کام کرتی ہے اور جہاں جہاں دنیا میں قادیانی اپنے غلط خیالات و عقائد کو پھیلاتے ہیں یہ ان کو جواب دینے کے لئے وہاں کام کرتی ہے۔ اچھا کام ہے۔

آپ نے بتایا تھا کہ مختلف جامعات میں سیرت کی مختلف شعبہ جات کو مختلف شخصیتوں کے مقدس ناموں سے منسوب کرنا چاہئے۔ حال ہی میں یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری کا افتتاح ہوا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ اس کو کسی علمی اور تاریخی شخصیت سے منسوب کیا جاتا؟

یہ بالکل بہتر ہوتا۔ ہم نے یونیورسٹی کی لائبریری کا نام اس لئے نہیں رکھا کہ پاکستان کے ایک مشہور قانون دان اور ہماری یونیورسٹی کے پہلے بورڈ آف ٹرسٹیز کے رکن جناب خالد اسحاق صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ، جو پاکستان کا سب سے بڑا ذاتی کتب خانہ ہے اور جس میں ڈھائی لاکھ کے قریب کتابیں ہیں حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ وہ کتابیں ہماری لائبریری کو مل جائیں۔ وہ اپنی زندگی میں یہ کتابیں کسی ادارے کو دینا چاہتے تھے۔ میرا ان سے ملنا تھا۔ یونیورسٹی کے سابق ریکٹر جسٹس خلیل الرحمن خان صاحب بھی ان سے ملے تھے۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی تھی۔ کہ وہ اس پر غور کریں گے۔ ہم نے اس پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر آپ نے یہ کتابیں ہماری لائبریری کو دے دیں تو ہم مرکزی لائبریری کا نام خالد اسحاق لائبریری رکھ دیں گے۔ ابھی تک وہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ ان کے پس ماندگان نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہم نے لائبریری کا نام بھی نہیں رکھا۔ جب یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو جو حضرات اس وقت یونیورسٹی کے ذمہ دار ہوں گے وہ جو نام مناسب سمجھیں گے وہ رکھ دیں گے۔

☆

حضرت عمرو بن العاص عرب کے چار انتہائی ذہین اور عقلمند شخصیات میں سے تھے، دیگر تین حضرات کے اسمائے گرامی بتائیں۔

ایک کا نام تھا حضرت مغیرہ بن شعبہ، دوسرے تھے زیاد بن ابی سفیان اور چوتھے تھے

حضرت معاویہ ان کے بھائی۔

☆

جنگ عظیم اول میں جو 73 لاکھ افراد مرے گئے ان میں سے
کتنے مسلمان تھے؟

یہ مجھے معلوم نہیں۔ برطانوی فوج میں ضرور مسلمان تھے جو برصغیر کے سپاہیوں پر مشتمل تھے لیکن ان کی صحیح تعداد کا مجھے علم نہیں۔ اندازہ ہے کہ وہ لاکھوں میں ہوں گے۔

☆

لفظ عشق جو اپنے معنی بھائی بہن اور والدین کے ساتھ بہت
زیادہ بیہودہ ہونے کے باوجود ہم استعمال نہیں کر سکتے تو حضور
کے ساتھ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟

عربی میں لفظ عشق کے معنی بہت زیادہ اور شدید محبت کے ہیں۔ اردو میں یہ لفظ کسی اچھے یا قبیح معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ تمام معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فارسی اور صوفیانہ ادبیات میں یہ اصطلاح ذات رسالت مآب اور اللہ تعالیٰ سے محبت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ صوفیاء اس کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ مولانا روم نے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ علامہ اقبال نے استعمال کیا ہے۔ اور بھی بہت سے اکابر صوفیاء اس لفظ کو استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس لئے اس سیاق و سباق میں اس کے استعمال میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہونی چاہئے۔

☆

کیا حکومت پاکستان موجودہ اکیسویں صدی میں سیرت کو
عام کرنے کے لئے تحقیقی مرکز یا تحقیقی پالیسیاں کیوں
نہیں بنا سکی؟

یہ تو ان پارٹیوں سے پوچھئے، ان کی طرف سے میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔

☆

کیا سیرت نبوی پر تمام کتب کی ویب سائٹ اور کتب کے کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے لئے کوئی ایک لائبریری قائم نہیں ہو سکتی۔

کیوں قائم نہیں ہو سکتی، بالکل ہو سکتی ہے۔ میں نے یہی عرض کیا ہے کہ اگر تمام مسلم ممالک کوئی ایسی بڑی لائبریری بنائیں جس میں ان تمام کتابوں کو ویب پر منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو یہ بڑا مفید ہوگا۔

☆

حضرت عمر فاروقؓ نے نہر سویز کو بنانے سے منع کیا۔ اس کی وجوہات کو تھوڑا سا واضح کر دیں۔ عورتوں کو اٹھائے جانے سے کیا مراد ہے؟

آپ نے غالباً اس لئے منع فرمایا تھا کہ جو اسلام کا دل ہے یعنی حجاز، مکہ اور مدینہ منورہ، یہ براہ راست ان کی زد اور ان کے اثر میں آجائے گا۔ اس لئے حضرت عمر فاروقؓ نے اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔ تجربے نے ثابت کیا کہ جب سے نہر سویز بنی ہے یہ علاقہ براہ راست ان بحری طاقتوں کی زد میں آ گیا۔ وہ جس آسانی سے مشرقی ممالک پر قبضہ کر سکے اس میں نہر سویز کی بڑی اہمیت ہے۔ نہر سویز سے پہلے ان کو بہت دور سے آنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے وسائل اتنی آسانی سے دستیاب نہ ہوتے تھے۔ بظاہر یہی چیزیں حضرت عمرؓ کے پیش نظر ہوں گی۔

عورتوں کے اٹھا لے جانے سے مراد یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا دشمن اور داخلی پہلو ان کے سامنے کھل جائے گا تو پھر مسلمانوں کی خاندانی زندگی اور پرائیویسی محفوظ نہیں رہے گی۔ یہ مراد ہے۔

آپ نے جو فارسی شعر پڑھا اس کا ترجمہ بتا دیں۔

فارسی شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں طلب صادق نہ ہو تو اگر خضر کی ہمراہی میں بھی آب حیات کے چشمے تک پہنچ جائے گا تو اس کو آب حیات حاصل نہیں ہوگا۔ آب حیات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اپنے دل میں بھی طلب صادق اور سچا جذبہ موجود ہو۔

☆

سیرت کے حوالہ سے جو کام ہوا ہے کیا مستقبل میں اس سے بہتر کام ہو سکتا ہے؟

یقیناً ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف نبوت کا دروازہ بند کیا ہے۔ باقی کوئی دروازہ بند نہیں کیا۔ آنے والے پچھلوں سے بہتر کام کر سکتے ہیں۔

☆

نبی کریم ﷺ کے غزوات کے تناظر میں آپ نے مقتولین کی تعداد 550 بتاتے ہوئے اشارہ کیا تھا کہ بنو قریظہ کے بارے میں ہم تفصیل کی وضاحت بعد میں کریں گے، اس کا تعین تشنہ رہ گیا۔

وہ کہنا یہ تھا کہ بنو قریظہ ایک اہم یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ منورہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ یہودیوں کے قبائل میں مسجد نبوی سے سب سے بعید مسافت پر یہی تھا۔ ان سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ یہ یہودی دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور ان کو وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو مدینہ کے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ لیکن جب غزوہ خندق ہوا اور کفار مکہ نے دیگر کفار سے مل کر بڑی تعداد میں لشکر بنا کر مسلمانوں پر حملہ کیا تو بنو قریظہ کے یہودیوں نے اندر سے ان کے ساتھ مل کر سازش کی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی

اس لائبریری کا پس منظر یہ ہے کہ بحر میت (بحر مردار) جس کو کہتے ہیں۔ اس کا مغربی کنارہ پہلے اردن کے قبضے میں تھا اور 1968 میں اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ وہاں ایک غار میں 1947 میں ایک لائبریری دریافت ہوئی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد تک کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ کچھ کتابیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی بھی بتائی جاتی ہیں وہ کچھ بعد کی ہیں۔ یہ سب مخطوطات کی شکل میں مٹی کے مٹکوں میں رکھی ہوئی تھیں اور قیاس اندازہ یہ ہے کہ جب عیسائیوں پر مظالم ہو رہے تھے اور یہودی ان پر سختیاں کر رہے تھے تو کوئی عیسائی راہب ان کو محفوظ کرنے کی خاطر ان کو غار میں رکھ کر اپنی جان بچا کر کہیں چلے گئے۔ شاید اس نیت سے کہ بعد میں جب حالات بہتر ہوں گے تو آ کر یہ کتب خانہ لے لیں گے۔ وہ بعد میں نہیں آ سکے۔ یہ کتب خانہ پڑا رہا اور 1947 میں دریافت ہوا۔ جب ماہرین نے اس کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس میں بہت سی مذہبی کتابیں ہیں۔ کچھ میں یہودیت کے بارے میں بھی کتابیں ہیں اور عیسائیوں کے بارے میں بھی مختلف اہل علم کی یادداشتیں ہیں۔ بعض قدیم کتابوں کے قدیم نسخے ہیں۔ یہ کتابیں اس وقت دریافت ہوئی تھیں جب وہاں اس وقت فلسطین پر یہودیوں کا باقاعدہ قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اسرائیل کی ریاست بننے کے بعد اس کا بڑا حصہ تو مغربی ملکوں میں منتقل کر دیا گیا۔ بعض حصے بیت المقدس میں اردن کے قبضے میں رہے۔ بعد میں جب اسرائیل کا قبضہ مغربی کنارے پر بھی ہو گیا تو وہ سارا ذخیرہ بھی اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے کچھ اجزا شائع ہوئے ہیں۔ میں نے خود اس کی کوئی چیز پڑھی نہیں۔ Dead Sea Scrolls کے بارے میں ایک دو کتابیں پڑھی ہیں۔ لیکن جو اجزا شائع ہوئے ہیں اور عربی یا انگریزی میں ترجمہ ہوئے وہ میں نے دیکھے نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس میں بعض ایسی چیزیں ہیں جن سے قرآن پاک کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے کہ سیرت اور حدیث اور قرآن پاک میں جو بیانات پچھلی قوموں کے بارے میں آئے ہیں کیا اس ذخیرہ میں ایسی کوئی چیز ہے جس سے ان کی تصدیق ہوتی ہو۔

☆☆

سیرت ہے اور پانچویں اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور عمر باقی رہی تو دو محاضرات فکر و عقیدہ کے نام سے اسی طرح سے بارہ خطبات ہوں گے۔ اس کے بعد میری ہمت کا یہ منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ اس کے بعد انگریزی اور عربی جس زبان میں بھی موقع ہوگا وہ لکھیں گے۔

☆

مورخین اسلام نے خلافت راشدہ کے زمانے کو Golden Era کہا ہے۔ اس کے ساتھ یورپ کو اس اعتبار سے تاریک زمانے کا نام دیا ہے۔ Dark age۔ لیکن آپ کے کلام سے استقبالیات سیرت کے نام سے جو حدیث مسلم شریف سے ارشاد ہوئی تو اس حدیث سے اہل یورپ کی ہنرمندی اور کمال ظاہر ہوتا ہے۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے یا تاریخ اسلام جو قدیم زمانے سے ہم پڑھتے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں یورپ کی تاریخ کے ادوار کی روشنی میں اسلامی تاریخ کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو دیکھنا چاہئے کہ اس کی implications کیا ہیں، اس پر اہل علم کو غور کرنا چاہئے۔

☆

ڈاکٹر ذاکر نائیک کے بعض محاضرات سیرت پر ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک صحیح الخیال انسان اور مخلص مسلمان ہیں۔ ان کے لیکچر بھی اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک دو لیکچر ان کے سنے ہیں۔ مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ میں ان سے ملا بھی ہوں۔ مجھے بہت اچھے آدمی لگے ہیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔

☆

ذرا وضاحت کیجیے کہ مسلمانوں کی جتنی خلافتیں گزری ہیں ان
میں سے کیا کسی نے حکومتی سطح پر سیرت کا کام کیا؟

سیرت پر کام کرنا تو علما کا کام ہے۔ یہ حکومتوں کا کام نہیں ہے۔ حکومتیں وسائل فراہم کر سکتی ہیں لیکن کام تو اہل علم ہی کریں گے، سیرت نگار اور مورخین کریں گے۔ ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ حکومتوں نے وسائل فراہم کیے ہیں۔ عبدالملک کا میں نے حوالہ دیا۔ عبدالملک نے عروہ بن زبیر اور کئی دوسرے سیرت نگاروں کو آمادہ کیا کہ وہ سیرت پر مواد جمع کریں۔ آج کل کی حکومتوں کو بھی یہ کام کرنا چاہیے۔

☆

کیا وجہ ہے کہ ہمارا کوئی بھی پروگرام ہو تو حکومت کے ارباب کار
ہمیشہ آنے سے کتراتے ہیں؟

ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں کئی بار آئے ہیں۔ وزیراعظم صاحب دو تین بار تشریف لائے ہیں۔ صدر صاحب دو بار اسی ہال میں تشریف لائے ہیں۔ کئی وزرا آچکے ہیں۔ میرے خیال میں کسی ایک یا دو واقعات کی روشنی میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔

☆

اس قسم کے پروگرام آپ مزید کرتے رہیں گے تو عام لوگ
بھی مستفید ہوں گے۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گے۔

☆

سیرت کے حوالے سے ابلاغ عامہ پر کام کس طرح ممکن ہے؟

سیرت کے حوالے سے ابلاغ عامہ تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ آپ سیرت پر دستاویزی فلمیں

بھی دکھا سکتے ہیں۔ اہم کتب سیرت کا تعارف بھی کروا سکتے ہیں۔ اہم مورخین سیرت کے بارے میں پروگرام ہو سکتے ہیں۔ لیکچرز ہو سکتے ہیں۔ اہم مقامات سیرت کے بارے میں دستاویزات تیار ہو سکتی ہیں۔ جنگوں کے مقامات کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب ہے عہد نبوی کے میدان جنگ۔ ان پر آپ ایک سیریز شروع کر سکتے ہیں۔ جنرل اکبر خان کی کتاب پر ایک سیریز آ سکتی ہے۔ جنرل محمود شیث خطاب کی کتابوں پر ایک سیریز آ سکتی ہے۔

☆

سیرت پر جدید کام کے سلسلہ میں مصر میں ایک فلم الرسالہ بنائی گئی ہے۔ سنا ہے مصری فقہا نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس طرح کے کام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

یہ فلم مصر میں نہیں لیبیا میں بنی تھی اور کرنل معمر قذافی نے بنوائی تھی۔ شروع میں مصر کے علمائے کرام نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا۔ یہ بنی بھی 76-1975 وغیرہ میں تھی۔ اب انہوں نے اگر کوئی نئی بات کہی ہے تو میرے علم میں نہیں۔ لیکن عام طور پر علمائے کرام کہتے ہیں کہ سیرت کو فلموں کا موضوع بنانا احتیاط اور تقدس کے خلاف ہے۔ اس رائے کا احترام ہونا چاہئے۔

☆

توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت کے خلاف احتجاج کے دوران مسلمانوں کا اپنے ہی املاک کو نقصان پہنچانا کیسا ہے؟

یہ تو غلط بات ہے۔ ہر شخص کا جان و مال محفوظ ہے۔ جن لوگوں نے کسی کے املاک کو نقصان پہنچایا انہوں نے قرآن کریم کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا ارتکاب کیا۔ اگر کسی نے ڈنمارک میں توہین رسالت کا جرم کیا ہے تو لاہور میں رہنے والے کسی شخص کی موٹر کار کو ضائع

کرنا، کسی کے مکان اور دکان کو آگ لگانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ یہ شریعت کی رو سے جرم ہے۔ اگر یہاں اسلامی قانون نافذ العمل ہوتا تو اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے کو کڑی سزا دی جاتی۔

☆

تنقیداتِ سیرت پر اردو یا انگریزی میں لکھی کوئی کتاب کا نام بتادیں۔

میرے علم کی حد تک تو غالباً تنقیداتِ سیرت پر الگ سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ بعض مضامین لوگوں نے البتہ لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں اور سیرت نمبروں میں شائع ہوئے ہیں۔

☆

غزوہ بدر، احد اور حنین سے لے کر آج تک بھی مسلمان اللہ کی معیت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکے۔ خداوند قدوس کی نصرت بھی نافرمانوں کے ساتھ نہیں رہتی۔ تو اس فعل کے تدارک کرنے کے لئے آج کے دور میں کیا صورت اختیار کی جائے؟

لوگوں کو دعوت دی جائے، تبلیغ کی جائے، دین کی تعلیم دی جائے۔ بس یہی ہے۔ اس کے علاوہ تو کوئی چارہ نہیں۔

☆

نورالدین زنگی کا جو واقعہ سیرت کی کتابوں میں نقل ہے اس کی تفصیلات بیان کریں۔

نورالدین زنگی کا واقعہ یہ ہے کہ یہ شام کے حکمران تھے۔ یہ اس عظیم بادشاہ کے پیش رو ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے آزاد کرایا تھا۔ جس کی نظیر اور مثیل کے مسلمان طویل عرصے سے منتظر ہیں اور ان شاء اللہ نیا صلاح الدین ایوبی بھی آئے گا اور نیا

نورالدین زنگی بھی آ نکلا۔

نورالدین زنگی نے خواب میں رسول ﷺ کی زیارت کی۔ حضور نے دو آدمیوں کی طرف خواب میں اشارہ کر کے نورالدین سے کہا کہ ان سے میری حفاظت کرو۔ نورالدین زنگی پریشان ہوئے، بہت سوچا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دوبارہ یہی خواب دیکھا۔ تیسری بار پھر یہی خواب دیکھا تو پھر لوگوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً مدینہ منورہ چلیں۔ وہاں دیکھیں گے کہ اس خواب کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ تو جب ان کا مدینہ منورہ چلے جانا طے ہوا تو علم ہوا تھا۔ بہت بڑے لشکروں میں سے تھے۔ وہاں انہوں نے یہ چاہا کہ ان دو آدمیوں کی شناخت کریں جن کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ کیا تھا۔ نورالدین نے کہا کہ مدینہ کے رہنے والے تمام لوگوں کے اعزاز میں میری طرف سے دعوت ہے اور میں ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے انعام دوں گا۔

انہوں نے پورے اہل مدینہ کی دعوت کی۔ ایک ایک آدمی کو بیٹھے ہوئے انعام دیا لیکن وہ دو آدمی نظر نہیں آئے۔ اگلے دن انہوں نے پھر دعوت کی اور کہا کہ مدینہ کا رہنے والا کوئی بھی شخص غیر حاضر نہ رہے۔ اس بار بھی وہ دو آدمی نظر نہ آئے۔ تیسرے دن انہوں نے اصرار سے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ سب آ گئے ہیں صرف دو بزرگ ہیں جو بہت عرصے سے آئے ہیں اور وہ تمام دن رات عبادت میں گزارتے ہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین زنگی نے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین نے کہا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ وہاں ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف حضور نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ نورالدین زنگی نے تھوڑی سی گفتگو کی تو اہل مدینہ کہنے لگے کہ یہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔ نورالدین نے کہا کہ آپ حضرات تشریف رکھئے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں مجھے وہ کرنے دیجئے۔

ان کو ڈرایا جب بات نہ بنی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ نورالدین زنگی نے حکم دیا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ گھر کی تلاشی لی گئی تو جہاں ان کا مصلیٰ بچھا ہوا تھا وہاں سے پتھر کی ایک سل نکلی۔ پتھر کی سل کے نیچے ایک سرنگ روضہ اطہر تک نکالی ہوئی تھی۔ انہوں نے مکان روضہ اطہر کے قریب بنایا ہوا تھا۔ نورالدین نے مزید سختی کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں